پیغمبرِ اسلام

غیر مسلموں کی نظر میں

تالیف وتدوین: محمد یحییٰ خان

- کارلائل، مائیکل ہارٹ، نپولین اور کونسٹن ورجیل جارجیو کا خراجِ عقیدت
- انجیل برنا باس کی گواہی
- ہندو ادیبوں اور شاعروں کا نذرانۂ عقیدت

تدوین وتالیف

محمد یحییٰ خان

نگارشات پبلشرز

24- مزنگ روڈ، لاہور۔ فون 042-37322892 فیکس 042-37354205
e-mail:nigarshat@yahoo.com
www.nigarshatpublishers.com

نام کتاب: پیغمبر اسلام ﷺ: غیر مسلموں کی نظر میں

تدوین وتالیف: محمد یحییٰ خان

ناشر: آصف جاوید

برائے: نگارشات پبلشرز، 24۔ مزنگ روڈ، لاہور

Ph:0092-42-37322892 Fax:37354205

مطبع: حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور

سال اشاعت: 2011ء

قیمت: -/550 روپے

☆☆☆☆☆☆

پیش لفظ

چالیس سال قبل میں راولپنڈی کے ایک پُر رونق اور مصروف ترین حصہ، راجہ بازار میں کسی کام کے سلسلے میں گھوم رہا تھا کہ سکھوں کی مختلف ٹولیاں نظر آئیں جو چار چار اور چھ چھ کی تعداد میں سیر کر رہے تھے۔ یہ لوگ بھارت سے حسن ابدال آئے تھے جہاں ان کے چند مذہبی مقامات ہیں تاکہ ان کی یاترا کر سکیں۔

مجھے سکھ مذہب کے بارے میں کچھ جاننے کا تجسس ہوا۔ اس وقت میری عمر بیس اکیس سال ہوگی، مذہب سے متعلق میرا کوئی قابل ذکر مطالعہ نہ تھا۔ میں نے ایک ٹولی کو روک کر پوچھا کہ ''آپ کسی نئے آدمی کو اپنے مذہب میں کیسے لاتے ہیں؟ یعنی اس سے کیا قول واقرار لیتے ہیں، کون سا 'کلمہ' پڑھواتے ہیں''۔ میری عمر کے نوجوان کا یہ سوال ان کے لئے بالکل غیر متوقع تھا۔ ان میں سے ایک بولا ''وہ پیچھے جو جتھہ آ رہا ہے اس میں ہمارے ایک گرنتھی ہیں ان سے پوچھ لینا''۔ یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

چند لمحوں بعد وہ جتھہ قریب آ گیا۔ ان میں ایک سردار صاحب ذرا زیادہ نمایاں تھے۔ اندازہ ہوا کہ یہی ''گرنتھی'' ہو سکتے ہیں چنانچہ میں نے وہی سوال دہرا دیا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری اور بولے...... ''کاکا ہم کسی کو سکھ بناتے نہیں، اپنے سکھ آپ 'پیدا' کر لیتے ہیں'' سب نے قہقہہ لگایا اور چل دیئے۔ چند مقامی لوگ جو قریب آ کھڑے ہوئے تھے وہ بھی ہنس پڑے اور میں شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ لیکن سوچتا رہا کہ ہم ''کسی'' کو مسلمان بنانے کے لئے پھر کلمہ طیبہ کیوں پڑھواتے ہیں۔ اپنی اسلامی برادری میں وسعت کے لیے افزائش نسل پر ہی انحصار کیوں نہیں کرتے؟ اور غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی کوششیں 'کیوں' کرتے ہیں؟ ہمارے پاس کیا ہے جس سے ہم دنیا کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟ تبلیغ کیا ہے؟ ماضی میں اس کا

طریقہ کیا تھا؟ اب کیا ہے اور آئندہ کیا ہونا چاہئے''۔اس سلسلے کا سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اہل دنیا ہمیں کیا سمجھتے رہے ہیں اور ہمارے بارے میں ان کے عزائم کیا ہیں۔

☆......☆......☆

اس سے کچھ عرصہ بعد، میں عملی صحافت سے منسلک ہو گیا جو''سوالات اور جوابات''ہی کی ایک دنیا ہے۔سکھوں سے ہونے والی ''مڈھ بھیڑ'' سے میرے ذہن پر جو سوالیہ نشانات مرتسم ہوئے تھے وہ میرے شعور اور تحت الشعور میں مسلسل کلبلاتے رہے۔اس پیشے سے آشنا لوگ جانتے ہیں کہ نیوز روم ایک اعصابی مرکز (NERVE CENTRE) ہوتا ہے جو دنیا بھر سے خبریں وصول کرتا، ان کی چھان بین (SIFTING) کرتا اور ان میں سے چند ایک کا انتخاب کر کے انہیں آگے پھیلانے کا کام انجام دیتا ہے۔

''نیشنل ڈیلیز'' قوموں اور ملکوں کی خبروں کو خصوصی طور پر ڈیل کرتے ہوئے اپنے ملک اور اپنی قوم کے حوالہ سے خبروں کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔رات کے نیوز ڈیسک پر باہر سے آنے والی خبریں سمندر کی لہروں کی طرح ٹھاٹھیں مارتی ہوئی آتی ہیں۔ان لمحات میں کام کرنے والے صحافیوں کی ٹیم کا ایک رکن میں بھی رہا ہوں۔ان خبروں میں''میری پسند'' کی اطلاعات بھی ہوتی تھیں جو میرے ذہن کے کمپیوٹر میں ہر سوال کے خانے میں خود بخود درج ہوتی چلی جاتی تھیں۔اور میرا جو ذہنی سفر اس پیشے سے منسلک ہونے سے پہلے شروع ہوا تھا وہ نئی وسعتوں (dimensions) کے ساتھ جاری رہا۔

☆......☆......☆

اس دوران سوچ کے اس دھارے نے مجھے ایک شخصیت سے ملا دیا۔ہم دونوں ایک ہی افق میں مختلف سطحوں پر''تیراکی'' کرتے ہوئے آپس میں آ ملے۔

ہوا یوں کہ 1960ء کے عشرے میں مسئلہ کشمیر، مسئلہ فلسطین، عرب سوشلزم، افغانستان میں خانہ جنگی اور مشرقی پاکستان میں زیر زمین سازشوں کے حوالے سے مغربی ذرائع اطلاعات جو خبریں دیتے تھے ان کا خصوصی جھکاؤ (Slant) اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے منافی محسوس ہونے لگتا تھا۔بین الاقوامی خبر رساں ادارے، اسلام اور پاکستان سے اپنے عناد کا مظاہرہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔نائیٹ ڈیسک پر کام کرنے والے دیگر رفقا کی

طرح میں بھی ان پر اپنے ردعمل کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ یہ تندوتیز خبریں میرے نظریۂ اسلامیت، میرے نظریۂ پاکستانیت، اور میرے نظریۂ جمہوریت سے بھی ''چھیڑ چھاڑ'' کرتی تھیں ان خبروں کے ساتھ ساتھ مشہور غیر ملکی جریدوں ٹائم نیوز ویک، اکانومسٹ اور فار ایسٹرن اکنامک ریویو میں بھی چھپنے والے نام نہاد غیر جانبدارانہ تجزیوں اور تبصروں میں مسلمانوں، عربوں اور پاکستان پر جمہوریت دشمنی وغیرہ کے فقرے چست کئے جاتے تھے۔ جن پر کوئی حساس پاکستانی اپنا ردعمل ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

ان جرائد کے بعض شماروں میں ایک محب وطن پاکستانی کی طرف سے ان ناروا حملوں کے تابڑتوڑ جوابات شائع ہونے لگے اور نیچے اس لکھنے والے کا نام ''ایم اے خان اختر لاہور'' چھپا ہوا دیکھا تو میں نے اس شخصیت کی تلاش شروع کر دی۔ دیا ہوا پتہ، انہیں TRACE کرنے کے لئے ناکافی تھا تاہم میری کوششیں جاری رہیں۔

حسن اتفاق کہئے یا جذبۂ تلاش کی صداقت کہہ لیجئے کہ ایک رات آخری کاپی پریس جا رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ بی بی سی کے نصف شب کے بلیٹن میں نشر کردہ خبر میں حسب معمول، پاکستان پر کوئی رکیک حملہ کیا گیا تھا اور فون کرنے والے ''صاحب'' اس خبر کی کسی اور ایجنسی کے حوالہ سے تفصیل جاننا چاہتے تھے۔ آخری کاپی جب آخری دموں پر ہو، ایسا فون اٹینڈ کرنے کے لئے وقت نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے مگر ادھر سے اصرار تھا کہ ''میں نے سب اخباروں کو فون کیا ہے کوئی جواب دینے کو تیار نہیں، آپ پلیز......'' اس پر میں نے کہا آپ فون بند کر دیجئے، مجھے نمبر دیجئے کاپی جانے کے بعد میں آپ کو رنگ بیک کرتا ہوں۔

میری جوابی کال پر انہوں نے اپنا جو نام بتایا تو یہ وہی 'نام' تھا جو کئی دنوں سے ذہن میں اٹکا ہوا تھا۔ ان کے لہجے میں تجسس اور ٹھہراؤ تھا۔ کاپی جا چکی تھی خوب اطمینان کے ساتھ تبادلہ خیال ہوا۔ میں نے رات گئے تک ایک ''عام شہری'' کے جاگنے اور غیر ملکی نشریات کا کسی پیشہ ور صحافی کی سی بے تابی سے انتظار کرنے کا ''اسرار'' معلوم کرنے کے لئے ان سے وقت مانگا۔ ان دنوں ایم اے خان اختر، یعنی نواب اختر کا ادارہ ''پاک بک کارپوریشن'' کمرشل بلڈنگ، دی مال پر تھا جہاں اگلے روز ہماری ملاقات ہوئی۔ پتہ چلا کہ آپ حیدر آباد (دکن) میں پیشۂ صحافت سے وابستہ تھے اور جب سے ہجرت کر کے پاکستان آئے ہیں، صحافت تو ترک کر دی ہے مگر ''رگِ

صحافت'' برقرار اور سلامت رہ گئی ہے۔ وہ پہلے خبروں پر ''نظر جمائے'' رکھتے تھے اب ''کان لگائے'' رہتے ہیں۔ غیر ملکی بلیٹن سنتے رہتے ہیں اسلام یا پاکستان کے خلاف کچھ سنتے ہیں تو اپنا ردعمل، کسی نہ کسی شکل میں ضرور ظاہر کرتے ہیں۔ کیونکہ بقول ان کے، انہوں نے پاکستان بنتے دیکھا ہے۔ ملک بنتے بنتے ''بنتے'' ہیں۔ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔ اور اس ''سحر'' کے لیے صد ہزار انجم کا خون ہوتے بھی دیکھا ہے۔ وہ مسلم ریاست حیدر آباد میں بھارت کا شرمناک پولیس ایکشن اور جبری ادغام کا عمل بھی دیکھ چکے ہیں اور اس معاملے میں اتنے حساس ہو چکے ہیں کہ یاد ماضی انہیں مسلسل بے تاب رکھتی ہے۔ چنانچہ نصف شب تک اغیار کی ریڈیائی نشریات کی سماعت ان کے اسی کرب کا مظہر تھی۔

دلچسپیوں کا یہی اشتراک ہماری دوستی کی پختہ بنیاد بنا۔ یکساں نظریات اور یکساں سوچ پر مبنی یہ تعلقات بحمد اللہ نصف صدی سے برقرار ہیں۔ اس دوران ''پاک بک کارپوریشن'' کے ذریعہ امریکہ اور یورپ میں چھپنے والی تازہ بہ تازہ کتب و جرائد کی SCANNING کے مواقع مجھے بھی ملتے رہے۔ ذہن میں اٹھنے والے سوالات کے نئے نئے جوابات موصول ہوتے رہے۔ صحافت میں صدی کا تقریباً نصف حصہ گزار چکا ہوں ایک مشہور شعر کے حوالے سے کہہ سکتا ہوں کہ ''نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں'' نظریاتی دنیا میں کئی تلاطم آئے۔ میرا ذہنی سفر بھی، نشیب و فراز کے ہچکولوں کے ساتھ جاری رہا۔

☆......☆......☆

اس دوران برطانیہ کے انیسویں صدی کے شہرۂ آفاق مصنف اور سماجی نقاد ٹامس کارلائل کے ''ورکس'' کا تازہ ترین مجموعہ، جو نارمن اینڈ شارلاٹ سٹراؤس کا ایڈیشن ہے نواب اختر کے ہاں ''وارد'' ہوا یہ ایڈیشن پہلے ایڈیشنوں کے مقابلے میں زیادہ معتبر اور مصدقہ تسلیم کیا گیا ہے (یہ ایڈیشن یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس نے شائع کیا ہے)۔ اس میں حضرت محمد ﷺ، ڈانٹے، مارٹن لوتھر اور نپولین کی شخصیات کے مختلف پہلوؤں پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے اور عالمی تاریخ کو نیا موڑ دینے میں ان کے انفرادی کنٹری بیوشن کی تفصیل دی گئی ہے۔ یہ کتاب دنیا کی پندرہ زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔

جونہی نواب اختر صاحب کو یہ نسخہ ملا۔ انہوں نے مجھے کارلائل کے لیکچر ثانی ''محمد بطور ہیرو''

کا ترجمہ کرنے کو کہا۔ میں نے چند روز مطالعہ کے بعد کہا کہ پاکستان میں اس کا ترجمہ شدہ ایڈیشن موجود ہے۔ مگر ان کا اصرار تھا کہ "خواہ کچھ بھی ہو تم نے یہ کام کرنا ہے"۔ چنانچہ میں نے اسے اردو کے قالب میں ڈھالنے کے لئے ترجمے کی بجائے ترجمانی کا انداز اپنایا کیونکہ "وکٹورین دور" کی زبان کا لفظی ترجمہ کیا جاتا تو اس موجودہ دور کے قاری کو شاید الفاظ تو پہنچ جاتے مگر مفہوم پوری طرح ذہن نشیں نہ ہو سکتا۔ جب کام کا یہ حصہ مکمل ہوا تو ساٹھ ستر صفحات سے زیادہ ضخامت نہ بن سکی۔ اس طرح یہ پمفلٹ سا بن کر رہ گیا۔ چنانچہ باہمی مشورہ سے طے پایا کہ کارلائل کے علاوہ بھی متعدد ممتاز شخصیات ہیں جنہوں نے حضور ﷺ کو شاندار خراج تحسین پیش کیا ہے چنانچہ "THE HUNDRED" "سو موثر ترین شخصیات" کے مصنف مائیکل ایچ ہارٹ، کارلائل ہی کے چوتھے ممدوح نپولین بونا پارٹ کے خود نوشت مضمون اور 1944ء میں رومانیہ کے وزیر خارجہ کونسٹن ورجیل جارجیو کے طویل تحقیقی مقالہ سے بھی استفادہ کیا جائے۔ بعد ازاں انجیل برناباس کے ان اقتباسات کو اس میں شامل کر لیا گیا جن میں حضور ﷺ کی آمد کی واضح پیشین گوئیاں اور محاسن کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس طرح کتاب کی معنوی افادیت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی ضخامت بھی مناسب ہو گئی ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب پبلک لائبریریوں اور ذوق مطالعہ رکھنے والے حضرات کی ذاتی لائبریریوں کے سٹینڈرڈ شیلفوں میں مناسب جگہ پا سکتی ہے۔ ہندو شعراء کا منظوم خراج عقیدت بھی اسی خیال سے اس میں شامل کر لیا گیا ہے۔

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا ہے کہ ان تمام مضامین اور مقالات میں "نسلی و علاقائی مذاہب" کے مقابلے میں اسلام پر ایک تبلیغی اور تحریکی دین کی حیثیت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ جیسا کہ سالہا سال قبل راولپنڈی میں بھارتی گرنتھی کے "جواب" نے میرے ذہن میں خیال پیدا کیا تھا۔

میں ان حضرات کے موقف کو بھی بے حد قابل احترام سمجھتا ہوں جو کہتے ہیں کہ سرور عالم حضرت محمد ﷺ کی بلند و بالا شخصیت کو منوانے کے لئے ہمیں غیر مسلموں سے سرٹیفکیٹ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ درست ہے۔ مگر ایک رائے یہ بھی ہے:

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اپنے لوگ تو اپنوں کی تعریفیں کرتے ہی ہیں۔ اس میں بھی تو مزا ہے جب اغیار ہمارے محبوب کی تعریف میں رطب اللسان ہوں اور ہم ان کی زباں سے بھی محبوب کبریاء کی تعریف سنیں۔ زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن سے مسحور تو تھی مگر اس نے مصر کے اعلیٰ طبقات کی بیگمات کو بھی ان کے حُسن سے مرعوب کرنے کے لئے دعوت کا اہتمام کر ڈالا تھا۔ اور وہ حسنِ یوسف سے اتنی متاثر ہوئیں کہ سیب کاٹتے ہوئے اپنی انگلیاں بھی کاٹ بیٹھیں۔

یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ مغرب کے اہل فکر و دانش سے مرعوب ذہن، جب اپنے ممدوحین کو نبی الامی ﷺ کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے پائے تو وہ بھی حق کی طرف رجوع کرلے۔ اگر یہ کتاب ایسے ذہن کے ایک شخص کے قبلہ کو بھی درست کرلے تو میں سمجھوں گا کہ ہماری کوشش بارآور ہوگئی ہے۔

میں ممتاز سکالر کرنل (ریٹائرڈ) غلام سرور ڈائریکٹر ریسرچ (فاؤنڈیشن فار ریسرچ آن انٹرنیشنل اینوائرنمنٹ اینڈ نیشنل ڈیویلپمنٹ اینڈ سیکوریٹی) کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے کارلائل کے مقالے کا ''ترجمہ'' کرنے کی بجائے اس کی ''ترجمانی'' کرنے کا قیمتی مشورہ دیا اور اس حصہ مسودہ کی نوک پلک بھی سنواری۔ بقول ان کے...... ''اس تحریر میں جوئے آب کی سی روانی ہے اور قاری کو پڑھتے وقت بے حد آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔''

وَمَا توفیقی الّا باللہ علیہ توکّلتُ وَالیہ اُنیب.

محمد یحییٰ خان

سابق سینئر نیوز ایڈیٹر روزنامہ مشرق لاہور

356 جہاں زیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

فون: 37831161

تعارف

حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے ساتھ ہی یہود کے اس خبثِ باطن اور عناد کا آغاز ہو گیا تھا جو انہیں آپ ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ تھا۔ یہ عناد وقت گزرنے کے ساتھ شاخ در شاخ پھیلتا چلا گیا۔ تاریخ کے صفحات ان سازشوں اور عیارانہ حربوں کی تفصیلات سے بھرے ہوئے ہیں جو اسلام اور پیغمبر اسلام محمد ﷺ کے خلاف آزمائے گئے۔ عیسائی علما بھی یہودیوں کے ہمنوا رہے ہیں۔ مگر صلیبی جنگوں کے زمانے سے ان دونوں قوموں کا یہ مشترکہ محاذ زیادہ فعال ہو گیا۔

اسی کا شاخسانہ ہے کہ مغربی علماء دانشوروں اور مصنفوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام محمد ﷺ کے بارے میں ایسے گمراہ کن اور جھوٹے مفروضے پھیلائے ہیں جن کی وجہ سے اسلامی معاشرت اور معیشت، اسلامی قوانین اور اسلامی تاریخ سے متعلق مغرب میں بعض بڑے غلط اور منفی تصورات رواج پا گئے۔ کہیں مسلمانوں کی تاریخ کو خوں آشامیوں اور تشدد کے واقعات سے پُر دکھایا گیا ہے، کہیں تعدد ازدواج کی اجازت کو سیاق وسباق سے قطع کر کے محض عیاشی کا ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مفروضہ ایک الزام کی صورت مغرب اور مشرق دونوں خطہ ہائے ارض میں بڑے اہتمام کے ساتھ مشہور کیا گیا کہ "اسلام تلوار کے زور سے پھیلا" اسی طرح غلامی کو فروغ دینے کا الزام بھی حقائق کو توڑ مروڑ کر عام کیا گیا۔ غرضیکہ اسلام کے اجلے دامن پر جھوٹے الزامات اور تہمتوں کے ذریعہ ہر طرح کے داغ لگانے کی کوشش کی گئی۔ اس کام میں یہود ونصاریٰ کو لادین عناصر کا بھی پورا تعاون حاصل رہا ہے۔

مسلمان اہل قلم نے ان الزامات کی تردید کرنے اور واقعات کو صحیح پس منظر میں پیش کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن اللہ تعالیٰ کی ایک اپنی سنت بھی ہے اور وہ یہ

کہ وہ جھوٹ مکر اور فریب کے انباروں کا پردہ چاک کرنے کے لئے خود انہی لوگوں کے ابنائے نوع میں سے حق گو اور حق پسند افراد کو اٹھا دیا کرتا ہے۔

''پیغمبر اسلام غیر مسلموں کی نظر میں'' ایسے ہی غیر متعصب اور حق پسند (حق پرست نہیں) غیر مسلم دانشوروں کے رشحات قلم کا مجموعہ ہے جنہوں نے مغرب کے پھیلائے ہوئے پروپیگنڈے کو رد کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ اظہار عقیدت کیا ہے اور جھوٹ، افترا اور مبالغہ آمیزی پر مبنی خیالی قلعوں کی بیخ کنی کی ہے۔ان دانشوروں میں ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے ایسے انصاف پسند لوگ شامل ہیں جنہیں اپنی اپنی قوموں اور طبقات میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔

فاضل مترجم نے سب سے پہلے انگریزی زبان کے ممتاز ادیب و مصنف اور سکالر ٹامس کارلائل کے مشہور مجموعہ (WORKS) میں سے لیکچر ثانی ''ہیرو بحیثیت پیغمبر'' کا ترجمہ پیش کیا ہے جس میں انہوں نے متعصب پادریوں کی طرف سے سرور عالم پر لگائے گئے ایک ایک الزام کا جواب دیا ہے۔ ساتھ ہی اہل مغرب سے استفہامیہ انداز میں یہ بھی پوچھا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا تھا تو یہ تلوار آئی کہاں سے تھی؟ آپ ﷺ کی حق گوئی اور کلمۂ حق کی آواز کا گلا کاٹنے کے لئے سب سے پہلے کس نے تلوار اٹھائی تھی؟

کتاب میں فرانس کے عظیم جرنیل اور بادشاہ نپولین بونا پارٹ کی مختصر تحریر بھی شامل ہے جنہوں نے اسلام کے تعدّدِ ازواج کے قانون کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے دور رس اثرات کو اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے عربوں کی صدیوں کی خانہ جنگیوں اور انتقام در انتقام والے معاشرے کو امن و شائستگی اور تہذیب سکھانے پر حضور ﷺ کو خراج تحسین پیش کیا اور پھر مسلمان فاتحین کا پارتھیوں منگولوں اور تاتاریوں سے موازنہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مسلمانوں نے نہ صرف امن قائم کیا بلکہ دیگر فاتحین کے برعکس علم و حکمت، فنون اور ثقافت کی بھی ترویج کی ہے۔ نپولین کے اس جملے کو بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں نے پندرہ سو سال میں کفر کی اتنی نشانیاں منہدم نہیں کی تھیں جتنی متبعین اسلام نے صرف پندرہ سال میں ختم کر دیں۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ محمد ﷺ اس وقت آئے جب انبیاء کی تعلیمات کو دنیا نے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ انہوں نے دنیا کو نئے سرے سے مقام کبریا

یاد دلایا۔ اور بتایا کہ خدا نہ کسی سے پیدا ہوا، نہ کوئی اس کا فرزند ہے اور نہ کوئی ''دوسرا'' قابل پرستش ہے۔ اور یہ تثلیث (TRINITY) ہی ہے جس نے بت پرستی کو جنم دیا ہے۔

ممتاز ادیب مائیکل ہارٹ نے اپنی کتاب، میں دنیا بھر کے انقلابیوں سے آنحضرت ﷺ کے انقلاب کا موزانہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دنیا میں جتنے انقلابات آئے، انہیں لانے والی شخصیات اگر دنیا میں نہ ہوتیں، تب بھی یہ انقلابات اپنے وقت پر آ جاتا تھے مگر جو انقلاب حضرت محمد ﷺ لائے، ان کے بغیر یہ انقلاب ہرگز نہیں آ سکتا تھا۔

رومانیہ کے وزیر خارجہ کونسٹن ورجیل جارجیو دوسری عالمی جنگ کے اختتام تک اس منصب پر فائز رہے انہوں نے پورے عالم عرب اور بالخصوص مقاماتِ ارض قرآن کا وسیع دورہ کیا اور اس دور میں دستیاب تاریخی لٹریچر اور آثار کے مشاہدہ و مطالعے کے بعد ایک طویل مقالہ لکھا ہے اس کے بعض حصوں کو بھی اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے انقلاب فرانس کے ساتھ انقلابِ محمدی ﷺ کا موازنہ کرتے ہوئے جنگ خندق اور مسجد قبا اور مسجد نبوی کی تعمیر کے واقعات پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ جن مقاصد کے لئے فرانس میں ''انقلاب'' لایا گیا تھا ان میں انسانی مساوات سرفہرست تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اہل فرانس کو تو ایک دن کے لئے بھی مساوات انسانی کی جھلک نصیب نہیں ہوئی جب کہ جنگِ خندق اور متذکرہ دونوں مساجد کی تعمیر میں حضرت محمد ﷺ خود کدال چلاتے اور گارا بناتے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ اپنی چادروں اور کڑاہیوں میں مٹی اور گارا اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے تھے۔ کسی انسانی آنکھ نے ایسی کامل و مکمل مساوات کب دیکھی ہوگی؟

کونسٹن ورجیل جارجیو اور ٹامس کارلائل کے مقالات کے اردو تراجم پہلے سے پاکستان میں موجود ہیں فاضل مؤلف نے مناسب ایڈیٹنگ کے بعد انہیں اس کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ انجیل برناباس کے ان اقتباسات کو بھی اس کتاب کا حصہ بنا دیا گیا جن میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہی انجیل درحقیقت اصلی انجیل ہے جسے محض تعصب کی بنا پر اہل کلیسا نے غائب کر دیا تھا تاکہ اس میں حضرت محمد ﷺ کی بعثت کی جو نشانیاں بتائی گئی تھیں، دنیا کو ان سے مطلع نہ ہونے دیا جائے۔ میرے خیال میں ان اقتباسات نے اس کتاب کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے کیونکہ جس تعصب کا مظاہرہ اس حقیقی انجیل سے کیا گیا، اسی تعصب و دشمنی کا نشانہ

خود حضور ﷺ کو بنایا گیا تھا۔ اس طرح کتاب کے دوسرے مواد اور انجیل برناباس کے مابین ایک گہرا معنوی اور مقصدی ربط قائم ہو گیا ہے۔

آخر میں ہندو شعراء کا منظوم کلام ہے جس میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ اظہار عقیدت کیا گیا ہے۔

پروفیسر جلیل نقوی
سابق صدر شعبہ فارسی
ایم۔اے۔او کالج لاہور

کارلائل کو قائداعظم کا خراج تحسین

ٹامس کارلائل کے لیکچر ثانی کا پہلی بار اردو ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے پروفیسر محمد اعظم نے کیا تھا اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت پر قائداعظم محمد علی جناح نے انہیں اس بات پر مبارک باد دی تھی۔ ہم اس سلسلے میں ان کا وہ خط قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ ہم اس موقع پر اس کے اولین مترجم کے لئے بھی دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبول کرے اور ان کے لئے اسے ذریعہ مغفرت بنائے۔

مؤلف و مترجم کتاب ہذا

ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ

مالابار ہل بمبئی

26 اگست 1944ء

جناب من!

آپ کا 17 اگست کا مکتوب موصول ہوا اور میں بڑی مسرت کے ساتھ آپ کی حسب خواہش مندرجہ ذیل چند سطور بطور پیش لفظ آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔

مجھے اس سے واقعی بڑی مسرت ہوئی ہے کہ آپ کارلائل کی کتاب ''ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ'' کے اردو ترجمے کا دوسرا ایڈیشن شائع کر رہے ہیں جس زمانے میں، میں انگلستان میں زیر تعلیم تھا، میں نے کارلائل کی متعدد دیگر تصانیف کے علاوہ اس کتاب کا بھی انگریزی میں مطالعہ کیا تھا اور اسی وقت سے میں ''چیلسی کے اس عظیم دانشور'' کی خدمات کا بڑا معترف ہوں۔ انہوں نے ہمارے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی حیات طیبہ اور آپ ﷺ کے کارناموں کی غیر جانبدارانہ تصویر پیش کر کے نہ صرف عالم اسلام بلکہ باقیماندہ دنیا کی بھی بے پناہ خدمت کی ہے۔

اس کتاب کے اردو ترجمے کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کا آپ نے جو تہیہ کیا وہ نہایت مستحسن ہے اور میں آپ کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

آپ نے اس کے اردو ترجمے کا جو نسخہ ارسال کیا وہ مجھے مل گیا ہے اس کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

بخدمت جناب محمد اعظم صاحب
لیکچرار شعبۂ اردو۔ جامعہ عثمانیہ
حیدر آباد دکن

آپ کا مخلص
ایم۔ اے۔ جناح

ٹامس کارلائل Thomas Carlyle

مختصر تعارف

ٹامس کارلائل برطانیہ کے شہرہ آفاق ادیب اور فلسفی تھے۔ وہ 1795ء میں سکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش اور تعلیم پائی۔ ابتدائی تعلیم ایک معمولی سے دیہی سکول میں حاصل کی اور 1809ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ چار سال تک یونیورسٹی کے ماحول میں رہنے کے باوجود ڈگری حاصل نہ کر سکے کیونکہ مروجہ علوم ان کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتے تھے۔ ایک مذہبی تعلیمی مدرسہ میں داخل ہوئے کچھ عرصہ شبانہ و روز محنت کرتے رہے مگر پادریوں کے رویّہ سے بدظن ہو کر اس سلسلے کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ ذریعہ معاش کے لئے ایک سکول میں ملازمت اختیار کر لی۔ نئی نسل کے ذہنوں کی آبیاری کرتے رہے، وائس پرنسپل کے عہدہ تک پہنچ گئے۔ ان کے ساتھی اساتذہ، ان کی آزاد خیالی اور درویشانہ زندگی کو برداشت نہ کر سکے جس پر انہوں نے اچھی خاصی آمدنی کی حامل ملازمت ترک کر دی۔ اور ایڈنبرا جا کر قانون کا مطالعہ شروع کر دیا، پھر اسے بھی ادھورا چھوڑ کر گوشہ نشیں ہو گئے اور تصنیف و تالیف میں منہمک ہو گئے۔ کارلائل نے ربع صدی تک علم کا گوشہ گوشہ چھان مارا، اچھی چیزوں کو اپنے اندر سموتے اور ناپسندیدہ چیزوں سے اجتناب کرتے رہے۔ بالآخر انہوں نے اس دائرہ سے نکل آنے میں ہی عافیت سمجھی۔ ہم ان کی اس ''صحرانوردی'' کو ''تمتع زہر گوشہ یافتم'' کہہ سکتے ہیں۔

اس مضطرب روح کو آخر مطالعہ کی دنیا میں قرار آیا۔ 1873ء میں انہوں نے انقلاب فرانس پر ایک مبسوط کتاب لکھی جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ انقلاب چونکہ یورپ میں یکے بعد دیگرے کئی انقلابات کا پیش خیمہ بن رہا تھا لہٰذا اس کے مضمرات پر کارلائل کے تبصرے اور تجزیئے نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ 1840ء میں انہوں نے مشاہیر عالم

(HEROES) پر معرکۃ الآرا مقالے لکھے جن کا مجموعہ "HERO AND HERO WORSHIP" (مشاہیر اور مشاہیر پرستی) کے عنوان سے 1841ء میں شائع ہوا۔ جس میں حضرت محمد ﷺ کے انقلابی کردار پر انہوں نے اپنے فاضلانہ خیالات کا اظہار کیا اور اس عمل میں بعض حلقوں کی خفگی مول لی مگر ساتھ ہی دوسرے حلقوں میں انہیں بے پناہ داد بھی ملی۔ ان کا یہی مقالہ اس کتاب کا موضوع ہے۔

بعد ازاں کارلائل نے برطانیہ میں معاشی انقلاب کے قائد "کرامویل (CROMWELL) کے خطوط اور خطبات" اور فریڈرک دی گریٹ" کی سوانح حیات لکھی جو ان کی آخری تصنیف تھی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی خدمات کا اعتراف ان کی حیات میں ہی کیا گیا۔ 1865ء میں انہیں ایڈنبرا یونیورسٹی کا اعزازی طور پر لارڈ ریکٹر مقرر کر دیا گیا۔ 1874ء میں انہیں پرشین آرڈر آف کا مرٹ عطا کیا گیا اور 1881ء میں انہوں نے وفات پائی۔ طبعی طور پر وہ دنیا سے اٹھ گئے مگر اہل علم کے دلوں میں وہ اب بھی زندہ ہیں۔ ان کے کارنامے نئی نسلوں کی ذہنی آبیاری کرتے رہتے ہیں۔

LECTURE II

FRIDAY, 8th May,1840

THE HERO AS PROPHET--- MOHAMMAD & ISLAM

یورپ کے شمالی علاقوں سویڈن، ڈنمارک اور ناروے وغیرہ میں (جنہیں ہم سکینڈے نیوین ممالک کہتے ہیں) جب جہالت، ناشائستگی، بُت پرستی و شرک اور لامذہبیت کا دور دورہ تھا اور انسان، بے سمت و بے لگام زندگی بسر کررہے تھے، عرب ممالک میں اسی دور میں مذہب کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس سے میری مراد مسلمانوں کے پیغمبر برحق کی بعثت سے ہے۔ یورپ کی اس بے خدا تہذیب کے پس منظر میں دنیائے عرب میں ظہور اسلام کے زمانہ کے حالات پر نظر ڈالیں تو آپ کو ایک بہت بڑی تبدیلی وتغیر کا احساس ہوگا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا بلکہ ایک نئے دور کا آغاز تھا جس نے بنی نوع انسان کے حالات وخیالات میں ایک انقلابِ عظیم برپا کردیا تھا اور جس کی بدولت انسان، سوچ کی نئی رفعتوں سے روشناس ہوگیا تھا۔

اس انقلاب کو برپا کرنے والی شخصیت محمد ﷺ تھے جو ایک مذہبی ہیرو کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوئے۔ ان کا یہ دعویٰ نہ تھا کہ وہ خدا ہیں اور نہ ہی ان کے پیروکاروں نے انہیں خدائی کا درجہ دیا تھا (کارلائل نے ''خدائی کے دعوے'' کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ اس سلسلے کی پہلی تقریر

میں ان کے ''ہیرو'' اوڈن (ODEN) کو اس کے پیروکاروں نے خدائی کے منصب پر فائز کر رکھا تھا...... مترجم) مذہبی ہیرو کو خدا ماننے کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اب یہ دور کبھی واپس نہ آئے گا۔ تاریخی حالات اور واقعات نے انسانوں کو یہ سبق دے دیا ہے کہ کوئی انسان خواہ جتنی بھی ترقی کرے خدا نہیں بن سکتا۔ اب تمام نابغہ ہستیوں (HEROES) کو انسان ہی سمجھنا پڑے گا۔ مشاہیر کو پسند ضرور کیا جائے گا انہیں عزت واحترام ملے گا لیکن ان کی پرستش (WORSHIP) کی کبھی نوبت نہ آسکے گی۔ جس زمانے میں انہیں خدا قرار دے دیا جاتا تھا وہ بڑا جاہلانہ دور تھا مگر ان حماقتوں اور غلط کاریوں سے اظہار بیزاری کے باوجود ہمیں اس زمانے کے لوگوں کی مجبوریوں کو سمجھنا اور اس امر کا اعتراف کرنا ہوگا کہ اس دور کے انسان کو کسی عظیم شخصیت کی عظمت کا راز معلوم کرنے کا کوئی اور طریقہ ہی معلوم نہیں تھا۔ اس سلسلے میں ایک اہم نقطہ جس پر ہمیں غور کرنا چاہیے یہ ہے کہ اس زمانہ کے لوگ کسی بڑی شخصیت کے ظہور پذیر ہونے پر اپنے ردعمل کا اظہار کس طرح کرتے تھے؟ جب کہ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بڑی شخصیتوں میں انہیں خدائی صفات کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ کبھی انہیں خدا سمجھ لیتے تھے اور کبھی پیغمبر مان لیا کرتے تھے۔

میں یہاں چار بڑی شخصیات اوڈن (ODEN)، لوتھر (LUTHER)، جانسن (JOHNSON) اور برنس (BURNS) کا حوالہ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ میری رائے میں یہ چاروں شخصیتیں ایک ہی جوہر یا مادے (STUFF) سے بنی تھیں لیکن ان کے حلقوں کے لوگوں نے ان کا الگ الگ انداز میں سواگت کیا تھا۔ میں ان کے موازنے کے سلسلے میں بات کا آغاز لوتھر سے کروں گا۔ مارٹن لوتھر 1483ء میں پیدا ہوا اور 1546ء میں فوت ہو گیا تھا۔ اس کو محض ایک مذہبی مصلح (REFORMER) اور پروٹسٹنٹ فرقے کا پیشوا قرار دیا گیا تھا۔ سیموئیل جانسن 1709ء میں پیدا ہوا اور 1784ء میں 75 سال کی عمر پا کر فوت ہوا تھا۔ یہ مشہور انگریز ادیب تھا اس کی قدر افزائی صرف اتنی ہوئی کہ اسے شاندار ادبی خدمات پر تین سو پونڈ سالانہ شاہی وظیفہ ملتا تھا۔ رابرٹ برنس 1759ء میں پیدا ہوا اور 1796ء میں فوت ہوا، یہ بھی انگریزی کا شاعر تھا جس کی وجۂ مرگ کثرت شراب نوشی تھی۔ اس کی قدر افزائی یہ ہوئی کہ اسے بہت بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا اور بس۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا۔ ان تینوں صاحبانِ علم و فن کی ہی ہم پلہ شخصیت اوڈن کو لیجیے جسے ٹیوٹن (TEUTONNES) قوم نے خدا (THE

(GOD) قرار دے کر اس کی پوجا شروع کر دی تھی۔ یہ ٹیوٹن (طوطانی) قوم، جرمن سیکنڈے نیوین اور اینگلو سیکسن (ANGLO SAXON) اقوام کا مجموعہ تھی (ٹیوٹنز چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے 950ء میں ان کی تہذیب و ثقافت کے صرف چند آثار کا پتہ چلا تھا) اس قوم نے اوڈن کی پرستش کے لئے شاندار معبد تعمیر کر رکھے تھے جن میں اسے سجدہ کیا جاتا تھا۔ اس کے عقیدت مند دل کی گہرائیوں سے اسے مکین عرش سمجھتے تھے۔ اسے مشکل کشا اور حاجت روا سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اس کی ناراضی کو اپنے لئے تباہی و بربادی کا پیش خیمہ قرار دیتے تھے۔ ان کے عقیدے کے مطابق وہ انسان کا روپ دھار کر آسمان سے زمین پر اترا تھا تاکہ اپنی مخلوق کے حالات سے براہ راست آگاہی حاصل کر سکے۔ ان چاروں ''عظیم شخصیتوں'' کی قدر افزائی کے لئے مختلف انداز اختیار کئے گئے۔ ان میں سے بعض تو عظیم کہلانے کے بالکل مستحق نہیں تھے چہ جائیکہ ان کی پرستش کی جائے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان میں سے بعض ''بری'' منفی خصوصیات کے حامل تھے۔ انہیں بڑھا چڑھا کر بلند منصب پر بٹھا دینا انسانی خصائل کی بنیادی کمزوریوں کا اظہار تھا۔ محبت و عقیدت کی اس فراوانی کا کوئی جواز نہ تھا۔ سیکنڈے نیویا میں اس قسم کی شخصیات کی پوجا پاٹ اس دور کی جہالت کی منہ بولتی دلیل ہے۔

آج کی تقریر کے لئے ہم نے سرزمین عرب میں پیدا ہونے والی ایک عظیم شخصیت محمد (ﷺ) کا انتخاب اس لیے نہیں کیا کہ آپ افضل ترین پیغمبر مانے جاتے ہیں بلکہ اس لیے کیا ہے کہ ہم بطور غیر مسلم ان پر کھل کر تنقید کر سکتے ہیں اور پوری آزادی سے اپنے خیال کا اظہار کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی اعلیٰ صفات کا اعتراف کر لینے سے یہ خطرہ نہیں کہ ہم میں سے کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے گا۔ اس لیے میں آپ کی وہ تمام صفات بیان کر دینا چاہتا ہوں جو حق و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر بیان کی جا سکتی ہیں۔ میں آپ (ﷺ) کو نبیوں میں سے صادق ترین (TRUEST) قرار نہیں دیتا پھر بھی آپ (ﷺ) کو پورے وثوق کے ساتھ سچا (TRUE) نبی ضرور سمجھتا ہوں۔ آپ کی کامیابی اور عظمت کا راز معلوم کرنے کے لئے ہمیں تعصبات سے پاک ہو کر کھلے ذہن کے ساتھ غور کرنا پڑے گا۔

کسی عظیم شخصیت کے بارے میں رائے قائم کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس جہانِ رنگ و بو کے بارے میں اس کا نظریہ کیا تھا؟ دوسرے لفظوں میں دنیا کے

متعلق اس شخصیت کی کیا رائے تھی اور اہلِ دنیا نے اس کو کیا سمجھا تھا؟

(حضرت) محمد (ﷺ) کی تعلیمات کیا تھیں اور ان میں اس دنیا کا کیا تصور پیش کیا گیا تھا؟
ان کی تعلیمات کا صحیح جائزہ اس وقت لیا جا سکتا ہے جب ہم انہیں ایک سچا انسان گردانتے ہوں لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ نظریہ جڑ پکڑ چکا ہے کہ "اسلام ایک سحر تھا اور اس کا پیغمبر فسوں گر تھا (نعوذ باللہ) ہمیں اپنے اس طرزِ فکر اور اس فرسودہ خیالی سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔ ہم لوگوں نے محمد (ﷺ) کے بارے میں جو جھوٹ اور افتراء پھیلا رکھا ہے وہ ہمارے لئے حد درجہ باعثِ ننگ بن رہا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ انجیل کے عالم اور ممتاز مستشرق ایڈورڈ پوکاک (EDWARD POCOCKE) نے ڈچ مستشرق گروٹیس (GROTIUS) سے جب پوچھا کہ آپ کے پاس اس الزام کا کیا ثبوت ہے کہ محمد (ﷺ) نے ایک کبوتر سدھا رکھا تھا جو ان کے کان میں سے مٹر کے دانے اٹھا اٹھا کر کھاتا رہتا تھا اور اس کبوتر کو فرشتہ قرار دیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ "اس وقت وحی آ رہی ہے" گروٹیس نے تسلیم کیا کہ اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس قسم کے لغو اور بے سروپا الزامات سے اجتناب کریں۔ (یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسیحی یورپ میں اسلام کے بارے میں مسیحی اہل قلم نے ایسی بے سروپا باتیں صدیوں پہلے سے لکھ رکھی ہیں۔ ان بے ہودہ الزامات کا ذکر پیریڈیکس کی کتاب میں کیا گیا ہے جو 1678ء میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں گبن نے اپنی تصنیف (HISTORY OF DECLINE AND FALL OF ROMAN EMPIRE) میں ان الزامات کو جگہ دی اور اس کے حوالہ سے جارج سیل (GEORGE SALE) نے اپنی کتاب (PRELIMINARY DISCOURSES) میں انہیں شامل کر لیا۔ یوں یہ الزامات دیگر یورپی تصانیف میں بھی بلا تحقیق دہرائے جاتے رہے۔ کارلائل نے اپنے اس مشہور لیکچر سے دو سال قبل 18 مئی 1838ء کو یورپی لٹریچر پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان الزامات کو کذب و افترا کا پلندہ قرار دیا تھا...... مترجم)

بارہ سو سال سے، اٹھارہ کروڑ انسان، اس دین اسلام کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں، یہ اٹھارہ کروڑ نفوس بھی ہماری طرح اولادِ آدم ہیں۔ فی زمانہ (حضرت) محمد (ﷺ) کے ماننے والوں کی تعداد دنیا کے سب ادیان پر ایمان رکھنے والوں سے زیادہ ہے۔ (کارلائل کے

زمانہ میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کی تعداد اٹھارہ کروڑ ہی ہو مگر مسلمہ اور مصدقہ ریکارڈ کے مطابق دنیا بھر کے مسلمانوں کی تعداد 1996ء کے دوران ایک ارب 10 کروڑ سے زائد تھی...... مترجم) ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ انسانوں کی اتنی کثیر تعداد روحانی دیوالیہ پن کی شکار ہے جنہیں مرتے دم تک اپنے اس دیوالیہ پن کا احساس نہیں ہوتا۔

یہ کروڑوں بندگان خدا اس عظیم شخص (ﷺ) کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی سچائی پر پختہ یقین رکھتے ہیں، یہ الفاظ صدیوں سے ان کے لئے شمع ہدایت کا کام دے رہے ہیں۔ ہم کیسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ سب عقائد اور افعال محض روحانی بازی گری تھی۔ میں کم از کم اپنی حد تک ایسے الزام یا قیاس کو صحیح تسلیم کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ اگر میں ایسا قیاس درست مان لوں تو مجھے اس سے پہلے پھر اور بھی بہت سی بعید از قیاس باتوں کو ماننا ہوگا۔ اگر اس دنیا میں جعل سازی کو اس قدر فروغ ہو سکتا ہے تو پھر یہ کیسی دنیا ہے؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟ ہمارے لوگوں کی یہ خام خیالیاں ہیں جن لوگوں نے یہ باتیں مشہور کی ہیں انہوں نے عقلِ انسانی کے بارے میں بڑی مضحکہ خیز رائے قائم کی ہے اور اپنی مریضانہ سوچ کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس روش پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ اس مذہب (اسلام) کی عمارت جھوٹ پر کھڑی کی گئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جھوٹا آدمی اینٹوں کی معمولی سی عمارت بھی تیار نہیں کر سکتا چہ جائیکہ وہ ایک مذہب کا بانی ہو اور جس نے ایک تہذیب کی بنیاد رکھی ہو۔ معمولی عقل کا آدمی بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ اینٹوں اور چونے کا مکان اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک تعمیر کرنے والے شخص کو مٹی چونے اور اس کام میں استعمال ہونے والی اشیا کے خواص کا علم نہ ہو۔ ایسے شخص کا بنایا ہوا مکان، مکان نہیں بلکہ مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا۔ جو دھڑام سے نیچے آ گرے گا۔ ایسا مکان بارہ صدیوں تک قائم نہیں رہ سکتا تھا اور نہ ہی اس میں اٹھارہ کروڑ انسان سما سکتے تھے۔ مگر یہ مکان تو اتنے طویل عرصہ سے قائم ہے۔ (حضرت) محمد (ﷺ) کی شخصیت اور ان کے اقوال و ہدایات کی صداقت پر یقین رکھنے والے انسان ہماری طرح ہی ذی شعور اور صاحب فراست ہیں اور ہماری طرح ہی دستِ قدرت کی صناعی کا نمونہ ہیں۔ ان بندگانِ خدا کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی ہے جو کسی بھی اور شخص کی بہ نسبت اپنے اس قائد کے اقوال پر زیادہ اعتماد رکھتی ہے۔ اگر ہم خدا کی اس کائنات کے حقائق اور اسرار کو

صحیح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایسے قیاس اور نظریات وضع کرنے والی ذہنیت کو خیر باد کہنا ہو گا۔ ایسے قیاس و گمان دورِ تشکیک (AGE OF SCEPTICISM) میں اگنے والے جھاڑ جھنکار اور جنگلی پودے ہیں جو روحانی فالج کا بدترین مظہر ہیں۔ انہیں جنم دینے والے لوگ روحانی طور پر مردہ و بے جان تھے۔ اس سے زیادہ ملحدانہ نظریہ صفحہ ہستی پر شاید ہی کسی نے گھڑا ہو۔

انسان کو فطرت کے قوانین کے مطابق اپنی راہ اختیار کرنا پڑتی ہے اور بنیادی سچائیوں سے وابستگی کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ اس سے ہٹ کر اپنے لئے کوئی اور راستہ بنانا قوانینِ فطرت سے منہ موڑنے کے مترادف ہے۔ ان قوانین سے انحراف کرنے والوں کا قدرت ساتھ نہیں دیتی۔ کاغذ کی ناؤ کہاں تک چل سکتی ہے؟ باطل پیغام کی حیثیت ایک کھوٹے سکے کی سی ہوتی ہے جس کا راز بہت جلد فاش ہو جاتا ہے۔ فطرت کی آگ بہت جلد جعلسازیوں کو جلا کر بھسم کر ڈالتی ہے۔

کیگلیوسٹرو (CAGLIOSTRO) جیسے انسان کچھ عرصہ لوگوں کو کامیابی سے دھوکہ دیتے رہتے ہیں لیکن آخرکار مکافاتِ عمل سے دوچار ہو کر رہتے ہیں۔

(کیگلیوسٹرو ایک اطالوی کیمیاگر تھا جس نے 1795ء میں وفات پائی تھی۔ وہ دھوکہ دہی کے ذریعہ یورپی ممالک سے بھاری رقوم کماتا رہا بالآخر جعلی اشیا تیار کرنے کے الزام میں وہ فرانس اور برطانیہ میں سزایاب ہوا۔ 1789ء میں اس کے لئے سزائے موت تجویز ہوئی جو بعد ازاں عمر قید میں تبدیل ہو گئی تھی)۔

ایسے انسانوں کی مثال جعلی کرنسی نوٹ کی سی ہے جسے وقت طور پر چلایا تو جا سکتا ہے مگر اسے چلانے کا ذریعہ بننے والوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ فطرت نے جس طرح انقلاب فرانس کے موقع پر جعلی قیادتوں کو سزا دلوائی تھی اسی طرح وہ دیگر جعلسازوں کو بھی زیرِ عتاب لے آتی ہے۔ جھوٹ، جھوٹ اور سچ، سچ ثابت ہو کر رہتا ہے۔

لیکن میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ درحقیقت بڑا انسان صرف سچائی کے بل بوتے پر بڑا بنتا ہے۔ اس کے دامن پر جھوٹ اور فریب کا معمولی سا بھی دھبہ نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک صداقت ہی بڑی شخصیت کی تعمیر کا موجب بنتی ہے۔

میں اس ضمن میں مرابو (MIRABEAU)، نپولین (NAPOLEON)، برنس (BURNS) اور کرامویل (CROMWELL) کی مثال دوں گا۔ جن کے عہد میں ان کا کوئی

بھی ہمسر نہ تھا۔ انہوں نے جو کچھ کیا اس کے لئے انہوں نے خلوص کو حرزِ جاں بنالیا تھا۔ میں ایسے انسانوں کو مخلص انسان قرار دیتا ہوں، اگر وہ مخلص نہ ہوتے تو اتنے کارنامے انجام نہ دے سکتے تھے۔

☆......☆......☆

(نپولین 1769ء میں جزیرہ کارسیکا میں پیدا ہوا، اپنی خداداد صلاحیت کی وجہ سے اعلیٰ فوجی افسر بنا، 1799ء میں صدر فرانس منتخب ہوا، 1804ء میں شہنشاہ بن گیا۔ آخر 1815 میں ڈیوک آف ولنگٹن سے واٹرلو کے میدان میں شکست کھائی، جزیرہ سینٹ ہیلینا میں قید کر دیا گیا جہاں وہ 1821ء میں وفات پا گیا۔ اسے تاریخ فاتح اعظم کے طور پر یاد کرتی ہے۔ برنس انگریزی زبان کا ممتاز شاعر تھا۔ اس کا شعری مجموعہ 1876ء میں شائع ہوا تھا۔ کرامویل انگلستان کا ممتاز مدبر تھا جو 1599ء میں پیدا ہوا، بحیثیت کرنل بہت سی خدمات انجام دیں اور سیاست و معیشت کے شعبوں میں اصلاحات کیں...... مترجم)

☆......☆......☆

میرا خیال ہے کہ مقصد کے ساتھ سچی لگن اور بے پایاں خلوص کے بغیر کوئی شخص قیادت کے منصب پر نہیں پہنچ سکتا۔ خلوص ہر بڑے انسان کی اولین خصوصیت ہوتی ہے۔ پُر خلوص ہونے کا یہ ثبوت نہیں کہ کوئی مدعی اپنی زبان سے اپنے مخلص ہونے کا اعلان کرے۔ ایسی خودنمائی کرنے والے انسان اپنی انا کے اسیر ہوتے ہیں اور ان کے دامن میں غرور کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جو انسان واقعی عظیم ہوتے ہیں انہیں ایسے سطحی دعوے کا اعلان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں نہ صرف اپنی عظمت کا احساس تک نہیں ہوتا بلکہ انہیں اپنی کوششوں میں کوتاہیوں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ شیخی بگھارنا تو درکنار وہ ایسا کرنے کے تصور کو بھی قریب پھٹکنے نہیں دیتے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ عظیم انسان کی صداقت اختیاری نہیں ہوتی، اس کی شخصیت کا حصہ ہوتی ہے یعنی صداقت پر عمل پیرا ہوئے بغیر اس کے لئے چارہ ہی نہیں ہوتا۔ اس کی نگاہ حقیقتِ کبریٰ (FACT OF EXISTENCE) پر مرکوز رہتی ہے وہ جتنی بھی کوشش کرے حقیقتِ امری (REALITY) کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ حقیقت پسندی اس کی فطرت کا خاصہ بن چکی ہوتی ہے۔ یہی چیز اس کی عظمت کی ضمانت ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک یہ دنیائے ہستی، زندگی و موت اور حیرت و خوف کی طرح کی ایک حقیقت ہے۔ دنیا بھر کے لوگ حقیقت

امری کو بھول جائیں تو بھول جائیں، تن آسانی اور نمود و نمائش کی زندگی بسر کرنے لگیں لیکن یہ انسان ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی نگاہیں شعلۂ حقیقت پر جمی ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک یہی امتیاز اسے عظیم بناتا ہے۔ یہی اس بڑے آدمی کی ابتدائی تعریف (PRIMARY DEFINITION) ہوتی ہے۔ یہ خصوصیت کسی چھوٹے انسان میں بھی ہو سکتی ہے۔ تمام بندگان خدا اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں لیکن ایک عظیم انسان کے لئے یہ صلاحیت ایک ناگزیر چیز ہے۔ ہم ایسے شخص کو ہی حقیقی انسان (ORIGINAL MAN) کہتے ہیں۔ اس کی شخصیت پہلے سے موجود کسی مرقع کی نقالی نہیں ہوتی۔ وہ ہمارے پاس ایک پیام بر، بن کر آتا ہے۔ اسے پردۂ غیب (INIFINITE UNKNOWN) سے پیام دے کر ہماری جانب بھیجا جاتا ہے۔ ہم اسے مختلف ناموں شاعر، پیغمبر یا خدا کے طور پر پکارتے ہیں۔ اس کی زبان سے ادا شدہ الفاظ، عام لوگوں کے الفاظ سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ وہ حقائق کی دنیا کا باسی ہوتا ہے۔ اس کے شب و روز اسی میں بسر ہوتے ہیں۔ سنی سنائی باتیں حقائق کو نہیں چھپا سکتیں۔ وہ نابینا ہو، بے گھر ہو یا مصائب سے دوچار ہو لیکن اس پر حقائق روز روشن کی طرح عیاں ہوتے ہیں۔ کیا اس کے الفاظ ایک طرح کی وحی نہیں ہوتے؟ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی اور لفظ ہی نہ ہو تو ہم اسے وحی کے سوا کیا نام دے سکتے ہیں؟ ایسے انسان کی شخصیت حقائق کا ہی ایک عکس ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اہل دنیا کو کئی الہامات سے نوازا ہے لیکن کیا اسے بھی خدا نے خود نہیں بھیجا ہے؟ کیا وہ خدا کا تازہ ترین اور آخری الہام یا پیغام نہیں ہے؟ اسے فہم و بصیرت خداوند تعالیٰ نے عطا کی ہے بنا بریں وہ اس کا مستحق ہے کہ لوگ اپنی تمام مصروفیات سے وقت نکال کر اس کے پیغام پر کان دھریں۔

اگر ہم (حضرت) محمد (ﷺ) کو...... سازشی اور حریص (نعوذ باللہ) قرار دیں اور ان کی تعلیمات کو بھی بے بصیرتی اور نادانی قرار دیں تو یہ ہماری سخت حماقت اور جہالت ہو گی۔ انہوں نے جو سادہ اور غیر مرصّع پیغام دیا وہ برحق تھا وہ پردۂ غیب (UNKNOWN DEEP) سے ابھرنے والی، حیران کن آواز تھی۔ ان کا نہ کوئی قول جھوٹ نکلا اور نہ کوئی فعل غلط ثابت ہوا۔ ان کی کوئی گفتگو نہ بے معنی تھی اور نہ ان جیسی کوئی مثال پہلے موجود تھی۔ وہ زندگی کا ایک روشن جلوہ تھا جو سینۂ فطرت سے اس لیے ظہور پذیر ہوا کہ دنیا کو منور کر ڈالے کیونکہ اس کائنات کا خالق، اس

کے ذریعہ دنیا کو اندھیروں سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ وہ جو پیغام سرمدی لے کر آئے تھے اس کی اہمیت وعظمت اپنی جگہ قائم ہے۔ اسے پہچاننے والوں کی لغزشیں اور کوتاہیاں اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتیں۔ (حضرت) محمد (ﷺ) پر ایسا کوئی الزام ثابت نہیں کیا جاسکا۔

نبی (ﷺ) کے منہ سے جو بات نکلتی ہے، ہمارا ضمیر گواہی دیتا ہے کہ وہ غیر معمولی بات ہے۔ اس جیسے الفاظ کسی عام انسان کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتے۔ وہ ''محرمِ رازِ درونِ خانہ'' ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد و مدعا، اس کے ہر لفظ اور ہر حرکت سے منعکس ہوتا ہے۔ سنی سنائی باتوں سے وہ قطعاً بیگانہ ہوتا ہے۔ اس کا دل سچائیوں کا امین اور حقائق کی روشنیوں سے منور ہوتا ہے۔ اس کی باتیں الہامی ہوتی ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر وہ کائنات کے حقیقی اسرار سے آگاہی رکھتا ہے۔ اس کی ہر بات ترجمانِ حقیقت ہوتی ہے۔ اس سے پہلے بھی انبیا پر وحی آتی رہی ہے لیکن اب کی بار وحی آخری اور تازہ ترین ہے۔ کیا یہ نبی اسی خدا کا بندہ نہیں تھا؟ اس کی باتوں کو کیسے سنی اَن سنی کر سکتے ہیں۔

یہ طے شدہ امر ہے کہ ہم محمد (ﷺ) کو جاہ طلب اور نعرہ باز شخصیت نہیں کہہ سکتے۔ (نعوذ باللہ! قریش مکہ کے سرداروں کا ایک وفد دعوتِ دین کے بدلے حضور (ﷺ) کو اقتدار کی پیشکش کر کے ان کا امتحان لے چکا تھا۔ آپ (ﷺ) نے اس ترغیب کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا تھا...... مترجم)۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا پیغام ہمارے لیے باعثِ الجھن بن گیا ہو لیکن ان کی آواز اس پیچیدہ و پر اسرار کائنات کے دل کی آواز ہے اس ہستی کی باتیں اور کام غلط ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ یہ سب کچھ خالقِ کائنات کے حکم کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ محمد (ﷺ) پر الزامات لگا کر انہیں ''ثابت'' بھی کر ڈالیں تب بھی آپ اس الہامی پیغام کی صحت سے انکار نہیں کر سکتے۔

ہم خامیوں اور لغزشوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور انہیں اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں کہ حقیقت کا مرکزی نقطہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ جب کہ میں کہتا ہوں کہ اصل غلطی یہ ہے کہ غلطی کا احساس نہ کیا جائے۔ کیا (حضرت) داؤد علیہ السلام گناہوں میں ملوث نہ ہوئے تھے؟ (العیاذ باللہ)...... لیکن ان گناہوں پر ان کا تمسخر اڑانا نہایت گھٹیا حرکت ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا گناہوں پر شرمندہ ہونا اور استغفار کرنا خدا کے نزدیک محبوب ترین عمل

نہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ گناہوں کا اعتراف نہ کرنا اور ان پر پشیماں نہ ہونا، سب سے بڑا گناہ بلکہ پیغام موت ہے۔ (حضرت) داؤد علیہ السلام کا حمدیہ کلام (ترانے) انسان کی اخلاقی ترقی کی بلند ترین منزل ہے۔ گر گر کر سنبھلنا، اپنی اصلاح کرتے رہنا اور چشم "گریاں" سے معافی کا طلب گار ہونا بڑی نیکی کا راستہ اور حقیقی زندگی کا پیغام ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم محمد (ﷺ) کی خامیاں تلاش کرتے وقت ان کے صحیح پس منظر اور ان کے زمانے کے اصل حالات سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ (حضرت) محمد (ﷺ) کی کامیابی کا راز معلوم کرنے کے لیے ہمیں ان کے زمانۂ بعثت کے حالات جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں اس بنیادی حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ ان کا پیغام سچ تھا۔

(حضرت) محمد (ﷺ) جن عربوں میں پیدا ہوئے وہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے غیر معمولی لوگ تھے۔ جس ماحول میں اس قوم کی بود و باش تھی وہ اسی نسل کے شایان شان تھا۔ چٹیل اور ناقابل گزر پہاڑ، مہیب ریگستان اور کہیں کہیں سبزہ۔ جہاں کہیں پانی ہے وہاں سبزہ بھی اگا ہوا ہے۔ اس سے ایک حسن بھی پیدا ہو جاتا ہے پھر خوشبودار مہندی کی جھاڑیاں ہیں۔ لوبان کے پودے اور نخلستان ہیں۔ ذرا اس لق و دق ریگستانی منظر کو سامنے رکھیے جہاں ریت ہی ریت ہے اور ایک گھمبیر سناٹا طاری رہتا ہے۔ یہی ریگستانی سمندر مختلف آباد اور غیر آباد علاقوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ انسان غیر آباد علاقوں کی طرف جا نکلے تو خود کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہے۔ دن کے وقت سورج کی ناقابلِ برداشت تپش، آگ برساتی رہتی ہے اور رات کو چرخ نیلوفری، روشن تاروں سے سجا ہوا نظر آتا ہے۔ اس ماحول نے یہاں کے باشندوں کو پھرتیلے، سخت جان، مستعد اور چاق و چوبند بنا دیا ہے۔ اس کے باوجود ان میں غور و فکر کی عادت موجود ہے۔

اہل فارس کو "مشرق کے فرانسیسی" کہا جاتا ہے۔ ہم عربوں کو "مشرقی اطالوی" کہیں گے۔ قدرت نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان کے جذبات اگرچہ تند و تیز ہوتے ہیں لیکن ان پر انہیں پورا قابو حاصل ہوتا ہے جو ان کی طبعی شرافت اور اعلیٰ فطرت کی علامت ہے۔ مہمان نوازی میں شاید ہی کوئی قوم ان سے بڑھ کر ہو۔ مہمان نوازی ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ ایک وحشی بدو، اجنبی مہمان کا اس طرح خیر مقدم کرتا ہے گویا وہ اس کے خیمہ یا گھر کی ساری املاک میں اس کا شریک ہے۔ اجنبی خواہ اس کا دشمن ہی ہو، وہ اس کی خاطر تواضع کو اپنا مقدس

ترین فرض سمجھتا ہے، اسے تین دن تک اپنے پاس ٹھہرانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ اور رخصت کرتے وقت ایک دوسرے "قانون" (جسے وہ دورِ قدیم کا مقدس قانون سمجھتا ہے) کے تحت اگر بس چلے تو اسے قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

عرب بہت کھرے لوگ ہیں ان کے قول و فعل میں تضاد نہیں ملتا۔ جو حال ان کے افعال کا ہے وہی ان کے اقوال کا بھی ہے۔ یہ چرب زبان نہیں بلکہ کم سخن ہوتے ہیں لیکن جب بولنے پر آتے ہیں تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں۔ یہ بے حد مخلص، سچے اور سنجیدہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہمیں علم ہے عرب بھی قوم یہود کی ایک شاخ ہیں لیکن یہودیوں جیسی مکروہ اور تنگ طبیعت کی بجائے ان میں ایک مخصوص خوش ادائی، دلکشی اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ جس سے یہودی بالعموم محروم ہوتے ہیں۔ (حضرت) محمد (ﷺ) کے عہد سے قبل عربوں میں مشاعروں کا بڑا زور ہوا کرتا تھا۔ ممتاز مستشرق جارج سیل (George Sale) لکھتا ہے:

"جنوبی عرب کے بازار عکاظ میں سالانہ میلے لگا کرتے تھے۔ جہاں اشیا کی خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ شاعری کے انعامی مقابلے بھی ہوا کرتے تھے۔ اچھے شعراء گرانقدر انعامات جیت کر لے جاتے۔ اس کی وجہ سے شعر و شاعری کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی اور لوگ بڑی تعداد میں مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔"

عربوں میں یہودیوں جیسی ایک خصوصیت، جو یقینی طور پر قابل تحسین ہے، ان کا مذہبی رجحان ہے۔ وہ اپنے مخصوص عقائد کے مطابق مذہب کے پُر جوش داعی اور مبلغ تھے۔ وہ صابئین کی طرح ستاروں کو پوجتے تھے اور دیگر مظاہر فطرت کے سامنے بھی سجدہ ریز ہوتے تھے۔ یہ ان کی غلطی تو تھی مگر ہم اسے کلی طور پر غلطی بھی نہیں کہہ سکتے۔ موجودات کو وہ مظہرِ ربانی اور جلوۂ یزدانی سمجھ کر لائق عبادت قرار دیتے تھے۔ کیا ہم بھی تمام مظاہر فطرت کو خدا کی صناعی تسلیم نہیں کرتے؟ کیا ہم قدرتی اشیا کے حسن کی تعریف نہیں کرتے؟ اور اسے شاعرانہ حسن قرار نہیں دیتے؟ کوئی شخص شاعر ہو تو ہم اس کی بطور شاعر عزت کرتے ہیں، خواہ وہ تحت اللفظ ادائیگی کرے یا لحن سے اشعار پڑھے، اس کی عزت کی جاتی ہے۔ یہ بھی پرستش ہی کی ایک ہلکی پھلکی قسم ہے۔ اسی طرح عربوں میں ان کے عقیدے کے مطابق پیغمبر یا پیشوا بھی ہوا کرتے تھے، جو اپنے اپنے قبیلے کو تعلیم دیتے تھے۔ ان غیر متمدن لوگوں کے سینے میں زہد و تقویٰ اور شرافتِ نفس کے

جذبات موجزن تھے۔ انجیل کے تمام نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ ہماری مذہبی کتاب ؟؟''کتاب'' ایوب (BOOK OF JOB) دنیا کے اسی خطے میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کے متعلق جتنے نظریات اب تک قائم ہیں ان سے قطع نظر، میں اسے بہت بڑے قلمی شاہکاروں میں سے ایک سمجھتا ہوں جن کی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ عبرانی کتاب نہیں، اس میں فرقہ بندی اور محدود حُب الوطنی کی بجائے وسعت اور ہمہ گیری ہے جسے تمام نوع انسانی کے لئے ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ یہ قسمتِ انسانی اور فطرتِ الٰہی کے لامتنہی مسئلہ و عُقدہ (NEVER ENDING PROBLEM) کے بارے میں ہمارا اولین اور قدیم ترین بیان (FIRST & OLDEST STATEMENT) ہے۔ اس کا طرز بیان نہایت صاف واضح اور دلکش ہے۔ اس کی سادگی، اس کا ترنم اور اس کی لطافت احاطۂ بیان میں نہیں آ سکتی۔ اس میں دیدۂ بینا اور عقلِ رسا کے ایسے جواہر پائے جاتے ہیں جن میں تمام روحانی اور مادی مسائل کا حل اور رہنمائی موجود ہے۔ اس کی خوبصورت تشبیہات اور استعارات کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس سازِ کہن میں خوشی اور غم کے وہ شیریں نغمات پنہاں ہیں جو قلب انسانی میں موجِ دریا اور چادرِ مہتاب جیسے رنگین جلوے پیدا کر دیتے ہیں۔ میرے خیال میں ادبی لطافتوں کے اس نظر فریب مرقع کا جواب، نہ بائبل میں موجود ہے اور نہ کہیں اور مل سکتا ہے۔

بت پرست عربوں کے پاس پوجنے اور پرستش کرنے کے لئے جو قدیم ترین اشیاء تھیں ان میں ایک سیاہ پتھر بھی تھا جسے حجرِ اسود کہا جاتا ہے۔ یہ اب بھی مکہ (مکرمہ) کی مقدس ترین عمارت، کعبہ کی دیوار میں نصب ہے۔ یونانی مؤرخ ڈیوڈرس سیکولس (DIODORUS CICULUS) نے لکھا کہ کعبہ قدیم ترین اور مقدس ترین عبادت گاہ چلا آ رہا ہے جب کہ سلوسترے دی ساسی (SILVESTRE DESACY) لکھتا ہے کہ ''بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حجر اسود آسمانی پتھر ہے۔'' ایسی صورت میں یہ بات زیادہ تعجب خیز نہیں ہے کہ اس شہابی پتھر کو کسی نے عالم بالا سے گرتے بھی دیکھا ہو۔ اب یہ سیاہ پتھر چاہ زمزم کے قریب رکھا ہوا ہے۔ اور ''کعبہ ان دونوں کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے۔'' (غیر مسلم حدود حرم میں داخل نہیں ہو سکتے اس لیے یورپی مورخین کو صحیح صورت حال سے آگاہی نہیں ہے۔ کعبہ کی عمارت چاہ زمزم سے کئی میٹر کے فاصلے پر ہے اور حجر اسود کعبہ کی دیوار کے اندر نصب ہے...... مترجم) چاہ

زمزم سخت زمین میں واقع ہے جہاں سے پانی سیلِ زندگی (GUSHING LIFE) کی طرح اُبل رہا ہے جو نہایت خوشنما، دلکش اور حیات بخش دکھائی دیتا ہے، خصوصاً گرم ممالک میں، جہاں پانی زندگی کے لئے شرطِ اول ہے چاہِ زمزم کا یہ نام جھرنے کی آواز سے مشابہت کی بنا پر پڑا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ وہی کنواں ہے جسے حضرت ہاجرہ نے (حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کے ساتھ جنگل میں دیکھا تھا (مسلم روایات کے مطابق چاہِ زمزم (حضرت ہاجرہ کی اس دعا کا نتیجہ تھا جو انہوں نے پیاس سے اپنے بلکتے بچے کے لئے پانی کی خاطر مانگی تھی۔ اس سے پہلے یہ چشمہ موجود نہ تھا...... مترجم)۔

الغرض حجرِ اسود اور یہ کنواں اب بھی مقدس اور محترم سمجھا جاتا ہے۔ کعبہ بھی ہزار ہا سال سے قائم و دائم ہے۔ کعبہ ایک حیرت انگیز اور پرشکوہ عمارت ہے جو اس وقت بھی شان و شوکت سے سیاہ غلاف میں ملفوف کھڑا ہے، یہ غلاف ہر سال تبدیل کیا جاتا رہا ہے۔ اس کی اونچائی 27 ہاتھ ہے۔ اس کے اطراف میں ستونوں کا دوہرا سرکٹ ہے۔ اس کے گرد و پیش کو جھاڑ فانوسوں اور نادر سامانِ آرائش سے سجایا گیا ہے۔ یہ فانوس آج رات پھر روشن کیے جائیں گے جو تاروں بھرے آسمان کے نیچے جگمگا کر عجیب سماں پیش کریں گے۔ الغرض یہ عہدِ قدیم کی ایک معتبر اور مستند ترین یادگار ہے۔ یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ دہلی سے لے کر مراکش تک کروڑوں مسلمانوں کی نگاہیں روزانہ پانچ مرتبہ نماز ادا کرتے ہوئے اس کی طرف پلٹتی ہیں۔ بلاشبہ یہ چار دانگ عالم کا مقدس ترین مرکز ہے۔ تمام عرب قبائل، کعبہ، حجرِ اسود اور چاہ زمزم کی زیارت کو آیا کرتے تھے۔ اسی تقدس کی بنا پر مکہ نے آج ایک عظیم شہر کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

کسی زمانے میں مکہ بہت بڑا شہر تھا مگر اب بہت بوسیدہ ہو گیا ہے کیونکہ اس میں شہر بننے کی قدرتی صلاحیت نہیں ہے (کارلائل نے مکہ کی بوسیدگی اور اس میں شہر بننے کی صلاحیت نہ ہونے والی بات اندازاً 1876ء میں کہی تھی جب خلافت عثمانیہ کا دور تھا اور مکہ محض ایک شہر تھا لیکن اب اس میں بوسیدگی والی کیفیت کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ تاہم 1913ء میں آل سعود کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مکہ مکرمہ بہت بڑا شہر بن گیا اور اس کی رونقوں کا سبب کعبۃ اللہ ہی ہے...... مترجم) کعبہ سمندر سے دور چٹیل پہاڑیوں کے درمیان ریتلے نشیب میں واقع ہے جہاں غلہ تک باہر سے آتا ہے۔ (1970ء کے بعد سے سعودی عرب نہ صرف غلے میں خود کفیل

ہو چکا ہے بلکہ اناج اور مختلف انواع کے پھل برآمد بھی کر رہا ہے...... مترجم) یہاں اکثر زائرین کو مکان کی ضرورت رہتی تھی۔ یہ قاعدے کی بات ہے کہ تمام مقدس مقامات تجارتی مرکز بھی بن جاتے ہیں۔ زائرین کے جمع ہوتے ہی تاجر بھی اپنے سامان تجارت سمیت پہنچ جایا کرتے ہیں۔ جہاں لوگ ایک ضرورت سے جمع ہوتے ہیں تو وہاں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی دوسری ضروریات بھی پوری کر سکیں گے۔ چنانچہ مکہ سارے عرب کا مرکز بن گیا اور اس طرح اسے مشرق میں ہندوستان اور مغربی ممالک شام، مصر اور حتیٰ کہ اٹلی تک کے لوگ بھی سب سے بڑی تجارتی منڈی سمجھ کر آنے لگے۔ کسی زمانے میں مکہ کی آبادی ایک لاکھ تھی جو مشرقی اور مغربی پیداوار کی خرید و فروخت کرتی اور منافع کے مواقع سے خوب فائدہ اٹھاتی تھی۔

ان کی حکومت بے وضع اور بے قاعدہ تھی مگر اشرافیہ (ARISTORATIC REPUBLIC) جمہوریت تھی جس میں مذہبیت بھی نمایاں طور پر محسوس ہوتی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ کسی بڑے قبیلے کے دس افراد کسی خاص قاعدے وضابطے کے بغیر چن لیے جاتے اور انہیں مکہ کی حکمرانی اور کعبہ کی تولیت کا فریضہ سونپ دیا جاتا تھا۔

(حضرت) محمد (ﷺ) کے زمانہ میں قبیلۂ قریش سب سے بڑا قبیلہ تھا۔ آپ (ﷺ) کا خاندان بھی اسی قبیلے کا حصہ تھا۔ جب کہ باقی ماندہ قوم مختلف صحراؤں میں بٹ کر الگ الگ ٹکڑوں میں بود و باش رکھتی تھی۔ ہر ٹکڑا اسی قسم کی غیر منظم حکومت کا تابع تھا۔ اس کی باگ ڈور ایک یا ایک سے زائد افراد گلہ بانوں، تاجروں، سماجی رہنماؤں کے پاس اور بعض اوقات ڈاکوؤں کے ہاتھ میں بھی ہوتی تھی۔ یہ بااثر طبقے اور افراد عموماً آپس میں دست و گریبان رہتے تھے۔ ان میں کعبہ میں اجتماع کے سوا، شیرازہ بندی کا کوئی ذریعہ یا مقام نہ تھا۔ کعبہ کے اجتماعات، انہیں اپنی ایک زبان، ایک نسل اور بت پرستی کے مشترک جذبے کا احساس دلاتے تھے۔ بت پرستی کی متعدد اقسام تھیں اور وہ الگ الگ طریقوں پر بتوں کے سامنے جبیں سائی کرتے تھے۔ تاہم کوئی اندرونی جذبہ انہیں ناقابل تفریق یکسانیت محسوس کراتا رہتا تھا۔ اس طرح وہ عرصہ دراز سے باقی دنیا کی نظروں سے دور، اپنی دنیا بسائے ہوئے تھے اور غیر محسوس طور پر اس موقع کے منتظر تھے جو انہیں دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بنا سکتا ہو۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب وقت آ گیا تھا کہ ان پر اپنی بت پرستی کے متزلزل ہونے کا یقین

غالب آرہا تھا۔ ابتری اور انتشار کے آثار واضح سے واضح تر ہو رہے تھے۔ دنیا کا اہم ترین واقعہ یعنی ولادتِ مسیح اور ان کی "وفات" سے متعلقہ معاملہ، جس نے دنیا کی تمام قوموں کو چونکا دیا تھا، اس کی خبریں صدیوں بعد یہاں پہنچی تھیں جس سے عربوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔

(حضرت) محمد (ﷺ) 570ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق قبیلۂ قریش کے خاندان بنو ہاشم سے تھا۔ آپ اگرچہ خود غریب تھے لیکن آپ کا رشتہ معززین علاقہ سے تھا۔ آپ کی ولادت سے پہلے آپ کے والد وفات پا چکے تھے آپ چھ سال کے تھے کہ آپ کی والدہ بھی جو اپنی قابلیت، حسنِ سیرت وصورت اور فہم وفراست کی وجہ سے شہرت رکھتی تھیں، وفات پا گئیں۔ اس طرح آپ کی پرورش کی ذمہ داری آپ کے دادا (عبدالمطلب) نے سنبھال لی جن کی عمر اس وقت تقریباً ایک سو سال تھی۔ آپ کے والد حضرت عبداللہ، عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے اور سب سے زیادہ لاڈلے بیٹے تھے۔ دادا کی سو سالہ آنکھوں نے عبداللہ کی تصویر کو (حضرت) محمد کے پیکر میں جلوہ گر پایا اور اس دُرِ یتیم سے بے حد شفقت کرنے لگے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "میرے خاندان کو اس خوبصورت اور پیارے بچے کی خوب حفاظت کرنی چاہئے کیونکہ ہمارے ہاں ایسا صاحبِ جمال اور ایسا گوہرِ گراں مایہ بچہ کبھی پیدا نہیں ہوا" آپ دو سال کے ہی تھے عبدالمطلب بھی وفات پا گئے۔ اور آپ کی تربیت ابو طالب کے سپرد ہو گئی۔ وہ آپ کے سب سے بڑے چچا اور سارے خاندان کے بزرگ تھے۔ حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابو طالب، بے حد منصف مزاج اور فہم وبصیرت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنے اس بھتیجے کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داری عرب روایات کے مطابق ادا کی۔ (حضرت) محمد سنِ شعور کو پہنچے تو تجارت کے کاروبار میں چچا کا ہاتھ بٹانے لگے اور اس سلسلے میں مختلف سفر بھی کئے۔ اور ان ہی کے ہمراہ ایک جنگ (جنگ حرب فجار) میں بھی شریک ہوئے اس وقت آپ کی عمر 18 برس تھی۔ لیکن آپ کا اہم ترین سفر وہ تھا جب اس سے چند سال قبل آپ شام میں منعقد ہونے والے تجارتی میلے میں شرکت کے لئے حضرت ابو طالب کے ہمراہ تشریف لے گئے تھے۔ بیرونی دنیا دیکھنے کا ان کے لئے یہ پہلا موقع تھا اور آپ ایک نئے عنصر (عیسائیت) سے روشناس ہوئے۔ آپ (ﷺ) کے لیے یہ سفر بے حد اہم تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس سفر میں (حضرت) ابو طالب اور آپ سرجیس نام کے ایک نسطوری راہب کی خانقاہ میں ٹھہرے جس

نے آپ کو عیسائیت کے بارے میں چند باتیں بتائیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے آپ (ﷺ) کو مسیحیت کی ''تعلیم'' بھی دی تھی۔ غالباً اس روایت کو پھیلانے والوں نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ اتنے مختصر وقت میں ایک چودہ سالہ بچے کو بھلا کیا تعلیم دی جا سکتی تھی؟ علاوہ ازیں آپ عربی کے سوا کوئی دوسری زبان بھی نہ جانتے تھے۔ اغلب خیال یہ ہے کہ شام کے سفر میں بہت سی باتیں آپ کے لئے انوکھی اور ناقابل فہم بھی تھیں۔ یہ درست ہے کہ آپ بہت زیرک تھے۔ آپ کا مشاہدہ عمیق اور یادداشت بہت عمدہ تھی۔ آپ کے ذہن میں بہت سی باتیں محفوظ ہو گئی ہوں گی۔ جو اگرچہ اس وقت معمہ تھیں لیکن بعد میں چل کر معاملات کو سمجھنے میں ان سے بڑی مدد ملی اور عقائد و نظریات کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔ غالباً سفرِ شام آپ کی زندگی کے آنے والے بہت سے واقعات کا پیش خیمہ تھا۔

ہمیں ایک اور بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ آپ (ﷺ) نے مروجہ معنوں میں کسی مدرسہ یا مکتب میں تعلیم نہیں پائی تھی، آپ کو ایسی کوئی سہولت یا موقع میسر نہ آیا تھا۔ چنانچہ یہ بات درست لگتی ہے آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ ریگستانی زندگی کے مشاہدات اور ذاتی تجربات ہی آپ کی تعلیم کا کل سرمایہ تھے۔ غور کیجئے تو یہ امر نہایت حیرت انگیز ہے آپ کتابی علم سے بالکل نا آشنا تھے۔ آپ کا ذریعۂ معلومات آنکھوں سے کیا ہوا مشاہدہ تھا یا اس دور افتادہ ریگستان میں پہنچنے والی خبریں تھیں۔ علم و حکمت کے جو ذخائر اس دور میں موجود تھے ان تک آپ کی رسائی نہ تھی۔ انبیاء (علیہم السلام) کی جو تعلیمات دنیا کے مختلف خطوں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھیں وہ آپ تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

کہا جاتا ہے کہ آپ (ﷺ) میں ابتداء ہی سے غور و فکر کی عادت تھی۔ احباب اور ہم عمر نوجوان آپ کو ''الامین'' کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ آپ کا ہر قول و فعل صداقت اور دیانت کا مظہر ہوتا تھا۔ آپ کی ہر بات پُر مغز اور پُر معنی ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کم سخن تھے اور بلا ضرورت کوئی بات نہ کرتے تھے۔ آپ کی گفتگو میں تدبر اور حکمت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ آپ ہمیشہ نفسِ مضمون پر یوں اظہار خیال کرتے کہ سننے والوں کو ہمہ تن گوش ہونا پڑتا تھا۔ لوگ ساری عمر آپ کو سنجیدہ، شفیق، راست باز اور راست گفتار سمجھتے رہے۔ آپ متین فکر، متواضع، ملنسار اور خوش طبع تھے۔ آپ کے چہرہ مبارک پر ہر وقت مسکراہٹ بکھری رہتی تھی۔ بعض لوگوں

کے چہروں پر تصنع اور ریاکاری کی جو مسکراہٹ موجود ہوتی ہے، آپ کے حسین چہرے سے ذہانت، ذکاوت اور دیانت کا رنگ جھلکتا تھا۔ آپ کا رنگ گندمی تھا اور آنکھیں سیاہ اور چمکدار تھیں۔ مجھے تو آپ کی پیشانی کی وہ رگ بھی بہت پیاری لگتی ہے جو غصے کی حالت میں پھول کر سیاہی مائل ہو جاتی تھی۔ یہ بنو ہاشم کا ایک امتیازی نشان تھا جو آپ کی پیشانی پر نمایاں طور پر موجود تھا۔

آپ (ﷺ) اولوالعزم، جری اور جوشیلے ہونے کے ساتھ ساتھ منصف مزاج اور صداقت پسند بھی تھے۔ آپ زندگی کی حرارت سے لبریز شخصیت کے مالک تھے اور صحرا کی پہنائیوں میں زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ انجام دینے کے لئے اٹھے تھے۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا نامی ایک دولتمند بیوہ نے آپ کی خوبیوں کا شہرہ سنا تو اس نے آپ کو اپنے سامانِ تجارت کا منتظم بنا لیا۔ آپ ان کا سامان لے کر دوبارہ شام گئے اور اپنا کام دیانتداری، مہارت اور خوش اسلوبی سے انجام دے کر واپس آئے اور اپنے ساتھ کثیر منافع بھی لائے، جس سے وہ مزید متاثر ہوئیں۔ عرب مصنفین نے ان کے گرویدہ ہونے اور شادی کے بارے میں کئی دلچسپ واقعات تحریر کئے ہیں۔ اس وقت آپ پچیس برس کے تھے اور خدیجہؓ کے چہرے پر چالیس سال کی ہونے کے باوجود حسن کے آثار موجود تھے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس محسن بیوی سے آپ کے تعلقات، محبت آگیں اور خوشگوار رہے۔ دونوں طرف خلوص اور گرم جوشی موجود تھی۔ اور آپ ہمیشہ انہیں دل و جان سے چاہتے رہے۔ یہ حقیقت، کہ آپ جوشِ شباب ختم ہونے تک بالکل معمول کے طریقے پر ان کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارتے رہے، اس الزام کو جھوٹا قرار دینے کے لئے کافی ہے کہ اس شادی کے پیچھے کوئی اور جذبہ کارفرما تھا۔

عمر کے چالیس برس گزرنے تک آپ (ﷺ) نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ آپ کی زندگی کے تمام غیر معمولی واقعات، جن میں سے کچھ حقیقت پر مبنی ہیں اور کچھ بروزنِ بیت مشہور کر دیئے گئے ہیں، حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد یعنی 50 ویں سال سے شروع ہوئے۔ اس وقت تک کسی نے آپ کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی۔ آپ کی شہرت یعنی ہمسایوں کا نیک خیال آپ کے لیے کافی تھا۔ جب بڑھاپے نے دروازے پر دستک دے دی، ساری گرمیٔ شباب ختم ہو گئی۔ آپ کے لئے اس دنیا میں صرف اطمینان و عافیت ہی ایک چیز رہ گئی تھی تو میں کیسے مان لوں کہ

آپ کو یکا یک ہوس پرستی کی سوجھ گئی تھی اور آپ نے اپنی ساری نیک نامی اور اپنے تمام خصائل اور فضائل پر پانی پھیر کر فریب کاری کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ جس سے آپ کسی طرح بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ نہیں، میں ایسی قیاس آرائیوں کو کبھی نہیں مان سکتا۔ ہرگز نہیں۔ یہ سیاہ چشم، پاک طینت اور صاف باطن انسان جو مادر صحرا کی آغوش میں پلا تھا، جذبۂ ہوس اور شہرت طلبی میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس شخصیت میں کچھ اور ہی خیالات موجزن تھے۔ یہ شخصیت اس قسم کی ہلکی باتوں سے بالاتر تھی اور مجسم خلوص اور صداقت تھی۔ ایسی شخصیت، خلوص اور سچائی کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کا خمیر ہی اخلاص کے بطن سے اٹھایا گیا تھا۔

دنیا کے دیگر لوگ جب اوہام اور تخیلات میں بری طرح مبتلا ہو چکے تھے اور اپنے اوہام کو دوسروں سے منوانے کے لئے جنگ و جدل میں معروف تھے یہ ہستی ان اوہام سے کوسوں دور تھی۔ آپ اپنی روح اور حقائق کی بنا پر سب سے الگ تھلگ تھے راز ہستی، آپ پر روز روشن کی طرح عیاں ہو چکا تھا، آپ کا وجود وہم و گماں سے ماورئی اور صفات ایزدی کا پرتو تھا۔ اس پُر خلوص انسان کی ندا ہاتفِ غیب کی آواز تھی جسے لوگ انتہائی توجہ اور انہماک کے ساتھ سنتے تھے اور انہیں سننا بھی چاہئے تھا کیونکہ اس کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز ہیچ تھی اور آج بھی ہیچ ہے۔

ہزاروں خیالات اور سوالات آپ (ﷺ) کے دل میں پیدا ہوتے رہتے، آپ سفر میں ہوتے یا حضر میں، یہ سوالات آپ سے جواب مانگتے رہتے کہ "میں کون ہوں اور یہ وسیع و ناپیدا کنار کائنات جس میں میں سانس لے رہا ہوں کیا چیز ہے؟ موت اور زندگی کا راز کیا ہے؟ اور میرا عمل اور یقین کیسا ہونا چاہئے؟" کوہ حرا کی بلندی اور کوہ سینا کی ہیبت ناک چٹانیں، ریگستانی تنہائی اور خاموشی، نیلے ستاروں سے مزین یہ آسمان ان سوالوں کا کیا جواب دے سکتے تھے؟ بالآخر آپ کی اپنی پاکیزہ روح نے ان کا جواب بذریعہ وحی حاصل کیا۔ یہ ایسے سولات ہیں جو ہمیں بھی خود سے پوچھنے چاہئیں اور ان کا جواب تلاش کرنا چاہئے۔ اس امّی شخص کے خیال میں یہ سوالات اتنے اہم تھے کہ وہ انہیں ہر چیز سے زیادہ اہم گردانتا تھا۔ جب کہ یونانی علوم کے پیچیدہ مباحث، ان کے رنگا رنگ فرقوں کا استدلال، یہودیوں کی قدیم مبہم اور پر اسرار روایات اور عربوں کی احمقانہ صنم پرستی، ان میں سے کسی میں سے ان مسائل کا جواب نہیں مل سکتا تھا۔

☆......☆......☆

ہیرو کی پہلی خصوصیت جو تمام خصوصیات سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اشیا کی ظاہری صورت کو دیکھ کر ان کی اصل حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ رسم و رواج اور مقبول روایات اچھی بھی ہو سکتی ہیں اور بری بھی۔ اگر یہ روایات حقیقت کی مظہر نہ ہوں تو یہ محض بت پرستی ہوتی ہیں۔ لکڑی کے ایک ٹکڑے کو خدا مان لیا جائے تو ایک حقیقت پسند شخص اسے مضحکہ خیز اور قابل نفریں حرکت ہی سمجھے گا۔ سونے کی ملمع کاری سے مزین اصنام جن کی قریشِ مکہ پرستش کرتے تھے اس بلند و بالا ہستی کے نزدیک کس کام کے تھے؟ ساری دنیا انہیں پوجتی رہے ہمارے اس ہیرو کو اس سے کیا غرض تھی اس ہستی کے سامنے تو حقیقت کبریٰ (GREAT REALITY) روزِ روشن کی طرح واضح اور صاف تھی۔ انہیں اس حقیقت کبریٰ کا اعلان کرنا تھا۔ اور اس اعلان کے لئے یہی موقع مناسب تھا۔ اس کا اعلان نہ کرنا بے بسی کے ساتھ موت کو قبول کرنے کے مترادف تھا (غالباً اس سے فاضل مقرر کی، اس سے مراد اعلانِ نبوت کرنے سے ہے...... مترجم)۔

جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ ان افعال کا محرک، کوئی دنیاوی لالچ تھی ہرگز قرین قیاس نہیں ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سارے عالم عرب میں وہ کونسی چیز تھی جو آپ کو مطمئن کر سکتی تھی؟ کیا یونان کے ہرکولیس (ہرقل روم) یا خسرو ایران کا تاج؟ یا ساری دنیا کے بادشاہوں کے تاج آپ کو اپنے اس اعلانِ حق سے باز رکھ سکتے تھے؟ آپ کے کس کام کے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ترغیبات آپ کے پیش نظر تھیں ہی نہیں۔ جنت کی نعمتیں اور دوزخ کے ہولناک عذاب کے سوا کوئی چیز آپ کے لئے قابل توجہ نہ تھی۔ دنیا بھر کے تاج و تخت کی چند روزہ بہار آپ کے لئے کیا معنی رکھتی تھی؟ کیا شیخِ مکہ یا شاہِ عرب بن کر عصائے شاہی ہاتھ میں لینے سے آپ کو اخروی نجات زیادہ یقینی نظر آ سکتی تھی؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ لہٰذا اس ناقص اور بعید از قیاس خیال کو ہمیں ذہن سے جھٹک دینا ہو گا کہ اس عظیم شخصیت نے جو کچھ کیا کسی لالچ کے تحت کیا ہو گا یا اس میں مکر و فن کا کوئی عنصر شامل تھا۔ اس قسم کی یاوہ گوئی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

☆......☆......☆

(حضرت) محمد (ﷺ) کی یہ عادت تھی کہ آپ ہر سال ماہ رمضان میں خلوت گزین ہو

جاتے تھے۔ اس سے آپ کو مکمل تنہائی اور خاموشی کی فضا میں غور وخوض کا موقع ملتا تھا۔ یہ، اس زمانے میں اہل عرب کا عام دستور تھا۔ خصوصاً آپ جیسے انسان کے لئے تو یہ فکر و تدبر کا بہترین طریق تھا۔ یہ، آپ کی عمر کا 40 واں سال تھا۔ آپ ماہ رمضان میں تسبیح وتہلیل کے لئے مکہ کے قریب کوہ حرا کے غار میں مقیم ہو گئے۔ ایک دن آپ نے اپنی شریک حیات خدیجہؓ سے، جو اس سال وہاں قریب ہی آ کر ٹھہر گئی تھیں، فرمایا:

''خدا کے خصوصی فضل وکرم سے تمام مسائل حل ہو چکے ہیں۔ میرے سارے شکوک و شبہات دور ہو گئے ہیں اور اب تمام معارف و اسرار مجھ پر واضح ہو گئے ہیں۔ یہ تمام بت اور ان سے متعلقہ عقائد مہمل اور بے معنی ہیں۔ یہ لکڑی اور پتھر کے کھلونوں کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ سارے جہانوں کا مالک خدائے واحد و لاشریک ہے ہمیں ان سب بتوں کو چھوڑ کر اسی وحدہٗ لاشریک کے سامنے سر جھکا دینا چاہئے وہ ذات کبریا ہے، اس کے سوا عظمت و رفعت کسی کو حاصل نہیں۔ وہی اصل حقیقت ہے۔ وہی ہمارا خالق و مالک ہے۔ وہ ہمیں رزق دیتا ہے اور پالتا ہے ہم سب اسی کا پرتو ہیں، اسی حسنِ ازل کا ایک عارضی نقاب ہیں، سوائے اس کے دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ ''اللہ اکبر'' یعنی وہ بزرگ و برتر ہے اور ''اسلام'' یہ ہے کہ ہم اسی کی اطاعت کریں اور اسی کے سامنے سر بہ سجود ہوں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری ساری قوتیں اسی کی اطاعتِ کامل میں مضمر ہیں۔ وہ ہماری دنیا اور آخرت کا مالک ہے، وہ جو کچھ چاہے اس میں وہ مختار ہے، جو کچھ بھی ہمارے لئے بھیجے خواہ وہ موت ہو یا اس سے بھی کوئی بدتر چیز، وہی ہمارے حق میں بہتر و مفید ہے ہم اپنا سب کچھ اسی کے سپرد کرتے ہیں۔

اسلام کے حوالے سے اطاعت اور صبر و شکر کے اس فلسفے کے بارے میں جرمنی کا مشہور شاعر و فلسفی گوئٹے (1749-1832ء) کہتا ہے کہ ''اگر اسی کا نام اسلام ہے تو کیا ہم سب مسلمان نہیں ہیں'' بلاشبہ ہم میں سے جو لوگ اخلاقی اور روحانی زندگی کے قائل ہیں وہ اسی عقیدے کے پابند ہیں۔ عقلِ انسانی کے کمال کی انتہا یہ نہیں ہے کہ وہ تقدیر کے آگے سپر انداز ہو جائے کیونکہ قدرت تو اسے مطیع کر کے ہی رہے گی تو پھر یہ یقین کر لینا چاہئے کہ تقدیر نے جو چیز ہمارے لیے مقدر کر دی ہے وہی ہمارے لیے بہترین ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ کارخانۂ قدرت میں اپنی عقلِ نارسا کو دخل دینے سے باز رکھے اور یہ سمجھ لے کہ اگرچہ اس کی

عقل وہاں تک نہیں پہنچ سکتی لیکن جو کچھ ہو رہا ہے ایک منصفانہ قانون کے تحت رونما ہو رہا ہے۔ اسے اس قانون کا ساتھ دینا اور بلا چوں وچرا اس کی پابندی کرنی چاہئے۔ میرے نزدیک یہی حقیقی درسِ اخلاق ہے، جس کا ہمیں اب جا کر علم ہوا ہے۔ جونہی انسان سطحی قوانین، عارضی حالات اور اندیشہ ہائے سود وزیاں سے بالاتر ہو کر اس عالمگیر قانون کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرتا ہے تو وہ صداقت، نیکی، اور فتح ونصرت کی شاہراہ پر جا پہنچتا ہے۔ اس کی کامیابی کا انحصار صرف اسی عظیم الشان قانون کے ساتھ یکجہتی کا مظاہرہ کرنے پر ہے۔ اس کے بغیر وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس یکجہتی اور ہم آہنگی کے لئے سب سے پہلی شرط اس امر کا یقین پیدا کرنا ہے کہ ایسا کوئی قانون ضرور موجود ہے جو سرتاپا صحیح ہے اور خیر و برکت پر مبنی ہے۔ یہی اسلام کی روح ہے اور یہی روح، عیسائیت کے اندر کارفرما ہے۔ عیسائیت بھی راضی بہ رضائے الٰہی رہنے پر بے حد زور دیتی ہے۔ اس کے احکامات کی رو سے ہمیں اپنے نفس سے مشورہ کرنے، دور از کار اعتراضات پر توجہ دینے اور اپنے راحت و رنج کو اہمیت دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہم کچھ نہیں جانتے، ہمیں جو چیز حد درجہ ظالمانہ محسوس ہوتی ہے وہ درحقیقت بری اور ظالمانہ نہیں ہے۔ ہمیں جو کچھ پیش آئے ہمیں اسے مشیتِ الٰہی سمجھ کر قبول کر لینا چاہئے اور یہ کہنا چاہئے کہ خدا دانا اور بینا ہے، اس کی اسی میں مصلحت ہوگی۔ وہ مجھے ہلاک کرنا چاہے تو میں سرِ تسلیم خم کر کے خود کو اس کے حوالے کر دوں گا۔ اسلام کا مطلب اپنی ذات کی نفی اور نفس کشی ہے۔ یہی عقل کا نقطۂ کمال وعروج ہے جو صاحبِ عرش نے اہلِ زمین کو بتایا ہے۔ یہی وہ نور ہے جو اس اُمی نبی کے ذریعہ کفر وعصیاں کے اندھیروں کو اجالوں میں بدلنے کے لئے عطا کیا گیا ہے۔ روح کو موت سے بچانے کے لئے زندگی کا نور اسی ''مہر منور'' کی وساطت سے آیا جسے (آنحضرت (ﷺ) نے ''وحی'' کہا اور یہ وحی ایک برگزیدہ فرشتہ ''جبرائیل'' لے کر آتے تھے۔ اس فرشتے کو ''جبرائیل'' کا نام انہوں نے ہی دیا تھا۔ کیا آج کوئی شخص بتا سکتا ہے کہ اس فرشتے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی نام ہو سکتا تھا؟

ہماری عقل کیا ہے؟ عقل القائے ربانی کا ایک مظہر ہے۔ کسی ''حقیقت'' کا ادراک ہونا یا اس کی ''ماہیت'' کا پتہ چلنا ایک وجدانی فعل (MYSTIC ACT) ہے جس کی وضاحت منطق و استدلال کی مدد سے بھی نہیں ہو سکتی۔ ممتاز جرمن شاعر اور ناول نگار نوالس

(NOVALIS 1704-1801AD) کا قول ہے کہ کیا (حضرت) محمد کا وجودِ باری پر ایمان بالغیب اس حقیقت کبریٰ کو بہترین طور پر ثابت نہیں کرتا؟ آپ کی روح اس حقیقتِ کبریٰ سے آگاہ تھی۔ یہ بالکل فطری امر تھا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظلمت اور ہلاکت سے بچا کر اس حقیقتِ عظمیٰ کا انکشاف کرنے پر مامور کر کے عزت سے سرفراز فرمایا تھا۔ اس لیے آپ کا فرض تھا کہ آپ نے یہ پیغام ساری مخلوق تک پہنچایا۔ کلمہ طیبہ کے دوسرے جزو ''محمد رسول اللہ'' کے معنی بالکل یہ ہیں کہ آپ اللہ کا پیغام پہنچانے پر مامور تھے۔ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ خوش خصال حضرت خدیجہؓ نے آپ کے اس بیان کو تحیر اور استعجاب کے عالم میں سنا ہوگا لیکن بالآخر انہوں نے جواب دیا ''جو کچھ آپ نے فرمایا ہے بالکل سچ ہے''۔

آنحضرت (ﷺ) خدیجہؓ کے اس جواب سے کس قدر ممنون ہوئے ہوں گے اور ان کے احسانات میں اس مخلصانہ کلام کو تسلیم کرنے کو کیسے محسوس کیا ہوگا، اس کا آسانی سے تصور کیا جا سکتا ہے۔ بقول نوالس ''جونہی میرے عقیدے کو کوئی اور شخص تسلیم کر لیتا ہے تو اس عقیدے میں مزید استحکام پیدا ہو جاتا ہے'' بلاشبہ عنایت و مہربانی میں یہ کمال کا درجہ ہے۔ چنانچہ حضور عمر بھر حضرت خدیجہؓ کے احسانات کو نہیں بھول سکے۔ اس واقعہ کے بہت بعد آپ کی سب سے کم عمر اور محبوب بیوی حضرت عائشہؓ نے جو اپنے اوصاف کی وجہ سے عالم اسلام میں بڑا ممتاز مقام رکھتی ہیں آپ سے ایک مرتبہ پوچھا کہ ''کیا میں خدیجہؓ سے بہتر نہیں ہوں؟ وہ تو بیوہ، بوڑھی اور بدصورت ہو گئی تھیں، کیا آپ مجھے ان سے بڑھ کر نہیں چاہتے؟'' حضرت محمد نے جواب دیا۔ ''خدا کی قسم میں ان کو تم سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ وہ مجھ پر اس وقت ایمان لائیں جب کسی نے میری بات پر ابھی یقین نہیں کیا تھا۔ ساری دنیا میں صرف ایک ہی ہستی میری مونس تھی اور وہ خدیجہؓ تھیں'' حضرت خدیجہؓ کے علاوہ آپ کے چچا زاد بھائی علی (ﷺ) ابن ابو طالب اور آپ کے غلام زیدؓ پہلے مسلمان تھے (کارلائل اس حقیقت سے ناواقف تھا کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد مردوں میں سب سے پہلے دعوتِ ایمان قبول کرنے والے حضرت ابوبکرؓ تھے البتہ نوجوانوں میں دعوت قبول کرنے والوں میں پہلے، حضرت علیؓ تھے جنہوں نے دعویٰ نبوت کے تین سال بعد اسلام قبول کیا تھا...... مترجم)

(حضرت) محمد (ﷺ) نے جن لوگوں کے سامنے عقیدۂ اسلام پیش کیا ان میں سے بیشتر نے اس سے بے اعتنائی برتی اور اس کا تمسخر اڑایا تھا۔ تین سال کی مسلسل محنت سے آپ صرف تیرہ افراد کو مسلمان بنا سکے۔ ترقی کی یہ رفتار بے حد سست اور صبر آزما تھی۔ آپ کے ساتھ وہ سلوک ہوا جو عموماً ایسی ہستیوں (انبیاء) کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ تین سال کی اس معمولی کامیابی کے بعد ایک بار آپ نے اپنے رشتہ داروں میں سے چالیس افراد کو دعوت دی۔ اور کھانے کے بعد کھڑے ہو کر ان کے سامنے اسلام کا پیغام دہراتے ہوئے کہا۔ "مجھے اسلام کا پیغام ساری نوع انسانی تک پہنچانا ہے۔ یہ دنیا کی اعلیٰ ترین نعمت ہے آپ میں سے کون میرا ساتھ دے گا؟" اس خاموش اور شک بھرے مجمع میں سے ایک سولہ سالہ نوجوان علی (رضی اللہ عنہ) اس خاموشی کو برداشت نہ کر سکا اور کھڑا ہو گیا اس نے پُر جوش لہجے میں اعلان کیا "میں آپ کا ساتھ دوں گا" مجلس، جس میں اس نوجوان کے والد، ابو طالب بھی موجود تھے، اگر چہ آپ کی مخالف نہ تھی لیکن صرف دو افراد کی طرف سے یہ عظیم الشان مہم چلانے کے اعلان کو اہل محفل نے مضحکہ خیز سمجھا اور تمسخر اڑاتے ہوئے سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن زمانہ شاہد ہے کہ یہ مضحکہ خیز بات نہ تھی۔ یہ نہایت اہم فیصلہ تھا اس سولہ سالہ پُر عزم نوجوان علیؓ کے اوصاف پر مجھے بے اختیار پیار آتا ہے جس نے ہر موقع پر شریف النفس اور جری ہونے کا ثبوت دیا۔ اس میں شجاعت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شیر کی سی ہمت و دلیری کے باوجود وہ مروت صداقت اور محبت کا ایسا مرقع نظر آتا ہے جس کی جھلک ہمارے مسیحی نائٹوں (KNIGHTS) میں دکھائی دیتی ہے۔ علیؓ نے اپنی نیک دلی کے باعث دوسروں کے نیک ہونے پر اعتبار کیا اور اسی کے باعث بغداد کی ایک مسجد میں شہید ہو گئے۔ (حضرت علیؓ کی شہادت کوفہ میں ہوئی تھی اور بغداد اس واقعہ سے تقریباً ایک سو سال بعد خلیفہ منصور عباسی کے دور میں تعمیر ہوا تھا...... مترجم) شہادت سے پہلے علی (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا "اگر زخم مہلک ثابت نہ ہوا تو حملہ آور کو معاف کر دینا۔ ورنہ قصاص لینا تاکہ ہم دونوں ایک ہی وقت رب العزت کے دربار میں پیش ہوں اور وہیں اس امر کا فیصلہ ہو جائے کہ ہم میں سے کون حق پر تھا۔"

آنحضرت (ﷺ) کی تبلیغ، قریش کی طبیعت پر بہت گراں گزری جو کعبہ کے پاسبان، بتوں کے زبردست پجاری اور بت پرستی کے سلسلہ کے متولی تھے۔ تاہم دو با اثر افراد ایمان لے آئے

تھے۔ اسلام اگرچہ آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا لیکن اس کا دائرہ بتدریج وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا تھا، جس سے مخاصمت میں اضافہ ہو رہا تھا اور دینِ حق کے خلاف مزاحمت بھی بڑھ رہی تھی۔ یہ لوگ کہنے لگے تھے "یہ کون ہیں جو اپنے آپ کو ہم سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں، ہمیں احمق اور ہمارے بتوں کو لکڑی کے محض کھلونے قرار دیتے ہیں" آخر آپ کے خوش خصال چچا ابو طالب نے بڑھتی ہوئی مزاحمتوں کو دیکھتے ہوئے کہا "اے جانِ عم! کیا تم اس تبلیغ سے باز نہیں رہ سکتے؟ تم اپنی حد تک اس عقیدے پر بے شک قائم رہو لیکن اس کا پرچار کر کے دوسروں کو پریشان کرنے، قبائل کے سرداروں کو ناراض کرنے اور اپنے آپ کو اور ہمیں خطرے میں ڈالنے سے باز رہو" آپ نے یہ سن کر جواب دیا کہ "اگر دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند آ کر مجھے اس کام سے باز رکھنے کی کوشش کریں تو بھی میں یہ کام نہیں چھوڑوں گا" (کارلائل نے حضور کا یہ "ارشاد" کسی ترجمے سے نقل کیا ہے اس لیے صحیح بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی۔ حضور نے یہ فرمایا تھا کہ "اگر لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں تب بھی میں اس تبلیغ سے باز نہیں آؤں گا" اصل الفاظ یہ تھے:

"یا عم و اللہ لو وضعو الشمس فی یمینی و القمر فی یساری علی اَن اَترك هذا الامر حتیٰ یظهره اللہ اوا هلك فیه ما ترکه".

بعض محدثین ان الفاظ کی یہ تعبیر کرتے ہیں کہ سورج سے مراد تکلیف اور چاند سے مراد راحت تھی۔ یعنی کفار خواہ مجھے دنیا کی تمام تکلیفیں پہنچائیں یا خوشیوں سے دامن بھر دیں، میں کسی طرح اس تبلیغ سے باز نہیں آ سکتا......ابن ہشام)

کہا جاتا ہے کہ آنحضرت یہ جواب دے کر رونے لگے کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ ابو طالب آپ سے محبت کرتے ہیں اور یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، خود پر جبر کر کے قریش کے کہنے پر اس کا اظہار کر رہے ہیں۔

آپ ہر شخص کو جو ان کی بات سننے پر آمادہ ہوتا یا جو زائر بھی مکہ آتا اپنا پیغام سناتے، یہ سلسلہ جوں جوں بڑھتا رہا آپ کے معتقدین کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ آپ سے کفار کے اختلافات، ظاہری اور در پردہ نفرت میں اضافہ ہوتا رہا اور اس سے بہت سے خطرات

بھی بڑھتے چلے گئے۔ آپ کے طاقتور رشتہ دار آپ کی ذات کو دشمنوں کی دستبرد سے بچاتے رہے۔ جہاں تک ایمان لانے والے دیگر افراد کا تعلق تھا آپ نے انہیں خود مشورہ دیا کہ وہ مکہ سے چلے جائیں اور سمندر پار حبشہ جا کر پناہ لے لیں۔ اس سے قریش کا غصہ مزید بڑھ گیا انہوں نے آپ کو قتل کرنے کے لئے باہمی مشاورت کی اور اس کے لیے حلف اٹھایا اور با قاعدہ منصوبہ بندی کر لی۔ ابو طالب اور (حضرت) خدیجہ کے انتقال کی وجہ سے ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں تھی۔ لہٰذا وہ آپ کو اب کسی قیمت پر چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔

(حضرت) محمد کے لیے حالات بہت مخدوش اور اندوہناک ہو چکے تھے۔ آپ کو غاروں میں پناہ لینا پڑی۔ بھیس بدل کر رہنا پڑا۔ کچھ عرصہ کبھی ایک جگہ اور کبھی دوسری جگہ جا کر رہنا پڑا۔ کیونکہ جان ہر وقت خطرے میں رہتی تھی۔ بعض اوقات تو بچنے کی کوئی امید نہ رہتی تھی۔ اور کئی ایسے مواقع پیش آئے جب آپ بالکل بال بال بچے۔ کبھی دشمن کا گھوڑا بدک گیا یا مشتعل ہو گیا تو کبھی دشمن آپ پر وار کرنے کے قابل نہ رہا۔ یا کرشمۂ قدرت کی وجہ سے کوئی اور واقعہ رونما ہو جاتا رہا۔ اگر دشمن اس میں کامیاب ہو جاتا تو کیا آپ کی ذات اور آپ کی تعلیمات کا وہیں خاتمہ نہ ہو جاتا؟ دنیا کو خبر ہی نہ ہوتی کہ وہ کس چیز سے مستفید ہونے سے محروم رہ گئی ہے؟ مگر (حضرت) محمد کو پیغمبر مبعوث فرمانے والے کی تدبیر ان کی تدبیروں سے زیادہ قوی تھی۔

نبوّت کے تیرہویں سال دشمنوں نے ایک اور تدبیر اختیار کی وہ یہ تھی کہ ہر قبیلے سے ایک ایک شخص کو منتخب کر کے چالیس افراد پر مشتمل ایک گروہ تیار کیا جس نے آپ کو قتل کرنے کی قسم کھائی اور آپ کی گھات میں رہنے لگا۔ صورت حال اتنی خراب دیکھ کر آپ نے یثرب جانے کا فیصلہ کر لیا جہاں کچھ لوگ مسلمان ہو چکے تھے اور دعوت پھیلانے کے لئے بھی وہ مقام زیادہ سازگار تھا۔ اسے آج کل مدینہ یا مدینۃ الرسول کہا جاتا ہے۔ یہ مکہ سے 320 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور راستے میں کوہ و بیابان حائل ہیں۔ سوچئے کہ آپ کی طبیعت کا اس وقت کیا عالم ہو گا۔ آپ بہ ہزار دِقت و پریشانی مدینہ پہنچے۔ اہل مدینہ نے آپ کا پُر جوش خیر مقدم کیا۔ اسلامی کیلنڈر کا آغاز اسی واقعۂ ہجرت سے ہوتا ہے۔ پہلا سن ہجری 622 عیسوی شمار کیا جاتا ہے۔ اس وقت آپ 53 سال کے ہو چکے تھے اور پیرانہ سالی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ آپ کے ہمدرد اور

دوست ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ آپ کا راستہ مہیب اور پُر خطر تھا سوائے اس کے کہ آپ کا قلب ایمان کی روشنی سے منور تھا ظاہری طور پر صورت حال بہت حوصلہ شکن اور غم آلود تھی۔ ایسی حالت میں سب انسانوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ اب تک آپ نے اپنے دین کی اشاعت صرف ترغیب اور تلقین کے ذریعہ کی تھی لیکن ظالم دشمنوں نے آپ کو بے رحمی کے ساتھ گھر بار اور وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ نہ صرف یہ کہ اس پیغام ایزدی سے لاپرواہی اور بے اعتنائی کی بلکہ جان کے بھی درپے ہو گئے تو صحرا کے اس پُر عزم فرزند نے اپنے دفاع کا اسی طرح عزم کر لیا جو ایک انسان اور ایک عرب باشندے کی شایان شان تھا۔ آپ نے دل میں کہا ''اگر قریش اسی پر تلے ہوئے ہیں تو پھر ایسا ہی سہی۔ یہ لوگ اس پیغام کو سننے پر تیار نہیں جو ان کے اور تمام نوع انسان کے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے اور چاہتے ہیں کہ اسے جبر و تشدد اور قتل و غارت کی قوت کے ذریعہ دبا دیں۔ اچھا تو انہیں شمشیر آزمائی بھی کر لینے دو'' اس کے بعد آپ کو دس برس اور ملے جو سخت جنگ و جدل اور جانگسل جدوجہد میں صرف ہوئے۔ اس کشمکش کا جو نتیجہ نکلا وہ آج ہمارے پیش نظر ہے۔ میں اس کا مختصر جائزہ لوں گا۔

☆......☆......☆

(حضرت) محمد کے تلوار کے ذریعہ اسلام ''پھیلانے'' پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسائیت کے پیروکاروں کے لئے یہ امر باعث فخر ہے کہ ان کا مذہب امن و سکون اور تعلیم و تلقین کے ذریعہ پھیلا تھا لیکن اگر ہم کسی مذہب کی صداقت یا عدم صداقت کا معیار اسی کو بنا لیں تو یہ ایک سنگین غلطی ہوگی۔ اسلام کے لئے تلوار بے شک استعمال ہوئی تھی مگر سوال یہ ہے کہ یہ تلوار آئی کہاں سے تھی؟ پہل کس نے کی تھی؟؟

ہر نیا خیال یا نظریہ ابتدا میں ایک ہی شخص کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں جاگزیں رہتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ دنیا کا واحد شخص ہوتا ہے کہ جس کے پاس وہ نظریہ، خیال یا پیغام موجود ہوتا ہے۔ اگر وہ اسے تلوار ہی کے ذریعہ پھیلانا چاہے تو اسے شاید ہی کامیابی نصیب ہو سکے۔ کیونکہ ایسا کرنے کے لئے اسے اتنی تعداد میں تلواریں فراہم کرنا پڑیں گی۔ ایک لحاظ سے تو ہمیں اپنے مذہب عیسوی کا دامن بھی خون کے دھبوں سے پاک نظر نہیں آتا۔ جب اس کے ہاتھ میں

تلوار آئی تو استعمال بھی ہوئی۔

شہنشاہ فرانس شار لیمان (CHARLEMANGNE) (742-814ء) کے دور میں سکسینیوں (SAXONS) کے مذہب کی تبدیلی تبلیغ کا نتیجہ نہیں تھی۔ (جرمن باشندوں کا تین سال خون بہایا جاتا رہا تھا) اس لیے "بزور شمشیر والا" اعتراض میری رائے میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ میرے نزدیک اس دنیا میں ہر شخص کو جدوجہد کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ وہ ہر چند تبلیغ کرے، بحث میں الجھے، زبان استعمال کرے یا تلوار بالآخر وہ کسی ایسی چیز پر غالب نہ آسکے گا جو مغلوب ہونے کی مستحق نہ ہو۔ جو چیز اس سے بہتر ہے وہ اسے ہرگز مغلوب نہیں کر سکے گا۔ تاہم جو چیز اس سے کم تر ہے اس پر وہ ضرور قابو پالے گا۔ اس عظیم کشمکش اور مبارزت عظمیٰ میں فیصلہ کن کردار خود قدرت ادا کرتی ہے۔ جو کبھی غلطی نہیں کرتی۔ اور بالآخر وہی چیز فتح مند ہو گی جو فطرت سے سب سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ اسے ہم صادق ترین (TRUEST) حقیقت قرار دے سکتے ہیں۔

(حضرت) محمد اور ان کی کامیابیوں پر غور کرتے ہوئے آپ کو فطرت کی کارفرمائیوں کو ذہن نشین رکھنا چاہیے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ فطرت میں گہرائی، حکمت و انصاف، تحمل اور صداقت کے تمام عناصر موجود ہوتے ہیں۔ جن کی بنا پر فطرت کبھی ناانصافی نہیں کرتی۔ آپ زمین کے آغوش میں گندم کے دانے بودیں۔ ساتھ کچھ بھوسہ اور کوڑا کرکٹ بھی اس میں شامل کر دیں لیکن مادر گیتی صرف گندم ہی اگائے گی۔ کوڑا کرکٹ بھی زمین، کسی استعمال میں لے آئے گی، اس کے وجود کو تبدیل کر دے گی لیکن گندم اوپر ہی لہلہاتی نظر آئے گی۔ اصل چیز محفوظ رہے گی نقل مفقود ہو جائے گی۔ یہ زمین سچائیوں کی محافظ ہے، ابتداء سے اس کا یہی دستور رہا ہے۔ کیا تاریخ انسانی سے ہمیں یہی سبق نہیں ملتا؟ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فروعات ختم ہو جاتی ہیں لیکن حق و صداقت کی روح کبھی فنا نہیں ہوتی۔ سوال یہ نہیں کہ بھس کم ہے یا زیادہ؟ سوال یہ ہے کہ آیا گندم کا کوئی دانہ موجود ہے؟ اگر ہے تو اسے اگا دیا جائے گا۔ بھس خالص بھی ہو سکتا ہے لیکن وہ قائم دائم نہیں رہ سکتا۔ مادر فطرت کا ہر جگہ یہی حال ہے۔ وہ صادق ہے اور اپنی صداقت کے اظہار میں نجابت، انصاف اور مادرانہ شفقت سے کام لیتی ہے ہر چیز میں اصلیت

تلاش کرتی ہے۔ اگر وہ اصلی ہوئی تو اس کی حفاظت کرتی ہے ورنہ نہیں کرتی۔ اب تک اس نے جتنی چیزوں کی حفاظت کی ہے ان سب میں صداقت کی ایک روح ضرور پائی جاتی ہے۔

(حضرت) محمد کے دین کو ہم ایک طرح کی عیسائیت کہہ سکتے ہیں۔ دنیا نے جس والہانہ انداز میں اسے قبول کیا، اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام، شام کے ان مہمل فرقوں سے بہتر تھا جو اقانیم ثلاثہ (HOMOIOUSION اور HOMOOUSION) کی لا حاصل بحث میں الجھے رہتے تھے۔ یعنی ''خدا'' اور ''بیٹا'' ایک ہی جوہر سے بنے ہوئے ہیں یا ان میں سے ہر ایک کا جوہر دوسرے کے جوہر سے مختلف ہے؟ اس بحث میں مذہب کے نام پر شور و غوغا برپا رہتا تھا۔ ایسے مناظروں میں جیتنے والے بھی ہارے ہوئے تھے کیونکہ سب کے سب حقیقت کی روشنی سے محروم تھے۔ اسلام کی صداقت بھی بعض غلط اور باطل عقائد میں الجھ گئی ہے لیکن اس پر اس کی صداقت کی وجہ سے ایمان لایا جاتا ہے، نہ کہ اس میں باطل کی آمیزش کی وجہ سے۔ اسلام محض بے جان اور بے نتیجہ منطقی گورکھ دھندا نہیں۔ مادرِ صحرا کے اس اُمی فرزند محمد (ﷺ) نے اپنے پُر خلوص اور روشن ضمیر کے ذریعہ جو زندگی اور موت کی طرح کی صداقت سے معمور تھا اور اپنی نگاہِ حقیقت بیں کی بدولت، معرفتِ الٰہی حاصل کر لی۔ آپ نے عربوں کی لا یعنی بت پرستی، یونانیوں اور یہودیوں کے مذہبی مناظروں، قدیم روایات، رسم و رواج اور فضول کج بحثیوں میں سے اصل حقیقت کو پالیا۔ اور فرمایا:

''بت پرستی فضول حرکت ہے۔ ان لکڑی کے بتوں کو تم تیل اور موم لگاتے ہو جس کی وجہ سے انہیں مکھیاں چمٹی رہتی ہیں، یہ محض لکڑی کے ٹکڑے ہیں، یہ کوئی نفع نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ عین جاہلیت ہے۔ یہ پوچ اور مہمل حرکت ہے، شرک اور کفر ہے۔ اگر تم ان کی حقیقت سمجھ سکو تو ان کا وجود تمہارے لئے نفرت انگیز ہو جائے گا۔ خدا ایک ہے۔ اسی کی ذات کو قوت اور اقتدار حاصل ہے۔ اس نے ہمیں پیدا کیا، وہی ہمیں مار اور جلا سکتا ہے، اللہ اکبر، اللہ بہت بڑا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ تمہارے حق میں وہی بہتر ہے جو وہ چاہے خواہ تمہارے نفس کو وہ کتنا ہی گراں گزرے۔''

اگر اس پیغام کو عرب کے بت پرست وحشیوں نے قبول کر لیا اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے اسے اپنے گرم سینوں میں جگہ دی تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میرے نزدیک وہ اسی طرح

قبول کئے جانے کے قابل تھا۔ یہ پیغام آج بھی کسی نہ کسی شکل میں ایک موثر اور جاندار پیغام ہے جسے ہر شخص کو قبول کرنا چاہئے۔ اس سے انسان اس ''معبد عالم'' (TEMPLE OF WORLD) کا صدر نشین بن جاتا ہے، خالق کائنات کی مرضی سے ہم آہنگی اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے احکامات کی احمقانہ مخالفت کرنے کی بجائے ان کے ساتھ اشتراک عمل کرنے لگتا ہے۔ آج تک مجھے فرض شناسی اور عبودیت کی اس سے بہتر تعریف (DEFINITION) معلوم نہیں ہو سکی۔ تمام نیکیاں، مقصدِ تخلیقِ کائنات کا ساتھ دینے میں مضمر ہیں۔ اسی سے انسان کو حقیقی کامیابی حاصل ہوتی ہے اور وہ صراط مستقیم پر رہتا ہے۔ عقیدۂ تثلیت میں ذات اور صفات کی بحثیں خواہ کتنے ہی زور و شور سے جاری رہیں لیکن ان کا اگر کوئی مدعا و مطلب نہیں تو سب بے کار ہے۔ غور طلب امر یہ نہیں کہ ان نظریوں اور منطقی مسئلوں کو الفاظ کا صحیح جامہ پہنایا گیا ہے یا غلط، بلکہ یہ ہے کہ بنی آدم انہیں اپنے دل میں جگہ دینے کو تیار ہیں یا نہیں؟ اسلام نے ان تمام مہمل مذہبی قوتوں کو ملیا میٹ کر دیا ہے اور میری رائے میں اس کو اس کا حق حاصل تھا۔ وہ سراپا حقیقت تھا جو خاص سینۂ فطرت سے از سر نو نمودار ہوا، عربوں کی بت پرستی اور شامیوں کے عقائد غرضیکہ ہر اس مذہب کو جو صداقت پر استوار نہ تھا، اس کے سامنے جھکنا پڑا۔ یہ مذاہب ایندھن کی لکڑی کی طرح شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ اسلام کی آتشِ صداقت نے انہیں جلا کر خاکستر کر دیا۔[1]

اسی جدوجہد اور جنگ و جدل میں خصوصاً واقعۂ ہجرت کے بعد محمد نے وقفوں وقفوں سے، وہ کتاب مقدس، جسے قرآن مجید کہا جاتا ہے ''لکھوانا'' شروع کر دی۔ اس کے معنی، ایسی چیز ہے جو بار بار پڑھی جاتی ہے۔ آپ اور آپ کے اصحابؓ نے اسے بڑی اہمیت دی اور پوری دنیا کے سامنے معجزے کے طور پر پیش کیا۔ مسلمان قرآن مجید کی اتنی تعظیم کرتے ہیں کہ شاید ہی کوئی عیسائی اپنی مذہبی کتاب، انجیل کا اتنا احترام کرتا ہو۔ اسے ہر جگہ تمام قوانین اور اعمال کا معیار قرار دیا گیا ہے اور خیالات و اعمال کے لئے ہدایت سمجھا گیا ہے۔ اسے خدا کا وہ خاص پیغام کہا جاتا ہے جس پر پوری دنیا کو عمل کرنا چاہئے۔ اسلامی عدالتیں اسی کتاب کے مطابق فیصلے صادر کرتی ہیں، ہر مسلمان اس کی تعلیم حاصل کرنا اور اسے مقصد زندگی بنانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ مساجد میں روزانہ اس کی تلاوت کی جاتی ہے، تیس تیس افراد کی ایک ایک جماعت باری باری اس کا ورد

کرتی ہے۔ بارہ سو سال سے اس کے الفاظ دنیا کے ایوانوں میں گونج رہے ہیں۔ اس صحیفہ کی آواز کروڑوں انسانوں کے دل و دماغ میں رچی بسی ہوئی ہے۔ بعض ایسے علماء کا حال سننے میں آیا ہے جنہوں نے اپنی عمر میں اس کو ستر (70) ہزار مرتبہ ختم کیا ہے۔

☆......☆......☆

میں نے مسٹر سیل کا ترجمہ قرآن پڑھا ہے۔ اس کو (ترجمہ کے ذریعہ) پڑھنا جان جوکھوں کا کام ہے، ایک ایک بات کو بیس بیس مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ یہ نہایت "خشک اور بے جان" تحریر ہے، چونکہ اس کو پڑھنا ضروری تھا، اس لیے پڑھ لیا، ورنہ ناممکن تھا۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن بے ربط حالت میں درختوں کی چھالوں اور جانوروں کی کھالوں اور ہڈیوں پر لکھا ہوا موجود تھا۔ اس حالت سے جب اسے کتاب کی صورت میں جمع کیا گیا تو طویل ابواب (سورتیں) پہلے رکھے گئے اور چھوٹے ابواب آخر میں رکھے گئے۔ حالانکہ نزول کے اعتبار سے آخر کے حصے شروع میں آنا چاہئیں تھے۔ تاہم میں نے سنا ہے کہ قرآنی الفاظ میں نغمے اور سنگیت کی سی مٹھاس ہے۔ یہ اہم نکتہ ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ترجمہ کرنے میں قرآن کا یہ وصف اوجھل ہو گیا ہو (کارلائل نے اس ترجمے کے نقص اور کمزوریوں کی بجا نشاندہی کی ہے۔ جہاں تک قرآن کے اعجاز بیان اس کی معنوی اور صوری خوبیوں کا تعلق ہے ان کا اعتراف اس کے ابتدائی مخاطب عربوں نے بھی برملا کیا تھا، اس کی فصاحت و بلاغت سے مرعوب ہو کر مخالفین نے حضور (ﷺ) کو شاعر اور ساحر تک کہہ دیا تھا...... مترجم) بایں ہمہ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عربوں کو قرآن سے والہانہ لگاؤ کیوں ہے؟ قرآن کو پڑھ کر جب آپ اس کی یکسانیت کے احساس پر قابو پا لیتے ہیں تو آپ کو اس کی خوبیاں محسوس ہونے لگتی ہیں۔ یہ خوبیاں ادیبانہ چاشنی سے مختلف ہیں۔ اس کی ادبی لطافت نہیں بلکہ کچھ اور ہی چیز ہے جو دل کو موہ لیتی ہے۔ سچی بات خود بخود دلوں میں گھر کر لیتی ہے۔ قرآن کی پہلی خصوصیت اس کی اصلیت اور صداقت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پریڈیو (PRIDEAUX) وغیرہ نے اسے شعبدہ بازیوں کا ایک ایسا مجموعہ قرار دیا ہے جس میں "مصنف" کی پیہم خطاؤں کی توجیہ د تاویل اور آرزوؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ایسی الزام تراشی کو مسترد کر دیں۔ میرے نزدیک یہ تہمت لگانا کہ وہ اکثر یا کبھی کبھی

جان بوجھ کر فریب کر جاتے تھے بالکل صحیح نہیں ہے۔ چہ جائیکہ یہ کہنا کہ مکروہ فریب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔۔ میں ایسی باتوں کو بالکل غلط قرار دیتا ہوں۔ ہر غیر متعصب شخص قرآن کو بالکل دوسری نظر سے دیکھے گا۔ یہ، ایک ان پڑھ (امی) لیکن انتہائی مخلص انسان کی آواز ہے جو شدتِ جذبات میں اپنا مدعا بیان کر رہا ہے۔ (حضرت) محمد کی تحریکی زندگی سخت آزمائش اور جنگ و جدل میں گزری ہے وہ ناساعد حالات میں گھرے ہوئے ایک انسان تھے جو دنیاوی زندگی اور نجاتِ آخرت کے متعلق لوگوں کو خبردار کر رہے تھے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ ان کا انداز بیان کیا ہوگا۔ کہیں تو انداز بیان کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے اور کہیں معانی الفاظ میں گم ہو گئے ہیں۔

(کارلائل کو جو ترجمۂ قرآن میسر آیا اس رائے میں اس کا دخل بھی ہو سکتا ہے......مترجم)

محمد کی ذاتی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ ان کا تیئس سالہ دور انتہائی کشمکش میں گزرا، قریش کے ساتھ جنگیں، اندرونی خلفشار اور سازشوں کے پھیلے ہوئے جال تھے۔ وہ چومکھی لڑائی کی حالت میں تھے۔ حالات نے انہیں کبھی چین نہیں لینے دیا۔ جب کبھی انہوں نے کوئی فیصلہ کیا تو ان کو ''الہام'' محسوس ہوا جو جبرائیل کے ذریعہ موصول ہوا، آپ کہتے ہیں کہ یہ سب فراڈ اور جعلسازی تھا۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا بالکل نہیں۔ یہ آگ کی بھٹی کی طرح تپتا ہوا ذہن کسی جعل ساز کا ذہن نہ تھا۔ محمد کی زندگی ایک بہت بڑی سچائی اور بہت بڑی حقیقت تھی۔ یہ کائنات پر محیط سچائی تھی، ان سے ''غلطیاں'' بھی ہوئی ہیں کیونکہ وہ ایک بدویانہ ماحول سے گھرے ہوئے تھے۔ ہمارے جو لوگ اس پیغام کو نقالی، دھوکہ اور دوسری آسمانی کتابوں میں سے مضامین کی چوری قرار دیتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ انہوں نے حالات اور واقعات کا بالکل غلط اندازہ لگایا ہے۔

جہاں تک میرا اندازہ ہے قرآن کا بنیادی نکتہ اس کا خلوص اور انسانوں کی خیر خواہی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کو عرب قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے بہر حال کوئی بھی کتاب ہو اس کا بنیادی وصف خلوص ہی ہو سکتا ہے۔ اسی خلوص کے بطن سے اس کتاب کی خوبیوں کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ سوائے خلوص کے اور کوئی خوبی کسی کتاب کا بنیادی وصف نہیں بن سکتی۔ اس کتاب کو آپ پڑھ جائیں آپ کو اس میں کائنات کی حقیقت صاف صاف نظر آتی محسوس ہو

گی، بالکل شاعری کی طرح۔قرآن میں زیادہ تر اگلے پیغمبروں کے قصے بیان کیے گئے ہیں کہ کس طرح یکے بعد دیگرے مختلف قبائل کی طرف مختلف نبی آتے رہے ہیں۔ (حضرت) ابراہیم(علیہ السلام) (حضرت) ہود (علیہ السلام)، (حضرت) موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء اپنے اپنے زمانہ میں لوگوں کو ان گناہوں سے خبردار کرتے رہے اور لوگ کس کس طرح ان عظیم نبیوں کو ستاتے رہے،(حضرت) محمد کے لئے یہ بات ایک لحاظ سے (باعثِ اطمینان تھی کیونکہ یہ کچھ ان کی قوم بھی ان کے ساتھ کر رہی تھی۔ یہ بات قرآن میں بار بار دہرائی گئی ہے۔حتیٰ کہ پڑھنے والا اس سے اکتا جاتا ہے۔(جس ترجمہ سے کارلائل نے یہ تاثر لیا ہے اس میں غالباً اس کلام کا یہ پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہو گا کہ ہر واقعہ کو قرآن میں نئے اور اچھوتے انداز میں نہایت مناسب سیاق و سباق میں دہرایا گیا ہے......مترجم) لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انہی آیات میں جابجا چونکا دینے والے حقائق بیان ہوئے ہیں جن میں محمد کی شخصیت بطور نبی واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قرآن میں ایسی تجلیات بھی ملتی ہیں جو ایک حقیقی مفکر و مدبّر کے شایانِ شان ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ آپ اس کائنات کی حقیقت سے واقف تھے۔اسی لئے آپ صاف اور سلیس پیرائے میں ہمارے قلب کو بھی اس رمز سے آشنا کر دیتے ہیں جس سے آپ کا ضمیر منوّر تھا۔آپ نے قادرِ مطلق کی جو تعریفیں کی ہیں پوری دنیا ان کی مدّاح ہے لیکن میں انہیں اس لیے اہمیت نہیں دیتا کہ میرے خیال میں عبرانی میں خدا کی تعریفیں اس سے بہتر پیرائے میں لکھی ہوئی موجود ہیں، جو قلبِ اشیا تک جا پہنچتی ہیں۔ یہ قدرت کا عطیۂ خاص ہے جو وہ تمام انسانوں کو عطا کرتی ہے لیکن جس کی قدر کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔اسی کو میں صحتِ نظر سے تعبیر کرتا ہوں اور یہی میرے نزدیک قلبِ صادق کی پہچان ہے۔

آپ سے معجزات صادر نہیں ہوئے جس پر آپ نے بلا تامل کہہ دیا۔"میں معجزے نہیں کر سکتا، میں داعیٔ حق ہوں، میرا کام صرف حق کو تمام مخلوق تک پہنچانا ہے" اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدا سے آپ کے نزدیک یہ کائنات خود ایک معجزۂ عظیم تھی۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔"اس زمین کو دیکھو جو خدا نے تمہارے لئے جائے قیام بنائی ہے۔اس میں راستے بنائے ہیں۔طرح طرح کی نعمتیں پیدا کی ہیں" قرآن میں بادلوں کا ذکر اکثر آیا ہے کیونکہ صحرائے عرب

کی پیاسی زمین کے لئے بارش بڑی نعمت ہے۔ بارش سے مردہ زمین جی اٹھتی ہے۔ ہری ہری گھاس کا مخملیں فرش بچھ جاتا ہے۔ قد آور درختوں میں کھجوروں کے خوشے لٹکتے ہیں کیا یہ چیزیں معجزہ نہیں ہیں؟ یہ مویشی، یہ خاموش کارکنان! یہ بھی خدا نے ہی پیدا کئے ہیں۔ یہ گھاس کو دودھ میں بدل دیتے ہیں۔ ان کی کھال سے تم اپنے جوتے بناتے ہو۔ شام کو یہ مویشی قطار در قطار خود بخود گھر لوٹ آتے ہیں۔ یہ تمہارے لئے عزت و شرف کا باعث ہیں۔ قرآن مجید میں بحری جہازوں کا بھی بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سمندر میں چلتے ہوئے پہاڑ محسوس ہوتے ہیں۔ ان کو ہوا دھکیلتی ہے۔ اگر اللہ تعالی ہوا بند کر دے تو یہ کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔ آپ کو اور کس قسم کے معجزات کی طلب ہے؟ کیا تمہارا اپنا وجود ایک معجزہ نہیں؟ خدا نے تمہیں مٹی سے بنایا۔ تم پہلے بہت چھوٹے تھے۔ اس سے پہلے تمہارا وجود نہیں تھا۔ اس نے تمہیں حسن اور جوانی عطا کی۔ تمہارے مابین محبت کا جذبہ رکھ دیا۔ جوانی کے بعد تم پر بڑھاپا آتا ہے پھر ضعیفی کا زمانہ آ جاتا ہے۔ بال سفید ہو جاتے ہیں اور پھر وہ وقت آ جاتا ہے کہ تمہارا وجود عدم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

★....★....★

مجھے قرآن کی اس آیت نے بہت متاثر کیا جس میں انسانوں کے مابین محبت اور مودّت کا ذکر آتا ہے۔ اگر یہ باہمی محبت پیدا نہ کی جاتی تو دنیا کا نقشہ کیا ہوتا؟ یہ آیت حقیقت کا ایسا انکشاف ہے جو انسانی ذہن میں دنیاوی ذرائع سے داخل نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں ایسی شاعرانہ بلند خیالی اور ایسی تمثیلات پائی جاتی ہیں جو براہ راست خالق حقیقی کی جانب سے وارد شدہ محسوس ہوتی ہیں۔ اور دل میں اتر جاتی ہیں۔ یہ تمام شواہد (حضرت) محمد کی گہری بصیرت، غیر اکتسابی (UNTUTORED) ذہانت اور عاقبت اندیشانہ بصارت پر دلالت کرتے ہیں۔ جنہوں نے ان کے کلام میں دنیاوی اور اُخروی رہنمائی اور ہر میدان میں درجۂ کمال کے اوصاف پیدا کر دیئے تھے۔

آپ کی آنکھ ہمیشہ دیکھتی رہتی تھی کہ دنیا بذات خود ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ سکینڈے نیویا کے باشندوں اور دیگر مفکرین کی طرح آپ کا بھی نظریہ یہی تھا کہ دنیا فانی ہے۔ اور یہ مظاہر قدرت محض خدائے عزوجل کی ہستی اور قوت کے مظہر ہیں۔ قرآن میں لکھا ہے کہ یہ پہاڑ ایک

دن ریزہ ریزہ ہو کر بادلوں کی طرح ہوا میں منتشر ہو جائیں گے اور یہ زمین خس و خاشاک کی طرح بکھر جائے گی اِدھر، اللہ نے اشارہ دیا اُدھر یہ مادہ فنا کی گھاٹی میں اتر گیا۔ محمد کی آنکھ ربِ کائنات کی حکمرانی کو ایک ناقابل بیان ہیبت و شوکت کے ساتھ ہر وقت کارفرما دیکھتی تھی۔ آج کل کے سائنس دان جس چیز کو قوانین فطرت کا نام دیتے ہیں ان کو معلوم نہیں کہ ہماری لیبارٹریوں میں بھی خالق کائنات ہی کی جلوہ فرمائی ہے۔ اگر ہم کائنات کے خالق کو ہی فراموش کر دیں تو پھر کون سی بات یاد رکھنے کے قابل رہ جائے گی؟ اگر ہم درختوں کے پھولنے پھلنے میں خدا کی قدرت کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے تو ہمارا علم نباتات و حیاتیات محض ایک خشک لکڑی کی طرح مردہ اور بیکار ہو جاتا ہے۔ انسان کسی ہستی کی پرستش کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر خدا کی پرستش نہیں کرے گا تو اندھیروں میں بھٹکنے لگے گا۔ خدا کی پرستش کے بغیر اس کا سارا علم و فضل ہیچ ہے۔

اہل اسلام کی "ہوس پرستیوں" کے متعلق آج تک بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ جو اصلیت سے بہت زیادہ کہہ یا لکھ دیا گیا ہے۔ اسے اہل مغرب نے مبالغے کی حد تک اچھالا ہے۔ ایسی باتیں جن سے ہمارے معاشرے کے لوگ بد کتے ہیں، محمد کی پیدا کردہ نہیں تھیں بلکہ عربوں میں صدیوں سے رائج چلی آ رہی تھیں۔ پیغمبر اسلام نے ان عادات اور رسم و رواج کو مختلف سمتوں سے محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ محمد کا دین آسان نہیں۔ روزے، وضو، پانچ وقت کی روزانہ نماز کے اہتمام اور ادائیگی کے سخت اور پیچیدہ قواعد، شراب سے مکمل اجتناب وغیرہ۔ یہ نہ سمجھئے کہ اسلام ایک آسان دین ہونے کی وجہ سے لوگوں میں مقبول ہو گیا۔ کوئی بھی مذہب آسانیوں اور آسائشوں کے زینوں پر چڑھ کر ترقی نہیں کرتا۔ یہ کہنا انسانیت کی توہین ہے کہ کردار کی عظمت کے مظاہر اور عہد آفریں کارنامے محض دنیاوی اور اخروی عیش و آرام کے لالچ میں انجام دیئے جاتے ہیں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ انسان میں بھی عالی ظرفی کا ایک معیار ہوتا ہے۔ کرائے کے سپاہی جو چند سکوں کی خاطر میدان جنگ میں لڑتے ہیں وہ بھی اپنی عزت نفس سے خالی نہیں ہوتے، ان سے اگر بہادری کا کوئی کارنامہ انجام پا جائے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس سپاہی نے ایک شلنگ فی یوم کی خاطر جان دے دی۔ ابن آدم کا معیار کام و دہن کی لذت نہیں بلکہ خدا کے حضور سرخروئی ہے۔ آپ کسی ادنیٰ سے انسان کو یہ راستہ دکھا دیں آپ دیکھیں

گے کہ اس کی معمولی شخصیت بھی شعلۂ جوالا بن کر چمکنے لگے گی۔ سختیاں برداشت کرنا نفس کا نہیں بلکہ دل کا معاملہ ہے۔

(حضرت) محمد کے متعلق آپ کچھ بھی کہیں لیکن آپ یہ بات قطعاً نہیں کہہ سکتے کہ وہ نفسانی خواہشات رکھتے تھے۔ اگر کوئی شخص ایسا کہتا ہے تو وہ سخت غلطی پر ہے۔ آپ نفسانی خواہشات کہتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ دنیاوی خواہشات نام کی کوئی چیز ان میں نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کے گھر کا ماحول نہایت سادہ تھا، کھانے میں جَو کی روٹی اور صرف پانی تھا۔ بعض اوقات مہینوں ان کے چولہے میں آگ تک نہیں جلتی تھی۔ مسلمانوں کو بجا طور پر فخر ہے کہ ان کے پیغمبر اپنے جوتے گانٹھ لیا کرتے اور کپڑوں کو خود پیوند لگا لیتے تھے۔ اگر محمد کا کردار بلند نہ ہوتا تو ان کی قوم ان کو اس طرح دل و جان سے نہ چاہتی۔ تیئس سال قوم سے ان کا رابطہ رہا۔ اس دوران فاقہ مستی اور مار پیٹ سے لے کر شدید جنگوں تک کی نوبت آئی۔ آپ کی قوم نے قریب سے ان کا مشاہدہ کیا۔ کوئی بات چھپی ہوئی نہ تھی۔ آپ انہی میں رہتے تھے اور انہی کے سامنے روزمرہ کے کاروبار، جوتے گانٹھنے سے لے کر سیاست دانی اور جنگ و جدال تک، ہر رنگ میں لوگوں نے ان کو دیکھا۔ کسی شہنشاہ کی اتنی عزت نہیں ہوئی جتنی گدڑی میں لپٹی ہوئی اس عظیم ہستی کو حاصل تھی، آپ کا تیئس سالہ دورِ نبوت ایک ''ہیرو'' کی تمام صفات اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔

اس عظیم پیغمبر کے آخری الفاظ، ایک دعا ہے۔ کانپتے ہونٹوں کے ساتھ بیم و رجا میں ڈوبا ہوا دل، اپنے خالق کے حضور کس طرح عجز و انکسار کا اظہار کر رہا تھا۔ محمد کے مذہب نے انہیں بگاڑا نہیں بلکہ سنوارا ہے۔ ان کی زندگی انسانی رفعت و عظمت کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی بیٹی کی وفات کے وقت آپ کے لبوں سے جو الفاظ ادا ہوئے وہ عیسائیت کے معیار کی بلندیوں کو چھوتے ہیں۔ آپ نے ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا الیہ راجعون''. پڑھا (ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے) جنگ تبوک میں ان کا ایک آزاد کردہ غلام زیدؓ فوت ہوا تو آپ نے فرمایا ''زید (ﷺ) نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اب وہ اپنے مالک کے پاس چلا گیا ہے جہاں اس کے لیے خیر ہی خیر اور برکات ہی برکات ہیں'' لیکن بعد میں زید کی بیٹی نے دیکھا کہ محمد (ﷺ) زید کی میت پر جھکے ہوئے زار و قطار رو رہے تھے۔ زیدؓ کی بیٹی نے کہا آپ ہمیں تو صبر

سا نقین کررہے تھے۔ آپ نے جواب دیا ”بیٹی! ایک دوست اپنے دوست کی موت پر آنسو بہا رہا ہے“ (حضرت زید جنگ تبوک میں نہیں جنگ موتہ میں شہید ہوئے تھے...... مترجم)۔

(حضرت) محمد اپنی وفات سے دو روز پہلے مسجد میں گئے لوگوں کو جمع کر کے کہا۔ ”میں نے کسی کو ناجائز مارا ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے لے، اگر میں کسی کا قرض دار ہوں تو بتائے تاکہ میں ادائیگی کر دوں۔“ ایک آواز آئی ”تین درہم“ جو اسی وقت آپ نے ادا کر دیئے اور فرمایا۔ ”دنیا میں شرمندگی اٹھا لینا آخرت کی رسوائی اٹھانے سے بہتر ہے“ ان باتوں پر غور کرنے سے (حضرت) محمد کی شخصیت کے تمام خدوخال نظر آ جاتے ہیں۔ یاد رکھئے محمد بھی اولاد آدم (علیہ السلام) ہیں اور ہمارے بھائی ہیں۔ ان کی ذات ہم سب کے لیے باعث عزت و شرف ہے۔

(حضرت) محمد کی جانب سے حرمتِ شراب کا اقدام مجھے بے حد پسند ہے وہ ایک پسماندہ صحرائی معاشرے کو اپنے قدموں پر کھڑا کر رہے تھے۔ ان کی شخصیت ایک کھلی کتاب تھی۔ غرور نام کی کوئی چیز ان میں نہ تھی۔ لیکن عاجزی اور فروتنی بھی نہ تھی۔ پیوند لگے کپڑوں میں وہ ایران اور روم کے بادشاہوں کو دوٹوک الفاظ میں مخاطب کر کے انہیں ان کے فرائض بتاتے ہیں۔ قبائلی ماحول میں زندگی اور موت کی کشمکش کے دوران ان کو سخت اقدامات بھی کرنا پڑے لیکن یہاں بھی انسانی ہمدردی اور بلند اخلاقی نمایاں نظر آتی ہے۔ محمد نہ تو اپنے سخت اقدامات پر شرمندہ ہیں اور نہ اپنی نوازشات اور عفو و درگزر پر نازاں۔ ان کے ہر اقدام کی اپنی ایک اہمیت تھی۔

حضور نے کسی معاملے میں سختی کی بھی تو اس کی تہہ میں آپ ایک معقولیت پائیں گے۔ جنگ تبوک کا ذکر اکثر ان کے لب پر آتا تھا۔ اس لڑائی میں کئی لوگوں نے شرکت کرنے سے گریز کیا۔ کسی نے موسم گرما کی شدت کا بہانہ بنایا تو کسی نے فصل کی کٹائی کا عذر پیش کر کے عملی شرکت سے پہلوتہی کی۔ محمد نے ان سے کہا ”تمہیں اپنی فصل کی فکر ہے۔ آخرت کی کھیتی کا کیا بنے گا۔ تم گرمی کے موسم کی سخت جان کر جہاد میں شریک نہیں ہوتے کیا دوزخ کی گرمی بھول گئے ہو“ کبھی آپ کفار کو مخاطب کر کے کہتے۔ ”تمہارے اعمال میزان میں تولے جائیں گے اور ان میں کمی بیشی نہیں کی جائے گی“ کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ مکافات عمل کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہوں اور آخرت کی ہیبت نے ان کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہو۔

"یقیناً" کا لفظ قرآن میں اکثر آیا ہے اور کئی مقامات پر ایک پورے جملے کے طور پر لکھا ہوا ہے۔ محمد کا کردار اور گفتار "یقیناً" تصنع اور بناوٹ سے پاک ہیں۔ جس دل میں ریاکاری اور بناوٹ گھر کر لے، اس میں سچائی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ایسے ریاکاروں کی سچائیوں سے تو محمد کے "جھوٹ" بھی افضل ہیں۔ میں محمد کے پیغام کو سب سے اعلیٰ پیغام کا درجہ نہیں دیتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ان کے پیغام میں ہمیشہ نیکی اور اچھائی کا عنصر نمایاں رہا۔ ان کی آواز ایسے دل کی آواز ہے جو ہمیشہ سچائیوں کا متلاشی ہو۔ یہاں (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) والا عفو نہیں پایا جاتا کہ ایک گال پر تھپڑ لگے تو دوسرا گال آگے کر دو۔ یہاں انتقام لینا جائز ہے۔ یہاں "آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک" کا اصول ہے لیکن اس سے زیادہ آگے بڑھنے کی اجازت نہیں۔ اسلام دنیا کے دوسرے بڑے ادیان کی طرح مساوات کا درس دیتا ہے۔ ایک انسان کی جان، دنیا کی ساری بادشاہتوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ عشر اور زکوٰۃ کی صرف تلقین نہیں کی جاتی بلکہ اس کی ادائیگی لازمی قرار دی گئی ہے۔ اور اس کی شرح مقرر کر دی گئی ہے۔ ہر شخص کی سالانہ آمدنی کا ایک حصہ غریبوں اور محتاجوں کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بانی اسلام کا دل رحم اور انسانیت کے جذبات سے کتنا لبریز تھا۔

محمد کا جنت اور دوزخ کا تصور "نفسانی" ہے جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو ہمارے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھئے کہ عربوں میں نفسانی خواہشات ہی کا دور دورہ تھا۔ (حضرت) محمد نے ان خواہشات کو مناسب حدود میں لانے کی کوشش کی۔ نفسانی خواہشات کو "غلو" کی حد تک پہنچانے والے محمد خود نہیں تھے بعد میں آنے والے ان کے پیروکار تھے۔ جن کی تحریروں میں یہ چیزیں ملتی ہیں ورنہ قرآن میں بہشت کی جسمانی لذتوں کا تذکرہ بہت کم ہے۔ بلکہ سب سے بڑا انعام جو بہشت میں کسی مومن کو ملے گا وہ ان کے لئے خدا تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ قرآن کہتا ہے "رب رحیم کی طرف سے تمہیں سلام کہا جائے گا" کیا روحانی درجات کا اس سے بڑھ کر کوئی تصور پیش کیا جا سکتا ہے؟ قرآن اپنے پیروکاروں کو بشارت دیتا ہے "تم جنت میں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھو گے، ایسی حالت میں کہ تمہارے دلوں میں کدورت نہ ہوگی۔"

بہشت اور دوزخ کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن میں یہاں ایک مثال پیش

کروں گا اور نتیجہ اخذ کرنا آپ پر چھوڑ دوں گا۔ یہ مثال گوئٹے کی کتاب (MEISTER'S TRAVELS) (سفرنامہ مستر) سے لی گئی ہے۔ کتاب کے ہیرو کا گزر ایک ایسی بستی سے ہوتا ہے جہاں عجیب و غریب رسم و رواج پائے جاتے ہیں۔ ان کا سربراہ حکم دیتا ہے کہ ''ہم میں سے ہر شخص اپنی کسی خواہش کا انتخاب کر کے اس خواہش کی مخالف سمت میں سعی کرے گا اور وہ کام کرے گا جسے اس کا نفس پسند نہ کرتا ہو۔ بقیہ خواہشات کی تکمیل کے لئے ہم اس کو پوری آزادی دے دیں گے''۔ مجھے یہ اصول بہت پسند آیا۔ اچھی چیزوں سے لطف اندوز ہونے میں کوئی برائی نہیں۔ انسان کو اپنا نفس قابو میں رکھنا چاہیے۔ اور جس حد تک ممکن ہو خود کو سفلی خواہشات کا تابع بنانے سے گریز کرنا چاہیے مسلمانوں کے لئے ماہ رمضان یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ اس مہینے میں خواہشات کے دیو کو زیر کرنے کی خصوصی مشق کرتے ہیں۔

(حضرت) محمد نے جنت اور جہنم کا جو تصور دیا ہے مجھے اس کے بارے میں ایک اور بات کہنی ہے۔ وہ یہ کہ یہ تصورات خواہ کتنے ہی کثیف اور مادی ہوں دائمی اور ابدی حقائق کی علامت ہیں جنہیں ہم اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں یا بھول جایا کرتے ہیں۔ جنت کی لذت بھری زندگی، خوفناک شعلہ نشاں جہنم اور قیامت کا پُر ہیبت دن جن کا (حضرت) محمد نے بہت اصرار سے ہمیں شدید احساس دلایا ہے۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا ہے؟ اس لیے کہ جن بدوؤں کے سامنے انہوں نے اپنا پیغام پیش کیا وہ ان عظیم حقائق کا واضح تصور رکھتے تھے۔ اس سے ان پر ایک سلسلۂ حقائق واضح ہونے کے عمل کا آغاز ہوا۔ اس سے ہمیں بھی ایک پیغام ملا ہے کہ ''اگر ہم نے صحیح راستہ اور حق کی راہ اختیار نہ کی، فرائض اور حقوق کی ادائیگی میں دیانتداری اور خلوص کا مظاہرہ نہ کیا، تو سزاؤں سے بچ نہیں سکیں گے''۔ انسان جو کام بھی کرتا ہے فطرت اس کا اپنے پاس ایک ریکارڈ رکھتی ہے۔ ہر شخص کے نیک اور بد اعمال اسے اس کے منطقی انجام تک پہنچائیں گے۔ اعمال صالحہ اسے اعلیٰ ترین مقام جنت کا راستہ دکھاتے ہیں جہاں دائمی خوشیاں اور لذتیں ہوں گی اور اعمال بد دوزخ کی آگ میں جھونک دیں گے۔ کیا انسان کو آخرت کا واضح تصور دلانے اور راہ راست پر رکھنے کے لئے اس سے کوئی بڑا ہتھیار یا ذریعہ موجود ہے؟

اس ارض خاکی پر انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ (حضرت) محمد نے اس سوال کا جواب

ایسے طریقے سے دیا ہے کہ اس پر ہمارے بعض مسیحی علما کو شرم آ جانی چاہئے۔ انہوں نے بینتھم (BENTHAM) اور ولیم پیلے (WILLIAM PALEY) کی طرح نیکی اور بدی، نفع و نقصان کے تصورات کی جمع و تفریق کا حساب نہیں لگایا۔ انہوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ نیکی ہر حالت میں کرنے کا کام ہے اور بدی سے، بہر صورت اجتناب کرنے کی ضرورت ہے۔ نیکی دائمی زندگی کا پیغام ہے۔ اور بدی دائمی موت اور برے انجام کا۔ ان دونوں میں محض اچھے اور برے کا فرق نہیں بلکہ جنت اور دوزخ کا فرق ہے۔ تم انہیں ناپ نہیں سکتے۔ کیونکہ ان میں کوئی مشترک پیمانہ نہیں۔ ایک، انسان کے حق میں ابدی حیات ہے اور دوسری دوامی موت ہے۔ بینتھم کا نظریہ افادیت (UTILITARIANISM) یعنی نفع و نقصان کو نیکی کا معیار قرار دینا، خدا کی اس وسیع کائنات کو آکہٗ بے جان بنا دینا اور انسان کی علوی روح (INFINITE CELESTIAL SOUL) کو خس و خاشاک اور خوشی و غمی کا پیمانہ بنا دینا، ہے۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ انسان اور اس کے انجام کا غلط تر اور فروتر نظریہ کس نے پیش کیا؟ انسان اور کائنات کے تصور میں ٹھوکر کس نے کھائی؟ محمد نے یا ان لوگوں نے؟" میں کہوں گا کہ ٹھوکر ان لوگوں نے کھائی ہے، محمد نے نہیں۔"

میں پھر یہی کہوں گا کہ بحیثیت مجموعی "اسلام" ایک طرح کی "عیسائیت" ہے۔ اس میں اعلیٰ ترین روحانیت کے وہ تمام عناصر موجود ہیں جنہیں عیسائیت کی کمزوریاں چھپا نہیں سکتیں۔ اہل سیکنڈے نیویا کا خدائے آرزو (GOD OF WISH) جو تمام غیر مہذب لوگوں کا "خدا" ہے اور جو ان کی تمام خواہشوں کو پورا کرنے والا ہے (حضرت) محمد نے اس کے انعامات کے تصور کو بہشت کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ لیکن یہ بہشت صرف ایمان و اعتقاد، اعمال صالحہ، نیک کردار اور صبر و تحمل کی بدولت حاصل کی جا سکتی ہے۔ سیکنڈے نیویا میں قبل از عیسائیت نیکی اور اس کے اجر کا جو تصور تھا، اسلام نے اس میں حقیقی روحانیت کے عنصر کا اضافہ کر دیا ہے۔ اسے جھوٹا مذہب نہ کہئے، اس کے کھاتے میں آپ جو غلطیاں ڈالتے ہیں، اس سے باز رہئے، اس کی سچائیوں پر نظر ڈالئے۔ بارہ صدیوں سے یہ، دنیا بھر کی کل آبادی کے پانچویں حصہ پر مشتمل انسانوں کا مذہب اور ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنا ہوا ہے، جس پر وہ دل و جان سے فدا

ہیں اور اس پر عمل کرنا سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔اس دور میں مسلمانوں کے برابر اور ان کی طرح عیسائیوں میں سے اگر کوئی فرقہ عمل کرتا ہے تو وہ غالباً صرف پیوریٹنز (PURITANS) ہیں،اور کوئی بھی نہیں ہے۔

آپ کسی رات قاہرہ (مصر) کی کسی سڑک پر نکل جائیے، جب چوکیدار اندھیرے میں کسی کو پکارتا ہے تو اسے جواب ملتا ہے "لا الہ الا اللہ واللہ اکبر"۔ یہ الفاظ آپ کی روح اور جسم میں سرایت کر جائیں گے۔ اسلام کے پُر جوش مبلغین، آج بھی ملایا سے پپوانیوگنی کے سیاہ فاموں اور بت پرست وحشی قبائلی علاقوں تک اسلام کا یہی حیات بخش پیغام پھیلانے میں مصروف نظر آتے ہیں اور دیگر مذاہب پر غلبہ پا رہے ہیں جو ان سے ہرگز بہتر نہیں۔

عرب قوم کے لئے اسلام، اندھیروں سے اجالے کی طرف پیش قدمی کا پیغام تھا، اسی نے اہل عرب کو اصلی زندگی عطا کی۔ یہ غریب چرواہوں کی قوم تھی، جو مدت مدید سے صحراؤں میں آوارہ گردی کر رہی تھی، گمنام تھی جسے کوئی پوچھنے والا اور جس پر کوئی توجہ دینے والا نہ تھا، ایک عظیم پیغمبران کے پاس ایک ایسا پیغام لے کر آیا جو ان کی فہم سے مطابقت رکھتا تھا۔اس پر ایمان لانے کے بعد گمنامی کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے انسان، یک دم دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ یہ چھوٹی قوم دنیا بھر کی بڑی قوم میں ڈھل گئی۔ایک صدی کے اندر اندر عرب، ایک طرف غرناطہ اور دوسری جانب دہلی تک دستک دینے لگے۔ دنیا پر ان کی شجاعت و ذہانت کی دھاک بیٹھ گئی۔ عرب سے نکلنے والی روشنی نے پورے عالم کو منور کر دیا جو ایک حیات بخش پیغام عقیدے اور عمل کا نام ہے۔عرب قوم، (حضرت) محمد اور ایک صدی کا عرصہ، کیا یہ آسمان سے نازل ہونے والی ایک چنگاری نہ تھی؟ کہ جس نے سیاہ اور مہیب ریت کے ڈھیر پر گر کر اسے دھماکہ خیز بارود بنا دیا اور جو دہلی سے غرناطہ تک کے آسمان کو منور کر گیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ عظیم انسان ہمیشہ ایک برقِ آسمانی ہوتا ہے جو دنیا بھر کے دیگر انسانوں کو اپنی آمد کے منتظر پاتا ہے اور وہ انہیں اپنے ساتھ ملا کر ایک شعلۂ جوالا بن جاتا ہے۔

مائیکل ہارٹ کی تصنیف میں ذکر رسولؐ

ممتاز امریکی ادیب و مصنف مائیکل ہارٹ نے عالمی عہد ساز شخصیات پر ایک کتاب THE 100 THE MOST INFULUENTIAL PERSONS IN HISTORY" لکھی ہے جس میں تاریخ عالم پر اثر انداز ہونے والی اہم ترین شخصیات کے کارناموں کو یکجا کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے ان عہد ساز شخصیتوں میں حضرت محمد کو سرفہرست رکھا ہے اور ایسا کرنے کی وجوہ بھی لکھی ہیں۔

ان شخصیات کا تعلق 600 سال قبل مسیح سے لے کر 20 ویں صدی تک ہے۔

زمانہ کے لحاظ سے ان کی فہرست یوں بنائی گئی ہے

عہد (زمانہ)	تعداد
600 سال قبل مسیح کی شخصیات	3
600ق۔م سے 201 ق۔م تک	13
200 ق۔م سے 1400 عیسوی تک	16
15 ویں صدی کی شخصیات	4
16 ویں صدی کی شخصیات	8
17 ویں صدی کی شخصیات	10
18 ویں صدی کی شخصیات	12
19 ویں صدی کی شخصیات	19
20 ویں صدی کی شخصیات	15
	100

کارناموں کی نوعیت کے اعتبار سے

شعبہ جات	شخصیات کی تعداد
سائنس داں و موجد	37
سیاسی اور فوجی شخصیات	30
سیکولر فلاسفر	14
مذہبی لیڈر	11
فن و ادب	6
مہم جو اور معرکہ آرا شخصیات	2
	100

تاریخی شخصیات کا خطہ وار تعلق

خطہ اور علاقہ	تعداد
برطانیہ	18
جرمنی و آسٹریا	15
فرانس	10
اٹلی	8
یونان	5
سپین	4
روس	3
باقیماندہ یورپ	8
امریکہ (یو۔ایس۔اے)	7
جنوبی امریکہ	1
افریقہ	3
چین	7

انڈیا	3
منگولیا	1
مغربی ایشیا	7
	100

نوٹ: خطے کے اعتبار سے ان میں یوکلڈ (ماہر اقلیدس)، ہومر، ارسطو اور سکندر اعظم کا تعلق یونان سے تھا۔ جوزف سٹالین کا روس سے۔ الیگزنڈر گراہم بیل کا برطانیہ اور امریکہ، دونوں سے تھا۔

فاضل مصنف نے سرور کائنات (ﷺ) کو ان عہد ساز، انقلاب انگیز اور معرکہ آرا شخصیات میں سرفہرست رکھنے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انقلابات رونما ہوئے یا حالات کا رخ موڑنے والے واقعات برپا ہوئے ان کا وقوع پذیر ہونا یا انجام پانا...... ناگزیر ہو چکا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اگر مارکونی ریڈیو ایجاد نہ کرتا تو آئندہ چند سالوں کے اندر کوئی دوسرا شخص یہ کارنامہ انجام دے سکتا تھا۔ سپین کا برنانڈو کورٹیز، اگر منظر پر نہ ابھرتا، تب بھی سپین، میکسیکو پر قبضہ کر لیتا۔ ماہر حیاتیات چارلس ڈارون سائنسی تحقیق و جستجو نہ کرتا تب بھی نظریۂ ارتقا چند سالوں میں دنیا کے علم میں آجاتا۔ لیکن حضرت محمد ان شخصیات میں سے ہیں کہ جو کارنامے انہوں نے انجام دیئے وہ کسی اور کے ہاتھ سے کبھی انجام نہ پا سکتے تھے۔

عظیم کارناموں اور تاریخ کے نئے ابواب رقم کرنے والوں میں آنحضرت (ﷺ) کو سرفہرست رکھنے کے بعد فاضل مصنف نے خود عیسائیت سے تعلق رکھنے کے باوجود حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا تیسرے نمبر پر ذکر کیا ہے۔ حضرت موسیٰ کا 16 ویں،۔ ارسطو کا 14 ویں اور مصلح عیسائیت مارٹن لوتھر کا 23 ویں نمبر پر ذکر کیا ہے۔ سکندر اعظم کا 33 ویں، نپولین بونا پارٹ کا 34 ویں، بابائے علم اقتصادیات ایڈم سمتھ کا 37 ویں، ممتاز موجد تھامس ایڈیسن کا 38 ویں، افلاطون کا 40 ویں، آلیور کرامویل کا 47 ویں، جوزف سٹالین کا 63 ویں، جولیس سیزر کا 65 ویں، ولیم (فاتح) کا 69 ویں، جرمن فلاسفر مانی کا 83 ویں، واسکوڈے گاما کا 84 ویں، سائرس دی گریٹ (ذوالقرنین) کا 86 ویں، شہرہ آفاق قانون دان اور منصف جسٹنین اول کا 96 ویں نمبر پر ذکر کیا گیا ہے۔

چنانچہ حضرت محمد کے حالات زندگی قلمبند کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:۔

مائیکل ہارٹ

پیغمبر اسلام......ایک عہد ساز شخصیت

میں نے دنیا کی عظیم شخصیات پر قلم اٹھانے کا تہیہ کیا تو سب سے اہم مسئلہ یہ سامنے آیا کہ میں آغاز کہاں سے کروں اور کس شخصیت کو سر فہرست رکھوں اور کیوں؟ چنانچہ میں نے (حضرت) محمد (ﷺ) کے تذکرہ سے اس تصنیف کا آغاز کیا۔ ممکن ہے کہ میرے احباب کو اس پر حیرت ہو اور کچھ کو اعتراض بھی ہو۔ لیکن ان پر یہ حقیقت واضح رہنی چاہئے کہ (حضرت) محمد تاریخ عالم میں واحد ہستی ہیں جو مذہبی اور دنیاوی، دونوں محاذوں پر کامیاب و کامران رہے۔ انہوں نے نہایت عاجزانہ طور پر اپنی مساعی کا آغاز کیا لیکن نہایت موثر سیاسی اور مذہبی قائد ثابت ہوئے۔ تیرہ سو سال گزر جانے کے باوجود ان کے اثرات آج بھی انسانوں کی ایک کثیر تعداد پر نہایت گہرے طور پر قائم ہیں۔ اس کتاب میں شامل افراد کی یہ خوش قسمتی رہی کہ وہ دنیا کے تہذیبی مراکز میں پیدا ہوئے اور ایسے لوگوں میں پلے بڑھے جو عموماً تہذیب یافتہ اور سیاسی طور پر مرکزی اقوام تھیں۔ ان سب کے برعکس (حضرت) محمد کی پیدائش جنوبی عرب میں 570ء میں ہوئی۔ اس وقت یہ علاقہ تجارت، فنون اور علم کے مراکز سے بہت دور، دنیا کا انتہائی دقیانوسی گوشہ تھا۔

آپ (ﷺ) چھ برس کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی پرورش عام حالات میں ہوئی۔ تاہم چالیس برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے آپ کا ایک غیر معمولی انسان ہونے کا تاثر پیدا ہو چکا تھا۔ اس دور میں عرب بُت پرست تھے جو متعدد دیوی دیوتاؤں پر ایمان رکھتے تھے۔ مکہ میں البتہ عیسائیوں اور یہودیوں کی مختصر آبادیاں تھیں جن کے توسط سے آپ (ابتداء) خدائے واحد و

مطلق کے تصور سے آشنا ہوئے۔ جب آپ کی عمر چالیس برس ہوئی تو آپ پر وحی نازل ہوئی جس کے ذریعہ خدا نے آپ کو سچے عقیدے کی تبلیغ کے لئے منتخب کرلیا۔ تین برس تک وہ اپنے قریبی اعزہ واقربا میں اپنے نظریات کا پرچار کرتے رہے۔ 613 عیسوی میں آپ نے کھلے عام تبلیغ شروع کردی۔ آہستہ آہستہ آپ کو ہم خیالوں کی حمایت حاصل ہونے لگی تو مکہ کے ذی اقتدار طبقہ کو آپ سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ 622ء میں آپ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے جو مکہ کے شمال میں 320 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے یہاں پہنچ کر آپ کو ایک بڑے سیاستدان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ جلد ہی آپ کی شخصیت کے اثرات واضح ہوئے اور آپ ایک مکمل فرمانروا بن گئے۔ اگلے چند برسوں میں آپ کے پیروکاروں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا اور مدینہ و مکہ کے بیچ چند جنگیں لڑی گئیں۔ جن کا اختتام 630ء میں آپ کی فتح مندی اور مکہ میں بطور فاتح واپسی پر، ہوا۔ آپ کی زندگی کے اگلے ڈھائی برسوں میں عرب قبائل بڑی تیزی سے اس مذہب میں داخل ہوئے۔ 632ء میں جب آپ کا انتقال ہوا تو آپ جنوبی جزیرہ ہائے عرب کے موثر ترین حکمران بن چکے تھے۔

بدو قبائل، تندخو جنگجوؤں کی حیثیت سے جانے جاتے تھے لیکن وہ تعداد میں کم تھے۔ شمالی زرعی علاقوں میں قائم وسیع بادشاہتوں کی افواج سے ان کی کوئی برابری نہیں تھی تاہم آپ نے تاریخ میں پہلی مرتبہ عربوں کو یکجا کیا۔ جو واحد سچے خدا پر ایمان لے آئے۔ اتنی مختصر عرب فوجوں نے انسانی تاریخ میں فتوحات کا ایک حیران کن سلسلہ شروع کردیا۔ جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں ساسانیوں کی نئی ایرانی سلطنت (NEO_PERSIAN EMPIRE OF SASSANIDS) قائم تھی۔ شمال مغرب میں بازنطینی یا مشرقی سلطنت روما تھی جس کا مرکز قسطنطنیہ تھا۔ بہ لحاظ تعداد عرب فوج کا اپنے حریفوں سے کوئی جوڑ نہیں تھا۔ تاہم میدان جنگ میں معاملہ مختلف تھا۔ ان پرجوش عربوں نے بڑی تیزی سے میسوپوٹیمیا شام اور فلسطین کو فتح کرلیا۔ 637ء میں جنگ قادسیہ اور 642ء میں نہاوند کی جنگ میں ایرانی فوجوں کو تاخت و تاراج کیا اور 642ء میں مصر کو بازنطینی تسلط سے آزاد کرالیا۔

تاہم نبی اکرم (ﷺ) کے جانشین اور قریبی صحابہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ ابن الخطاب کی زیر قیادت ہونے والی ان فتوحات پر ہی، مسلمانوں نے اکتفا نہ کیا۔ 711ء تک عرب فوجیں شمالی

افریقہ کے پاس بحراوقیانوس تک اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ چکی تھیں۔ پھر وہ شمال کی طرف مڑے اور آبنائے جبرالٹر کو عبور کر کے سپین میں وزی گوتھک (VISIGOTHIC) سلطنت پر قبضہ کرلیا۔ ایک دور میں تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان تمام مسیحی یورپ پر قابض ہو جائیں گے تاہم 732ء میں "طور" کی مشہور جنگ میں جب کہ مسلمان فرانس میں داخل ہو چکے تھے، فرانسیسی فوجوں نے انہیں شکست دے دی۔ جنگ وجدل کی اس صدی میں ان بدوی قبائل نے نبی کے الفاظ سے حرارت لے کر ہندوستان کی سرحدوں سے بحراوقیانوس تک عظیم سلطنت استوار کر لی۔ اتنی بڑی سلطنت کی اس سے پہلے کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ جہاں ان افواج نے فتوحات حاصل کیں وہاں بڑے پیمانے پر لوگ اس نئے دین کی جانب مائل بھی ہوئے۔ لیکن یہ فتوحات پائیدار ثابت نہ ہوئیں۔

ایرانی اگرچہ اسلام سے وفادار رہے لیکن بعد میں انہوں نے عربوں سے آزادی حاصل کر لی۔ سپین میں سات صدیاں خانہ جنگی جاری رہی بالآخر تمام جزیرہ نمائے سپین پر پھر سے مسیحی غلبہ ہو گیا۔ قدیم تہذیب کے یہ دو گہوارے میسوپوٹیمیا اور مصر عربوں کے قبضہ میں ہی رہے۔ یہی پائیداری شمالی افریقہ میں بھی قائم رہی۔ اگلی صدیوں میں یہ نیا مذہب مسلم فتوحات کی حقیقی سرحدوں سے بھی پرے پھیل گیا۔ آج افریقہ اور وسطی ایشیا میں اس مذہب کے کروڑوں پیروکار موجود ہیں۔ یہی حال پاکستان شمالی بھارت اور انڈونیشیا میں بھی ہے۔

انڈونیشیا میں اسلام نے ایک متحد کرنے والے عنصر (UNIFYING FACTOR) کا کردار ادا کیا۔ برصغیر پاک وہند میں ہندو مسلم تنازعہ ایک اجتماعی اتحاد کی راہ میں اب بھی بڑی رکاوٹ ہے، سوال یہ ہے کہ ہم کس طرح تاریخ انسانی پر (حضرت) محمد کے مجموعی اثرات کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ دیگر مذاہب کی طرح اسلام نے بھی اپنے پیروکاروں کی زندگیوں پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ اسی لئے اس کتاب میں دنیا کے عظیم مذاہب کے بانیوں کے حالات نمایاں طور پر شامل کئے گئے ہیں۔ چونکہ اس وقت دنیا میں عیسائیوں کی تعداد مسلمانوں کی بہ نسبت تقریباً دو گنا ہے اس لئے ابتداء یہ بات عجیب لگتی ہے کہ میں نے (حضرت) محمد (ﷺ) کا مقام (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) سے بلند ظاہر کیا ہے۔ لیکن میرے پاس اس فیصلہ کے لئے دو اہم وجوہ ہیں:۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ (حضرت) محمدؐ نے اسلام کی ترویج اور فروغ میں جو کردار ادا کیا ہے وہ عیسائیت کے فروغ میں (حضرت) عیسیٰ کے کردار کے مقابلے میں زیادہ زوردار اور توانا رہا ہے۔ مسیحیت کے اخلاقی اصولوں کی تشکیل میں (حضرت) عیسیٰ کا کردار (جہاں تک مسیحیت کا صیہونی عقائد سے اختلاف ہے) اگرچہ بنیادی رہا ہے اس کے باوجود بھی مسیحیت کے فروغ میں سینٹ پال نے زیادہ موثر کردار ادا کیا ہے اور وہی عہد نامہ جدید کے بڑے حصے کا مصنف ہے۔

(حضرت) محمد نے نہ صرف اسلام کی الٰہیات کی تشکیل میں فعال کردار ادا کیا بلکہ اس کے بنیادی اخلاقی اصولوں کا تعین بھی کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے اسلام کے فروغ کے لئے بھی مساعی کیں اور اس کی عبادات کی توضیح بھی کی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یسوع مسیح کے برعکس محمد (ﷺ) نے نہ صرف دنیاداری کے بھی آداب سکھائے بلکہ ایک روحانی شخصیت کے طور پر بھی رہنمائی فراہم کی۔ فی الحقیقت، عرب فتوحات کے پیچھے وہی اصل کارفرما قوت تھے۔ اس اعتبار سے وہ تمام انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ متاثر کن سیاسی قائد ثابت ہوئے۔ بہت سے تاریخی واقعات کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ناگزیر (INEVITABLE) تھے۔ ان کی رہنمائی کرنے والا جو شخص تھا وہ نہ بھی ہوتا، تب بھی وہ وقوع پذیر ہو کر ہی رہتے۔ مثال کے طور پر اگر سائمن بولیور کبھی پیدا نہ ہوتا پھر بھی شمالی امریکی نوآبادیاں سپین سے آزادی حاصل کر ہی لیتیں لیکن عرب فتوحات کے بارے میں ایسا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ محمد سے پہلے ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ وہ نہ ہوتے تو یہ فتوحات نہیں ہو سکتی تھیں۔ تاریخ انسانی میں ان سے مماثل ایک واقعہ تیرہویں صدی عیسوی میں ہونے والی، منگولوں کی فتوحات ہیں جو بنیادی طور پر چنگیز خان کے زیر اثر ہوئیں۔ یہ فتوحات عربوں کی فتوحات سے زیادہ وسیع و عریض ہونے کے باوجود ہرگز پائیدار نہیں تھیں۔ آج منگولوں کے قبضے میں صرف وہی علاقے باقی رہ گئے ہیں جو چنگیز خان کے دور میں ان کے زیر تسلط تھے۔

عرب فتوحات کا معاملہ اس سے بہت مختلف ہے۔ عراق سے مراکش تک عرب اقوام کی ایک زنجیر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ صرف اپنے مشترک عقیدے (اسلام) ہی کے سبب باہم متحد نہیں ہیں بلکہ ان کی زبان تاریخ اور تمدن بھی مشترک ہیں۔ قرآن نے مسلم تہذیب میں زبردست مرکزیت پیدا کر دی ہے اور ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اسے عربی میں لکھا گیا ہے۔ شاید اسی وجہ

سے عربی زبان تیرہ صدیاں گزر جانے کے باوجود باہمی طور پر ناقابل فہم بولیوں (DIALECTS) میں بٹ کر منتشر ہونے سے بچی رہی۔ جیسا کہ امتداد زمانہ کی وجہ سے زبانوں کے ساتھ ایسا معاملہ بن جاتا ہے۔ بلاشبہ ان عرب ممالک کے مابین کافی اختلافات ہیں پھر بھی یہ محض جزوی نوعیت کے ہیں۔ ان اختلافات کے باوجود ان کے درمیان اتحاد کے اہم عناصر کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جانی چاہئیں جو تسلسل اور تواتر کے ساتھ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ایران اور انڈونیشیا تیل پیدا کرنے والے دو غیر عرب اسلامی ممالک 1973-74ء کے موسم سرما میں ہونے والے، تیل کی تجارت کی بندش کے فیصلے، میں شریک نہیں تھے جب کہ تمام عرب ممالک اس میں شریک تھے۔ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ اس میں ان کے عرب ہونے کا بھی گہرا دخل تھا۔

پھر ہم جانتے ہیں کہ ساتویں صدی میں جو عرب فتوحات ہوئی تھیں وہ انسانی تاریخ کے تمام ادوار میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ ان فتوحات کے اثرات آج بھی واضح اور مسلسل محسوس ہو رہے ہیں۔ یہ اثرات اسلام کی مذہبی اور دنیاوی تعلیمات کا ایسا نادر اور بے مثل امتزاج (UNPARALLED COMBINATION) ہیں جو (حضرت) محمد کو انسانی تاریخ کی واحد اور بااثر ترین شخصیت کہلانے کا حق عطا کرتے ہیں۔

اقتباسات

نپولین:

☆ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں نے 1500 سالوں میں کفر کی اتنی نشانیاں نہیں مٹائیں جتنی متبعینِ اسلام نے صرف 15 سال میں مٹا دیں۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت محمد بہت ہی بڑی شخصیت تھے۔

مائیکل ہارٹ:

☆ دنیا میں جتنے لوگوں نے انقلابی کارنامے انجام دیئے، وہ کارنامے ان کے بغیر بھی رونما ہو سکتے تھے مگر حضرت محمد نہ ہوتے تو اتنا عظیم کارنامہ کبھی انجام نہیں پا سکتا تھا۔

شہنشاہ فرانس نپولین کا خراج عقیدت

''وہ دن دور نہیں جب میں دنیا کے صاحبان علم و دانش کو متحد کر کے ایک ایسا دور قائم کر دوں گا جو یک رنگ وہم آہنگ ہو اور اصول قرآن اس کی بنیاد ہو کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ قرآن ہی کے اصول سچے ہیں اور انسانیت کو طمانیت کی منزل تک اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔'' نپولین بونا پارٹ۔

اپنی قوم کو وجود باری کا جو سبق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیا سلطنت روم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اور قدیم براعظم میں حضرت محمد (ﷺ) نے یہی اعلان کیا۔ مگر عرب بڑے ہی بت پرست تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو جب لوگ بھول گئے تو محمد (ﷺ) نے انہیں مقام کبریا پھر یاد دلایا۔

آریائی نسل کی ملتوں اور دیگر انسانی گروہوں نے فکرِ مشرق میں عجب خلفشار پیدا کر رکھا تھا کہ خدا ہے، مسیح علیہ السلام ہے اور روح القدس ہے مگر حضرت محمد (ﷺ) نے اعلان کیا کہ سوائے ایک خدا کے دوسرا کوئی بھی نہیں، نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، نہ کوئی اس کا فرزند ہے اور نہ کوئی دوسرا قابل پرستش۔ انہوں نے فرمایا کہ تثلیث ہی ہے جو بت پرستی کو راہ دیتی ہے۔ اس لئے جانو کو معبود سوائے خدا کے اور کوئی نہیں ہے۔

محمد (ﷺ) کی ذات ایک مرکزِ ثقل تھی جس کی طرف لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ ان کی تعلیمات نے لوگوں کو اپنا مطیع و گرویدہ بنالیا اور ایک گروہ پیدا ہو گیا جس نے چند ہی سال میں نصف (معلومہ) دنیا میں اسلام کا غلغلہ، بلند کر دیا۔ اسلام کے ان پیروؤں نے دنیا کو جھوٹے خداؤں سے چھڑالیا۔ انہوں نے بُت سرنگوں کر دیئے۔ موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں نے

15 سو سال میں کفر کی نشانیاں اتنی منہدم نہ کی تھیں۔ جتنی ان متبعینِ اسلام نے صرف پندرہ سال میں کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد کی ہستی بہت ہی بڑی تھی۔

جس وقت وہ اپنی قوم کے سامنے آئے اس وقت عرب خانہ جنگی کا شکار تھے۔ مسلمانوں نے اپنا پرچم دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لہرا دیا۔ جو قومیں ابتلا و آزمائش کے دور سے گزر کر جسم و روح کی پرورش و سربلندی کا سامان مہیا کرتی ہیں ان سے ایسی ہی عظیم کارگزاریاں ظہور میں آتی ہیں۔ جنگِ قادسیہ کے بعد نتائج کہاں سے کہاں تک پہنچے؟ جیحوں کے کناروں سے چین کی سرحد تک ان کا پھریرا لہرانے لگا۔ شام اور مصر، ان کے زیرِ نگیں آ گئے۔ لیکن غور کرو اگر پیروانِ اسلام کے ''خالد'' اور ''عمر'' ہزیمت کھا جاتے تو پھر ان کا ٹھکانہ کہاں تھا؟ وہ لوٹ کر پھر لق و دق صحراؤں کی خانہ بدوش زندگی میں واپس چلے جاتے، اور آوارۂ صحرا پھرتے رہتے جیسے ان کے اجداد بے نشان اور بے حیثیت رہ گئے تھے وہ بھی ایسے ہی ہو جاتے۔ نکبت و فلاکت کی تصویر رہتے اور پھر دنیا کو کیسے معلوم ہوتا کہ محمد کون تھے؟ علی ؓ کون تھے؟ اور عمر ؓ کیا تھے؟

پارتھی، (PARTHIANS) منگول، تاتاری اور اقوامِ ترک کی بابت یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں وہ علم و حکمت اور فنون و ثقافت کے دشمن تھے مگر ان کے برعکس عرب تو شروع سے ہی علم کے گرویدہ اور حکمت و فنون کے متلاشی تھے۔ کون ہے جو محمد عربی پر علم دشمنی کا الزام لگا سکے۔ پہلے اموی خلیفہ، معاویہ کو دیکھئے۔ شعر و ادب کا دلدادہ تھا۔ ایک دفعہ کوئی یہودی عالم ''ربی'' ان کے سامنے پیش ہوا اور بڑی بلیغ عربی میں چند اعتذاریہ اشعار پڑھے جنہیں سنتے ہی خلیفہ نے اسے عفو کا مستحق قرار دے دیا۔ ان کا بیٹا یزید بھی شعر کا دلدادہ تھا۔ بس یوں سمجھئے کہ مسلمانوں میں فنِ شعر جمہور و جرأت کے جوہروں کے بالکل مانا جاتا تھا۔ ہارون الرشید اور المامون کی طرف نگاہ کیجئے۔ کہ انہوں نے علم و حکمت اور فنون و ثقافت کی کتنی پرورش کی۔ انہیں ادب کا ذوق تھا۔ کیمیا و ریاضی کی لگن تھی اور ہر دم دانشوروں کی صحبت میں گزارتے تھے۔ انہوں نے لاطینی، یونانی علوم و فنون کے خزانوں کو عربی میں منتقل کرایا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے ''ایلڈ''۔ ''اوڈیسی'' اور ''اقلیدس'' کے ترجمے عام کئے۔ انہوں نے مدارس اور دارالعلوم بنوائے، جہاں طب، ہیئت اور اخلاقیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ریاضی دان احمد نے ''بطلیموس'' کی جدولوں کو درست کیا۔ عباس ایک اور بڑا حساب داں تھا۔ مسلمان سائنس دانوں نے صنعا سے

بطلیموس کوفہ تک کے فاصلہ کو ایک درجہ سمت الراس تک ناپا۔ وہ کیمیا کے تجربے کرتے تھے۔ انہوں نے ''الانبیق'' ایجاد کی، دھوپ گھڑی بنائی، گھڑیاں مرتب کیں، ریاضی میں اعلام و اعداد معین کئے۔ آج ان سب کا وجود عربوں کا ہی مرہون منت ہے۔

مگر ایجادات و کمالات سے بڑھ کر جو شرف انہیں حاصل ہے وہ ان کے آداب زندگی ہیں، ان کا ادب ہے، ان کی حکمت ہے۔ ان کی شاعری میں ولولہ ہے، غلو ہے۔ محمد نے اہل علم کو سراہا ہے۔ حکمت کی ہمت افزائی کی ہے اور عقل و دانش کے کارپردازوں کو اونچا کیا ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ اسلام میں علم اور کتاب کی قدر رہوئی ہے) قاہرہ کے کتب خانہ میں صرف ہیئت پر چھ ہزار سے کم کتابیں نہ تھیں۔ دیگر علوم پر ایک لاکھ کتابیں ان کے علاوہ تھیں۔ قرطبہ کی لائبریری میں تین لاکھ کتابوں کی موجودگی ایک معروف و مشہور حقیقت (A KNOWN FACT) ہے۔ غرض خلفائے اسلام نے اپنے پانچ سو سالہ دور میں ہر طرح علم و حکمت کی حفاظت کی۔ ہر طرح اس کا چرچا کیا اور ترقی کا قدم آگے ہی بڑھتا گیا کہ اچانک فتنۂ چنگیزی کا ظہور ہوا۔

محمد (ﷺ) نے ازواج کی تعداد متعین کر دی۔ ان سے قبل مرد کے لئے کوئی حد ہی نہ تھی کہ وہ کتنی بیویاں کر سکتا ہے۔ جو صاحب ثروت تھے وہ جتنی عورتوں کو چاہتے بیویاں بنا لیتے، مگر محمد نے یہ رسم توڑ دی۔ سوال یہ تھا کہ محمد نے عہد عیسوی کے قانون کی پابندی کیوں نہیں کی؟ اور مردوں کو یہ اجازت کیوں نہیں دی کہ وہ جس قدر بیویاں چاہیں کر لیں؟ پھر ادھر یورپ میں کیا ہوتا رہا ہے؟ یہاں کے قانون سازوں نے خواہ یونانی ہوں یا جرمن یا رومی و گال، اسپینی ہوں یا انگریز ایک سے زائد بیویاں کرنے کی اجازت نہیں دی۔ مغرب میں تو یہی حال ہے، مگر ادھر مشرق میں کیا ہے؟ وہاں تو ہمیشہ اس کی آزادی رہی۔ ازمنہ قدیم سے یہاں کی ہر ملت میں خواہ وہ یہودی ہوں، آشوری ہوں یا ایرانی، تاتاری ہوں یا افریقی حد ازدواج معین نہ تھی۔ بعض نے (تاویل میں) کہا ہے کہ جغرافیائی کیفیت اس کی متقاضی ہے اور مغرب کے مقابلے پر یہاں یہ فرق ہونا اسی کا نتیجہ ہے۔ مگر بات اور ہے۔

ایشیا اور افریقہ میں مختلف اللون انسان بسے ہوئے تھے انہیں باہم دگر کس طرح شیر و شکر کیا جاتا۔ کثرت ازدواج کے سوا اور کوئی تدبیر نظر نہیں آتی تھی۔ اسی طرح یہ ممکن تھا کہ سفید پر کالے اور کالے پر سفید کا جبر و تسلط دور کیا جا سکتا تھا۔ کثرت ازدواج میں یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی ماں یا

ایک ہی باپ سے پیدا ہونے والے بچے کالے گورے دونوں ہی بھائی بھائی بن جاتے ہیں۔ دونوں ایک دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ مشرق میں ایک بات یہ بھی ہے کہ جلد کا رنگ ایک انسان کو دوسرے پر فوقیت نہیں دیتا۔ (تفریق رنگ و نسل پر قابو پانے کے لئے) محمد نے چار بیویاں تک کرنے کی اجازت دے دی، مگر سوال یہ ہے کہ جب عورتیں کم ہوں تو چار تک کی اجازت بھی کیسے دی جا سکے گی؟...... مگر ایک نقطے پر غور کیجئے۔ کثرت ازواج سے فائدہ تو صرف صاحب مال و زر ہی اٹھا سکتے ہیں اور وہی (معاشرہ میں) اوپر ہیں، وہی آراء کی تشکیل کرتے ہیں۔ پس انہیں آپس میں یہ شادیاں مربوط رکھتی ہیں۔ اگر ہم (یعنی اہل فرانس) اپنی نو آبادیوں (جیسے مصر و شمالی افریقہ) میں کالوں کو آزادی دینا چاہتے ہیں اور ان میں رنگ و نسل کا تعصب بھی دور کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے قانون سازوں کو کثرت ازواج کی اجازت دینا ہی پڑے گی۔

مشرق میں غلامی کا وہ عالم کبھی نہیں رہا جو مغرب میں ہے۔ مشرق میں غلامی کی کیفیت بائبل کے مطابق ہی نظر آتی ہے۔ غلام کو اپنے آقا کی املاک میں سے حصہ ملتا ہے۔ وہ اس کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے (میرے زمانے میں) اکثر پاشا (حاکمانِ مصر) غلاموں سے ہی ہیں۔ بڑے وزیر، مصر کے تمام مملوک سلاطین، علی بن مراد بے وغیرہ سب غلام تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز اپنے مالکوں کے ہاں معمولی نجی ملازم کی طرح کیا مگر بربنائے صلاحیت یا بطریق کرم وہ اونچے درجوں تک پہنچ گئے۔

مگر مغرب میں حالت کیا تھی؟ غلاموں کے ساتھ جو سلوک تھا وہ نجی ملازموں سے بھی بدتر تھا۔ وہ مرتبۂ حیات کے بالکل نچلے زینے پر کھڑے تھے وہ اپنے غلام آزاد بھی کر دیا کرتے تھے۔ مگر کیا انہیں آزادوں کی برابری میسر آئی؟...... الغرض مشرق اور مغرب میں یہ فرق بڑا واضح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مصر کو سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے کہ فوج ساری کی ساری سلطان الکبیر کے غلاموں پر مشتمل نہیں ہے۔ (مسلمانوں کا معاشرہ ایسا ہے کہ) یہاں باپ ایک مجسٹریٹ بھی ہے۔ پہلا مجسٹریٹ وہی ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیویوں اور اولادوں اور غلاموں پر کلی اختیار حاصل ہوتا ہے۔ کسی کنبے کے اندرونی معاملات کیا ہیں؟ ان میں کسی انتظامیہ نے دخل نہیں دیا اور نہ باپ کے اقتدار پر ہاتھ ڈالا۔ کنبہ کے سربراہ، باپ، کی جتنی بھی بیویاں ہوں سب کا احترام یکساں ملحوظ رکھا جاتا ہے حتیٰ کہ خانہ جنگیوں میں بھی یہی صورت رہتی ہے۔

مجھے توقع ہے کہ وہ دن دور نہیں جب میں دنیا کے صاحبانِ علم و دانش کو متحد کر کے ایک ایسا دور قائم کر دوں گا جو یک رنگ و ہم آہنگ ہو اور اصولِ قرآن اس کی بنیاد ہو کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ قرآن ہی کے اصول سچے ہیں جو انسان کو طمانیت کی منزل تک اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ (ملخص)

(''بونا پارٹ اور اسلام'' از ''شیفلر'' پیرس، فرانس)

کارلائل کی تحریر کے چند اقتباسات

☆ حضرت محمد (ﷺ) کی عظمت کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے تعصبات کو ترک کرنا ہوگا۔

☆ وقت آ گیا ہے کہ ہم اسلام پر لغو الزامات لگانے سے باز آ جائیں۔

☆ یہ طے شدہ امر ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) جاہ طلبی کے جذبات سے بالاتر تھے۔

☆ حضرت محمد (ﷺ) بچپن ہی سے بے حد زیرک، عمیق مشاہدے اور عمدہ یادداشت کے مالک تھے۔

☆ صحرائے عرب کا یہ پاک طینت شخص صداقت اور خلوص کا پیکر، جذبۂ ہوس اور شہرت طلبی سے کوسوں دور تھا۔

☆ ایسے شخص کے لیے ہرقل روم کا تاج اور خسرو ایران کا تخت کیا معنی رکھتے تھے جس نے جنت کی لازوال نعمتوں کو اپنا مطمع نظر بنا رکھا ہو۔

☆ جو لوگ اسلام کے تلوار کے ذریعہ پھیلنے کا دعویٰ کرتے ہیں میں ان سے پوچھتا ہوں یہ تلوار آئی کہاں سے تھی۔

☆ ''خدا کی قسم، میں خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تم سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں، وہ مجھ پر اس وقت ایمان لائیں جب کسی نے میری بات پر ابھی یقین نہیں کیا تھا''۔ حضرت محمد کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جواب۔

رومانیہ کے وزیر خارجہ کا تعارف

رومانیہ کے ممتاز مستشرق کونسٹن ورجیل جارجیو نے آنحضرت کی ذات اور ان کی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کے لائے ہوئے انقلاب کا انقلابِ فرانس (1789) سے موازنہ کر کے دنیا پر یہ واضح کیا ہے کہ اسلامی انقلاب نہ صرف اسی دور میں حقیقی کامیابی سے ہمکنار ہو گیا تھا بلکہ صدیوں بعد بھی اس کے اثرات محسوس ہو رہے ہیں جب کہ علمبردارانِ انقلابِ فرانس اپنے مقصد میں عشرِ عشیر بھی کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ انسانوں کے مابین مکمل انصاف اور مساوات، جو ان کا اصل اور بنیادی نعرہ تھا کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ جب کہ غلامی سے آزاد کرائے گئے بلال حبشی ﷺ کو مسلمانوں نے سیّدنا بلال ﷺ کہنا شروع کر دیا۔ ایک اور آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کا بیٹا اسامہ اس اسلامی لشکر کا سپہ سالار رہا جو حضور کی رحلت کے بعد روم پر حملہ آور ہوا تھا اور حضرت عمر ﷺ ان کے ماتحت اس معرکے میں شریک تھے۔ بانی انقلاب اسلام حضرت محمد عام مسلمانوں کی طرح فاقوں میں مبتلا ہوئے اور پیٹ پر پتھر باندھ کر فاقے کا مقابلہ کرتے رہے۔ حضور نے مسجد نبوی کی ابتدائی تعمیر اور خندقیں کھودنے میں نہ صرف عملی شرکت کی بلکہ عام لوگوں سے بڑھ کر حصہ لیا۔ انسانی مساوات کی ایسی مثال کوئی دوسرا انقلاب پیش نہیں کر سکا۔ دنیا کو بوریا نشین حکمران کے تصور سے اسلام ہی نے روشناس کرایا ہے۔

کونسٹن ورجیل جارجیو کا یہ حاصل مطالعہ مشرقی یورپ کی دانش گاہوں میں اسلام پر ہونے والے تحقیقی کام کا ثمر ہے۔ رومانیہ کی یونیورسٹیوں میں مذاہب کے تقابلی مطالعے کا خصوصی اہتمام رہا ہے۔ رومانیہ تقریباً چار سو سال مسلم اقتدار کے زیرِ نگیں رہ چکا ہے۔ ذیل کے طویل مقالے کے مصنف، فلسفہ، لٹریچر اور ادیان (THEOLOGY) کے نہایت سنجیدہ اور زیرک طالب علم تھے۔ اور ان کے مقالے کا فرنچ، جرمن، انگریزی، روسی اور عربی و فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

فاضل مصنف مروجہ تعلیم سے فراغت کے بعد رومانیہ کی وزارت خارجہ میں ملازم ہو گئے تھے لیکن ملازمت کے ساتھ ساتھ تحقیق اور مطالعہ پر بھی وقت صرف کرتے رہے۔ اس دوران وہ وزیر خارجہ کے منصب پر پہنچ گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مشرقی یورپ کی سیاست میں رونما ہونے والی ہنگامہ آرائیوں اور اکھاڑ پچھاڑ سے بددل ہو کر انہوں نے اپنا وطن ترک کر دیا اور فرانس چلے گئے۔ باقی ماندہ زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ ان پر تصوف کا غلبہ ہو گیا۔ سیرت نبوی پر یہ کتاب ان کی آخری تصنیف تھی۔ جو فاضل مصنف کی بیس سالہ تحقیق کا نچوڑ ہے۔ کتاب کا عنوان "محمد" ہے اس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) کو از سر نو پہچاننے کی کوشش ہونی چاہئے۔ اس کتاب کے دو تراجم میری نظر سے گزرے ہیں ایک ترجمہ مولانا عبدالصمد صارم کا ہے اور دوسرا ایک انجینئر خلیل الرحمان کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ انہیں مناسب ترامیم کر کے اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔

......مؤلف

کارلائل

☆ حضرت محمد (ﷺ) نے کسی معاملے میں سختی کی تو اس کی تہہ میں بھی گہری معقولیت تھی۔

☆ "ایک گال پر تھپڑ لگے تو دوسرا گال آگے کر دو" والا اصول ہر دور میں نہیں چل سکتا لیکن اسلام کا "آنکھ کے بدلے آنکھ ناک کے بدلے ناک" والا اصول ہر دور میں چل سکتا ہے۔

کونسٹن ورجیل جارجیو

دنیا میں پہلا عظیم ترین انقلاب

پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی بلند و بالا شخصیت اور ان کے مشن پر اظہار خیال کرنے سے پہلے میں، ان حالات پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جن میں حضورؐ نے کام کیا اور ساتھ ہی میں عرب نفسیات کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کروں گا۔ تاکہ قاری اس عظیم ہستی کے کارناموں کو صحیح پس منظر کی روشنی میں سمجھ سکے۔

زمانہ قبل از اسلام میں عربوں میں جو خصوصیات تھیں وہ بعد میں بھی موجود رہیں، ان کی پہلی خصوصیت مہمان نوازی تھی۔ ان سے بڑھ کر مہمان نواز دنیا کی کوئی قوم نہیں ہو سکی۔ دوسری خصوصیت مظلوموں اور ضرورت مندوں (Asylum Seekeys) کو تحفظ اور پناہ دینا تھی پناہ دینے میں، وہ اتنے فیاض ہوتے تھے کہ ایک بدو نے انجانے میں اپنے بیٹے کے قاتل کو بھی تحفظ دے دیا۔ اسی عمل کے دوران اس پر جب انکشاف ہوا کہ اس کے زیر پناہ شخص اس کے بیٹے کا قاتل ہے، اس نے اس کی گردن اڑا دینے کی بجائے اسے صرف یہ کہا...... "میری نظروں سے دور ہو جاؤ مبادا کہ مجھ پر اپنے فرزند کی محبت غالب آ جائے اور میں تم سے انتقام لے بیٹھوں" چنانچہ اس نے بھاگ کر اپنی جان بچا لی۔ تیسری خصوصیت قبیلے کے قوانین کا احترام تھا۔ اس خصوصیت نے شدید بدامنی وانتشار اور خون ریزی کی عادی قوم کو کسی نہ کسی حد تک قوانین کے قریب تر رکھا۔

یہ وہ خصوصیات تھیں جن سے عرب کبھی بھی محروم نہیں ہوئے ایک بدو ہمیشہ بہادر کہلوانے کا متمنی رہتا تھا۔ اس کی خواہش ہوتی تھی جنگ سے پیچھے نہ ہٹے۔ دشمن کے مقابلے میں کبھی پیٹھ

نہ دکھائے۔ ہمیشہ ثابت قدم رہے۔ فتح پائے یا قتل ہو جائے۔ رحم کا وہ مفہوم جو ہم اہل یورپ میں مروّج ہے عربوں میں نہیں تھا۔ اسی لئے اگر کوئی شخص چوری کرتا تو اس کا ہاتھ کاٹتے ہوئے کسی کو رحم نہ آتا تھا۔ گویا وہ اقلیمِ رحم کا جلاوطن مسافر سمجھا جاتا تھا۔

اگر عربستان کے تپتے ہوئے صحرا میں کوئی بھوکا پیاسا مسافر کسی بدو عرب کے خیمے میں چلا جائے اور وہاں اس کی مہمان نوازی نہ ہو تو یقیناً وہ بھوک پیاس سے مر جائے۔ اس طرح اگر ایک مسافر راہزنوں سے بھاگ کر کسی بدو کے خیمے میں پناہ لے اور وہاں اسے پناہ نہ ملے تو یقیناً مارا جائے گا۔

وطن سے نکال دیئے جانے کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جب کوئی عرب کسی قبیلے سے نکال دیا جاتا تھا تو اس کی ہلاکت یقینی ہو جاتی تھی۔ گویا برادری سے خارج کرنا نہ تھا بلکہ حکمِ فنا تھا۔ میں فرانسیسی محقق، ارنسٹ رینان کے نظریہ کی تصدیق کرتے ہوئے کہ اہل عرب کی نفسیات در سومات، جزیرۃ العرب کی آب وہوا اور جغرافیائی ماحول کے زیر اثر بنی ہیں، اس میں ایک اور نکتہ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اہل عرب کی جوانمردی اور سخاوت کا تعلق عربستان کی آب وہوا سے نہیں ہے کیونکہ ان اقالیم کے باشندے، جہاں زندگی دشوار ہے (جیسے یورپ کے کوہستانی علاقے) انتہائی کفایت شعار ہوتے ہیں خساست کی حد تک بھی پہنچ جاتے ہیں وہ اس امر کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتے کہ کسی انجانے مہمان کی میزبانی کر کے نقصان اٹھائیں لیکن عرب کے جھلسے ہوئے صحرا میں اگرچہ زندگی بہ نسبت یورپین پہاڑوں کے دشوار تھی گا ہے اہل عرب اپنے واحد ذریعۂ معاش یعنی اپنے اونٹ کو بھی ذبح کر کے اس کا گوشت مہمان کو کھلا دیتے تھے کہ وہ سیر ہو جائے۔

ارنسٹ رینان نے اپنی کتاب ''عربوں کی بدوی زندگی'' میں لکھا ہے:

''تمدن دنیا کی تاریخ میں ہمیں کوئی بھی ایسی بات حسین وجمیل نہیں ملتی جو اہل عرب کی جاہلی طرز زندگی سے بہتر ہو۔'' اس قوم میں روحِ جواں مردی وسخاوت (از راہ مہمان نوازی) بہت ہی قوی تھی ورنہ ان میں نہ رحم تھا اور نہ خوں ریزی سے نفرت۔ گو ہاتھ کاٹنا اور گردن اڑا دینا ان کے ہاں عام باتیں تھیں مگر مظلوم کی حمایت کرتے وقت وہ کسی خطرے یا نقصان سے نہیں ڈرتے تھے۔

کبھی کوئی مظلوم، صحرا میں، کسی بدو کے خیمے میں پناہ لیتا تو صاحب خیمہ تلوار لے کر اس کی حمایت میں کھڑا ہو جاتا، جب تک کہ صاحب خیمہ کو قتل نہ کر دیا جاتا، پناہ لینے والے کو گرفتار نہ کیا جا سکتا تھا۔ چونکہ رسول کریم (ﷺ) اہل قریش کے خیال میں مظلوم نہ تھے لہٰذا کسی نے بھی آپ کی حمایت کے لئے قدم نہ اٹھایا جب کہ دو بار آپ پر خانہ کعبہ میں حملہ ہو چکا تھا۔

آپ سوال کریں گے، کیا ان کے چہرے پر آنکھیں نہ تھیں کہ وہ یہ دیکھ سکتے کہ لوگ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ میں اس سوال کے جواب میں عرض کروں گا کہ دیہاتی عرب اس شخص کو مظلوم سمجھتے تھے جو کسی دوسرے قبیلے سے آئے اور کسی اور قبیلے کی پناہ لے۔ اگر کوئی مظلوم کسی قبیلے سے مکہ میں آتا اور قریش کی پناہ طلب کرتا اور کہتا کہ میں مظلوم ہوں، اس کے لئے اہل قریش اپنی جان تک دینے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ حضرت محمد نہ باہر سے آئے تھے اور نہ "بیگانے" تھے۔ جن لوگوں نے دو مرتبہ آپ کے قتل کرنے کی کوشش کو دیکھا اور چھڑانے کے لئے نہ بڑھے تو وہ اس اقدام کو قانونی اور جائز بات خیال کرتے تھے۔

اہل عرب کی نظر میں مظلوم وہ شخص تھا جو کسی "شخص" کا نشانۂ ستم ہو۔ اگر کوئی شخص اپنے ہی قبیلے کا نشانۂ ستم ہوتا تو وہ مظلوم نہیں سمجھا جاتا تھا، کیونکہ حسب رواج وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ کوئی قبیلہ اپنے کسی فرد پر ظلم نہیں کر سکتا اور اگر کوئی قبیلہ ایسا کرتا ہے تو وہ قانونی سزا ہے کیونکہ ہر فرد کا قانونی قاضی، اس کا اپنا قبیلہ ہوتا تھا۔ اہل عرب کے اس عقیدے پر حیرت نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اس دور میں بھی یورپ کی ایک ریاست، فرانس میں اسی قسم کا عقیدہ ہے حالانکہ فرانس متمدن دنیا میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

آج بھی جب فرانس میں ایک جج کسی ملزم کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے کہ فلاں مجرم کا سر جلاد کے چھرے سے تن سے جدا کر دیا جائے تو کوئی بھی اس جج کو قاتل قرار نہیں دیتا اور کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ اس نے تباہ کاری کا ارادہ کیا ہے۔ تعزیرات فرانس قانون نمبر 327 میں لکھا ہے:

"جب بھی کسی کا قتل کیا جاتا، یا کسی کے زخم لگانا یا کسی کو مارنا، قانون کے تحت وقوع پذیر ہو گا اور قانونی عدالت کے کسی حاکم کے ذریعہ ہو گا، اسے جرم جنایت سے تعبیر نہیں کیا جا سکے گا"

اس دور میں بھی فرانس جیسی سلطنت میں عدلیہ کا جج حکم دیتا ہے کہ مجرم کے سر کو تن سے جدا کر دیا جائے، جلاد اپنی تلوار سے سر کو جدا کر دیتا ہے اور کوئی شخص بھی جلاد یا جج کو ظالم نہیں کہتا بلکہ سب

کھڑے تماشا دیکھتے ہیں اور کچھ بھی نہیں کہتے۔

☆......☆......☆

ان عربوں میں کوئی قانونِ عدل نہ تھا، بس قبیلے کا ہی وجود تھا، ہر شخص اپنے گروہ سے تعلق رکھتا تھا اور کوئی بھی گروہ اپنے کسی آدمی کو مارتا نہ تھا، البتہ صرف جب انہیں ایسا کرنے کا حق پہنچتا ہو۔ جب قریشیوں نے یہ ارادہ کر ہی لیا کہ آپ (ﷺ) کو شہید کر دیں تو بلاشبہ آپ حسب عقیدۂ قریش واجب القتل تھے۔ صرف چار ہستیاں ایسی تھیں جو آپ پر رحم کرتی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو آپ پر ایمان لا چکے تھے۔ یعنی حضرت خدیجہؓ، علی، زید اور ابوبکر۔ اگر میں حضرت ابوبکر کی چھوٹی سی بچی عائشہؓ کو بھی شمار کر لوں جو اپنے باپ کی وجہ سے مسلمان پیدا ہوئی تھیں تو پھر آپ کے حمایتیوں کی تعداد پانچ ہو جاتی ہے۔ مگر یہ پانچوں افراد کفار کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔

نبوت کے چوتھے سال آپ کے حامیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی کیونکہ کئی ایک افراد اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ اُس زمانے میں اور اس زمانے میں بھی ایسے افراد ہیں جو آب دہوا اور دھوپ کے علاوہ خدا پر عقیدہ رکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ لوگ وہ تھے جو غلام، سیاہ فام، خارجی یا برادری سے خارج کردہ تھے یا وہ لوگ تھے جنہیں ''الناس'' کہا جاتا تھا۔ آج کل کے اہل یورپ ''الناس'' کا ترجمہ ''عوام'' کرتے ہیں حالانکہ عربی زبان میں اس لفظ کا مفہوم یہ ہے۔ وہ لوگ جو اپنا دفاع آپ نہیں کر سکتے، ایسے افراد کا شمار آج تک ہر دور میں ان لوگوں سے زیادہ رہا ہے جو اپنا دفاع، خود کر سکتے ہیں۔

یہ لوگ غلام، سیاہ فام، بیگانے اور برادری سے خارج کردہ تھے اور ایک بڑی تعداد مفلسوں کی تھی جو اسلام سے پہلے یہ تصور کرتے تھے ایک دن ایسا آئے گا کہ ہم بھی دوسروں کے ہمسر کہلا سکیں گے۔ جب محمد مبعوث ہوئے تو انہوں نے فرمایا سارے انسان ایک جیسے ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نیز فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو ایک مادے یعنی خاک سے پیدا کیا ہے۔ یہ مضمون سورہ الرحمان نمبر 55 آیت نمبر چودہ میں مذکور ہے: خلق الانسان من صلصال کالفخار (ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے انسان کو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی مٹی سے پیدا کیا ہے جو گل کوزہ گراں سے مشابہ تھی۔ غلاموں اور سیاہ فاموں نے پہلی بار یہ بات سنی کہ وہ مواد جس سے ان کی تخلیق ہوئی ہے

اور وہ مواد جس سے امیروں اور شریفوں کی تخلیق ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا۔ دونوں طبقوں کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے، وہ فرق جو خدوخال اور رنگ کا ہے صرف اس لئے ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔

حضرت زید کے بعد (جنہیں خود رسول اللہ نے آزاد کیا تھا) سب سے پہلے غلام بلال حبشی تھے جو آپ پر ایمان لائے۔ ''وہ بیگانہ'' وسیاہ فام تھے۔ عربستان میں تین چیزیں بدبختی کا سبب شمار ہوتی تھیں ایک بیگانہ ہونا، دوسرے غلام ہونا اور تیسرے سیا فام ہونا، بلال میں یہ تینوں باتیں موجود تھیں۔

حضرت بلال ﷺ مکہ کے ایک دولت مند شخص امیہ بن خلف کے خاندان سے تعلق غلامی رکھتے تھے۔ جب ان کے آقا کو پتہ چلا کہ وہ داخل اسلام ہو گئے ہیں تو انہیں مکہ شہر سے باہر لے ان کے کپڑے اتار کر تپتی ہوئی ریت پر باندھ کر دھوپ میں لٹا دیا اور کہا یا تو اسلام کو چھوڑ دے، ورنہ اسی حالت میں یہیں مر جائے گا۔ بلال یہ جانتے تھے کہ میرا آقا جو کچھ کہہ رہا ہے کر کے دکھائے گا اور مرتے دم تک مجھے نہیں کھولے گا مگر وہ موت کے لیے تیار ہو گئے۔ عبداللہ بن عثمان یعنی حضرت ابوبکر پدر حضرت عائشہؓ نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ بلال کو چھڑا کر ہی دم لوں گا، وہ بلال کے آقا کے پاس گئے اور ان کی خریداری کی بات چیت کرنے لگے۔ آقا نے جو یہ دیکھا کہ ابوبکر ہر قیمت پر خریدنا چاہتے ہیں تو وہ راضی ہو گیا ابوبکر نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا اور رسول اللہ نے انہیں اپنا موذن بنا لیا۔ عربی زبان میں موذّن اس شخص کو کہتے ہیں ''جو پیغام دوسروں تک پہنچائے''یعنی کوئی ایسی بات دوسروں تک پہنچائے جسے سب سن لیں۔ اسلام کے بعد موذّن اس شخص کو کہنے لگے جو عبادت کے لئے لوگوں کو بلند آواز سے بلاتا ہے۔

جب ''الناس'' کے محروم طبقے نے دیکھا کہ ایک سیاہ فام انسان لوگوں کو اسلام کی طرف بلا رہا ہے تو وہ جرأت کے ساتھ اسلام کی طرف بڑھے۔ دو عورتیں جو عمر بن خطاب کی کنیزیں تھیں، اسلام لے آئیں ایک کا نام بسینہ اور دوسری کا زنیرہ تھا۔ عمر، حضرت بلال کے آقا کی طرح سنگ دل نہ تھے مگر پھر بھی انہوں نے دونوں کو چہار میخ کر دیا اور دونوں کو مارنا شروع کر دیا اور کہا اس وقت تک مارے جاؤں گا جب تک کہ دین محمد (ﷺ) کو نہ چھوڑ دو گی۔ ان دونوں کا جسم خون آلود ہو گیا مگر انہوں نے اسلام کو نہ چھوڑا۔ حضرت ابوبکر ان کی مدد کو بھی دوڑے اور عمر بن خطاب سے

کہا دونوں کو فروخت کر دو۔ عمر راضی ہو گئے اور حضرت ابو بکر ﷺ نے دونوں کو خرید کر آزاد کرا دیا۔ اس طرح مسلمانوں کی تعداد سات ہو گئی جن میں سے تین عورتیں تھیں، چوتھی عورت جو داخلِ اسلام ہوئی ایک گاؤں کی رہنے والی تھی، غزیہ نام تھا۔ وہ کنیز نہ تھی، وہ مکہ آئی اور علی الاعلان لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے لگی۔ دیہات کی عورتیں بھی دیہاتی مردوں کی طرح تھیں کہ کسی بات سے نہ ڈرتی تھیں لہٰذا غزیہ ﷺ قریش کی کسی دھمکی کی پرواہ نہ کرتی تھی۔

اہل قریش نے جو یہ دیکھا کہ غزیہ کسی طرح تبلیغ اسلام سے باز نہیں آتی تو وہ اسے اغواء کر کے لے گئے اور ایک قافلہ جو مکہ سے باہر جا رہا تھا، اس کے ایک اونٹ پر باندھ دیا اور قافلہ والوں سے کہہ دیا کہ ایسے کھانا پانی نہ دیں حتیٰ کہ بھوک پیاس سے مر جائے، مرنے کے بعد لاش کو پھینک دیں تاکہ بجو کھا جائیں۔ جیسا کہ روایت ہے غزیہ بیان کرتی ہے کہ تین رات دن گزرنے کے بعد میں بھوک پیاس سے بے تاب ہو گئی، تو چوتھے روز مجھے ایسا لگا کہ میرے ہونٹ ٹھنڈے پانی سے تر ہو گئے ہیں۔ میں نے پینا شروع کر دیا اور اس قدر پیا کہ خوب سیراب ہو گئی، صبح شتر بانوں نے خیال کیا کہ میں بھوک پیاس سے بے حال ہو گئی ہوں مگر انہوں نے مجھے خوش حال دیکھا، میں نے انہیں رات کا سارا واقعہ سنا دیا، تو وہ بہت شرمندہ ہوئے اور مجھے کھول دیا۔ بعض روایتوں میں آیا کہ وہ سب مسلمان ہو گئے۔ ایک نکتہ قابل ذکر ہے اس سے پیشتر کہ جماعت قریش اسے اغواء کرنا چاہتی تھی، حضرت ابو بکر کو اس کا علم نہ تھا ورنہ آپ ضرور آڑے آتے اور ایسا نہ کرنے دیتے۔ حضرت ابو بکر نے اپنا تمام مال دین اسلام کے لئے وقف کر دیا تھا حتیٰ کہ آپ بالکل خالی ہاتھ ہو گئے۔ اس پر بھی آپ خوش رہتے تھے۔ جب بھی کوئی غلام یا کنیز اسلام لاتا اور اس کا آقا اسے ستاتا تو آپ بہت زیادہ قیمت دے کر اسے خرید کر آزاد کر دیتے۔

پہلی شہید خاتون

ابو جہل کی ایک کنیز کا نام سمیہ تھا۔ جو غلامی کے علاوہ، دایہ گری بھی کرتی تھیں یعنی حاملہ عورتوں کے گھروں میں جاتیں اور ان کی ہر قسم کی مدد کرتیں۔ اس زمانہ میں دایہ گری کا یہ مفہوم نہ تھا جو آج کل ہے۔ دایہ، حاملہ عورتوں کو مشورے دیا کرتی تھی، چونکہ وہ دایہ تھیں لہٰذا ابو جہل کے گھر میں وہ کنیزوں سے زیادہ احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ جب وہ مسلمان ہو گئیں، تو

ابو جہل کو ان کے اسلام لانے کا علم ہوا وہ بولا دین جدید کو ترک کر دے۔ سمیہؓ نے جواب دیا کہ میں دین محمد کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اس پر ابو جہل نے انہیں کوڑوں سے اس قدر مارا کہ وہ بے حال ہو گئیں۔ حضرت ابو بکر کو پتہ چلا تو فوراً پہنچے۔، دیکھا کہ سمیہؓ بے ہوش پڑی ہیں۔ ابو جہل سے بولے یہ کنیز مجھے فروخت کر دو۔ وہ بولا ہر گز نہیں۔ حضرت ابو بکر نے فرمایا اگر تو راضی ہو جائے تو میں تجھے ایک سو دینار دوں گا۔ ابو جہل بولا، ہر گز نہیں، حضرت ابو بکر نے قیمت اور بڑھا دی، فرمایا میں ڈیڑھ سو دینار دے دوں گا، وہ قیمت بڑھاتے رہے اور ابو جہل انکار ہی کرتا رہا۔

حضرت ابو بکر نے جب یہ دیکھا کہ ابو جہل کسی طرح بھی راضی نہیں ہوتا تو آپ نے اس سے فرمایا اگر تو سمیہؓ کے بیچنے پر راضی ہو جائے تو میں تجھے اہل قاضیہ دے دوں گا۔ اہلِ قاضیہ اہل عرب کی ایک خاص اصطلاح تھی، یہ ان اونٹوں کے لئے استعمال ہوتی تھی جو کسی شخص کے قتل کئے جانے پر مقتول کے خاندان کو بطور دیت دیئے جاتے تھے۔ قاضیہ ایک مقتول کی قیمت کو کہتے تھے جو مقتول کے وارثوں کو ادا کی جاتی تھی۔ ابو جہل پھر بھی راضی نہ ہوا۔ اس وقت تک ابو بکر دو غلاموں اور چار کنیزوں کو آزاد کرا چکے تھے جو اسلام لے آئے تھے مگر سمیہؓ کو آزاد نہ کرا سکے۔

جب قریش کی عورتوں نے سنا کہ سمیہؓ ابو جہل کے گھر میں ہر دن مار کھاتی ہے مگر اسلام سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتی تو وہ ابو جہل کے پاس گئیں کہ سمیہؓ کو نہ مارے کیونکہ ہمارے زمانہ حمل میں وہ ہماری امداد کرتی رہی ہے لیکن ابو جہل نے یہ درخواست بھی رد کر دی۔ اس نے مزید مارا حتیٰ کہ ان کا سارا جسم لہولہان ہو گیا تھا اور وہ حرکت تک نہ کر سکتی تھیں، پھر بھی یہی کہتی تھیں، میں دین اسلام کو نہیں چھوڑ سکتی۔ جب ابو جہل سمیہؓ کے عقیدے کو بدلنے میں ناکام ہو گیا تو اس نے ان کے قتل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا، ایک دن انہیں خانہ کعبہ کے سامنے لایا، ساکنانِ مکہ جمع تھے، اتمام حجت کے لئے اس نے سمیہؓ سے سوال کیا، کیا تو اسلام کو چھوڑ سکتی ہے؟ سمیہؓ نے کہا ایسا ہر گز نہیں ہو گا۔ ابو جہل بولا میں تجھے ابھی ابھی قتل کئے دیتا ہوں، باشندگانِ مکہ کے سامنے اس نے اپنا نیزہ ان کے سینے کے آر پار کر دیا۔ اس طرح حضرت سمیہؓ اسلام کی راہ میں سب سے پہلے شہید ہوئیں۔ روایت ہے کہ جب آپ نے سنا کہ ابو بکر سمیہؓ کے آزاد کرانے کی انتہائی کوشش کر رہے ہیں تو ان کے حق میں دعا کی اور فرمایا:

"حیا اللہ وجھك" (خدا تیرے چہرے کو منور رکھے۔)

جب سمیہؓ شہید ہو گئیں تو قریش کی چار بڑی ہستیاں جمع ہوئیں یعنی ابوسفیان، ابوجہل، ابو لہب اور اس کی بیوی اُمّ جمیل اور یہ طے کیا کہ مکہ کا کوئی باشندہ ابوبکر کے ہاتھ اپنا کوئی غلام یا کنیز فروخت نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ دیکھ چکے تھے کہ اسلام غلاموں میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے اور جو بھی غلام، مسلمان ہو جاتا ہے ابوبکر اسے آزاد کرا دیتے ہیں لہٰذا ان لوگوں نے یہ اسکیم سوچی تا کہ اسلام وسعت نہ پا سکے۔ اس اسکیم کے بعد چند ایک آزاد مرد داخلِ اسلام ہوئے، ان کے اسما یہ ہیں: حضرت عثمان بن عفان برادر زادہ عبدالمطلب، عبدالرحمان بن عوف و سعد بن ابی وقاص برادر زاد حضرت آمنہ والدہ ماجدہ رسول کریم طلحہ بن عبیداللہ اور سعید بن زید بن عمرو جو کہ اشرافِ مکہ کے نوجوانوں میں سے تھے۔ ان کا باپ حنیف تھا، مسلمانوں کی تعداد کے اضافے، نے اہل قریش کو سخت پریشان کر دیا کیونکہ یہ لوگ مکہ کے بڑے لوگوں میں سے شمار ہوتے تھے، لہٰذا انہوں نے آپ کو پریشان کرنے کے لئے نئے نئے اقدامات شروع کر دیئے۔ انہوں نے تمام اہل مکہ سے کہہ دیا کہ حضرت محمد (ﷺ) کو خانہ کعبہ میں داخل نہ ہونے دو، ہر وقت آپ کی راہ میں پہرہ رہتا، آپ گھر سے نکلتے تو پتھروں کی بارش شروع ہو جاتی اور آپ پر غلاظت کی بارش ہونے لگتی۔ جب بھی آپ گھر سے خانہ کعبہ کی طرف نکلتے، جان کا خطرہ درپیش ہوتا مگر آپ کوئی پرواہ نہ کرتے اور خانہ کعبہ میں جا کر عبادت کیا کرتے۔

خانہ کعبہ سب سے پہلا عبادت گھر ہے جو انسانوں نے بنایا بلکہ دوسری روایت کے مطابق خانہ کعبہ کو آدم علیہ السلام نے بنایا تھا اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی تجدید کی تھی، یہ بھی روایت ہے کہ جب نوح علیہ السلام نے کشتی بنائی اور طوفان آیا تو کشتی میں سوار ہو کر سات بار خانہ کعبہ کا طواف کیا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ گزرتا کہ آپ (ﷺ) خانہ کعبہ تشریف لے جاتے اور خون آلود واپس نہ آتے، کیونکہ اہل قریش آپ پر بالکل رحم نہ کرتے تھے۔ قریش آپ سے اس قدر عناد رکھتے تھے کہ خانہ کعبہ کا بھی احترام نہ کرتے تھے۔ پرانے دستور کے مطابق 'محیط خانہ کعبہ' حرم تھا یعنی ایسی جگہ جہاں کسی کو کسی سے لڑنا نہ چاہیے مگر دونوں دفعہ جب بھی قریش نے پیغمبر اسلام کو شہید کرنا چاہا، خانہ کعبہ ہی میں اس کی کوشش کی۔ سب سے پہلا مسلمان جو راہ اسلام میں شہید ہوا، خانہ کعبہ میں ہی شہید ہوا۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن آپ خانہ کعبہ سے لوٹتے ہوئے قریشیوں کے پتھروں سے اس قدر زخمی ہو گئے کہ گھر پہنچتے ہی بے حال ہو گئے۔

اگلے دن تکلیف کی شدت کی وجہ سے خانہ کعبہ میں نہ جا سکے کیونکہ اٹھنے کی تاب و طاقت نہ تھی۔ اس روز وہ مسلمان جو خانہ کعبہ میں آ کر عبادت کیا کرتے تھے جب انہیں پتہ چلا کہ آپ تشریف نہیں لا سکتے تو وہ خود عبادت میں مشغول ہو گئے۔ سجدے میں گئے تو قریش نے حملہ کر دیا، چند ایک مسلمان زخمی ہوئے اور حضرت حارث ﷺ فرزند حضرت خدیجہؓ زوجہ رسول کریم شہید ہو گئے۔ یہ حضرت خدیجہؓ کے ان دو شوہروں میں سے کسی ایک کے فرزند تھے جن سے رسول اکرم سے پہلے ان کی شادی ہوئی تھی، حارث ﷺ سب سے پہلے مرد تھے جو راہ اسلام میں شہید ہوئے۔ آپ ﷺ کو سجدے کی حالت میں خانہ کعبہ کے اندر شہید کیا گیا۔ اس دن کے بعد سے ہمیشہ ایک طائفہ قریش خانہ کعبہ کے پاس نگرانی کرتا رہتا کہ کوئی مسلمان بیت اللہ میں قدم رکھنے نہ پائے، نہ آپ داخل ہو سکیں اور نہ آپ کا کوئی ساتھی۔

جب نبی کریم (ﷺ) نے یہ دیکھا کہ خانہ کعبہ میں جا کر عبادت نہیں کر سکتے تو ایک چھوٹے سے نشیبی درے کو عبادت کے لئے منتخب کر لیا جہاں آپ (ﷺ) کے پیروکار دن میں دو بار با جماعت نماز ادا کرتے۔

یہاں نماز پڑھنے کا طریقہ یہ تھا۔ بلال حبشی، اذان اور مسلمانوں کو نماز کی دعوت دیتے۔ نماز سے فارغ ہو جانے کے بعد آپ مسلمانوں کو قرآن کی چند ایک آیات سناتے۔ اس دور میں چونکہ مسلمان آزادی کے ساتھ نماز نہ پڑھ سکتے تھے لہٰذا بیابان میں جا کر نماز ادا کرتے اور وہیں جماعت کرتے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ابوسفیان تھا، یہ آپ (ﷺ) سے بہت زیادہ دشمنی رکھتا تھا کیونکہ وہ رسول اللہ کا برادر رضاعی شمار ہوتا تھا، (اس نے اور رسول اللہ نے ایک دایہ کا دودھ پیا تھا۔) ابوسفیان لوگوں سے کہا کرتا۔ ''محمد کو نیست و نابود کر دو تا کہ یہ خطرہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔''

مکہ میں سارے جزیرۃ العرب کے تمام پیروکاران مذہب جمع ہوتے اور دور دور سے سفر کر کے آتے، خانہ کعبہ کے ہر پتھر پر ایک یا دو بت ہوتے تھے۔ جس شخص کا جو بھی مذہب ہوتا خانہ کعبہ میں جاتا اور اپنے مذہب کے مطابق بت کے سامنے رکوع یا سجدہ کرتا۔

اس اصول کے تحت باشندگان مکہ کو حضرت محمد (ﷺ) کے ساتھ دشمنی نہ کرنی چاہئے تھی کیونکہ کسی ایک مذہب کی پیدائش سے اہل مکہ کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کا اظہار ہونا نہ

چاہئے تھا۔ اس نکتے کا جواب یہ ہے کہ دیگر مذاہب جن کے پیروکار مکہ میں بھی موجود تھے یا دوسرے مذاہب کے وہ لوگ جو سفر کر کے مکہ آتے تھے، خانہ کعبہ کے بتوں سے مزاحمت نہ کرتے تھے یعنی وہ گوناگوں مذاہب جن کے بت، خانہ کعبہ میں دھرے تھے، بالکل غیر جانب دار اور غیر متعصب تھے مگر محمد (ﷺ) نے جب اپنی رسالت کا اعلان کیا اور تبلیغ شروع کی تو سارے بتوں کی مخالفت کی، سب کو توڑ ڈالنے کو کہا اور صرف خدائے واحد کی عبادت پر زور دیا۔ اہل مکہ نے دیکھا کہ اگر حضرت محمد کی بات مان لی جائے، خانہ کعبہ سے بتوں کو نکال دیا جائے اور بت پرستی کو بالکل چھوڑ دیا جائے تو ان پر ایک زبردست مصیبت آ جائے گی۔ مکہ کا بین الاقوامی بازار جو چار ماہ ہر سال کھلا رہتا ہے بند ہو جائے گا۔ مکہ میں کھیتی باڑی نہ ہوتی تھی، باشندگان مکہ دو ذرائع سے معاش حاصل کرتے تھے، ایک تجارت سے اور دوسرے اونٹوں کی پرورش سے۔

خانہ کعبہ اسلام سے پہلے یعنی دور جاہلی میں جزیرہ عرب کا سب سے بڑا بت خانہ تھا، جس طرح کعبہ آج بھی تمام اسلامی فرقوں میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اس دور میں بھی تمام عربی مذاہب کے درمیان مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اشہر حرام کے علاوہ مذکورہ مرکزی حیثیت کی وجہ سے سال کے تمام دنوں میں بھی زائرین، مکہ آتے تھے تاکہ اپنے بتوں کی زیارت کریں۔ اگر وہ بتوں کو نکال پھینکتے تو کوئی بھی زیارت کے لئے نہ آتا، لہٰذا مکہ کی بین الاقوامی منڈی جو سال کے چار مہینے اشہر حرام میں (جن میں جنگ حرام تھی) کھلی رہتی تھی، بند ہو جاتی۔ اس وجہ سے اہل مکہ اقتصادی اعتبار سے دین محمدی کو اپنے لئے خطرناک سمجھتے تھے اور سوچتے تھے کہ اگر حضرت محمد نے ترقی حاصل کر لی تو ہم اقتصادی اعتبار سے تباہ ہو جائیں گے۔ اہل مکہ کی دشمنی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ جب آپ نے بتوں پر حملہ کیا تو گویا اہل عرب کے اجداد پر بھی حملہ کیا اور ان کے عقیدے کو (جن میں سے بعض اس دور میں زندہ بھی تھے) باطل قرار دیا۔

بوگس دلیل:

چونکہ اہل عرب کے سارے اجداد، بت پرست تھے اور نبی اکرم (ﷺ) ان سے صاف صاف کہتے تھے کہ بت پرستی کو چھوڑ دو۔ اہل عرب اپنے اجداد کا اس قدر احترام کرتے تھے جیسے بتوں کا، گویا انہیں پوجتے تھے خصوصاً مذہبی عقائد کو اہل عرب بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھتے

تھے۔ جواباً وہ کہتے کیا ہم اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ دیں؟ ایک اصول کلی جو تمام دنیا میں ہر دور میں رہا ہے اور آج تک باقی ہے، یہ ہے کہ لوگ مذہب اور مذہب کے ظاہری احکامات کا تو احترام کرتے ہی ہیں مگر دراصل باطنی طور پر ان کی یہ عقیدت مندی افراد کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ کوئی بھی نہیں دیکھتا کہ ایک مسلمان کے باطنی عقائد کیا ہیں، آیا وہ جس مذہب کی پیروی کا مدعی ہے اس پر عقیدہ بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ بلکہ لوگ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ آج وہ ظاہری اعمال بجا لاتا ہے یا نہیں؟ اور مذہب کے ظاہری احکامات کا احترام کرتا ہے یا نہیں؟ مذہب کی ظاہری اقدار، وراثت میں انسان کو اپنے اجداد سے ملتی ہیں۔ ہر نسل بغیر سوچے سمجھے یہ چاہتی ہے کہ وہ اپنی ظاہری مذہبی اقدار آنے والی نسل کو منتقل کر دے۔ اہل عرب میں مذہبی احکامات کا احترام، اخلاف کو اسلاف سے ملا تھا جو بہت قوی تھا۔ کسی شخص کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ مذہبی عقیدے کو بدل سکے اور یہ کہہ سکے کہ تمہارے اجداد کچھ بھی نہ جانتے تھے غلط راہ پر تھے۔ حضرت محمد یہی باتیں کہتے تھے اور اسی لئے اہل مکہ ان کے دشمن تھے۔

جب قریش کو معلوم ہوا کہ آپ اور آپ کے پیروکار بیابان میں جا کر عبادت کرتے ہیں تو وہ اس راہ میں بھی آڑے آئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص جو اسلام لا چکے تھے اس طرح روایت کرتے ہیں:

''ہم مسلمان خانہ کعبہ میں اپنا اجتماع نہیں کر سکتے تھے لہٰذا کسی مسلمان کے گھر میں اجتماع کرتے اور وہاں عبادت کرتے مگر یہ بات بھی ممکن نہ رہی تھی کیونکہ قریش ہماری بڑی کڑی نگرانی کرنے لگے تھے۔ جب ہم یہ چاہتے کہ کسی مسلمان کے گھر جا کر عبادت کریں تو ہمیں ادھر جانا پڑتا لہٰذا اہل محلہ ہمیں دیکھتے اور حملہ کر دیتے تا کہ ہمیں قتل کر دیں، یہ دیکھ کر ہم مکہ سے باہر اجتماع کرنے لگے تا کہ ہماری کسی کو اطلاع نہ ہو سکے۔ ہم مکہ سے بہت دور جا کر اجتماع کرتے اور وہاں عبادت کرتے۔ جب عبادت کر چکتے تو اس کے بعد کسی اور مقام کا انتخاب کرتے تا کہ اگلے دن وہاں جمع ہوں کیونکہ اہل قریش اس قدر سختی سے ہماری نگرانی کر رہے تھے کہ اگر ہم پے در پے دو روز کسی جگہ اجتماع کر لیتے تو انہیں علم ہو جاتا۔ ایک دن ہم درہ ابو درب میں جمع ہوئے، وہاں جسم کو پاک کرنے کے بعد عبادت میں مشغول ہو گئے، ابھی ہم نماز میں مصروف ہی تھے کہ قریش کے بڑے بڑے سرداروں نے ہلہ بول دیا، ان میں ابوسفیان اور اخنس بن شریف بھی تھے۔ ان

لوگوں نے ہمیں اپنی مدافعت پر مجبور کر دیا۔ وہاں اونٹ کی ایک بڑی سی ہڈی پڑی تھی میں نے وہ اٹھالی اور پوری طاقت سے ایک شخص کے سر پر دے ماری، اس کے سر سے خون جاری ہو گیا اور وہ اسی حالت میں وہاں سے فرار ہو گیا۔ میں سب سے پہلا شخص ہوں جس نے اسلام کی راہ میں ایک کافر کا خون زمین پر بہایا"۔

اس دور میں صرف ایک شخص ایسا تھا جو اپنے گھر سے موت کے خوف کے بغیر باہر نکلتا تھا اور وہ خود رسول مقبول تھے۔ دوسرے لوگ گھروں سے باہر نہ نکلتے تھے مگر یا تو صبح طلوع ہونے سے پہلے یا غروب شمس کے بعد جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوتے، ان دونوں اوقات میں وہ اس طرح گھر سے نکلتے تھے کہ کوئی شخص انہیں دیکھنے نہ پائے یا کم از کم وہ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ یہ مسلمان ہیں، انہیں دیکھنے نہ پائیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی تعداد بڑھتی ہی رہی مگر بہت کمی کے ساتھ۔ جو لوگ داخلِ اسلام ہوتے تھے ان میں سے بیشتر غلام یا مزدور غریب یا وہ لوگ ہوتے تھے جنہیں خواص واشراف نے بدکردار قرار دے رکھا تھا۔

حضرت محمد (ﷺ) خواص واشراف مکہ کی نظر سے، لوگوں کو نہیں دیکھتے تھے، وہ تو یہ دیکھتے تھے کہ آیا یہ شخص دراصل بدکردار ہے یا نہیں؟ خواہ اشراف مکہ کی ہیئت حاکمہ اسے بدکردار قرار دیتی ہو یا نہ دیتی ہو۔ دین مسیح میں بھی کئی ایک ایسے اولیائے کرام گزرے ہیں جنہیں حکومت وقت نے بدکردار قرار دے کر ان کے خون کو مباح کر دیا تھا مگر بڑا فرق ہے اس بات میں کہ خواص واشراف کسی کو بدکردار قرار دیتے ہوں یا یہ کہ درحقیقت وہ بدکردار ہوں۔ جب کبھی آپ (ﷺ) کسی بدکردار کو مائل اسلام دیکھتے تو غور کرتے کہ آیا یہ شخص درحقیقت بدکردار ہے یا یہ کہ صرف اشراف مکہ اسے بدکردار سمجھتے ہیں۔ اگر دوسری صورت ہوتی تو آپ (ﷺ) اس کو داخلِ اسلام کر لیتے اور اگر پہلی صورت ہوتی تو دیکھتے کہ آیا وہ درحقیقت اپنی بدکرداری پر پشیمان ہے اور سچی توبہ کرنا چاہتا ہے تو آپ اس کے اسلام کو قبول کر لیتے۔ اس کی بہترین مثال ابوذر غفاری ﷛ ہیں جو بنو غفار سے تھے۔

ذاتی مشاہدہ

مکہ کے شمال میں ایک ایسی سرزمین ہے جسے میں دنیا کی وحشت انگیز ترین زمین سمجھتا

ہوں، یہاں ایک قبیلہ بنوغفار رہتا تھا ان لوگوں کا مشغلہ راہزنی تھا۔ آج سے چودہ سو سال پہلے اس سرزمین کا یہ نقشہ تھا کہ یہاں کی سرزمین اتنی سنگلاخ، گرم تھی کہ وہاں کیکر کے کانٹے بھی جل جاتے تھے۔ اگر کوئی شخص اس سرزمین کو عبور کرنا چاہے تو اس کے سامنے چھوٹے ٹیلے آتے ہیں جن کے دامن میں بہ خط عمودی ایک قطعہ ہے جیسے کسی نے چھری سے کاٹ دیا ہو۔ اس کے آخر میں نہایت گہرے، خشک اور درے خوف ناک ہیں کہ کوئی مسافر اوپر سے نیچے کو دیکھے تو ان سیاہ، سبز اور زرد پتھروں کی ناہمواری کو دیکھ کر کانپ اٹھتا ہے۔ جب میں نے اس درے کو عبور کیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں آغاز خلقت میں ہوں یا کرۂ قمر میں آ گیا ہوں کیونکہ زمین کرۂ ماہ کی طرح اونچی نیچی اور درہم و برہم تھی، بعض، طبقے بالکل سیاہ قبر کی طرح معلوم ہو رہے تھے اور بعض بالکل زرد۔ موسم گرما میں جب آفتاب ان چٹانوں پر آتا ہے اور سخت دھوپ پڑتی ہے تو یہاں کی حرارت اور ہوا ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ اس صحرا میں ذرا انسان باہر نکلے تو بس مر ہی جائے۔

☆......☆......☆

بنوغفار جن کے ایک فرد ابوذر بھی تھے، اس سرزمین میں رہتے تھے اور لوٹ مار کر کے زندگی بسر کرتے تھے۔ اہل عرب میں لوٹ مار کرنا کوئی عیب کی بات نہ تھی وہ اسے ''غزوہ'' سے تعبیر کرتے تھے بلکہ اگر غزوہ کامیاب رہتا تو ان کے لئے باعث افتخار ہوتا تھا۔ بدو عرب کی رسومات کے مطابق، غزوہ پوشیدہ طور پر کیا جاتا تھا۔ اس طرح کہ جس قبیلے کو لوٹا جائے وہ بالکل غافل ہو۔ غزوہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ کسی کا خون نہ بہایا جائے، لٹنے والے قبیلے کا ایک بھی فرد قتل نہ کیا جائے اور کسی عورت یا بچے کا مال نہ چھینا جائے۔ اگر عورتیں قیمتی لباس یا گردن بند یا جھانور وغیرہ پہنے ہوتیں تو لوٹنے والے ان پر ہاتھ نہ ڈالتے تھے، نہ ہی وہ کسی عورت سے کسی قسم کا تمتع کرتے تھے۔ ہاں عورتوں سے یہ کہہ سکتے تھے کہ اپنے قیمتی زیورات اور کپڑے اتار دیں۔ جب عورتیں کپڑے یا زیورات اتارنے لگتیں تو غزوہ کرنے والوں کا یہ فرض تھا کہ وہ منہ پھیر کر کھڑے ہو جائیں تا کہ کسی عورت کے ننگے جسم پر ان کی نظر نہ پڑے۔ حسب رسومات عرب سال میں چار ماہ غزوہ کرنا حرام تھا جنہیں وہ ''اشہر حرام'' سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ لوگ جو زیارت کعبہ کے لباس میں ہوتے تھے یعنی احرام باندھے ہوتے تھے انہیں بھی لوٹنا جائز نہ تھا۔ غزوہ میں کسی کا

قتل جائز نہ تھا الّا یہ کہ لٹنے والے قبیلے اپنے مال کی حفاظت کے لئے تلوار اٹھالیں تب ان کا قتل کرنا جائز سمجھا جاتا تھا۔ بنوغفار جو مکہ کی شمالی جانب رہتے تھے اور رسومات جواں مردی کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ وہ حرام مہینوں میں بھی لوٹ مار کرتے تھے حتیٰ کہ وہ لوگ جو احرام باندھے ہوتے تھے انہیں بھی لوٹ لیتے تھے۔ ایک دفعہ ماہ ذیقعدہ میں، جو اشہر حرام میں سے ایک ماہ ہے طائفہ غفار نے ایک قافلہ سے جو ان کی سرزمین سے عبور کر رہا تھا حملہ کیا۔ انہوں نے صرف لوٹ مار پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ کئی مردوں کو بھی قتل کیا اور عورتوں پر بھی حملہ کیا۔ ابوذر نے جب عورتوں اور بچوں کی آہ وزاری سنی اور یہ دیکھا کہ بچے اپنی ماؤں کی لاشوں کے پاس کھڑے رو رہے ہیں تو اس منظر کو دیکھ کر ان کا دل بھر آیا اور انہوں نے تہیہ کرلیا کہ اپنی قوم کو چھوڑ دیں گے اور کبھی بھی غفاریوں کے ساتھ زندگی بسر نہیں کریں گے۔

نیک روحیں

ابوذر اپنی والدہ اور اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر وہاں سے نکل کھڑے ہوئے قبیلے سے خارج ہو گئے اور تپتے ہوئے صحرا کی راہ لی۔ اہل عرب میں جو کوئی بھی اپنے قبیلے کو چھوڑتا یا قبیلے سے نکالا جاتا، اس کا فنا ہو جانا یقینی تھا۔ بدو عرب افراد بنوغفار کا خون تو ویسے ہی حلال سمجھتے تھے، جب کبھی انہیں یہ معلوم ہوتا کہ یہ شخص قبیلہ غفار سے ہے تو اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیتے کیونکہ بنوغفار، رسوم وقوانین عرب کی پابندی نہ کرتے تھے اور اصولِ جواں مردی کو پیروں تلے روندتے تھے۔ ابوذر ایک مدت کی صحرانوردی کے بعد اس مقام پر پہنچ سکے جہاں کی ان کی والدہ تھیں انہوں نے ماں اور بھائی کو وہاں چھوڑا اور تنہا بیابان کی طرف رخ کرلیا۔ چند ماہ تک یہ مرد بدوی، بیابان عربستان میں تنہا چکر لگاتا رہا حتیٰ کہ ایک ایسے علاقے میں پہنچ گیا جہاں گوہ کی کثرت تھی اور کچھ جڑی بوٹیاں ایسی تھیں جن کو کھا کر گزارہ ہو سکتا تھا۔ جو شخص عرب نہیں ہے وہ کبھی اس امر کا اندازہ نہیں لگا سکتا کہ ایک انسان کس طرح گوہ اور نباتات کی جڑوں پر زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی عرب کر سکتا ہے جس نے بچپن سے بھوک، پیاس پر صبر کیا ہو اور رفتہ رفتہ بھوک پیاس پر صبر کرنا اس کی فطرت بن گئی ہو۔

انگلستان کے سر رچرڈ برٹن جس نے 1850ء میں عربستان کی سیاحت کی (اس دور میں

آج کی طرح گاڑیاں نہ تھیں) اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:

"بدو عربوں کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان بھوک سے نہیں مرتا، کھانے سے مرتا ہے۔ غذا موت کا سبب بنتی ہے، جب تک کوئی بدو صحرا میں بھوکا رہتا ہے سالم رہتا ہے مگر جب شہر میں آتا ہے اور خوب خوب کھاتا ہے تو بیمار ہو جاتا ہے اور دو تین سال میں مر جاتا ہے۔"

چند ماہ تک ابوذر بیابان میں بھوک پیاس پر صبر کرتے رہے اور رات دن کی تنہائی پر قانع رہے۔ چاندنی راتوں میں بیابان کے ستاروں تلے غور وفکر کیا کرتے پھر مکہ کی راہ اختیار کی اور تیس دن تک وہاں رہے۔ اس طرح کہ کسی کو پتہ نہ چلا وہ کس قبیلے سے ہیں۔

ان تیس دنوں میں انہوں نے حضرت محمد (ﷺ) کی وجہ شہرت سنی کہ وہ لوگوں کو واحد خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ لوگ بدی سے پرہیز کریں اور کفر وشرک کو چھوڑ دیں۔ تیسویں دن انہوں نے طے کر لیا کہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوں لہٰذا ایک شخص سے آپ کے گھر کا پتہ پوچھنے لگے۔ اس شخص نے بڑے تعجب سے انہیں دیکھا اور چیخ کر کہنے لگا "اے قریشیو! دوڑو اسے قتل کر دو یہ مسلمان ہے" لوگ ان پر حملہ آور ہوئے تو وہ بھاگے اہل قریش نے ان کا تعاقب کیا اور پتھر مارنا شروع کر دیئے۔ ابوذر خود بیان کرتے ہیں کہ ان کے پتھروں سے میں بے جان ہو گیا۔ وہ سمجھے کہ مر چکا ہوں لہٰذا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جب مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ تمام جسم لہولہان ہو چکا ہے۔ رات گئے دو شخص آئے اور مجھے اٹھا کر ایک گلی میں لے گئے۔ اس کے بعد مجھے پتہ چلا کہ ان میں سے ایک ابوبکر تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت ابوبکر ؓ کو ایک مسلمان کے سنگسار کیے جانے کی خبر پہنچی تو رات کی تاریکی چھا جانے کے بعد وہ ایک مسلمان کو ساتھ لے کر ابوذر کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اگلے دن ان کی رسول اللہ سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے ان کا نام دریافت فرمایا اور پوچھا کس قبیلے سے ہو؟

ابوذر نے عرض کی "میں قبیلہ غفار سے ہوں، اس قبیلے کی حرکات سے نالاں ہوں لہٰذا میں نے انہیں چھوڑ دیا اور راہ صحرا اختیار کی، ایک عرصہ تک بیابانوں میں گھومتا پھرتا رہا حتیٰ کہ مکہ چلا آیا، یہاں آ کر میں نے سنا کہ آپ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ آپ سے ملاقات کروں اور آپ کے وسیلہ سے خدائے واحد کو پہچانوں۔"

آپ نے دریافت فرمایا: "مکہ میں کب سے ہو؟"

ابوذر بولے، "تیس دن گزر چکے ہیں۔"

آپ نے پوچھا، "اس عرصہ میں گزران کا کیا وسیلہ تھا؟"

ابوذر بولے۔ "کچھ بھی نہیں۔"

آپ نے سوال فرمایا، "پھر کیسے زندہ رہے؟"

انہوں نے کہا، "تیس دن صرف آبِ زمزم پیتا رہا"۔

آپ نے دریافت فرمایا، "ان تیس دنوں میں کچھ کھایا بھی؟"

ابوذر نے عرض کی، "کچھ بھی نہیں۔"

ہم آج کل کے لوگ ان باتوں پر حیرت نہیں کرتے کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ انسان اگر تیس دن کچھ نہ کھائے اور صرف پانی پیتا رہے تو وہ زندہ رہ سکتا ہے مگر اس کا وزن بہت کم ہو جائے گا کیونکہ جسم نے جو کچھ غذائی مواد جمع کئے ہیں وہ انہیں خرچ کرتا رہے گا۔ جو لوگ بھوکے رہنے کے عادی ہیں وہ بغیر کچھ کھائے زندہ رہ سکتے ہیں بشرطیکہ پانی پیتے رہیں۔ رسول مقبول (ﷺ) یہ جانتے تھے کہ ابوذر، غفاری ہیں یعنی راہزن ہیں۔ پھر بھی آپ نے انہیں مذہب اسلام میں داخل کر لیا۔ کیونکہ آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اپنے افعال پر پشیمان ہیں، سچی توبہ کر رہے ہیں اور راہ حق کے متلاشی ہیں۔ حضرت ابوذر صدر اسلام کی ایک نمایاں شخصیت تھے، انہوں نے سارے غفاریوں کو مسلمان کیا پھر ان لوگوں نے چوری تک نہیں کی جب کہ پہلے یہ سب راہزنی کرتے تھے۔

ہم نے حضرت ابوذرؓ کا یہ قصہ اس لیے لکھا ہے تا کہ یہ ثابت کر دیں کہ حضرت محمد ان لوگوں کو جو عام نظروں میں بدکردار ہوتے تھے مگر توبہ کر لیتے تھے، دین اسلام میں داخل کر لیتے تھے۔ اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہل مکہ آپ (ﷺ) کے اتنے سخت دشمن تھے کہ جو کوئی آپ (ﷺ) کے گھر کے بارے میں دریافت کرتا اسے بھی قتل کر دیتے تھے کیونکہ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے یا مسلمان ہونا چاہتا ہے تبھی تو خانہ مبارک کا پتہ دریافت کرتا ہے۔

یہ ایک تعجب انگیز بات ہے کہ اہل مکہ آپ (ﷺ) کو شہید کیوں نہ کر سکے جب کہ سارے

کے سارے آپ کے دشمن تھے؟ آپ کو شہید نہ کر سکنے کی وجہ یہ تھی:

قریش کی دس شاخیں تھیں جن میں سے ایک شاخ بنو ہاشم کہلاتی تھی اور حضرت محمد (ﷺ) ان ہی میں سے ایک فرد تھے۔ اگر بقیہ نو قبیلے آپ کو شہید کرنے کا اقدام کرتے تو انہیں حسب دستور عرب بنو ہاشم کو خون بہا دینا پڑتا، ورنہ اپنے کیفر کردار کو پہنچنا پڑتا۔ اہل قریش نے آپ سے کہا تھا۔ "اے محمد! اگر بنو ہاشم تیرے پشت پناہ نہ ہوتے تو ہم تجھے سنگسار کر کے نیست و نابود کر دیتے۔" رہے بنو ہاشم، سو وہ دو مرتبہ آپ کے قتل کے درپے ہوئے مگر ایسا نہ کر سکے اور باز رہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو ایک طاقتور حامی مل گیا تھا۔ تاہم جب بھی آپ گھر سے باہر نکلتے لوگ پتھر برساتے تھے۔

ابو جہل اور حمزہ

ایک دن ایک گروہ، ابو جہل کے اکسانے پر آپ پر پتھر برسا رہا تھا جس سے آپ کا جسم مبارک لہولہان ہو گیا تھا۔ ایک شخص جو یہ منظر دیکھ رہا تھا آپ کے چچا حضرت حمزہ کے پاس گیا اور سارا قصہ بیان کیا۔ حمزہ ایک پہلوان تھے۔ وہ اسی وقت شکار سے واپس آئے تھے۔ اس شخص نے کہا، آپ ایک بہادر آدمی ہیں، آپ کی غیرت یہ کس طرح برداشت کرتی ہے کہ لوگ آپ کے بھتیجے کو پتھروں سے ماریں، لاتیں جڑیں، گالیاں دیں لیکن آپ پرواہ نہ کریں۔ حمزہ کو اس وقت تک دین محمدی سے کوئی دلچسپی نہ تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ اجداد کے عقیدے کے خلاف ہیں جب کہ اجداد کا عقیدہ ان کے نزدیک بڑا ہی محترم تھا۔ مگر جب انہوں نے سنا کہ لوگ ان کے بھتیجے کو پتھر مار رہے ہیں، لاتیں برسا رہے ہیں اور گالیاں دے رہے ہیں وہ طیش میں آ گئے اور اس شخص سے پوچھا: "میرے بھتیجے کو کیا گالیاں دیتے ہیں؟" اس نے لوگوں کی دی ہوئی چند ایک گالیاں سنائیں تو ان کا سرخ سرخ رنگ سیاہ پڑ گیا کہ لوگ اتنی غلیظ گالیاں دیتے ہیں۔

عربوں کے نزدیک یہ بڑا جرم تھا کہ کسی شخص کو گالیاں دیتے وقت اس کے عزیزوں کا نام لیا جائے۔ قبیلے کے کسی فرد کا یہ سن لینا کہ قبیلے کو گالی دی گئی ہے پورے قبیلے کے سن لینے کے مترادف تھا کیونکہ خاندان کے سارے افراد ایک ہیں اور سب خون میں شریک ہیں۔ چنانچہ

حضرت حمزہ ﷺ تلوار لے کر موقع پر پہنچ گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ سب کا سرغنہ، سنگ باری کرانے والا اور گالیاں دلانے والا ابو جہل ہے لہٰذا انہوں نے اس کے گھر کا رخ کیا اور زور سے اس کو تلوار کا دستہ مار کر کہا۔ ''ارے! تو یہ خیال کرتا ہے کہ محمد کا کوئی حامی نہیں؟ اسی لیے ان کو پتھر مرواتا ہے اور گالیاں دلاتا ہے۔ میں آج سے دین محمد کو قبول کرتا ہوں، جو کوئی بھی آج سے انہیں کچھ کہے گا میں اسے دیکھ لوں گا۔'' حضرت حمزہ کا اسلام لے آنا آپ کے لئے بڑا مفید ثابت ہوا کیونکہ حمزہ پہلوان تھے اور نہایت جرأت مند تھے، اس کے باوجود بھی اہل قریش آپ کو ستاتے رہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کے چچا حمزہ اسلام لے آئے ہیں، ستانے میں کمی نہ کرتے تھے۔

اس کے بعد حضرت محمد اور صحابہ، عبادت کرنے کے لئے ایک گھر میں جمع ہوتے جو صفا پہاڑ پر واقع تھا۔ یہ گھر خانہ کعبہ کے بالکل سامنے تھا، میں نے اس گھر کو دیکھا ہے۔ آج کل یہاں ایک مدرسہ ہے۔ جب بھی مسلمان یہاں عبادت کے لئے جمع ہوتے، کچھ لوگ شمشیر بدست دروازے پر نگرانی کرتے کیونکہ ہر دم یہ کھٹکا رہتا تھا کہ قریش حملہ کر کے انہیں قتل کر دیں گے۔

☆......☆......☆

اہل عرب اس وقت تک موت سے ڈرتے ہیں جب تک کہ ان کے ہاتھوں میں تلوار نہ ہو اور جب تلوار ہاتھ میں آ گئی تو موت کا خوف ان کے دل سے نکل جاتا ہے۔ ایک بدو اگر شمشیر بدست ہو جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو دس مردوں کے برابر سمجھنے لگتا ہے۔ اہل عرب کا ایمان ہے کہ موت وقت پر آتی ہے اور یہ انسان کے ہاتھوں میں نہیں ہے، اللہ کے ہاتھوں میں ہے لہٰذا ان کا عقیدہ تھا کہ اگر کوئی تلوار ہاتھ میں لے کر میدان جنگ میں اتر آتا ہے تو وہ اس وقت تک مارا نہیں جا سکتا جب تک کہ اس کی موت کا وقت نہ آ جائے۔ گو موت کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ تھا تاہم جنگ کے وقت وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالتے تھے اور دل ٹھنڈا رکھتے تھے۔

جب آپ کے چچا حضرت حمزہ نے اسلام کو قبول کر لیا تو اور لوگ بھی مسلمان ہو گئے، اس طرح مسلمانوں کی کل تعداد تیس سے تجاوز کر گئی۔ اہل مکہ اسلام کی یہ وسعت دیکھ کر بپھر گئے۔ خصوصاً اہل قریش، لہٰذا دار الندوہ یعنی مجلس شوریٰ مکہ میں وہ مشورے کے لئے جمع ہوئے تاکہ دین جدید کے خاتمہ کی کوئی سبیل نکالیں مگر وہ اس مشورے سے کوئی نتیجہ نہ نکال سکے۔ عرب کے

سرداروں میں سے ایک شخص کا نام عمر تھا، جب مجلس برخاست ہو گئی اور تمام مشائخ قریش دار الندوہ سے باہر نکل گئے تو اس نے کہا۔ ''میں محمد کو قتل کر دوں گا اور ان کے ''شر'' سے اہل مکہ کو محفوظ کر دوں گا'' مشائخ قریش آپ کے قتل کئے جانے کے متمنی تھے مگر کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی۔ عمر اس کے لئے آمادہ ہو گئے۔ عمر بن خطاب مکہ کے متعصب اور دبنگ قسم کے مرد تھے، علاوہ ازیں وہ سب سے بلند قامت بھی تھے۔ اہل مکہ جانتے تھے عمر بن خطاب کے منہ سے جو کچھ نکل جاتا ہے اسے رد نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ کسی کے بارے میں یہ کہہ دیں گے کہ فلاں شخص کو قتل کر دوں گا تو بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ اسے قتل کر ہی ڈالیں گے۔ لوگ سمجھ لیتے تھے کہ وہ شخص مر چکا ہے۔

عمر رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

عمر بن خطاب سر عام اعلان کر تو چکے تھے کہ وہ پیغمبر کو شہید کر کے اسلام کا نام ہی ختم کر دیں گے مگر قدرت الٰہی کا کچھ اور ہی فیصلہ تھا۔ انہوں نے یہ اعلان 614ء میں یعنی ہجرت سے آٹھ سال پہلے کیا تھا۔ اور اس روز مسلمان اور رسول اکرم ایک گھر میں جمع تھے جو صفا پہاڑ پر واقع تھا۔ عمر آپ کے قتل کرنے کے ارادے سے اپنے گھر گئے، تلوار اٹھائی اور صفا کی طرف چل دیئے۔ راستے میں نعیم بن عبداللہ مل گئے جو اسلام لا چکے تھے مگر قریشیوں کو اس کا علم نہ تھا کیونکہ انہوں نے اپنے اسلام لانے کو چھپا رکھا تھا۔ نعیم نے ان سے دریافت کیا۔ اے عمر کہاں کا ارادہ ہے؟ عمر بہت بلند آواز سے بولا کرتے تھے، چیخ کر بولے۔ ارے نعیم میں جب سے پیدا ہوا ہوں میں نے محمد کے سوا کسی کو نہیں دیکھا جس نے ہماری اس قدر توہین کی ہو حتیٰ کہ ہمارے بڑے سے بڑے دشمن نے بھی اتنا نہیں کیا جتنا کہ وہ کر چکے ہیں۔ یہ شخص جو دینِ جدید لایا ہے اہلِ مکہ میں نفاق ڈال دیا ہے۔ ہمارے اجداد کو برا کہتا ہے، ہمارے بزرگوں کے عقیدے کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ہم اپنے خداؤں کی پرستش کو چھوڑ دیں۔ میں نے آج تک صبر کیا اور صرف اس لیے صبر کیا کہ آخر محمد قریش سے ہے مگر آج تو میں اس کی بے باکی سے تنگ آ گیا ہوں، میں جا رہا ہوں تا کہ اہل مکہ کو اس شر سے محفوظ کر دوں۔ نعیم جانتے تھے کہ عمر ایک سادہ، صادق الوعد، شریف اور راست گو انسان ہیں، ان کی بات کو بدلا نہیں جا سکتا اِلّا یہ کہ کوئی

ایسی بات کہہ دی جائے جو قرین عقل ہو کہ اس کے خیالات کو بدل سکے کیونکہ وہ عقل و انصاف والی بات قبول کر لیتا ہے اور اس پر اصرار نہیں کرتا۔ اس بنا پر وہ عمر کے پیچھے دوڑے اور کہا۔ ''تم ذرا ٹھہرو تو سہی میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں'' عمر ٹھہر گئے۔ نعیم پاس پہنچے تو چونکہ عمر بہت بلند قامت تھے لہٰذا ان کا سر بھی ان کے سینے تک نہ پہنچ سکا۔ عمر کی یہ عادت تھی کہ تلوار کو نیام سے باہر نہ نکالتے تھے مگر بوقت جنگ اور غیر زمانہ جنگ میں اگر غصہ کا اظہار کرتے تو لکڑی سے مخالف کو مارتے اس دن وہ تلوار لئے ہوئے تھے جب عمر ٹھہر گئے تو نعیم بولے۔ ''اے عمر! آپ محمد کے دین جدید پر چراغ پا ہیں کیونکہ اس مذہب نے مکہ میں نفاق کا بیج بو دیا ہے لیکن اس سے پیشتر کہ آپ اہل مکہ کے نفاق کا علاج کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے گھر کی اصلاح کریں''۔ عمر نے کہا، ''کیا مطلب؟'' نعیم بولے آپ کے قریبی عزیزوں میں سے دو افراد مسلمان ہو چکے ہیں اور آپ ہی کے گھر میں رہتے ہیں۔ ایک تو آپ کی بہن فاطمہؓ ہے اور دوسرا اس کا شوہر سعید بن زید ہے۔ باشندگان مکہ کی اصلاح کرنے سے پہلے ان کی اصلاح کیجئے، مناسب تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ عمر ایک سیدھے اور منطقی انسان تھے، نعیم کی بات سے قائل ہو گئے کہنے لگے، تم سچ کہتے ہو اس سے پہلے کہ میں مکہ سے اسلام کی بیخ و بنیاد کو اکھاڑ کر پھینکوں، مجھے چاہئے کہ پہلے اپنے گھر کو دیکھوں چنانچہ وہ صفا کی طرف بڑھنے سے باز رہے اور اپنے گھر کی طرف چلے گئے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی بہن فاطمہؓ سعید بن زید اور تیسرا شخص خباب (یہ بھی مسلمان ہو چکے تھے) تینوں قرآن پڑھ رہے ہیں، انہوں نے کوڑا اٹھایا اور بہن پر برس پڑے۔ اتنا مارا کہ ان کے جسم کے مختلف حصوں سے خون جاری ہو گیا۔ کہنے لگے۔ محمد کے دین کو چھوڑنا ہی پڑے گا۔ فاطمہؓ نے جواب دیا اگر آپ اس کوڑے سے مارتے مارتے مجھے مار بھی ڈالیں تو میں ایسا نہیں کروں گی۔ اگر آپ قرآن کو پڑھیں گے تو آپ کو خود پتہ چل جائے گا کہ دین محمد (ﷺ) برحق ہے۔

یہاں دو روایتیں ہیں:

ایک یہ کہ حضرت عمر نے سعید بن زید کے ہاتھ سے قرآن کو چھین کر پڑھنا شروع کر دیا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بہنوئی سعید سے کہا کہ مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ۔ یہ بات انہوں نے اس لئے کہی تھی تا کہ یہ دیکھیں کہ قرآن ایسا کیا اثر رکھتا ہے کہ ہمشیرہ کہہ رہی ہیں اگر

آپ قرآن کو سنیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ دینِ برحق ہے۔

پہلی روایت کہ حضرت عمر نے سعید ﷺ کے ہاتھوں سے قرآن کو چھین کر پڑھنا شروع کر دیا، تاریخی واقعات کے مطابق نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں یعنی ہجرت سے آٹھ سال پہلے قرآن اس صورت میں جیسا کہ ہم اب دیکھتے ہیں موجود نہ تھا بلکہ پورے دورِ نبوت میں بھی موجود موجودہ شکل میں نہ تھا۔ اس لئے کہ قرآن خلافتِ عثمانی میں بصورت کتاب بنا۔ ہاں ایسا ہو سکتا تھا کہ چند آیاتِ قرآنی کو بعض مسلمانوں نے لکھ لیا ہو اور ان تین افراد میں سے بھی کسی نے کچھ لکھ لیا ہوتا کہ بھول نہ جائیں۔ اس طرح یہ آیتیں حضرت عمر کے ہاتھ لگ گئی ہوں۔ ہمیں پتہ نہیں کہ یہ آیتیں کس چیز پر تحریر تھیں، بہرحال حضرت عمر نے آیتوں کو پڑھا اور بہت زیادہ متاثر ہوئے، اپنی بہن کی پیشانی کو بوسہ دیا، معافی چاہی اور کہا۔ ''میں ابھی ابھی مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔''

اسی وقت وہ تینوں حضرت عمر ﷺ کے ساتھ صفا پہاڑ کی طرف روانہ ہو گئے جہاں رسول مقبول ایک گھر میں موجود تھے۔ وہاں جو مسلمان تھے انہوں نے اس عالم میں عمر کو آتے دیکھا تو انہوں نے خیال کیا کہ قتل و قتال کے ارادے سے آ رہے ہیں مگر عمر نے انہیں مطمئن کیا اور کہا میں اسلام لانے کے لئے آیا ہوں۔ عمر بن الخطاب چالیسویں فرد تھے جو اسلام میں داخل ہوئے۔

حضرت عمر ﷺ کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو بڑی تقویت پہنچی، انہیں صدرِ اسلام کی تاریخ میں سب سے موثر کردار سمجھنا چاہئے کیونکہ عمر ﷺ بڑے بلند قامت، بڑے بڑے قوی شانوں والے اور بڑی بلند آواز والے تھے۔ جب وہ کڑک کر بولتے تو ان کی آواز ہزار قدم تک جاتی۔ وہ تمام صفات جو ایک اصیل بدو میں ہونی چاہئیں ان میں موجود تھیں۔ وہ کبھی ممنوعہ باتوں (منہیات) کے پاس نہ پھٹکے اور ایک بادیہ نشین عرب کی طرح کھانے پینے میں انتہائی کفایت شعاری سے کام لیتے تھے۔ منہیات سے ہماری مراد امور ہیں جو جاہلی دور میں اسلام سے پہلے اہل عرب میں ممنوع تھے۔ عمر ﷺ دونوں کھانوں کے وقت صرف پانچ لقمے کھاتے اس سے زیادہ کبھی نہ کھاتے کچھ بعید نہیں اگر مافوق العادۃ کاموں کے انجام دینے کا سرچشمہ ان کی یہی عادت ہو جب آپ خلیفہ بنے تو ہمیشہ پندرہ رات دن مسلسل کام کرتے اور کسی قسم کی تھکن محسوس

نہ کرتے، اور کبھی بھی کسی مجرم کی سزا سے صرف نظر نہ کرتے، نہ سزا میں تخفیف کرتے مگر یہ بھی محلل تھا کہ کسی بے گناہ کو ستائیں۔

وہ دس سال خلیفۃ المسلمین رہے اور اس قلیل عرصہ میں دنیا کی تین بڑی بھاری سلطنتوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا یعنی ایران، مصر اور شام کو داخلِ اسلام کر لیا مگر باوجودیکہ وہ دنیائے قدیم کے ایک بڑے حصہ پر حکومت کر رہے تھے، زمین پر بوریا بچھا کر بیٹھتے جو کھجور کے پتوں سے بنا ہوا ہوتا تھا۔ حضرت عمر جس دن صفا پہاڑ پر مشرف بہ اسلام ہوئے انہوں نے حضرت محمد (ﷺ) سے عرض کی ہم خانہ کعبہ میں جا کر عبادت کریں گے۔ مسلمان پہلی بار (تعداد زیادہ ہونے کے بعد) اجتماعی صورت میں پہاڑ کی گھاٹی سے اترے، کعبہ میں پہنچے اور نماز ادا کی۔

کفار کے لئے چیلنج

اس روز ابوجہل، ابوسفیان، ابولہب اور دیگر بڑے بڑے سردار خانہ کعبہ کے سامنے جمع تھے مگر مسلمانوں سے کوئی تعرض نہ کر سکا۔ نماز ختم ہونے کے بعد وہ کعبہ سے باہر نکلے تو حضرت عمر نے سرداران قریش سے کہا:

"دیکھو آج کے بعد اگر حضرت محمد اور اسلام کے بارے میں تمہیں کچھ کہنا ہو تو مجھ سے کہنا۔ کیونکہ میں آج سے مسلمان ہو گیا ہوں۔"

سرداران قریش یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ حضرت محمد اور تمام مسلمان خانہ کعبہ سے نکل کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ کسی کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ ایک بھی ناروا کلمہ اپنی زبان پر لاتا یا سنگ باری کر سکتا۔

سرداران قریش جو پہلے ہی حضرت حمزہ کے اسلام لانے پر خوفزدہ تھے حضرت عمر کے اس اعلان سے مزید خوفزدہ ہو گئے۔ حمزہ بڑے پہلوان تھے مگر قریش ان کی بہ نسبت حضرت عمر سے زیادہ ڈرتے تھے۔ کیونکہ وہ ان ﷺ کی دلیری، غیرت، کھرے پن اور وفاداری سے خوب واقف تھے۔ اہل مکہ کہا کرتے تھے کہ شیطان عمر ﷺ بن خطاب سے ڈر کر بھاگ جاتا ہے۔

یہ صورتِ حال کفار کے لئے ناقابل برداشت تھی لہٰذا انہوں نے دوبارہ مشورہ کیا جس میں یہ طے پایا کہ آپ کے چچا ابو طالب سے جو بنو ہاشم کے سب سے سمجھدار انسان ہیں گفتگو کی

جائے اور ان سے کہا جائے کہ حضرت محمدؐ کو قبیلے سے خارج کر دیں تا کہ ہم انہیں شہید کر سکیں۔ بنو ہاشم کا ایک فرد ہوتے ہوئے، لوگ آپ کو قتل نہیں کر سکتے تھے ہاں اگر ابو طالب انہیں اپنے قبیلے سے خارج کر دیتے تو حضرت محمدؐ کا خون مباح ہو سکتا تھا۔ بنو ہاشم کا فرد ہونا اس بات کی ضمانت تھا کہ آپؐ کا خونِ مبارک کوئی قیمت رکھتا ہے اور قاتل قبیلے پر فرض ہو جاتا کہ وہ آپؐ کے قبیلے کو خون بہا (دیت) دیتا۔

لہٰذا انہوں نے چند افراد کا انتخاب کیا کہ وہ ابو طالب کے پاس جائیں اور ان سے درخواست کریں کہ وہ آپ کو قبیلے سے خارج کر دیں اور ان کے عوض تمام قبائل قریش سے ایک یا دو جوانوں کو اپنے قبیلے میں شامل کر لیں۔ یہاں پڑھنے والا حیران رہ جائے گا کہ قریش کیسے ابو طالب سے یہ مطالبہ کر سکتے تھے کہ وہ آپ کو قبیلہ سے خارج کر دیں اور ہر قبیلے سے ایک یا دو جوان ان کے بدلے میں لے لیں۔

بات یہ ہے کہ قبل از اسلام جزیرۃ العرب میں قتلِ نفس کوئی روحانی جرم نہ سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دیتا تو وہ اپنی اس حرکت پر پشیمان نہ ہوتا نہ دوسرے لوگ اسے عقوبتِ دینوی و اخروی کا مستوجب قرار دیتے تھے۔ فرد اپنے قبیلے میں ایک گھوڑے یا اونٹ کی مانند تھا، اگر اسے کوئی قتل کر دیتا تو قاتل کو خوں بہا دینا پڑتا اور اگر مقتول کا قبیلہ خون بہا لینے پر راضی نہ ہوتا تو قاتل پر کوئی روحانی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ خوں بہا دینے کے بجائے قاتل کے قبیلے سے ایک فرد کو قبیلۂ مقتول کے حوالے کر دیتے تھے تا کہ حساب برابر ہو جائے۔ بدو عرب، قبیلے کے فرد کو قبیلہ کا سرمایہ سمجھتے تھے لہٰذا یہ سوچ کر کہ مقتول کے قبیلے کا ایک فرد کم ہو گیا ہے وہ اپنا ایک فرد انہیں بخش دیتے تا کہ ان کی کمی پوری ہو جائے اس طرح یہ خیال کرتے تھے کہ مقتول کے قبیلے کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔

بعض شعرائے دورِ جاہلیت یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کے بیٹے بھائی یا باپ کے خون کا بدلہ ہی نہیں ہو سکتا نہ باپ بیٹے یا بھائی کے بدلے قاتل کے قبیلے سے کسی شخص کو لے کر ضرر کو پورا کیا جا سکتا ہے اور دل کو مطمئن کیا جا سکتا ہے کہ معاملہ برابر ہو گیا۔ یہ شعرا کہتے تھے کہ ایک بیٹے، بھائی یا باپ کا خون قابلِ عوض ہی نہیں ہوتا اگر چہ قاتل کے تمام قبیلے کو قتل کر دیا جائے، ایسے شعرا اس عقیدے کی بنا پر اپنے قبیلے سے علیحدہ ہو جاتے اور عمر کا باقی حصہ ایک مسترد شدہ شخص کی طرح

بیابانوں میں بسر کرتے تھے۔ مروجہ قانون یہ کہتا تھا کہ اگر ایک شخص قتل کر دیا جائے اور قاتل خوں بہا دینے کے لئے تیار ہو جائے تو پھر اس پر کوئی ذمہ داری نہیں رہتی نیز ایک فرد کے بدلے ایک پورے قبیلے کو کیسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال بعض شعرائے دورِ جاہلی خون بہا کو قتل کا معاوضہ نہیں سمجھتے تھے مگر وہ شاعر تھے جب کہ اہل قریش تاجر تھے اور وہ یہ سوچتے تھے کہ اگر ابو طالب راضی ہو جائیں کہ حضرت محمد (ﷺ) کو قبیلے سے خارج کر دیں اور ان کے بدلے ایک جوان لے لیں تو انہیں کوئی ضرر نہیں پہنچتا بلکہ اگر دو جوان لے لیں تو وہ فائدہ میں ہیں۔

قریش کے نمائندے ابو طالب کے پاس گئے اور اپنے گروہ کی درخواست کو ان کے سامنے رکھا تو وہ بولے، ''میں ہرگز مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اپنے آبائی دین پر ہی مروں گا مگر میں یہ بھی نہیں کر سکتا کہ اپنے بھتیجے کو برادری سے خارج کر دوں۔ ہاں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں ان سے گفتگو کروں گا شاید میں انہیں دینِ جدید سے دست بردار کرا سکوں، تم لوگ کل آنا تا کہ گفتگو کا نتیجہ تمہارے گوش گزار کر دوں۔'' اسی دن ابو طالب، آپ کو اپنے گھر لائے اور کہا ''قریش مجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ کو نکال دوں تا کہ وہ آپ کو قتل کر سکیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ہرگز ہرگز میں دینِ محمدی (ﷺ) کو قبول نہیں کروں گا مگر چونکہ وہ میرے بھتیجے ہیں لہذا انہیں نکال بھی نہیں سکوں گا، ہاں ان کے ساتھ بات چیت کروں گا شاید وہ دین جدید سے ہاتھ دھو لیں۔''

آپ نے دریافت فرمایا۔ ''آپ مجھے کیوں دین سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں؟'' ابو طالب نے کہا ''میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ آپ کے ساتھ گفتگو کروں کہ یہ باتیں جو آپ کرتے ہیں انہیں آئندہ زبان پر نہ لائیں۔''

آپ نے فرمایا ''چچا جس دن میں نے رسالت کی تبلیغ شروع کی ہے سوائے خدا کے کسی پر بھروسہ نہیں کیا اور آج بھی اللہ کے علاوہ میرا کسی پر تکیہ نہیں ہے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ مجھے قبیلے سے خارج کر دیں تو کر دیجئے'' اس طرح ابو طالب اس جواب پر خاموش ہو کر چلے گئے۔ انہوں نے آپ کو قبیلے سے خارج نہیں کیا کیونکہ یہ بات ان کے نزدیک باعثِ عار تھی اور اہل قریش سے کہا ''میں محمد کو خارج نہیں کر سکتا مگر وعدہ کرتا ہوں کہ تا زیست ان کے مذہب کو قبول نہیں کروں گا'' جب سردارانِ قریش نے دیکھا کہ چچا بھتیجے کی گفتگو سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو فیصلہ کیا کہ خود حضرت محمد سے گفتگو کریں لہذا ایک نمائندہ عتبہ کو جو بڑا بردبار، ٹھنڈے دماغ والا

اور مردم شناس تھا آپ کی خدمت میں بھیجا۔ اس نے آپ سے عرض کی۔

''اے محمد! جب سے آپ نے ہوش سنبھالا ہے ہم آپ کو امین و صابر مانتے تھے اور سب آپ کے حسنِ خلق سے خوش تھے، آپ سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچی تھی مگر اب آپ کی تبلیغ نے اس شہر کے لوگوں کی زندگی خراب کر دی ہے کہ کوئی بھی آسودہ نہیں ہے۔ آپ علی الاعلان اس بستی کے لوگوں کے مذہب کی مذمت کرتے ہیں۔ ہمارے بتوں کو باطل کہتے ہیں، ہمارے آبائی دین کو غلط بتاتے ہیں حالانکہ آپ خود ہمارے ایک فرد ہیں اور ہمارے اجداد سے پیدا ہوئے۔ آپ کیسے گوارا کرتے ہیں کہ اپنے آباؤ اجداد کو برا کہیں؟ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جو کچھ چاہتے ہیں مجھ سے صاف صاف کہہ دیں اگر آپ دولت چاہتے ہیں تو میں زبان دیتا ہوں کہ ہم اسی قدر دولت تاجران مکہ سے جمع کر کے پیش کر دیں گے کہ آپ بالکل بے نیاز ہو جائیں۔ اگر عورتوں کے خواہاں ہیں تو میں ضامن ہوں کہ اہل قریش اپنی حسین ترین لڑکیاں پیش کر دیں آپ ہر روز اور ہر شب ایک حسین ترین لڑکی کے ساتھ بسر کر سکیں گے۔ اگر یہ چاہتے ہیں کہ عزت ہو اور مکہ کے سب سے اعلیٰ شخص شمار ہوں تو ہم اس کے لئے حاضر ہیں کہ آپ اس بستی کے سب سے بڑے سردار ہوں، بشرطیکہ اپنی روش کو بدل دیں، ہمارے عقائد کی مذمت نہ کریں اور یہ نہ کہیں کہ ہمارے بت باطل ہیں کیونکہ ہم اس توہین کو برداشت نہیں کر سکتے، آپ کا ہر لفظ ہمارے سینوں میں تیر کی طرح اتر جاتا ہے۔''

رسول مقبول نے بڑے سکون کے ساتھ اس کی باتیں سنیں جب وہ سب کچھ کہہ چکا تو آپ نے فرمایا:

''میں جو کچھ کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ میرا خدا کہتا ہے، وہ باتیں جو وہ مجھ پر نازل کرتا ہے اور میں تمہیں سناتا ہوں۔ عربی زبان میں ہیں، جن پر تم سمجھ کر عمل کر سکتے ہو۔ میں جب بھی یہ کہتا ہوں کہ تمہارا اور تمہارے اجداد کا دین برحق نہیں ہے، کیونکہ وہ اور تم مشرک ہو، تو یہ سب کچھ خدا کی طرف سے کہتا ہوں، میں اس کا پیام لے کر آیا ہوں جسے انجام تک پہنچاؤں گا، تمہارا لالچ دینا اور ڈرانا مجھے تبلیغ توحید سے باز نہیں رکھ سکتا۔ میں تمہاری نجات کے لئے تم سے کہتا ہوں کہ شرک کو چھوڑ دو اور دین خدا کو قبول کر لو۔''

قریش کا نمائندہ یہ جواب سن کر قریش کے پاس گیا اور کہا میں کچھ نہیں کر سکتا، تم لوگ جو

چاہوان کے ساتھ کرو۔

پہلی شادی

تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ حضرت محمد کی کئی بیویاں تھیں مگر اکثر تذکرہ نویس یہ لکھنا بھول ہی گئے ہیں کہ جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں آپ نے کسی عورت سے شادی نہیں کی اور پچیس سال تک حضرت خدیجہؓ کے ساتھ وفادارانہ زندگی بسر کی۔ جب خدیجہؓ سے شادی ہوئی تو آپ کی عمر پچیس سال تھی اور شباب کا عالم تھا حضرت خدیجہؓ کی وفات کے وقت آپ کی عمر پچاس سال تھی۔ وہ صرف ایک بیوی ہی نہ تھیں بلکہ مخلص ترین دوست اور مشیر بھی تھیں آپ اہل عرب کی طرح اپنی زوجہ "محترمہ" سے بے حد محبت کرتے تھے۔

ایک یورپین، عربوں کے ذوقِ بیوی کی کیا قدر سمجھ سکتا ہے جو یورپ میں پلا بڑھا ہو، جہاں نیلگوں سمندر، بڑی بڑی ندیاں، وسیع جنگل، سرسبز باغ، بلبلوں کے نغمے اور دل کشا چمن ہوں۔ مگر صحرائے عربستان میں جہاں نہ سمندر، نہ ندی نالے، جنگل، نہ چمن، نہ باغ، نہ صدائے بلبل، وہاں ایک صحرا نشین بدو، ان تمام مناظر کو اپنی عورت کے اندر دیکھتا ہے اور صدائے بلبل کی بجائے صدائے زن کو سنتا ہے۔ اس کی نظر میں پھول کا کھلنا، عورت کے تبسم سے عبارت ہے، سرو آزاد، قامتِ زن ہے، اور جب بھی اس کی نظر اپنی بیوی پر پڑتی ہے تو وہ گلستاں ہی گلستاں دیکھتا ہے۔

وہ ساری شاعرانہ تشبیہات جو یورپ کے شعراء نے اپنے اشعار میں عورت کے بارے میں کہی ہیں سب شعرائے عرب سے ہی اخذ کی ہیں کیوں کہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے شروع شروع تمام رعنائیاں عورت میں جلوہ گر دیکھیں۔ عرب شعرا نے دور جاہلیت میں جو کچھ بھی عورت کے بارے میں کہا وہ سب خلوص پر مبنی تھا۔ یورپ کے شعراء جو ان کے مقلد ہیں، ان کی روح واحساسات کی گہرائی تک نہ پہنچ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کے بارے میں دورِ جاہلی کے اشعار میں جو حلاوت ہے یورپین شعراء کے ہاں نہیں ہے۔

آپ (ﷺ) شاعر نہ تھے کہ حضرت خدیجہؓ کی تعریف میں شعر کہتے مگر ایک عرب کی طرح فطرت کی تمام زیبائیاں ان کے چہرے میں دیکھتے تھے۔ انہوں نے متواتر پچیس سال، نہایت

وفادارانہ طور پر حضرت خدیجہؓ کے ساتھ گزارے اور کبھی بھی دل میں یہ خیال نہ لائے کہ کسی اور عورت کے ساتھ شادی کریں۔ حضرت خدیجہؓ میں جہاں اور بہت سی صفات تھیں ایک یہ بھی صفت تھی کہ وہ آپ کی مخلص مشیر تھیں، آپ جب کبھی ان سے کسی کام کے بارے میں مشورہ طلب کرتے وہ بہترین مشورہ دیتیں اور آپ اس سے فائدہ اٹھاتے۔ وہ آپ پر سب سے پہلے ایمان لائیں حالانکہ وہ ایک تاجر عورت تھیں اور تاجروں کو سوائے منافع کے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ بعثت کے پہلے ہی دن ایمان لے آئیں اور اس کے بعد اپنا سارا مال، اسلام کی راہ میں اس طرح خرچ کر دیا کہ جب دنیا سے رخصت ہوئیں تو کچھ بھی نہ تھا۔

صدر اسلام میں دو شخصیتوں نے اپنا سارا مال اسلام کے لئے خرچ کیا ایک حضرت خدیجہؓ اور دوسرے حضرت ابوبکر ؓ تھے۔ اسلام سے پہلے یہ دونوں مکہ کے بڑے تاجروں میں شمار ہوتے تھے مگر مرتے دم کچھ بھی نہ تھا کیونکہ انہوں نے اپنی ہستی کو اسلام کی راہ میں فنا کر دیا تھا۔

پہلی ہجرت

حضرت عمر ؓ نے اسلام لانے کے بعد نہ صرف اپنے گھر والوں کو اسلام کی تبلیغ کی بلکہ اپنے پورے خاندان، بنو عدی کو تبلیغ کی اور ان کے قبیلے سے کئی ایک افراد مسلمان بھی ہوئے قریشیوں نے جو دیکھا کہ مسلمان روز بروز بڑھتے ہی جاتے ہیں تو وہ سہم گئے ادھر حضرت حمزہ اور حضرت عمر کو بھی آپ کا حامی پایا کہ وہ آپ (ﷺ) کو ذرا سا بھی گزند نہیں پہنچنے دیتے لہٰذا انہوں نے ارادہ کرلیا کہ ایک اسکیم کے تحت لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کر دیں۔ قرآن نے اس اسکیم کا نام فتنہ رکھا۔

بعض وہ لوگ جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اسلام کی طرف سبقت کرنے والوں یا رسول اکرم کی طرح استقامت نہ رکھتے تھے کہ مشرکوں کی تکالیف کے سامنے ٹھہر سکیں کیونکہ اہل قریش انہیں زیادہ سے زیادہ ستانے لگے تھے۔ انہوں نے سب کو تاکید کر دی کہ مسلمانوں سے کچھ نہ خریدیں۔ نہ کوئی چیز ان کے ہاتھ فروخت کریں، نہ انہیں بیٹی دیں، نہ ان سے بیٹی لیں۔ مکہ جیسی سرزمین میں جہاں ذریعہ معاش سوائے سوداگری کے کچھ نہ تھا اس حکم نے مسلمانوں کی زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ لہٰذا بعض نو مسلم استقامت نہ دکھا سکے انہوں نے

اسلام سے ہاتھ کھینچ لیا اور جدّی دین میں داخل ہو گئے۔ رسول اللہ نے سوچا کہ اگر اس وقت کوئی تدبیر نہ کی گئی تو بہت سے نومسلم قریشیوں سے گھبرا کر اسلام سے ہاتھ کھینچ لیں گے۔ لہٰذا آپ نے وہ اقدام کیا جو آج تک کسی پیغمبر نے نہ کیا تھا۔ آپ نے ارادہ کیا کہ خود تو مکہ میں رہوں خواہ جان جاتی رہے لیکن مسلمانوں کو حبشہ کی طرف روانہ کر دوں۔

حبشہ میں ایک ایسے بادشاہ کی سلطنت تھی جو کسی بھی مذہب والے کو آزار نہیں پہنچاتا تھا وہاں ہر شخص اپنے مذہب کے مطابق عبادت کر سکتا تھا بشرطیکہ وہ دوسرے مذہب کے پیروکاروں کے لئے باعثِ آزار نہ ہو۔ آپ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں حتیٰ کہ مسلمانوں کے لئے مکہ میں زندگی آسان ہو جائے۔ آپ نے مسلمانوں کو تاکید کی کہ خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلے جائیں اس طرح کہ قریشیوں کو اطلاع نہ ملے۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ ایک ساتھ مل کر جاؤ گے تو اہل قریش خبردار ہو جائیں گے لہٰذا تھوڑے تھوڑے آدمی جاؤ تاکہ انہیں ہجرت کا شبہ بھی نہ ہو۔

مکہ سے پہلی بار جن لوگوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی ان کے نام یہ تھے۔

(1) حضرت جعفر بن ابی طالب ﷜ اور ان کی زوجہ اسماء ﷝۔ جو کشتی میں سوار ہو کر دریائے قلزم عبور کر کے حبشہ پہنچے۔ حضرت ابو طالب کے دو فرزند تھے ایک حضرت علی ﷜ جنہیں رسول اللہ نے گویا اپنی فرزندی میں لے لیا تھا اور بعد ازاں ان سے اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کی شادی کر دی اور دوسرے جعفر ﷜ تھے جنہیں آپ کے چچا عباس نے اپنی فرزندی میں لے لیا تھا انہیں پالا اور جب وہ جوان ہو گئے تو اسماء سے ان کی شادی کر دی۔ (2) حضرت عثمان بن عفان، داماد رسول کریم شوہر رقیہ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، رقیہؓ رسول اللہ کی صاحبزادی تھیں ابولہب کے بیٹے نے انہیں طلاق دے دی تھی۔ حضرت عثمان نے ان سے شادی کر لی تھی۔ (3) زبیر بن العوام (4) عبداللہ بن مسعود (5) عبدالرحمان بن عوف (6) ابو حذیفہ عقبہ (7) مہملہؓ دختر سہیل بن عمرو (8) ابو سلمہ بن عبدالاشد اور ان کی زوجہ ام سلمہؓ دختر امیہ (9) عثمان بن مظعون (10) عامر بن ربیعہ اور ان کی اہلیہ لیلیٰؓ دختر ابو حشیمہ (11) حاطب بن عمر (12) سہیل بن بیضاء (13) مصعب بن عمیر۔

یہ سب چھپ کر مکہ سے روانہ ہوئے۔ سمندر کے کنارے پہنچے، کشتی پر سوار ہوئے اور حبشہ

کی راہ لی۔ یہ مسلمانوں کا سب سے پہلا دستہ تھا جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ ان کے بعد دوسرے مسلمان بھی حبشہ کی طرف گئے۔

بعض تذکروں میں لکھا گیا ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالب، مسلمانوں کے دوسرے دستے میں روانہ ہوئے تھے، پہلے وفد میں نہیں مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حبشہ میں درود کے بعد ہر موقعہ پر جعفر ہی شاہ حبشہ کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات میں گفت وشنید کیا کرتے تھے۔ پہلے گروہ کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا گروہ مکہ سے حبشہ گیا، کشتی کے ذریعے یہ لوگ حبشہ پہنچے اس طرح ایک سو نو مسلمان حبشہ کو ہجرت کر گئے۔ جب اہل قریش کو پتہ چلا کہ مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں تو انہوں نے اپنے دو نمائندے عمرو بن العاص اور عمارہ بن الولید کو حبشہ روانہ کیا تا کہ شاہ حبشہ سے درخواست کریں کہ وہ مسلمانوں کو واپس مکہ بھیج دے۔ عمرو بن العاص، عمارہ بن الولید کے ساتھ شاہ حبشہ کے دربار میں گئے اور کہا۔ ''اے بادشاہ جن لوگوں کو آپ نے پناہ دی ہے کل یہ آپ کے مذہب پر بھی ہاتھ صاف کرلیں گے بہتر یہ ہے کہ انہیں ہمارے سپرد کر دیجئے تا کہ ہم انہیں مکہ واپس لے جائیں اور ان کے خاندانوں کے سپرد کر دیں کیونکہ ان کے خاندان والے انہیں ہم سے طلب کرتے ہیں۔''

اس پر شاہ حبشہ نے مسلمانوں کو دربار میں بلایا۔ اور ان سے کہا ''یہ دو شخص مکہ سے آئے ہیں کہتے ہیں کہ تم لوگ بدکردار ہو لہٰذا تمہیں مکہ واپس بھیج دینا چاہئے کیونکہ تمہارے اہل خاندان تمہارا مطالبہ کرتے ہیں تم لوگ ان کے جواب میں کیا کہتے ہو؟'' حضرت جعفر بن ابی طالب آگے بڑھے اور کہا ''اے بادشاہ! ان دونوں سے دریافت کیجئے کیا ہم نے مکہ یا کسی اور مقام پر چوری کی ہے یا کسی کو قتل کیا ہے یا کوئی اور بری حرکت کی ہے؟'' شاہ حبشہ نے ان دونوں سے پوچھا تو وہ بولے۔ ''انہوں نے کوئی چوری یا قتل کی واردات نہیں کی'' حضرت جعفر نے کہا۔ ''اے بادشاہ ہم گزشتہ زمانے میں بت پرست تھے، لہو ولعب میں عمر گزارتے تھے، شہوت رانی کرتے تھے اور کمزوروں پر ظلم کرتے تھے، حتیٰ کہ ہم میں ایک پیغمبر محمد (ﷺ) بن عبداللہ آئے، انہوں نے فرمایا بت پرستی چھوڑ دو، خدائے یگانہ کی طرف رجوع کرو، بت پرستی شہوت رانی اور ظلم وستم سے ہاتھ کھینچ لو' ہم ان پر ایمان لے آئے یہ دو شخص جو ہمیں یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں بت پرست ہیں پتھر اور لکڑی کے بتوں کو پوجتے ہیں اور ضعیفوں پر ظلم کرتے ہیں۔ جس دن سے

حضرت محمد مبعوث ہوئے ہیں یہ اور تمام وہ لوگ جو ان دونوں کے خاندان سے ہیں جنہیں قریش کہتے ہیں ہر موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور حضرت محمد پر سنگ باری کرتے اور گالیاں دیتے ہیں۔''

شاہ حبشہ نے جب دونوں کے بیانات سن لئے تو حکم دیا کہ وہ ہدیئے جو عمرو بن العاص اور عمارہ بن الولید لائے ہیں واپس کر دیے جائیں پھر عمرو اور عمارہ سے کہا ''یہ لوگ جو میرے شہر میں آئے ہیں میرے مقرب ہیں کیونکہ یہ بھی میری طرح خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں لہٰذا میں اپنی مملکت سے خارج نہیں کر سکتا تاکہ تم انہیں ستانے نہ پاؤ۔''

جب قریش کے دونوں نمائندے واپس ہو گئے تو بادشاہ نے حضرت جعفر سے کہا ''حضرت محمد کے کچھ ارشادات مجھے سناؤ'' حضرت جعفر نے نجاشی کو کچھ آیات قرآنی سنائیں۔ یہ انیسویں سورۃ کی وہ آیات تھیں جن میں حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ کو برحق کہا گیا ہے۔ نجاشی عیسائی تھا اس نے جو یہ آیتیں سنیں تو زار و قطار رونے لگا اور اس کے حاشیہ نشین بھی رونے لگے پھر اس نے کہا۔ ''تمہارا پیغمبر بڑا خدا رسیدہ اور سچا انسان ہے جب تک جی چاہے میرے ملک میں رہو۔ تمہیں یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا'' جو مسلمان مکہ سے حبشہ گئے تھے وہ وہاں آرام کی زندگی بسر کرتے رہے۔ انہیں قریش کے ستانے کا کوئی خطرہ نہ تھا مگر یہاں پہنچ کر مسلمانوں کو یہ صدمہ لاحق ہوا کہ عبید اللہ بن جاش اور سکران بن عمرو کلیساؤں کی عظمت کو دیکھ کر مرعوب ہو گئے اور دین نصرانیت اختیار کر لی۔ قریشیوں نے جو یہ دیکھا کہ مسلمان حبشہ میں آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو انہوں نے جل کر مسلمانوں کو اور زیادہ ستانا شروع کر دیا۔

ابوجہل

قریش کا ایک بڑا سردار ابوجہل مسلمانانِ مکہ سے ملتا اور انہیں ورغلاتا۔ اگر وہ مسلمان اشراف مکہ سے ہوتا تو اس کی بہت تحقیر و تذلیل کرتا اور کہتا ''شرم نہیں آتی، باپ دادوں کے دین کو چھوڑ بیٹھے اور ان کے عقائد پر باطل ہونے کی مہر لگا دی تم اس سرزمین میں کیسے زندہ رہ سکتے ہو؟ جہاں تمہارے اجداد نے لات، منات اور عزیٰ پر جان دے دی'' (یہ خانہ کعبہ کے تین بڑے بت تھے جن پر اہل مکہ اعتقاد رکھتے تھے) ابوجہل ان کلمات سے اصیل و شریف انسان کے

عقیدے کو متزلزل کرنا چاہتا تھا تا کہ وہ اسلام سے برگشتہ ہو جائے۔ اگر مسلمان تاجر ہوتا تو اس سے کہتا "آج کے بعد تجھ سے کوئی بھی سودا نہیں خریدے گا، نہ تیرے ہاتھ کچھ فروخت کرے گا۔ اور جن لوگوں کو ذمہ تیرا کچھ آتا ہے وہ ایک حبہ بھی نہیں دے گا"

اہل قریش نے مسلمانوں کے لئے جو سزا تجویز کی تھی اس کی رو سے مسلمان سے معاملہ کرنا حرام تھا مگر اس کے مال کا کھانا حلال تھا، یہ بھی روا تھا کہ مسلمان کا جو بھی مطالبہ ہو وہ نہ دیا جائے لیکن اس کے ذمہ جو کچھ ہو، وصول کر لیا جائے۔ جب تک انسان تاجر نہ ہو سمجھ نہیں سکتا کہ اس تہدید کا کیا اثر ہوتا ہے۔ سارے مسلمان سوداگر حضرت محمد کی طرح بھی نہ تھے کہ اپنے آپ کو راہ خدا میں شکنجہ میں کسواتے، اسی وجہ سے بعض لوگ متزلزل ہو گئے اور بعض تاجر، اسلام لانے سے باز رہے۔ اگر کوئی ایسا شخص مسلمان ہوتا جو ان لوگوں میں سے شمار ہوتا جنہیں اہل عرب "الناس" کہتے تھے یعنی جو لوگ اپنا دفاع آپ نہیں کر سکتے، تو ابو جہل انہیں کوڑے سے اس قدر پیٹتا کہ وہ بے ہوش ہو جاتے چنانچہ لوگ، اہل قریش سے ڈرنے لگے جو لوگ یہ چاہتے کہ آپ (ﷺ) سے رابطہ قائم کریں وہ ان کے ڈر سے خاموش ہو کر بیٹھ جاتے۔

حضرت ابو بکر

مکہ کے تاجروں میں صرف حضرت ابو بکرؓ ایسے شخص تھے جو بغیر جان و مال کے خوف کے علی الاعلان حضرت محمد اور دین اسلام کی طرف داری کرتے تھے۔ قریشیوں نے ان کے لئے سارے دروازے بند کر دیئے تھے، کوئی بھی ان سے لین دین نہ کرتا اور جس کے ذمہ بھی ان کا قرض تھا وہ ادا نہ کرتا۔ ان شدید اقدامات کے باوجود رسول اللہ سے ان کی وفاداری میں کمی نہ آتی، انہوں نے بغیر کسی دکھاوے کے اپنا سب کچھ اسلام کے لئے وقف کر دیا تھا۔ مکہ سے حبشہ کی طرف جو لوگ بھی ہجرت کرتے حضرت ابو بکر کے خرچ پر کرتے۔ اسلام کا صرف یہی ایک خزانچی تھا اور اسے بھی رقم کی واپسی یا آمدنی کی کوئی امید نہ تھی۔ حضرت ابو بکر نے مکہ سے ہجرت نہ کی کیونکہ وہ آپ کو تنہا نہ چھوڑنا چاہتے تھے جس دن سے آپ داخل اسلام ہوئے کبھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑا البتہ ایک مرتبہ موقع ایسا آ گیا تھا کہ رسول اکرم کو یقین ہو گیا تھا اگر ابو بکر نہ گئے تو شہید کر دیئے جائیں گے لہٰذا آپ نے ان سے فرمایا۔ "مکہ سے چلے جاؤ۔"

حضرت ابوبکر نے بادل ناخواستہ آپ (ﷺ) کو ترک کر دیا اور یمن کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک ایسے مقام پر ٹھہرے جہاں ایک بڑا طاقتور قبیلہ رہتا تھا۔ اس قبیلے کا سردار، رفاعی تھا۔ جب اس نے سنا کہ ابوبکر مجبور ہو کر مکہ سے چلے آئے ہیں تو وہ ان کے پاس آ کر کہنے لگا۔ ''آپ ایک تباہ شدہ آدمی کی طرح مکہ سے چلے جائیں گے؟'' یہ شخص جانتا تھا کہ آپ ؓ مکہ کے بڑے تاجر ہیں۔ انہوں نے فرمایا ''چونکہ میں دین جدید میں داخل ہو گیا ہوں لہٰذا گروہ قریش نے پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ مجھے قتل کر دیں میں اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلا'' رفاعی نے کہا ''میں آپ کو واپس مکہ لے چلوں گا اور اہل مکہ سے کہوں گا کہ یہ میری پناہ میں ہیں اس کے بعد کوئی بھی آپ کو آزار نہ پہنچا سکے گا'' رفاعی نے آپ کو اپنے ساتھ لیا اور مکہ جا کر قریشیوں سے کہا۔ ''یہ میری پناہ میں ہیں، میں نے انہیں پناہ دے دی ہے جو کوئی انہیں تکلیف پہنچائے گا میں اس سے نمٹ لوں گا'' کسی کو پناہ دینا بھی اہل عرب کی ایک رسم تھی کہ اگر کوئی قبیلہ کسی شخص کو پناہ دیتا اور یہ اعلان کر دیتا کہ یہ شخص ہماری پناہ میں ہے پھر اگر اسے کوئی قتل کر دیتا یا ستاتا تو پناہ دینے والا قبیلہ اس سے جنگ کرتا تھا۔

رفاعی کا قبیلہ بڑا جنگجو اور مردان کار والا تھا، یہ لوگ مکہ سے کچھ زیادہ دور بھی نہ تھے لہٰذا قریش نے رفاعی قبیلہ کی جنگ کے خوف سے حضرت ابوبکر کو کچھ نہ کہا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ جب حضرت ابوبکر ؓ نے اپنے آپ کو اہل مکہ کے آزار سے محفوظ پایا تو اپنے گھر میں ایک چھوٹی سی مسجد بنا لی وہاں ہر شب بلند آواز اور خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھا کرتے۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے وہ بتاتی ہے کہ ابوبکر سب سے پہلے مسلمان تھے جو بلند آواز اور خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھا کرتے تھے۔ ان سے پہلے جتنے بھی مسلمان تھے سب قرآن تو پڑھتے تھے مگر بلند آواز سے نہ پڑھتے تھے کیونکہ دشمنوں سے خائف تھے۔ حضرت ابوبکر رفاعی قبیلے کے بھروسہ اور اس لیے بھی کہ وہ خوش الحان تھے قرآن کو با آواز بلند پڑھا کرتے تھے۔

قرآن

وہ لوگ جو عربی زبان سے آشنا ہیں، جانتے ہیں کہ قرآن شعر نہیں ہے مگر اس کی بعض آیات موزوں ہیں خصوصاً وہ چھوٹی چھوٹی سورتیں جو مکہ میں نازل ہوئیں جیسے سورۃ الاخلاص،

سورۃ اللھب، سورۃ الکافرون، سورۃ الکوثر، سورۃ قریش، سورۃ الفیل، سورۃ الھمزہ، سورۃ العصر، سورۃ التکاثر، سورۃ القارعہ، سورۃ زلزال، سورۃ العلق، سورۃ التین، سورۃ الم نشرح، سورۃ الضحیٰ، سورۃ الیل، سورۃ الشمس، سورۃ البلد، سورۃ الفجر، سورۃ الغاشیہ، سورۃ الاعلیٰ سورۃ الطارق، سورۃ البروج، سورۃ الانشقاق اور سورۃ انفطار یہ سب سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں۔ ان کی آیتیں موزوں ہیں اور بعض آیتیں وزن کے علاوہ قافیہ بھی رکھتی ہیں۔ چونکہ وہ سورتیں مکہ میں نازل ہوئی تھیں مسجع آیتیں رکھتی تھیں۔ آپ انہیں خوش الحانی سے تلاوت کرتے، جو بھی آپ کے گھر کے پاس سے گزرتا خواہ دشمن اسلام ہی کیوں نہ ہوتا ذرا ٹھہر جاتا اور سنتا کیونکہ دیہاتی عرب کبھی بھی خوش الحان کلام کو سننے سے نہیں چوکتا بالخصوص جب کہ وہ شعر ہو۔

کلمان ہووارٹ (مشہور یورپین عرب شناس) لکھتا ہے۔ ''فطرت نے اہلِ عرب کو چار چیزیں دی ہیں۔ اونٹ، خیمہ، شمشیر اور شعر''

شعر یعنی کلامِ موزون و مسجع اور مقفی، بدوی عرب کے لئے اونٹ، خیمہ اور شمشیر کی طرح لوازمات زندگی میں سے ہے۔ اگر کوئی شخص موزوں کلام کو خوش الحانی سے ادا کرتا ہے تو وہ بلاشبہ اہل عرب کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ سب سے پہلا قدم جو اہل عرب نے شعر کی طرف بڑھایا وہ حُدی ہے۔ حُدی کو شتر بانانِ عرب نے ایجاد کیا اور اونٹ کے پاؤں کی آواز سے اس کی تخریج کی۔ جب کوئی انسان اونٹ پر سوار ہو کر صحرا پیمائی کرتا ہے (جہاں اب بھی مافوق العادت گرمی کی وجہ سے ہوا، اس قدر گرم ہو جاتی ہے کہ سفر دشوار ہو جاتا ہے) تو اونٹ کے ہلنے جلنے سے تھک کر چُور ہو جاتا ہے کیونکہ اونٹ کی حرکت ایک قسم کی تھکاوٹ پیدا کر دیتی ہے، جو لوگ اونٹ کی سواری کے عادی نہیں، انہیں قے آ جاتی ہے جس طرح سمندری سفر میں بعض لوگ قے کرنے لگتے ہیں۔ بدو عرب اونٹ پر سوار ہوتے اور بادیہ پیمائی شروع کرتے تو شعر پڑھتے کیونکہ اونٹ کے چاروں ہاتھوں پاؤں کے زمین پر ''دبادب'' پڑنے کا یہ تقاضا ہے کہ سوار اپنی آواز کو اس کی صدائے پا سے ملائے، اسی سے حدیٔ شتر بانان پیدا ہوئی۔ اہل عرب صرف اس لیے کہ کسل مند نہ ہوں حدی پڑھتے تھے مگر انہوں نے دیکھا کہ جب وہ حُدی پڑھتے ہیں تو اونٹوں کی قطاریں اپنی گردن بلند کر لیتی ہیں اور ان کی سستی دور ہو جاتی ہے لہٰذا وہ سمجھ گئے کہ ان کی حدی اونٹوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ آج بھی چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد حدی ہنگامِ راہ پیمائی اونٹوں پر اثر

کرتی ہے اور انہیں چست و چالاک بنا دیتی ہے، میں نے عربستان میں خود اس بات کا تجربہ کیا ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ آج کل جب کہ صحرائے عربستان پر ہوائی جہاز پرواز کر رہے ہیں تیل کے پائپ چل رہے ہیں اہل عرب مال دار ہو گئے ہیں اور امریکی موٹروں پر سوار ہوتے ہیں اب بھی رات گئے اونٹوں کی کوئی قطار صحرا سے گزرتی ہے تو حدی خوانی کی صدا کانوں میں آتی ہے۔

جب رات ہو جاتی مکہ کی بستی کا شور و غوغا ختم ہو جاتا اور لوگ اپنے گھروں کو لوٹتے ہوتے تو ابوبکر دل نشین بلند آواز کے ساتھ قرآن پڑھنا شروع کر دیتے۔ عرب مورخ ابن ہشام لکھتا ہے جو کوئی اپنے گھر کی طرف لوٹتا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پچھواڑے کھڑے ہو کر قرآن کی آیتیں سنتا حتیٰ کہ بعض اوقات لوگوں کے ہجوم سے راستہ بند ہو جاتا۔

حضرت ابوبکر کے خلاف شکایت

اہل قریش نے جو یہ دیکھا تو رفاعی کو "ہدیہ" بھیجا اور کہا، تم نے جس ابوبکر کو پناہ دی ہے، ان سے کہو کہ بلند آواز سے قرآن نہ پڑھا کریں کیونکہ لوگ ان کے گھر کے پیچھے جمع ہو جاتے ہیں جس سے شہر مکہ کے نظم و نسق پر برا اثر پڑتا ہے۔ رفاعی نے ہدیہ وصول کر لیا اور حسب دستور عرب، حضرت ابوبکر کو پیغام بھیجا کہ بلند آواز سے قرآن نہ پڑھا کریں۔ اگر آئندہ ایسا ہوا تو میں حق پناہ واپس لے لوں گا، لہٰذا آپ میرے قبیلے کی حمایت میں نہیں رہیں گے۔ حضرت ابوبکر نے اس کے جواب میں فرمایا۔ "میں اپنے دین کو نہیں چھوڑ سکتا، نہ ہی بلند آواز سے قرآن پڑھنے کی لذت کو ترک کر سکتا ہوں کیونکہ ان آیتوں سے میری جان قائم ہے جنہیں میں بلند آواز سے پڑھتا ہوں اگر تو حق پناہ واپس لینا چاہتا ہے تو لے لے، اس کے بعد میں بھی حضرت محمد کی طرح خدا کی پناہ لے لوں گا۔"

طویل نظر بندی

610ء میں ورقہ بن نوفل نے پیغمبر اسلام سے کہا تھا۔ "کاش جس زمانے میں آپ کی قوم آپ کو دیس نکالا دے، میں زندہ ہوں" ان کی یہ بات 616ء میں پوری ہو گئی۔ اہل قریش نے جو یہ دیکھا کہ بنو ہاشم یعنی حضرت محمد کا قبیلہ اس بات پر کسی طرح راضی نہیں ہے کہ آپ کی حمایت سے ہاتھ کھینچے تا کہ ہم انہیں شہید کر سکیں۔ شاہ حبشہ بھی مہاجر مسلمانوں کو لوٹانے پر راضی

نہ تھا۔ تیسری جانب رسول مقبول کا نفوذ مکہ میں بڑھتا جا رہا تھا۔ تو انہوں نے آپ کو اور آپ کے تمام ساتھیوں کو مکہ سے خارج کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ خانہ کعبہ میں ایک فیصلہ لکھ کر آویزاں کر دیا گیا کہ رسول اللہ اور ان کے پیروکاروں کو آج کے دن سے مکہ سے خارج کیا جاتا ہے۔ اس فیصلے کے مندرجات یہ تھے:

(1) کسی بھی باشندہ مکہ کو کسی مسلمان کے ساتھ خواہ وہ مرد ہو یا عورت بات چیت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

(2) کوئی باشندہ مکہ کسی مسلمان سے مصافحہ نہ کرے اگر ایسا کرے گا پلید قرار دیا جائے گا۔

(3) مکہ کا کوئی بھی رہنے والا مسلمان سے بیٹی نہیں لے سکتا، نہ دے سکتا ہے۔

(4) مکہ کا کوئی باشندہ کسی مسلمان سے خرید و فروخت نہیں کر سکتا۔

(5) جس کسی کے ذمہ مسلمان کا کچھ نکلتا ہے اسے ہرگز نہ دے۔

یہ احکامات اس وقت تک باقی رہیں گے جب تک کہ حضرت محمد اپنے دین سے دست بردار نہیں ہوں گے یا یہ کہ بنو ہاشم ان کی حمایت چھوڑ دیں گے۔ قریشی حضرت محمد کو قتل کر دینے کے مجاز ہوں گے۔

اس فیصلے کے مطابق 616ء میں قریش نے تمام مسلمانوں کو مکہ سے خارج کر دیا، چونکہ بنو ہاشم نے آپ کی حمایت کا دم بھرا تھا لہٰذا انہیں بھی خارج کر دیا گیا حالانکہ ان میں حضرت ابو طالب عم پیغمبر بھی شامل تھے جو غیرت و حمیت کی بنا پر اپنے برادر زاد کو نہ چھوڑ سکے۔ حضرت محمد کے قبیلہ کا صرف ایک فرد ابولہب اس بات پر تیار نہ ہوا کہ مسلمانوں کے ساتھ مکہ سے خارج ہو جائے مگر دوسرے افراد، عصبیت اہل عرب کی بنا پر مسلمانوں کے ساتھ مکہ سے باہر ہو گئے اور ایک (شعب) گھاٹی میں جو حضرت ابو طالب کی تھی، سکونت پذیر ہو گئے۔ شعب اس شگاف کو کہتے ہیں جو کسی چٹان پر ہو۔ مجازاً اس شگاف کو بولتے ہیں جو پہاڑ میں بصورت درہ پیدا ہو جاتا ہے۔ قریش کے تمام قبیلے مکہ سے باہر ایک ایک شعب کے مالک تھے۔ یہ شعب پہاڑ میں ہوتا تھا۔ جب کبھی باہر سے کوئی خارج شدہ شخص مکہ والوں کی پناہ میں آتا تو اسے شعب میں ٹھہراتے کیونکہ اہل عرب کا یہ قاعدہ تھا کہ اگر کسی کو اپنے قبیلہ کی پناہ میں دیتے تو اسے قبیلہ کا فرد قرار دیتے، ایک ''بیگانہ'' کسی طرح بھی قبیلہ کا جزو نہیں بن سکتا تھا اور

قبیلے میں رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔

صحرا میں ہر قبیلے کی ایک منفرد قسم کی چادر تانی جاتی تھی اس طرح کہ اگر کوئی شخص پہاڑ کے اوپر سے ان چادروں کو دیکھتا تو یہ اندازہ آسانی کے ساتھ لگا سکتا تھا کہ فلاں قبیلے کے عزیز و اقارب کس چادر کے زیر سایہ رہتے ہیں۔ قبیلے کے سردار کی چادر ہمیشہ درمیان میں ہوتی تھی، اس کے دائیں بائیں اس کے بیٹوں کی، پھر بھائیوں کی، پھر لڑکیوں اور دامادوں کی اور جو دور کے عزیز ہوتے تھے وہ دوسری چادروں کے نیچے رہتے تھے، قبیلے کے سردار سے ان کی چادر قریب نہیں ہوتی تھی۔ شعب کو گھر نہ سمجھنا چاہئے اگرچہ شعب ابی طالب درہ کوہ میں ایک محصور مقام تھا مگر وہ صرف غریبوں کے لئے ایک پناہ گاہ تھی کوئی اس لئے نہ تھی کہ خود ابو طالب یا ان کا خاندان اس میں رہے۔ وہاں صرف ایک گھر سا تھا جس میں اتنی بڑی جمعیت سکونت پذیر نہ ہو سکتی تھی اور بھی کوئی جگہ قابل رہائش نہ تھی اس گھر کے اردگرد ٹیلے تھے اور ایک درہ تھا۔

عرب کے چند ایک شعراء نے اطراف مکہ کی اراضی کا نقشہ کھینچا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آج تک جب کہ تیل کی آمدنی نے عرب کی اقتصادی حالت کو بہتر بنا دیا ہے۔ ان زمینوں کا وہی حال ہے۔ مکہ کی آس پاس کی زمین اور ٹیلوں پر ایک بھی درخت نہ تھا، سوائے ان عریاں چٹانوں کے جو سورج کی تپش کو منعکس کرتی ہیں اور کچھ بھی نہ تھا۔ سارا سال ایک بھی پرندہ وہاں پر نہ مارتا کیونکہ پرندہ وہاں جاتا ہے جہاں کچھ چارہ ہوتا ہے۔ آج تک اہل مکہ گزشتہ دور سے زیادہ پانی کی افراط نہیں کر سکے۔

چونکہ شعب میں مسلمانوں کا آنا بالکل ناگہانی تھا اس لیے وہ خوراک کا زیادہ سامان اپنے ساتھ نہ لا سکے اور اگر لاتے بھی تو وہ چند روز سے زیادہ نہ چلتا۔ ''فیصلے'' میں لکھا تھا کہ کوئی شخص مسلمانوں کے ہاتھ کچھ نہ فروخت کرے اور نہ خریدے، لہٰذا مسلمان غلہ خرید بھی نہ سکتے تھے۔ شعب ابی طالب ایک ایسے مقام پر تھی جہاں سے کوئی قافلہ بھی نہ گزرتا کہ مسلمان کسی قافلے سے کچھ خرید سکتے۔ چنانچہ انہیں ایک خوفناک ترین قحط سے دوچار ہونا پڑا، صرف ایک وجہ سے وہ زندہ رہ سکے کہ سال میں چار ماہ جنگ ممنوع تھی لہٰذا مسلمان بغیر کسی خوف کے ان دنوں میں مکہ کے اندر آ جا سکتے تھے اور غلہ خرید سکتے تھے اور ان جانوروں کی کھالوں کو جو زائرین قربان کرتے تھے اکٹھا کر سکتے تھے۔ مسلمان ان کھالوں کو شعب ابی طالب میں لے جاتے اور

بعد ازاں انہیں جوش دے کر غذا حاصل کرتے۔ ایک دن حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے نے کچھ غلہ حضرت محمد اور اپنی چچی کے لئے بھیج دیا کیونکہ وہ بھی آپ کے ساتھ ہی تھیں۔ طائفہ قریش، نے جو ہمیشہ نگرانی کرتے رہتے تھے کہ مکہ سے کوئی بھی مسلمانوں کے لئے کچھ نہ بھیجے، ان کے بھتیجے کو غلہ لے جاتے دیکھ لیا تو وہ غلہ چھین لیا اور انہیں اس قدر مارا کہ تین دن تک وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہے۔

بعض مسلمان تذکرہ نویسوں نے حضرت محمد کے احترام کی وجہ سے شعب ابی طالب کی نظر بندی کی مدت نہیں بتائی۔ ان تین سالوں میں حضرت محمد اپنی زوجہ محترمہ سمیت مسلمانوں کے ساتھ یہاں نظر بند رہے۔ ان مورخوں نے یہ سمجھا اگر یہ لکھ دیں گے کہ حضرت محمد اور مسلمان یہاں تین سال تک انتہائی بھوک کی زندگی بسر کرتے رہے تو یہ آپ کی شخصیت کے منافی ہوگا حالانکہ میری نظر میں اس واقعہ سے آپ کی شخصیت اور زیادہ بلند ہو جاتی ہے۔

ان تین سالوں میں چند مرتبہ بعض شیوخ مکہ بیچ میں پڑے اور انہوں نے قریش سے کہا کہ آپ حضرت محمد اور ان کے ساتھیوں کو مکہ میں آنے دو، قریشیوں نے کہا۔ ''محمد اپنا دین چھوڑ دیں اور مکہ میں آ جائیں ان سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی اور وہ حسب سابق تجارت کر سکیں گے، ورنہ موت کے لئے تیار ہو جائیں''۔ اگر آپ (ﷺ) کمزور ارادے والے ہوتے تو ایسا کر سکتے تھے کہ عارضی طور پر یا صرف دکھانے کے لئے دین سے انحراف کر لیتے حتیٰ کہ قریش مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے اور آپ پھر کسی مناسب وقت پر اپنے دین کی تبلیغ شروع کر دیتے مگر چونکہ آپ ایک نبی تھے اور اپنے دین کو چھوڑنے اور اپنی رسالت سے وقتی طور پر ظاہری طور پر منہ موڑنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہ تین سال کی نظر بندی آپ کے لئے ایک اور آزمائش تھی جس سے وہ نہایت خوبی سے عہدہ برآ ہوئے، بھوک اور تکالیف آپ کو متزلزل نہ کر سکیں۔ شعب ابی طالب میں مسلمانوں کے پاس کوئی گھریلو سامان نہ تھا، حضرت خدیجہؓ کے پاس صرف ایک دیگ اور ایک کوزہ تھا ایک دن وہ پیالہ ٹوٹ گیا تو کئی دن آپ صبر سے بیٹھی رہیں۔ اتفاقاً ایک پھیری والے کا ادھر سے گزر ہوا جو پیالہ جوڑنا جانتا تھا تب آپ نے اس سے وہ پیالہ مرمت کروایا۔

جو مسلمان تذکرہ نویس شعب ابی طالب کی زندگی کے بارے میں خاموشی اختیار کرتے ہیں، میں اسے ان کی کم فہمی پر محمول کرتا ہوں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کا وہاں تین سال محصور

رہنا، آنے والے زمانے کے لئے ان میں استعداد پیدا کر رہا تھا، یہ دور آپ کے لئے ایک مکتب کی حیثیت رکھتا تھا تا کہ اپنے ارادے کو اور قوی کر سکیں اور یہ اندازہ لگا سکیں کہ آئندہ کس طرح مقابلہ کرنا چاہئے۔

اس کڑی آزمائش اور دائمی رنج والم کے علاوہ ایک اور ناخوش گوار واقعہ پیش آیا۔ حضرت خدیجہؓ شدائد کی تاب نہ لا کر بیمار ہو گئیں، وہاں دوا یا غذا کا کوئی انتظام نہ تھا لہٰذا وہ 616ء میں جسے مسلمان غم کا سال (عام الحزن) کہتے ہیں، شعب ابی طالب میں رحلت کر گئیں۔ اس زمانے میں ان کی عمر پینسٹھ سال تھی اور آپ کی پچاس سال تھی۔ دو سال تک آپ پر ان کی وفات کا شدید صدمہ طاری رہا۔ پھر جب کبھی ان کا خیال آ جاتا تو آنکھیں اشک آلود ہو جاتیں۔ تاریخ میں کہیں پتہ نہیں چلتا کہ ایک نوجوان نے پندرہ سال زیادہ عمر والی عورت سے اس قدر محبت کی ہو کہ دم وفات تک اسے نہ بھولا ہو۔ زن آشوئی کی ساری مدت میں باوجود اختلاف سن کے کبھی بھی دونوں میں اختلاف پیدا نہیں ہوا، پچیس سال آپ دونوں محبت کی زندگی گزارتے رہے۔ جب حضرت خدیجہؓ کا شعب ابی طالب میں انتقال ہوا تو مسلمانوں کے پاس کفن کا کپڑا تک نہ تھا لہٰذا انہیں ان کے دوپٹہ میں دفن کر دیا گیا۔ کتنا عجیب واقعہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی زوجہ مطہرہ کا کفن صرف ایک دوپٹہ تھا۔

حضرت خدیجہؓ ایک مخلص مسلمان تھیں، انہوں نے ابتدائے اسلام میں اپنی دولت سے اسلام کی بڑی مدد کی جب کہ آپ (ﷺ) بالکل تہی دست تھے۔ ابتدائے اسلام میں وہ رسول اللہ کی تنہا غم خوار تھیں جب بھی حضرت محمد پتھروں سے زخمی ہو کر لوٹتے، خدیجہؓ ہی زخم دھوتیں، پٹی باندھتیں، کپڑے بدلواتیں اور تسلی دیتیں۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد دوسرے دن مسلمانوں پر ایک اور کاری ضرب لگی، آپ کے چچا ابو طالب جن کی عمر چھیاسی سال تھی وفات پا گئے، یہ بھی یہاں غذا اور دوا کے نہ ملنے اور شعب میں بھوکے رہنے کی وجہ سے نہ بچ سکے۔ جب ابولہب، برادرِ ابو طالب کو اطلاع دی گئی کہ تیرا بھائی ابو طالب قریب المرگ ہے تو وہ شعب میں آیا اور سرہانے کھڑے ہو کر کہنے لگا۔ "اپنی قسم یاد رکھنا کہ دین محمدی قبول نہیں کروں گا اور دین اجداد پر جان دوں گا۔"

ابو طالب نے قسم کھا کر کہا میں نے دین اسلام قبول نہیں کیا، اپنے جدی دین پر جان دے

رہا ہوں۔'' اگر حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب رسول اللہ کا ساتھ چھوڑ دیتے، شعب ابی طالب میں زندگی نہ گزارتے اور بھوک وغیرہ کی مصیبتیں برداشت نہ کرتے تو شاید اس سے زیادہ زندہ رہتے ۔آپ کے لئے حضرت خدیجہؓ کی قربانیاں کچھ زیادہ تعجب انگیز نہیں ہیں کیونکہ وہ ان کے شوہر اور پیغمبر تھے مگر ابو طالب کی فداکاریاں اپنے بھتیجے کے لیے یقیناً باعث حیرت اور قابل توضیح وتشریح ہیں۔ ابو طالب دین اسلام پر عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔ نہ آپ کو پیغمبر مانتے تھے پھر بھی اپنے برادر زادے کے لئے جان دے دی، کیوں؟ تاکہ عصبیت عربیہ کو برقرار رکھیں۔ بدو اہل عرب میں تعصب اس قدر قوی تھا کہ ابو طالب جیسا سردار قبیلہ حاضر تھا کہ اس شخصیت کے لئے جان دے دے جس پر اس کا عقیدہ نہیں ہے، مکہ کی زندگی کو ترک کر دے اور بڑھاپے میں شعب کی تکلیفیں جھیلنے جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ قبیلہ کا ایک فرد بغیر پشت و پناہ کے رہ جائے۔

جب ابو طالب کا انتقال ہو گیا تو بنو ہاشم مجبور ہو گئے کہ ایک دوسرا سردار منتخب کریں، تو حسب رسومات عرب، انہوں نے ابولہب کو چن لیا جو مکہ میں مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ ابو طالب کی وفات کے بعد اتفاقاً اہل قریش کی نظر ''تحریری فیصلے'' پر پڑ گئی، دیکھا کہ اسے دیمک کھا گئی ہے اور اس میں سوائے ان الفاظ کے کچھ باقی نہیں رہا۔

''اے صاحب خانہ تیرے نام سے''

خانہ سے مراد یہاں خانہ کعبہ ہے اور صاحب خانہ یعنی خدا جو قریش کے خیال میں ایک شخصیت تھی، جس کے نام سے وہ اپنے احکامات لکھا کرتے تھے۔ دیمک، گرم علاقوں کی نسبت عربستان میں بہت زیادہ ہوتی ہے لکڑی اور کاغذ کو خوب کھاتی ہے۔ آج بھی اگر کوئی شخص مکہ میں کہیں کتاب رکھ دے اور اس جگہ سے نہ ہلائے پھر کچھ عرصہ بعد اسے اٹھا کر دیکھے تو سوائے جلد کے کچھ بھی باقی نہ پائے گا، سب کچھ دیمک چاٹ چکی ہو گی۔ اہل قریش نے دیکھا کہ دیمک اپنا کام دکھا چکی ہے۔ صرف صاحب کعبہ کا نام باقی رہ گیا ہے تو وہ ڈر گئے۔ ادھر ابو طالب کا انتقال ہو گیا اور ادھر ابولہب سردار بن گیا۔ جب ابولہب سردار ہو گیا تو سرداری کا فرض انجام دینے کی خاطر اس نے حضرت محمد کی حمایت کرنا ضروری سمجھا تاکہ اپنے قبیلے کی روایات کا تحفظ کر سکے۔ لہٰذا جونہی اس نے کہا کہ محمد اور ان کے ساتھی شعب سے نکل کر مکہ چلے آئیں تو سب نے اتفاق کیا اور مسلمان شعب سے نکل آئے۔

اس کی طویل مدت میں مسلمانوں پر جو تجارت پیشہ تھے طرح طرح کی مصیبتیں آئیں اور اکثر دیوالیہ ہو گئے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ حضرت ابوبکر کے پاس قارون کا خزانہ ہے۔ ان کے پاس بھی صرف ہزار درہم رہ گئے تھے۔ بھوک کی وجہ سے سب کے سب نحیف و ناتواں ہو چکے تھے ان کے چہروں پر صرف ہڈیاں تھیں اور کھال کو دھوپ نے سیاہ کر دیا تھا۔

لوگوں نے ابولہب سے دریافت کیا کہ "تو حضرت محمد (ﷺ) کا سخت ترین دشمن تھا کیسے شعب کی قید ختم کرنے پر راضی ہو گیا؟" اس نے کہا، چونکہ میں قبیلہ کا سردار بن گیا ہوں لہٰذا میرا یہ فرض ہے کہ (حضرت) محمد کی حمایت و نگرانی کروں مگر میں ان کے مذہب کا مخالف ہوں۔ میری حمایت اس دم تک ان کے ساتھ ہے کہ وہ ہمارے قبیلے کے ساتھ خیانت نہ کریں۔ اگر وہ ہمارے قبیلے کے ساتھ خیانت کریں گے تو میں انہیں یہاں سے خارج کر دوں گا۔ البتہ ابوطالب کی طرح ان کے ساتھ نہیں جاؤں گا اور وہاں جا کر ان کی نگرانی نہیں کرونگا۔ زیادہ عرصہ تک ابولہب دین اسلام کی مخالفت سے باز نہ رہ سکا بلکہ اس نے آپ کے نکال دیئے جانے کی ایک راہ پیدا کر لی جس نے حضرت محمد کی معنوی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔

ایک دن ابولہب نے تمام مردانِ بنو ہاشم کی دعوت کی اور حضرت محمد (ﷺ) کو بھی تاکید کی کہ میرے گھر دعوت میں شریک ہوں۔ جب سب بیٹھ گئے تو ابولہب نے آپ سے کہا۔ "میں بنو ہاشم کے لوگوں کے روبرو آپ کے دادا عبدالمطلب کے بارے میں سوال کرنا چاہتا ہوں، آپ کہتے ہیں کہ مشرک جہنم رسید ہوں گے، عبدالمطلب، آپ کے دادا بہشت میں ہیں یا دوزخ میں؟" اس کے جواب میں حضرت محمد نے (سورۃ توبہ آیت نمبر 113) پڑھ کر سنائی:

"ما کان لِلنّبِیِّ وَالّذین امنو آ ان یّستغفرِوُ للمشر کین ولو کانو آ اُولی قُربیٰ"

(پیغمبر اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ مشرکوں کے لئے طلب مغفرت نہ کریں اگرچہ وہ ان کے قریبی عزیز کیوں نہ ہوں۔)

مسلمانوں کے سارے علماء کا یہ عقیدہ ہے کہ ان آیات قرآنی کے مطابق اگر کسی مسلمان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا نزدیک ترین عزیز جہنم میں ہے بشرطیکہ وہ مشرک ہو تو اس کے لئے خدا سے بخشش کی دعا نہ کرے کیونکہ مشرک مستوجب سزا ہے، اسے دوزخ ہی میں جلتے رہنا چاہیئے۔

پھر ابولہب نے ابوطالب کے بارے میں دریافت کیا کہ میرا بھائی ابوطالب آیا بخشا گیا یا نہیں؟

آپ نے فرمایا۔"جب ابوطالب دنیا سے رخصت ہوئے تو اسلام نہ لائے اور اپنے آبائی مذہب سے ہاتھ نہ کھینچا لہٰذا ان کا معاملہ بھی خدا کے ہاتھ میں ہے۔

بعدازاں اس نے اپنے چند ایسے اجداد کے نام گنائے جو حضرت محمد کے اجداد بھی تھے اور پوچھا۔"آیا یہ لوگ بھی بخشے گئے؟"۔

آپ نے پھر وہی آیت قرآنی پڑھ کر سنائی اور کہا۔"حکم خدا قطعی ہے، اس میں کسی کا استثنا نہیں ہے۔"

چند لحظہ مجلس میں سکوت طاری رہا، ایک بھی نہ بولا کیونکہ سب کو ان باتوں پر حیرت تھی۔

اہل عرب میں اجداد کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، اجداد نہ صرف محترم تھے بلکہ تمام قوانین، رسومات اور آداب عرب کے سرچشمہ تھے۔ جب کبھی بھی کوئی ایسا مشکل مسئلہ درپیش ہوتا جسے اعراب بادیہ حل نہ کر سکتے تو آباؤ اجداد کی روش کی طرف رجوع کرتے تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ وہ ان حالات میں کیا کرتے تھے اور کیا حل نکالتے تھے۔ آباؤ اجداد کی تغلیط، کے علاوہ یہ ان کی توہین بھی تھی، قوانین، رسوم اور تمام آداب عربیہ سے بھی انکار تھا۔ اس وقت تک اگرچہ حضرت محمد ایک دین جدید لائے تھے اور اعراب کو دعوت دیتے تھے کہ دین جدید پر ایمان لائیں مگر صراحتاً ان کے باپ دادوں کی تغلیط نہیں کی تھی لیکن اس دن انہوں نے بالکل کھلم کھلا اس مجلس میں تمام اجداد بنی ہاشم کو غلط کار کہہ ڈالا۔

حضرت محمد ایک عرب تھے وہ ظاہر داری نہیں کر سکتے تھے اگر وہ ظاہر دار اور زمانہ ساز ہوتے تو اتنی تکالیف نہ اٹھاتے۔ آپ اپنے عقیدے کا اظہار کر دیتے تھے بغیر اس امر کے اندیشہ کے کہ دوسرے اس سے رنجیدہ ہوں گے۔ قدیم دنیا میں اہل عرب کی طرح کوئی بھی قوم صاف گو نہ تھی۔ ایک بدو عرب جو کچھ کہتا اس کے فکر کا آئینہ ہوتا وہ کبھی بھی اس طرح مطلب بیان نہ کرتا جو اس کے فکر کے خلاف ہوتا۔ اہل عرب کی صاف گوئی آج کے دور میں ہم لوگوں کو کھٹکتی ہے کیونکہ ہماری تربیت زمانہ دراز سے یہی چلی آتی ہے کہ مافی الضمیر کے ادا کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ کسی کا دل آزردہ نہ ہو، اس طرح مطالب کو بیان کریں کہ کوئی بھی ملول نہ ہو۔ ہم گفتگو یا تحریر کے وقت بعض کلمات مثلاً بعض اعضائے بدن کو زبان پر نہیں لاتے ان چیزوں کے بیان کرنے کے لئے ہم استعارات کا سہارا ڈھونڈتے ہیں مگر اہل عرب ان کلمات کو زبان پر

لاتے ہیں، قرآن میں بھی ایسے کلمات ہیں، بعض بدو تو اپنے قبائل کا نام مردوں کے اعضاء کے نام پر رکھتے تھے، جو لوگ عربی جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ قدیم زمانے میں بعض قبائل عرب کے نام مردوں کے بعض اعضاء کے نام پر تھے۔

جب آپ نے اس مجلس میں سب کے سامنے بنو ہاشم کے اجداد کو غلط کار کہا تو ابولہب نے سب سے پوچھا کہ کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ میں محمد کو طرد کردوں (برادری سے خارج کر دوں)؟ سب نے یہی جواب دیا کہ قبیلے کے سردار کو یہ حق حاصل ہے کیونکہ مسلمانوں نے ان کے عقیدے کے مطابق ایک ایسا "جرم" کیا تھا جو قابل معافی نہ تھا۔ ابولہب بولا، میں انہیں قبیلہ سے طرد کئے دیتا ہوں، مجلس ختم ہوگئی اور لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ پہلی بار جب آپ (ﷺ) کو برادری سے خارج کیا گیا تھا قریش کی طرف سے کیا گیا تھا بنو ہاشم کی طرف سے نہیں بلکہ سردار بنو ہاشم، ابو طالب خود آپ (ﷺ) کے ساتھ مکہ سے خارج ہو گئے تھے۔ حمایت کرتے تھے اور اسی شعب میں رہتے تھے حتیٰ کہ رحلت کر گئے۔

مگر اس بار تو بنو ہاشم نے آپ کو برادری سے خارج کیا تھا اور اعلان کر دیا تھا کہ انہیں برادری سے خارج کر دیا جائے جس وقت سے سردار بنو ہاشم نے یہ فیصلہ کیا تھا آپ ایک ایسے انسان ہو گئے تھے جس کے لئے فرانس کے انقلابیوں نے ایک اصطلاح بنائی ہے۔ خارج از دائرہ قانون۔ یعنی وہ شخص جو ملک وقوم کے اساسی قانون کو ٹھکرا دیتا ہے اور قانون کی حفاظت سے نکل جاتا ہے۔

مطرود قرار پانے کے بعد مسلمانوں کی حالت ان لوگوں سے بھی بدتر تھی جو دور انقلاب فرانس میں "خارج از دائرہ قانون" تھے۔ کیونکہ فرانس میں اگر کوئی شخص خارج شدہ فرد کو قتل کر دیتا تو وہ سزا کا مستحق ہوتا تھا اور عدالتِ انقلابی اس کا فیصلہ کرتی تھی لیکن مکہ میں اگر کوئی شخص اپنے قبیلے سے نکالا جاتا تو اس کا خون رائیگاں قرار پاتا، ہر شخص اسے قتل کر سکتا تھا، فروخت کر سکتا تھا اور غلام بنا سکتا تھا بلکہ اگر کوئی اسے زندہ جلا دیتا تو وہ مجرم و مستوجب سزا نہ قرار پاتا کیونکہ جو بھی قبیلے سے خارج کر دیا جاتا وہ جانوروں کے برابر بھی نہ تھا۔

ہندوستان کی ملیچھ اقوام، نئے قانون اساسی سے پہلے جب کہ انہیں برابری کا درجہ حاصل نہ تھا، عرب کے مطرود سے بہتر تھیں کیونکہ ان کے ساتھ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا جائز نہ تھا مگر وہ

بھوکوں تو نہیں مرتے تھے کام کرتے اور روٹی کھاتے تھے۔

ابولہب نے آپ کو طرد (OSTRACISE) کر کے انسانوں کی صف سے ہی خارج کر دیا اور ایک بے آب و گیاہ صحرا میں دھکیل دیا اس طرد کے بعد آپ بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ پہلے بستی سے نکالے جانے پر حضرت خدیجہؓ آپ کی دل جوئی کرتی تھیں اور مرہم پٹی کرتی تھیں یا ان کے چچا ابو طالب ہمدردی کا اظہار کرتے تھے مگر اس بار نہ خدیجہ تھیں نہ ابو طالب تھے۔ پیغمبر اسلام نے جب اپنے آپ کو یکہ و تنہا دیکھا تو خدا سے التجا کی کہ اپنی پناہ دے، اس مرتبہ وہ صرف خدا کی پناہ میں تھے اسی زمانے میں اللہ تعالی انہیں زمین سے آسمان کی طرف لے گیا۔ اس سفر کو مسلمان معراج کہتے ہیں۔

معراج کی علمی توضیح

اس سے پیشتر کہ میں معراج پیغمبر کے بارے میں کچھ کہوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق جو کچھ مسلمانوں نے لکھا ہے اس کا ذکر کر دوں۔

معراج کے واقعہ کے بارے میں میرا ماخذ (روایات مصنفین اسلام) ابن ہشام بخاری، حمید اللہ، السہیلی، طبری، القسطلانی اور اسد بیگ ہیں۔ یہ لوگ لکھتے ہیں کہ معراج ماہ رجب (ساتویں قمری مہینہ) میں ہوئی۔ جس رات آپ آسمان پر تشریف لے گئے ستائیسویں رات تھی۔ حسب روایات اہلِ اسلام حضرت محمد کا سفر آسمانی موسوم بہ معراج دو مرحلوں میں ہوا تھا، پہلا مرحلہ مکہ سے بیت المقدس تک کا سفر اور دوسرا بیت المقدس سے آسمان تک سفر تھا۔

مسلمان تذکرہ نویس اس شب کے بعض واقعات کو حضرت محمد کی زبانی اس طرح نقل کرتے ہیں۔

حضرت محمدؐ فرماتے ہیں۔ ''اس رات میں مکہ میں سویا ہوا تھا۔ ابھی میرے مکہ سے نکالے جانے پر عمل نہیں ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ میرے گھر کی چھت پھٹ گئی ہے اور جبرئیل علیہ السلام اس میں سے اندر آ گئے ہیں۔ جبریل نے میرا سینہ چاک کیا، اس کے بعد اسے آب زمزم سے دھویا بعد ازاں ایک لوٹا پُر از حکمت لائے اور اسے میرے سینے میں انڈیل دیا پھر شگافِ صدر کو بند کر دیا، میرا ہاتھ پکڑا اور کہا اٹھو، براق (اسپ بال دار) پر سوار ہو جاؤ۔''

یہ اسپ بال دار جس پر حضرت محمد اس رات سوار ہوئے گھوڑے اور خچر کے درمیان تھا، اس کی صورت عورت کی سی تھی، یہ بجلی کی طرح حرکت کرتا تھا جس دم آپ اس پر سوار ہوئے بیداری و خواب کی حالت تھی جب آپ روانہ ہوئے تو راہ میں حمرون (الخلیل) میں قیام کیا کیونکہ وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر ہے۔ یہاں آپ نے ان کی قبر پر دعا پڑھی پھر سوار ہو کر روانہ ہوئے اور بیت اللحم میں اترے، یہ مسیح علیہ السلام کی جائے ولادت ہے۔ یہاں بھی دعا پڑھی پھر براق پر سوار ہو کر بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے اور مسجد اقصیٰ میں پہنچے۔ یہاں پہنچ کر آپ کی پہلی منزل یعنی سفرِ خاکی ختم ہو گیا، دوسری منزل، آسمانی سفر کی مسجد اقصیٰ سے، جو بیت المقدس میں ہے، شروع ہوئی۔

اس سے پیشتر کہ حضرت محمدؐ اس شب میں آسمان کی طرف روانہ ہوں، اپنے پائے مبارک کا نشان قبۃ الصخرا، پر ثبت کر دیا۔ یہ گنبدِ سنگ، بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ میں ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اپنے پائے مبارک کا نشان مقام ابراہیم علیہ السلام میں ایک پتھر پر ثبت فرمایا تھا۔

براق پر ہی آپ زمین سے آسمان کی طرف روانہ ہوئے، آسمان ماہ یعنی فلک اول پر، جو تمام افلاک میں زمین سے سب سے زیادہ قریب ہے، اترے۔ یہاں آپ کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی۔ دیکھا کہ وہ انسانوں کے دو گروہوں کے درمیان کھڑے ہیں جو ابھی ابھی زمین سے آئے تھے، کچھ لوگ آدم علیہ السلام کی داہنی طرف ہیں اور کچھ بائیں طرف تھے۔ جو لوگ دائیں طرف تھے یہ وہ لوگ تھے جو بہشتی شمار ہوتے ہیں اور جو بائیں طرف تھے وہ دوزخ والے تھے۔

آدم علیہ السلام جو کہ انسان ہی ہیں، جب دائیں طرف دیکھتے مسکرا دیتے اور بائیں سمت دیکھتے تو رو دیتے کیونکہ وہ تمام نوع بشری کے باپ ہیں اور ایک باپ کی طرح اپنے فرزندوں کی خوش حالی پر خوش ہوتے اور بدحالی پر روتے تھے۔

آپ پہلے آسمان سے گزرے اور دوسرے آسمان پر پہنچے جہاں آپ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یوحنا کو دیکھا، اس کے بعد تیسرے آسمان کی طرف روانہ ہوئے، وہاں حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کی۔ چوتھے میں ادریس علیہ السلام پانچویں میں ہارون علیہ السلام چھٹے میں موسیٰ

علیہ السلام اور ساتویں میں ابراہیم علیہ السلام سے ملے، یہ سب سے بلند آسمان ہے۔

حضرت ابراہیم ساتویں آسمان میں ایک گھر کی دیوار سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے جسے خانہ فرشتگاں کہنا چاہیے، اس کا نقشہ بالکل خانہ کعبہ جیسا تھا۔ آسمان ہفتم کے بعد ایک ایسا طبقہ نظر آیا جو اطرافِ خانہ کعبہ (حرم) کی طرح تھا اس کے اختتام پر سدرۃ المنتہیٰ دیکھی۔ یہ ایک درخت ہے جس کے اوپر کا حال مجہول مطلق ہے۔ کسی کو پتہ نہیں کہ وہاں وضع ملکوت کس طرح ہے۔

یہاں پیغمبرِ اسلام اس قدر خدا سے قریب ہوئے کہ اللہ کے قلم کی آواز سن سکتے تھے، جس سے آپ سمجھ گئے کہ باری تعالیٰ حسابِ بشر لکھنے میں مصروف ہیں، گو قلم خداوندی کی آواز کو سنتے تھے مگر خدا کو نہ دیکھ سکتے تھے کیونکہ خدا کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا اگرچہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔

جب آپ نے آسمان پر جانا چاہا تو دیکھا کہ آسمان اول یا آسمانِ ماہ میں چند ایک نگہبان فرشتے ہیں جو اس امر پر تعینات ہیں کہ دیکھیں کون لوگ آسمان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ گو حضرت محمد پیغمبر تھے مگر براہ راست آواز خداوندی کو نہیں سن سکتے تھے یہ آواز بوسیلہ جبرئیل آپ تک پہنچی کیونکہ کسی انسان کے کان خواہ وہ پیغمبر ہی کے کان کیوں نہ ہوں، براہ راست صدائے خداوندی کو نہیں سن سکتے تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے بواسطہ جبرئیل علیہ السلام حضرت محمد سے گفتگو کی، فرمایا، ”مجھے معلوم ہے کہ آپ کو قوم نے خارج کر دیا ہے مگر صبر کرنا چاہیے کیونکہ آپ سے سابق پیغمبر اس سے بھی زیادہ تکالیف اٹھا چکے ہیں پھر شدائد کے شکنجوں میں کس دیئے گئے حتیٰ کہ وفات پا گئے۔“

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد سے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں بات چیت کی اور فرمایا، ”جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو جمع کر کے ہجرت کی تھی، اسی طرح آپ بھی اپنے پیروؤں سمیت مکہ سے ہجرت کر جائیں۔ جب رسول اللہ خدا سے رخصت ہو کر زمین کی طرف لوٹنے لگے تو آپ کو بارہ احکامات دیئے گئے (جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو دس فرامین (COMMANDMENTS) دیئے گئے تھے) اور حکم ہوا کہ انہیں مسلمانوں تک پہنچائیں وہ بارہ فرمان یہ ہیں۔

(1) مسلمان سوائے خدائے واحد کے، کسی کی پرستش نہ کریں۔

(2) ماں باپ سے محبت کریں اور ان کا احترام کریں۔

(3) صلہ رحمی کریں۔

(4) ضعیفوں، مسافروں اور ان بیگانوں کی جو پناہ گیر ہوں مدد کریں۔

(5) زیادہ خرچ کرنے سے بچیں۔

(6) بخل سے پرہیز کریں۔

(7) زنا کے پاس نہ جائیں۔

(8) قتل نہ کریں۔

(9) دوسروں کے مال، بالخصوص یتیموں کے مال کو غصب نہ کریں۔

(10) باٹوں اور پیمانوں کو درست رکھیں۔

(11) بے عقلی کی باتوں سے دور رہیں۔

(12) غرور نہ کریں۔

واقعہ معراج کے دوران آپ نے بڑے بڑے پیغمبروں سے ملاقات کی اور ان سے تعارف حاصل کیا یہ بات بے محل نہ ہوگی اگر میں یہ بتادوں کہ ڈانٹے نے اپنی کتاب طربیۂ خدائی (DIVINE COMEDY) میں بسلسلہ تعارف اشخاص و حالات وہی روش اختیار کی ہے جو حضرت محمد نے وقائع معراج کے بارے میں اختیار کی ہے۔ سفر معراج میں حضرت محمد نے تمام بزرگان نوع بشر کو دیکھا اور ان لوگوں سے ملاقات کی جو صاحب سیف و قلم تھے یعنی صاحب رزم بھی تھے اور صاحب کتاب بھی۔

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) ہفت آسمان کو طے کر کے سدرۃ المنتہٰی تک پہنچے اور وہاں اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے مگر جب واپس اپنے گھر پہنچے تو آپ کے حجرے کی کنڈی یا آپ کے خانہ مبارک کی کنڈی جو روانگی کے وقت کھولی گئی تھی ابھی تک ہل رہی تھی۔

یہ بات اس دور میں جب کہ آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت مشہور ہو چکا ہے عجیب نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اس نظریہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ زمانہ، ان دو اجسام کے لئے جن میں سے ایک متحرک ہو اور دوسرا ساکن ایک جیسا نہیں رہتا، لہٰذا ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنے گھر سے نکلے آسمانوں پر جائے اور وہاں سے لوٹے تو اس کے حجرے یا گھر کی زنجیر اسی طرح ہلتی

رہے کیونکہ اس معاملہ پر، یعنی زمانے کے اضافی ہونے پر، بہت کچھ بحث ہو چکی ہے۔ جس سے سب باخبر ہیں میں اس پر کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ معراج حضرت محمد (ﷺ) کی یہ بات کوئی عجیب نہیں ہے البتہ قابل تعجب یہ بحث ہوگی کہ آیا حضرت محمد اسی گوشت پوست اور استخوان وخون والے جسم کے ساتھ آسمان پر تشریف لے گئے تھے یا نہیں؟

اس سلسلے میں علمائے اسلام کے دو نظریے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اسی جسم خاکی کے ساتھ آپ آسمان پر گئے اور بعض کہتے ہیں کہ آپ کی روح نے آسمان کی طرف پرواز کی مگر یہ بات کسی بھی مسلمان عالم نے نہیں کہی کہ آپ نے بحالت خواب سدرۃ المنتہیٰ تک سفر کیا جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ کا جسم مبارک آسمان پر گیا، کہتے ہیں چونکہ آپ پیغمبر تھے لہٰذا سب کچھ کر سکتے تھے، وہ اس جسم خاکی کے ساتھ آسمان پر جا سکتے تھے اور ساتویں آسمان تک پہنچ سکتے تھے۔ دوسرا فریق یہ کہتا ہے کہ آپ اس جسم خاکی کے ساتھ آسمان پر نہیں گئے۔ یہ ضروری بھی نہ تھا کہ اس جسم خاکی کے ساتھ ہی آسمان پر جائیں، انہوں نے اپنی روح کے ذریعہ آسمانوں کا سفر کیا، وہ ساتوں آسمانوں تک پہنچے، سدرۃ المنتہیٰ پر گئے اور خدا سے ہم کلام ہوئے۔ اگر ان لوگوں کے عقیدے کو دیکھا جائے تو ہم لوگ جو عام انسان ہیں، خواب میں ہزارہا کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیتے ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ بات چیت کر لیتے ہیں جو مر چکے ہوتے ہیں۔ ہم نہ صرف ان مردوں کے ساتھ گفتگو کر لیتے ہیں جو ہماری زندگی میں موجود تھے بلکہ ان لوگوں کے ساتھ بھی ہم کلام ہوتے ہیں جنہیں مرے ہوئے ہزاروں سال گزر گئے۔

ہم اس حالت میں یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم مُردوں سے گفتگو کر رہے ہیں تب بھی تعجب نہیں کرتے، یہ بات ہمیں بالکل ایک معمول کا امر معلوم ہوتا ہے اور ہم ان سے یہ بھی نہیں کہتے کہ آپ لوگ مر چکے ہیں، کہیں وہ آزردہ نہ ہو جائیں۔ جب ہم خواب دیکھتے ہیں ہمارا جسم خاکی کوئی تھکن محسوس نہیں کرتا بلکہ آرام سے بستر پر دراز ہوتا ہے، پھر بھی ہم اس قدر تیز رفتار ہوتے ہیں کہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔

اس حالت میں یا بقول قدماء روح بدن سے خارج ہو جاتی ہے، فضا میں گھومنے لگتی ہے دور دور کے شہروں میں چلی جاتی ہے اور ان لوگوں کے ساتھ، جنہیں مرے صدہا سال گزر گئے، ملاقات کر آتی ہے، قابل تعجب یہ بات ہے کہ ان ملاقاتوں میں ان لوگوں سے جو ہم سے صدہا

سال پہلے زندہ تھے ہماری زبان سے آشنا نہیں تھے، نہ ہم ان کی زبان سے آشنا ہیں، باتیں کر لیتے ہیں زبان کا نہ جاننا مانع نہیں ہوتا، پھر بھی وہ ہماری اور ہم ان کی بات سمجھ لیتے ہیں۔

یا، یہ بات ہے کہ روح ہمارے جسم سے خارج نہیں ہوتی بلکہ بحالت خواب ہمارے وجود میں (اور آج کل کہنا چاہئے کہ ہمارے اعصاب اور ہمارے مغز کی شکنوں میں) ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہماری نظر سے پردے اٹھ جاتے ہیں، دور کے فاصلے چھوٹے ہو جاتے ہیں اور ہم اپنے آپ کو ایک ایسا شخص پاتے ہیں جو ہر جگہ سے آشنا ہے اور ہر شخص سے شناسا ہے۔

حالت بیداری میں ہم یہ نہیں کر سکتے کہ ایک آب جُو سے، جو قدرے عریض ہو، پار ہو سکیں مگر بحالت خواب ہم دروں کے اوپر سے پرواز کر جاتے ہیں اور پہاڑوں کی چوٹیوں کو قطع کر جاتے ہیں، یہ پرواز ہماری نظروں میں ایک عام بات ہے جیسے ہم کسی بازار سے گزر رہے ہیں، سونے کی حالت میں سینکڑوں مشکل کام ہمارے لئے آسان اور معمولی ہو جاتے ہیں۔ ہم خواب دیکھنے کی حالت میں اپنے گھر میں بھی ہوتے ہیں اور اس مقام پر بھی، جو ہم سے ہزار ہا کلومیٹر کے فاصلے پر ہوتا ہے۔ باوجود طویل فاصلہ کے، دونوں جگہ ہم اپنے وجود کو موجود پاتے ہیں۔ بحالتِ خواب ہم ان جانی زبانوں کو جان سکتے ہیں بلکہ ان میں گفتگو بھی کر لیتے ہیں اور جب کسی نادیدہ کشور میں پہنچتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ہماری نشوونما یہیں ہوئی ہے اور ہم یہیں پیدا ہوئے ہیں۔

عالمِ رویا میں ہمارے کچھ دوست ہمیں ملتے ہیں اور کچھ دشمن بھی جن سے ہم عالم بیداری میں واقف نہیں ہوتے مگر سوتے ہی وہ خواب کے اچھوتے عالم میں ہمارے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں بعض ہم سے محبت کرتے ہیں اور بعض اتنے وحشت انگیز ہوتے ہیں کہ ہم فریاد کرتے ہیں اور ڈر کے مارے جاگ جاتے ہیں۔

عالم خواب میں ہم کوہ آتش فشاں کے دہانے میں گھس جاتے ہیں اس کے مرکز تک پہنچ جاتے ہیں اور ایسی حالت میں واپس آتے ہیں کہ بال بھی بیکا نہیں ہوتا، اسی طرح ہم نیند میں انتہائی سرد مقامات پر چلے جاتے ہیں اور ہماری زندگی کو آزار تک نہیں پہنچتا۔ عالم خواب میں زمانے کا پیمانہ کچھ اور ہی ہو جاتا ہے ہم اس زمانے کو روز و شب کے گھنٹوں سے نہیں ناپ سکتے۔

بہت سے لوگوں کو ایسا اتفاق ہوا ہے کہ انہوں نے ایک دن ایک رات میں بحالت خواب

اپنے آپ کو کسی دوسرے ملک میں دیکھا، وہاں وہ سالوں بلکہ سینکڑوں سال رہے اور ایک سلسلۂ واقعات کا ظہور پذیر ہوا جن میں سے ہر واقعہ ایک طویل مدت تک جاری رہا مگر جب نیند سے بیدار ہوئے اور گھڑی پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ چند منٹ سے زیادہ نہیں گزرے۔

یہ ایسے مسائل ہیں جن کے لئے زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہر شخص کو اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا معاملہ پیش آتا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ خواب میں فاصلے ختم ہو جاتے ہیں اور انسان آنِ واحد میں ہر جگہ جا سکتا ہے۔ ہر چیز کو سن سکتا اور ہر قوم کی زبان کو سمجھ سکتا ہے یعنی کہ ہر زبان میں بات کر سکتا ہے۔ انسان عالم خواب میں ایسے راگ سنتا ہے جو اس نے عالم بیداری میں کبھی بھی نہیں سنے کیونکہ یہ نغمے دوسرے عالم کے ہوتے ہیں۔ موسیقی کے بعض استادوں نے بحالت خواب نغمات دلربا سنے اور جب بیدار ہوئے تو انہیں نوٹ کر لیا تاکہ بھول نہ جائیں۔

عالم خواب میں ماضی، حال اور مستقبل سب برابر ہیں کبھی ہزار دو ہزار سال کا چکر پڑ جاتا ہے گاہے، ہزار دو ہزار سال پہلے، گاہے ہزار دو ہزار سال بعد اور کبھی انسان ان لوگوں سے ہم کلام ہوتا ہے جو بہت پہلے گزر چکے اور کبھی ان سے جو بہت بعد آئیں گے۔ بعض فلاسفر حالت بیداری میں مشکل مسائل کو حل نہ کر سکے مگر حالت خواب میں انہیں حل کر لیا۔ وہ موانع جو ہمارے دماغ کو حالت بیداری میں پھیلنے نہیں دیتے اور اس کے کمالات کو بروئے کار نہیں آنے دیتے، حالت خواب میں زائل ہو جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا نکات کو خیال میں رکھتے ہوئے کیا یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام جیسی شخصیت نے بیداری کے عالم میں اپنی روح کو ایسی دنیا میں بھیج دیا ہو جسے ہم عالم خواب میں دیکھتے ہیں؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ حالت خواب میں ہمارے اعصاب اور ہمارے دماغ کی شکنوں میں جو باتیں پیدا ہو جاتی ہیں، حضرت محمد (ﷺ) کے دماغ میں عالم بیداری میں پیدا ہو گئی ہوں اور انہیں ایسے عالم میں جانا میسر آ گیا ہو جسے ہم عالم رؤیا میں دیکھتے ہیں نیند کی حالت میں یا تو روح، بدن سے نکل کر دوسری دنیا میں چلی جاتی ہے (جیسا کہ قدماء کا عقیدہ تھا) یا ہمارے اعصاب اور مغز کی شکنوں میں ایسی حرکت پیدا ہو جاتی ہے جو ہمیں زمان و مکان سے بالا لے جاتی ہے پھر ہم اپنے آپ کو ازلی و ابدی پانے لگتے ہیں۔ سارے جہاں میں اپنے آپ کو دیکھتے ہیں اور کبھی جمادات و نباتات کی آوازیں سنتے اور سمجھتے ہیں۔

اگر یہی جلوہ حضرت محمد کے دماغ و اعصاب میں بحالت بیداری ظاہر ہو گیا ہو تو ان کی معراج عقلی اعتبار سے قابل قبول ہے اور یہ بھی قبول کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی مسافرت بہت سریع تھی جس دم آپ واپس آئے آپ کے حجرے یا گھر کی زنجیر اسی طرح ہل رہی تھی جس طرح کہ برآمد ہوتے وقت جنبش میں آئی تھی اگرچہ یہ بات بطور ضرب المثل کے کہی گئی ہے نہ کہ بطور روایت۔ مقصد یہ ہے کہ آپ کی سرعت مسافرت کو سامعین کے ذہن نشین کیا جائے۔

اسلامی تذکرہ نویسوں کا ایک گروہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ صرف آپ کی روح آسمان تک نہیں گئی بلکہ آپ اسی جسم خاکی کے ساتھ ایسی ہی خارق العادۃ سرعت کے ساتھ آسمان پر تشریف لے گئے اور واپس آئے۔ اگر ان لوگوں کی روایت کو معرض بحث میں لایا جائے تو جسمانی (فزیکل) اعتبار سے دو مباحث پیدا ہو جاتے ہیں ایک سرعتِ سفر کا مسئلہ اور دوسرا یہ کہ جسم کے لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ نور کی رفتار سے بھی زیادہ سرعت کو برداشت کر لے؟ جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے معراج کی سرعتِ رفتار روشنی کی سرعت سے بھی بہت زیادہ تھی اور امواجِ کشش ثقل کی سرعت سے بھی تیز تر تھی۔ حضرت محمد چند لحظوں میں فضائے بیکراں کے دور ترین منطقے تک پہنچ کر واپس آ گئے۔ ہم آج کل کے لوگ جانتے ہیں کہ اس جہان کے قطر کی وسعت آئن سٹائن کے نظریہ کے مطابق تین ہزار سال ملین نوری ہے یعنی اگر نور ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر کی سرعت سے حرکت کرے اور دنیا کی ایک سمت سے چلے تو تین ہزار ملین سال بعد دوسری طرف پہنچ پائے گا۔ مگر ایک سرعت اور بھی ہے جو ایک لحظہ میں دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشے تک پہنچ جاتی ہے۔ اسے موج کشش ثقل کہتے ہیں۔ اگر ایک منٹ میں انتہائے جہان پر ایک کہکشاں جو سینکڑوں ملین آفتابوں (SUNS) کی حامل ہے یکا یک ٹوٹ جائے اور امواج میں تبدیل ہو جائے تو کشش ثقل دنیا اس طرح عکس عمل کرے گی کہ اسی آن میں نظام جہان کو معتدل کر دے گی، اگر ایسا نہ ہو تو اسی منٹ میں جب کہ وہ کہکشاں ٹوٹ کر امواج میں تبدیل ہو، ہماری دنیائے خورشید نیست و نابود ہو جائے۔

قانون کشش ثقل (LAW OF GRAVITATION) کی تاثیر، جس کا نیوٹن نے انکشاف کیا ہے، پورے جہان پر حاوی ہوتی ہے اور کشش ثقل کی تاثیر عکس العمل آنی ہوتی ہے۔ حسب روایت تذکرہ نویسان اسلامی آپ کی سرعت رفتار آسمانی، نور کی سرعت رفتار سے تیز

تھی۔ البتہ اگر ہم یہ کہہ دیں کہ حضرت محمد نے حالت بیداری میں اپنی روح کے ذریعہ آسمانوں پر پرواز کی تو کوئی مبحث جسمانی (فزیکل) ہمیں کھولنا نہیں پڑتا۔ ہاں اگر یہ کہیں کہ جسم خاکی کے ساتھ آسمان پر پرواز کی تو یہ سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ کیا جسم تین لاکھ کلو میٹر فی سیکنڈ کی رفتار کو برداشت کرسکتا ہے۔

فزیکل سائنس کہتی ہے کہ مادہ قادر نہیں ہے کہ تیس ہزار کلو میٹر فی سنٹ کی رفتار کو برداشت کر سکے مگر یہ کہ وہ ''خود مبدل بہ نور'' ہو جائے اور نور بھی تین لاکھ کلو میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے زیادہ حرکت نہیں کرسکتا۔ بعض تذکرہ نگارانِ دینِ اسلام لکھتے ہیں کہ حضرت محمد اسی جسم خاکی کے ساتھ نور کی سرعت سے بھی زیادہ تیز جا سکے تھے، انہوں نے اپنے سفر کو کشش ثقل کی سرعتِ عکس العمل سے شروع کیا اور ختم کیا۔

اگرچہ فزیکل سائنس اس بات کو قبول نہیں کرتی مگر چونکہ، میں مذہب اسلام کے عقائد کا احترام کرتا ہوں لہٰذا مذہبی اعتبار سے اس بات کو قبول کرتا ہوں۔ ہم مذہب مسیح کے پابند، اپنے مذہبی معتقدات میں بھی بہت سی ایسی باتیں رکھتے ہیں کہ فزیکل سائنس، موجود زندگی میں انہیں قبول نہیں کرتی مگر چونکہ ہم ایک مذہبی عقیدہ رکھتے ہیں لہٰذا انہیں قبول کر لیتے ہیں۔

قتل کی کوشش

جب آپ معراج سے واپس آئے تو اپنے آپ کو دشمنوں کے درمیان پایا۔ دشمنوں کا اگر داؤ چل جاتا تو آپ کو شہید کر دیتے اور دیت وقصاص کی کچھ بھی پرواہ نہ کرتے۔ اس زمانے میں بنو حنیفہ کا ایک گروہ، عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ آیا تھا۔ قریشیوں نے ان میں سے ایک شخص کو انعام دینے کے وعدے پر آپ کو قتل کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اس واقعہ کا آپ کو علم ہو گیا، چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں لہٰذا رات کے وقت آپ مکہ سے باہر ہو گئے اور طائف کی راہ لی۔ شہر طائف، جنوب مکہ میں واقعہ ہے۔ اس زمانے میں اگر اونٹ کے ذریعہ سفر کرتے تو دو روز میں مکہ سے طائف پہنچتے اور اگر گھوڑے کے ذریعہ سفر طے کرتے تو ایک دن میں پہنچ جاتے۔ چونکہ طائف سطح سمندر سے ایک ہزار آٹھ سو میٹر بلند ہے اور وہاں پانی بھی بکثرت ہے (اس زمانے میں بھی وہاں پانی کی کثرت تھی) وہاں بارشیں بھی

ہوتی ہیں لہٰذا یہ شہر صاف ستھرا سرسبز و شاداب ہے۔ مکہ کے امیر لوگ یہاں موسم گرما گزارنے کے لئے باغ بناتے ہیں۔

آج بھی اگر کوئی شخص بیابان عربستان سے گزر کر طائف میں پہنچتا ہے وہاں کے گھنے درختوں والے باغ دیکھتا ہے اور وہاں کی شمیم جاں افزا سونگھتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ دوسری دنیا میں آ گیا ہے۔ باشندگان طائف دولت مند تھے ان کا اصلی مشغلہ سود خوری تھا، وہ سود در سود پر قرض دیتے سو پر سو درہم سود لیتے اور زراعت کے لئے غلام رکھتے تھے۔ طائف میں ایک ٹیلہ تھا جس پر لات کا مجسمہ نصب تھا۔ یہ ٹیلہ پناہ گاہ شمار ہوتا تھا جو کوئی بھی اس منطقے میں آ جاتا سزا سے محفوظ ہو جاتا خواہ وہ قتل کر کے کیوں نہ آیا ہوا ہو۔

رسول اللہ (ﷺ) طائف میں آئے اور اپنے عزیزوں میں سے ایک عزیز کے گھر چلے گئے۔ یہ شخص عبدالمطلب کے چچاؤں میں سے کسی کا بیٹا تھا۔ ''عبد یالیل'' اس کا نام تھا۔ جب اس کو پتہ چلا کہ حضرت محمد تشریف لائے ہیں تو اس نے آپ کے مہمان ہونے کی پرواہ نہ کی اور اپنے چند ایک غلاموں کو بھیجا کہ آپ کو سنگسار کر دیں کیونکہ اسے معلوم تھا بنو ہاشم نے انہیں دیس نکالا (طرد) دے دیا ہے۔ غلاموں نے آپ کا پیچھا کیا اور پتھر برسانا شروع کر دیئے۔ آپ مجبور ہو کر طائف کے ایک باغ میں چھپ گئے۔ عبد یالیل کے غلام آپ کو نہ پا سکے اور طائف کی مختلف جگہوں میں ڈھونڈتے رہے۔ آپ نے جس باغ میں پناہ لی تھی اس کے مالک دو بھائی مکہ کے باشندے تھے وہ بھی پناہ دینا نہ چاہتے تھے مگر انہوں نے دیکھا کہ آپ پتھروں سے مجروح ہو گئے ہیں اور کپڑے خون آلود ہو گئے ہیں لہٰذا انہیں رحم آ گیا اور اپنے ایک عیسائی غلام سے کہا، انہیں ایک خوشہ انگور لا دے۔ غلام نے درخت سے ایک خوشہ توڑا آپ کی طرف بڑھایا اور خوشہ پیش کرتے ہوئے کہا، کھایئے۔ کھانے سے پہلے آپ بسم اللہ پڑھی تو عیسائی غلام حیران رہ گیا، بولا، اے زخمی تو عیسائی معلوم ہوتا ہے؟ حضور نے فرمایا۔ ''نہیں'' غلام بولا، ''یہ کلمات جو آپ نے پڑھے مشہور یہ ہے کہ عیسائی کھانا کھانے سے پہلے پڑھتے ہیں، اگر آپ عیسائی نہیں ہیں تو ایسے کلمات زبان پر کیوں لائے ہیں؟'' رسول اللہ نے فرمایا، ''خدا کا پیغمبر ہوں، خدائے واحد نے مجھے بھیجا ہے اسی لیے لوگ مجھے پتھر مارتے ہیں، مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں کیونکہ میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں'' غلام بولا۔ ''میں خدائے واحد کی پرستش کرتا ہوں کیوں کہ میں عیسائی ہوں'' پیغمبر

اسلام (ﷺ) اور عیسائی غلام، عداس کے درمیان دوستی ہوگئی۔

عداس بولا یہ باغ جو آپ دیکھ رہے ہیں دو بھائیوں کا ہے ایک کا نام عتبہ اور دوسرے کا نام شیبہ ہے۔ یہ دونوں ربیعہ کے فرزند ہیں جو قریشی الاصل ہے۔ اگرچہ میرے آقا عتبہ نے یہ کہا ہے کہ آپ کو انگور دوں مگر میں جانتا ہوں کہ وہ آپ کو یہاں ٹھہرنے نہ دے گا۔ میں آپ کو آج رات اس باغ اور طائف سے اس طرح نکال لے جاؤں گا کہ جو لوگ گھات میں بیٹھے ہیں وہ آپ کو دیکھ نہ سکیں گے۔ اس عیسائی غلام نے اپنے عہد کو پورا کیا اور راتوں رات آپ کو عتبہ اور شیبہ کے باغ سے باہر لے گیا اور کہا ''اے مرد باخدا اس شہر سے کہیں دور چلا جا کیونکہ تیری جان خطرے میں ہے۔''

طائف سے نکلنے کے بعد آپ مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور واپس جا پہنچے جہاں سے چلے تھے۔ آپ کا سارا بدن زخموں سے دکھ رہا تھا بھوکے پیاسے تھے مگر بھوک اور درد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے چلتے چلے گئے کیونکہ عرب کی خصوصیات میں یہ بھی ہے کہ رنج کو صبر سے برداشت کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ تکلیف کو برداشت نہ کر سکتے تو صحرائے جزیرۃ العرب میں کیسے زندہ رہ سکتے؟ عرب میں جو چھوکرے بکریاں چراتے ہیں کبھی کبھی ایک ایک ماہ تک اپنے والدین سے دور رہ جاتے ہیں۔ اگر وہ اس مدت دراز میں بکری کا دودھ پی سکتے ہیں تو اسی پر گزارہ کر لیتے ہیں ورنہ بھوکے رہتے ہیں۔ ایک عرب کا دس سالہ لڑکا پینتالیس دن برابر عرب کے چٹیل میدان میں والدین سے دور رہا۔ اس طویل زمانے میں اسے کھانے کو کچھ بھی نہ پہنچ سکا مگر پینتالیس دن کے بعد جو باپ نے اسے دیکھا تو اچھا خاصا تھا نہ وہ کوئی حرف شکایت زبان پر لایا نہ اس نے کسی وحشت و نفرت کا اظہار کیا، کہنے لگا میں نے صبر کیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ آخر کار میں اپنے والدین سے ملوں گا ہی۔ اگر ایک بدو عرب صبر نہیں کر سکتا تو عرب ہی نہیں، چونکہ رسول اکرم دیہاتی عرب تھے لہٰذا صبر کے ساتھ روحانی و جسمانی تکالیف برداشت کرتے رہے۔

جنات نے بھی قرآن سنا

اس روز آپ نے ایک وادی ''بطن نخلہ'' میں رات گزاری۔ وہاں بڑے سوز و گداز کے ساتھ قرآن کی آیتیں تلاوت کیں۔ جنات کے ایک گروہ نے جو یہ کلام سنا تو آپ پر ایمان لے

آئے اور بہت متاثر ہوئے۔ قرآن کی چھیالیسویں سورت کی 29 ویں آیت میں (بشرطیکہ بسم اللہ کو ہم ایک آیت شمار کریں) اس واقعہ کو اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

"واذ صرفنا الیک نفراً من الجن یستمعون القرآن فلما حضروہ قالوآ انصتوا فلما قضی ولّوا الی قومھم منذرین".

(ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو آپ کی طرف بھیجا تا کہ قرآن کو سنیں، وہ حاضر ہوئے تو کہنے لگے خاموش رہو، جب تلاوت ہو چکی تو وہ اپنی قوم کی طرف ڈرانے کے لئے گئے۔)

''جن'' سے مراد مکہ کے بیابان کے باشندے بھی ہو سکتے ہیں جو رات میں دکھائی نہ دیتے تھے یا دن میں اہل شہر کی نظر سے نہیں گزرتے تھے۔ مشرق کی سرزمین خصوصاً جزیرۃ العرب میں ایسا بسا اوقات ہوتا ہے کہ دو قافلے رات کے وقت ایک ہی مقام پر ٹھہرتے ہیں اور ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے۔ اگر اونٹوں کی گھنٹیاں نہ بجیں، آگ روشن نہ ہو اور قافلے کے کتے نہ ہوں تو ایسا ہو سکتا ہے کہ دونوں قافلوں کو ایک دوسرے کا علم نہ ہو اگرچہ وہ چند گز کے فاصلے پر ہی کیوں نہ ہوں۔ محمد رسول اللہ اس رات تنہا سفر کر رہے تھے۔ جب آپ بطن نخلہ میں پہنچے، کافی رات گزر چکی تھی جو لوگ اس منطقہ میں آباد تھے، سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے مگر راہ گیر کو دیکھ نہ سکتے تھے البتہ اس کی آواز سن سکتے تھے لہٰذا اس کے کلام سے متاثر ہو سکتے تھے۔ جیسا کہ روایت ہے یہ لوگ مسلمان ہو گئے۔

آیات قرآنی اور روایات سے پتہ نہیں چلتا کہ یہ لوگ بطن نخلہ کے اصلی باشندے تھے یا کوئی قافلہ والے تھے۔ بہرحال اتنی بات مسلّم ہے کہ وہ جو بھی ہوں اور جو کچھ بھی ہوں تاریکی میں آپ کو نظر نہ آئے تھے مگر آپ کی آواز سن سکتے تھے، اور قرآن سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے تھے۔ عربی زبان میں ''جنّ'' اس چیز کو بولتے ہیں جو پوشیدہ و مستور ہو اور دکھائی نہ دیتی ہو، اسی لئے اس بچے کو جو شکم مادر میں ہوتا ہے جن کہتے ہیں اور اکثر جنین بولتے ہیں جنین بھی جن ہی سے نکلا ہے۔ زبان عربی میں مذکورہ بالا معانی کے علاوہ جنّ کے ایک اور معنی ''وحشت'' بھی ہیں یعنی دوسروں سے خوف و ہراس، اسی لئے یہ کلمہ اہل عرب میں انس کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔

انس وہ جماعت ہے جو ایک دوسرے سے محبت و الفت رکھتی ہو اور جنّ وہ گروہ ہے جو

سب سے دور رہتے ہوں اور کنارہ کش ہوں۔ چونکہ شہری باشندے بہ تقاضائے تمدن آپس میں الفت و محبت رکھتے ہیں لہٰذا پرانے زمانے میں اہلِ عرب ساکنین شہر کو انس اور باشندگان بیابان کو جن کہتے تھے، آج کل کی زبان میں انہیں اہلی اور وحشی کہنا چاہئے یا متمدن و وحشی بولنا چاہئے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے، اہل عرب میں انس و جن کا اطلاق انسانِ متمدن اور انسانِ وحشی پر ہوتا تھا جیسا کہ ہم بھی اس دور میں ان دونوں الفاظ میں فرق کرتے ہیں۔ آج کل ہم انسانِ وحشی اس شخص کو بولتے ہیں جو شہر میں زندگی نہ گزارتا ہو، ہمارے جیسا لباس نہ پہنتا ہو، کاروں میں سوار نہ پھرتا ہو، ٹیلی فون، تار برقی سے استفادہ نہ کرتا ہو اور اپنے آپ کو ہمارے اجتماعی نظام کا پابند نہ سمجھتا ہوں۔ البتہ چودہ سو برس پیشتر عربستان میں باشندگان مکہ و ساکنانِ بیابان کے درمیان اس قدر تفاوت نہ تھا جیسا کہ آج کل کے انسانِ متمدن و انسانِ وحشی کے درمیان موجود ہے کیونکہ سارے ہی عرب بادیہ نشین تھے اور سب کے سب ایک ایسے قانون کے پابند تھے جو باوجود اختلاف قبائل کے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ اہل مکہ اور دیہاتی لوگوں کے درمیان ظاہری فرق صرف اتنا تھا کہ اہل مکہ کبھی کبھی گوشت روٹی کھا لیتے تھے، کپڑے بدل لیتے تھے، تجارت کے ذریعے روپیہ کما سکتے تھے اور پیاس کے وقت پانی پی سکتے تھے۔ ان سے قطع نظر، اہل مکہ اعراب بادیہ ہی کی طرح زندگی گزارا کرتے تھے اور معتقدات کے اعتبار سے کوئی امتیاز نہ رکھتے تھے۔ ساکنانِ مکہ، بیابانوں کو وحشی نہیں سمجھتے تھے کہ ''انسان وحشی'' ان کا نام رکھ دیتے مگر چونکہ وہ نظروں کے سامنے نہیں آتے تھے اور بد و بہت کم شہر کا رخ کرتے تھے لہٰذا وہ انہیں جن کہتے تھے۔

میری یہ بات بعض آیات قرآنی کے خلاف نہیں جاتی جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنات کا وجود ہے جو آگ سے پیدا ہوئے۔ اس دور کا یہ نظریہ کہ کرۂ خاک آگ سے پیدا ہوا ہے اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ کرۂ زمین کی سینکڑوں چیزیں آگ سے بنی ہیں چنانچہ چار ہزار پانچ سو ملین سال کے طولانی دورِ انقلاب و تقلب سے کرہ زمین کی یہ شکل پیدا ہوئی جو آپ دیکھ رہے ہیں۔

میرا یہ فرض نہیں ہے کہ میں قرآن کی مدافعت کروں، میرا مقصد تو صرف اس قدر ہے کہ جو لوگ عربی زبان نہیں جانتے اور قرآن کو اصل عبارت سے نہیں پڑھ سکتے ایسے لوگ جب قرآن کا ترجمہ کسی یورپین زبان میں پڑھتے ہیں جب کہ سارے مترجم عربی زبان کے اسرار و

رموز سے بھی واقف نہیں ہوتے تو یہ لوگ کہنے لگتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جنات قرآن کو سنیں؟ میں نے یہ تشریح ایسے ہی لوگوں کے لئے کی ہے۔

عرب خصوصیات

پیغمبر اسلام ایک ایسی راہ پر مکہ کی جانب چلے جس سے وہ مکہ سے بہت قریب ہو گئے۔ اس سے پیشتر آپ مکہ میں آرام کی زندگی گزار چکے تھے، اچھا عمدہ لباس پہنتے تھے بھوک لگتی تو کھانا کھاتے اور پیاس لگتی تو پانی پیتے مگر اب جو مکہ کی طرف آئے تو خستہ حال، سراپا مجروح اور بھوکے پیاسے تھے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب آپ کو اہل مکہ نے دیس نکالا دے دیا تھا اور قبیلہ ہاشم نے طرد (برادری سے خارج) کر دیا تھا تو پھر کیوں پیغمبر اسلام نے مکہ کا رخ کیا؟ بات یہ ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) عرب تھے اور کوئی عرب بغیر اپنے قبیلے کے زندگی نہیں گزار سکتا لہٰذا جب انہیں ان کے قبیلے نے خارج کر دیا تو یہ ضروری تھا کہ وہ کسی اور قبیلے کے ساتھ رہ کر زندگی بسر کریں۔ عرب باشندہ ایک ایٹم کی طرح ہوتا ہے جو تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا، ہر ایٹم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ دوسرے ایٹم کے ساتھ مل کر رہے تاکہ ایک مالیکیول تشکیل پائے، تب ہی ایک مالیکیول (MOLECULE) زندہ رہ سکتا ہے۔ یا وہ شہد کی مکھی کی مانند ہوتا ہے جو بغیر چھتے کے زندہ نہیں رہ سکتی، اگر وہ کچھ دنوں چھتے سے دور ہو جاتی ہے تو ختم ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ آپ بہت جلد مکہ سے باہر چلے جائیں لہٰذا آپ مکہ سے طائف کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ دیکھیں کیا یہ ممکن ہے کہ اپنے پیروکاروں کے ساتھ وہاں زندگی گزار سکتے ہیں مگر آپ نے دیکھا کہ شہر طائف مسلمانوں کو قبول نہیں کرتا لہٰذا پھر مکہ لوٹ آئے تاکہ مسلمانوں کے نکالنے کے لئے کوئی اور مناسب جگہ دیکھ سکیں۔ چونکہ کسی نہ کسی قبیلے کے ساتھ ملنا آپ کے لئے ناگزیر تھا اس لئے آپ نے ایک شخص کو اخنس بن شریق رئیس قبیلہ بنو زہرہ کے پاس بھیجا تاکہ اس کی پناہ حاصل کر سکیں اس نے جواب دیا، میں تو چاہتا ہوں کہ آپ کو پناہ دوں مگر ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ قریش میرے حلیف ہیں اور جو شخص کسی قبیلے کا حلیف ہو وہ ایسے شخص کو پناہ نہیں دے سکتا جسے اس قبیلہ نے برادری سے خارج کر دیا ہو۔ تب آپ نے سہیل بن عمرو کے پاس قاصد بھیجا اور اس سے کہا کہ مجھے اپنے قبیلے سے ملا لے۔ سہیل بن عمرو، قریشی تھا مگر ان کی

اصلی شاخ سے نہ تھا، ان کی ایک فرعی شاخ سے تھا لہٰذا وہ بھی پناہ نہ دے سکا۔

یہ دیکھ کر آپ مکہ سے باہر ہی قیام پذیر رہے، ماہ رجب شروع ہو چکا تھا جو کہ ساتواں ماہ قوی ہوتا ہے۔ اہل عرب اس ماہ میں حج (عمرہ) کرتے تھے۔ جو حج ذی الحجہ کی نسبت سے حج اصغر ہوتا تھا۔ عرب کے چند ایک قبیلے حج عمرہ کے لئے مکہ آئے تھے۔ آپ نے یہ سوچ کر کہ کسی ایک قبیلے کی پناہ مل جائے مختلف سرداروں سے بات چیت کی۔ آپ جب کبھی کسی قبیلے کے سردار سے ملتے تو اس سے کہتے مجھے پناہ دے دو۔ آپ نے پندرہ مختلف سرداروں سے گفتگو کی اور نفی میں جواب پایا تو سولہویں سردار سے بات کی۔ یہ سردار اپنے قبیلے کے پانچ نفر کے ساتھ یثرب سے آیا تھا (جس کا نام اسلام میں مدینہ پڑا) تا کہ حج عمرہ کرے۔ یہ شخص آپ پر نہیں ہنسا بلکہ بہت توجہ سے باتیں سننے لگا، جونہی رسول اللہ نے قرآن کی آیتیں سنائیں اس کی حالت دگرگوں ہوگئی، اس نے اپنے قبیلے کے پانچ آدمیوں کو بلایا جو اس کے ساتھ مکہ آئے تھے آپ نے انہیں قرآن سنایا اور وہ پانچ بھی بہت زیادہ متاثر ہوئے اور چھ کے چھ مسلمان ہو گئے۔ عمرہ کے بعد وہ مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو کہنے لگے ہم کوشش کریں گے کہ اور لوگ بھی مسلمان ہو جائیں۔ چند روز رسول خدا مکہ سے باہر ہی رہے کہ قریش کی ایک شاخ کے سردار قبیلہ نوفل نے آپ کی حمایت کا اعلان کیا بعد ازاں آپ مکہ کے اندر داخل ہوئے اور خانہ کعبہ میں تشریف لے گئے۔

تب آپ نے حضرت سودہؓ سے شادی کی یہ حبشہ سے واپس آگئی تھیں۔ سودہؓ مسلمان تھیں اور ان کے شوہر بھی مسلمان تھے دونوں میاں بیوی مسلمانوں کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ وہاں جا کر ان کے شوہر عیسائی ہو گئے تھے۔ حضرت سودہؓ ڈریں کہ اگر حبشہ میں رہیں تو کہیں شوہر، عیسائی نہ بنا لے لہٰذا اس سے طلاق لے کر مکہ چلی آئیں اور یہاں پہنچ کر پیغمبر اسلام کے عقد نکاح میں چلی آئیں۔

سودہؓ نہ جوان تھیں اور نہ حسین، آپ فرمایا کرتے تھے میں نے سودہؓ سے اس لئے شادی کی ہے تا کہ خدیجہؓ کے بچے بے ماں کے نہ رہ جائیں۔ حضرت سودہؓ سے شادی کے بعد رسول اللہ کے مخلص دوست حضرت ابوبکر ﷺ نے درخواست کی کہ میری لڑکی عائشہؓ کو قبول فرمالیں۔ میری بیٹی عائشہؓ سب سے پہلی لڑکی ہے جس نے اس دنیا میں اسلام کے ساتھ قدم رکھا لہٰذا وہ آپ کے شایان شان ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا وہ تو ابھی بہت کم عمر ہے، اس زمانے میں حضرت عائشہؓ کی

عمر سات سال سے زیادہ نہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی آپ قبول فرمالیں ہم بڑی ہونے تک انتظار کرلیں گے۔ یہ پیام 630ء میں طے پایا اور سب سے پہلی عورت جس نے اسلام کے ساتھ دنیا میں قدم رکھا۔ پیغمبر خدا کے لئے مخصوص ہوگئی۔

اسلام میں امت کا تصور

حضرت محمدؐ ایک سال مزید مکہ میں سخت ترین مصائب جھیلتے رہے گو آپ موت کے خواہاں نہ تھے مگر موت سے بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ اہل عرب کہا کرتے تھے اور اب بھی یہی کہتے ہیں ”کہ جس دن اس دنیا میں ہمارا آنا لکھا تھا کسی نے ہم سے یہ نہ پوچھا کہ آیا تم دنیا میں جانا چاہتے ہو یا نہیں؟ اگر ہم سے یہ سوال کیا جاتا کہ دنیا میں جانا چاہتے ہو تو شاید ہم نفی میں جواب دے دیتے۔ پھر جس روز اس دنیا سے ہمیں لے جانا چاہیں گے تو کوئی بھی ہم سے یہ نہیں دریافت کرے گا کہ مرنا چاہتے ہو یا نہیں؟ ہماری زندگی خدا کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ ہمیں جب دنیا میں بھیجنا چاہتا ہے بھیج دیتا ہے اور جب لے جانا چاہتا ہے، لے جاتا ہے۔ ہمیں اس نے کوئی اختیار نہیں دیا کہ یہاں آئیں یا چلے جائیں۔ زندگی ایک سرمایہ کی مانند ہے جو خدا نے ہمیں بخشی ہے ہم اس سرمایہ کے سود سے نفع اٹھا سکتے ہیں، سرمایہ سے نہیں، کیونکہ سرمایہ ہمارا اپنا نہیں ہے۔ لہٰذا موت کی طلب نہ کرنی چاہئے کیونکہ موت ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے مگر جب موت آئے تو ڈرنا بھی نہ چاہئے کیونکہ ڈرنے سے موت ملتوی نہیں ہوسکتی۔“

رسول اللہ چونکہ عرب تھے لہٰذا موت کے بارے میں ان کا بھی یہی عقیدہ تھا، وہ مشقت و تکالیف کو برداشت کئے جاتے تھے۔ ایک سال کے بعد یعنی 621ء میں حج عمرہ کے لئے متعدد مدنی مکہ آئے تو معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں جو بغرض زیارت مکہ آئے ہیں ایک قبیلے کے ہیں اور دو ایک دوسرے قبیلے کے ہیں۔ وہ بارہ جب مکہ پہنچے تو انہوں نے ایک مقام عقبہ (دو پہاڑوں کی تنگنائے) میں حضرت محمدؐ کے ساتھ بات چیت اور مشورہ کیا۔ یہ تنگنائے مکہ و منیٰ کے درمیان وہ مقام ہے جو قدیم زمانے میں ابلیس اور دیگر موذی ارواح کا مسکن مشہور تھا۔

کہتے ہیں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ چاہا کہ اپنے فرزند کو راہ خدا میں قربان کریں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ پکے مسلمان (مطیع خدا) ہیں تو شیطان اسی تنگنائے میں ان سے آ

کر ملا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ حضرت ابراہیم، کو قربانی سے روک دے لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو پتھر مارے تاکہ وہ دور ہو جائے آج بھی جب حاجی لوگ حج کے لئے جاتے ہیں تو ایک خاص دن میں یہاں جا کر پتھر مارتے ہیں (وہ نشانات جہاں شیطان ملا تھا وہاں پتھر کھڑے ہیں جنہیں سنگریزے مارے جاتے ہیں)۔

مدینہ کے بارہ مسلمان جنہیں تاریخ اسلام "انصار" کے نام سے یاد کرتی ہے (بلکہ سارے مسلمانان مدینہ کو انصار کہتے ہیں) جب اس تنگنائے میں آپ سے ملے تو حضور سے کہا "پچھلے سال کی نسبت سے مسلمانوں کی تعداد مدینہ میں زیادہ ہو گئی ہے یہ اضافہ قرآن کی وجہ سے ہوا ہے۔" انصار نے کہا کہ "یہودی ایک عرصۂ دراز سے اس امر کے منتظر تھے کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ ان کی پیشگوئی نے حقیقت کی صورت اختیار کر لی ہے اس مرتبہ بجائے اس کے کہ پیغمبر یہودی قوم میں ظاہر ہو خود ہم عربوں میں ظاہر ہوا ہے اور وہ بھی اہل قریش سے جن کی اصالت میں کوئی بھی شک نہیں کر سکتا۔ ہم اہل عرب اب تک اپنے آپ کو یہودیوں اور عیسائیوں کے سامنے سرنگوں دیکھتے تھے کیونکہ وہ اہل کتاب تھے اور ہم اہل کتاب نہ تھے، ہماری یہ آرزو تھی کہ ہم بھی ان کی طرح صاحب کتاب ہو جائیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم ایک ایسے پیغمبر کے پیروکار بن گئے جو ہمارے لئے ایک کتاب بھی لایا ہے وہ کتاب بھی کیسی لاجواب ہے جسے قرآن کہتے ہیں کہ جب کان میں پڑتا ہے تو دل کو ہلا دیتا ہے اور انسان کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔"

عبداللہ بن ابی کا تاج

اس کے بعد ان بارہ انصار نے آپ (ﷺ) سے مدینہ کی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مدینہ میں باوجود اختلاف کے ایک بادشاہ کا انتخاب ہو چکا ہے جس کا نام عبداللہ بن ابیؔ ہے۔ ایک سنار نے اس کا تاج بنانے کے لئے اس کے سر کا ناپ بھی لیا ہے مگر چند ایک قبائل مدینہ اس کی سلطنت کے خلاف ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ بجائے ایک بادشاہ کے، پیغمبر کا انتخاب کریں چونکہ آپ قریشی ہیں اور آپ کے باپ عبداللہ مدینہ کے قریب دفن ہیں لہٰذا مدینہ کے لوگ اس بات پر آمادہ ہیں کہ آپ کو سردار بنا لیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ پیغمبر، بادشاہ

سے بڑا ہوتا ہے اس لئے کہ اسے خدا کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت محمدؐ نے انصار سے فرمایا ''کیا تم لوگ اس بات پر راضی ہو کہ میرے ہاتھ پر ''بیعت النساء'' کرو؟'' بیعت النساء جزیرۃ العرب میں اس حلف وفاداری کو کہتے تھے جس میں کسی قبیلے سے نکالا ہوا شخص کسی دوسرے قبیلے کی پناہ (جوار) میں آ جاتا تھا یا چند قبیلے مل کر کسی ایک قبیلہ کے ساتھ حلف وفاداری کرتے تھے۔ اس تنگنائے میں دو قبیلوں کے نمائندوں نے آپ (ﷺ) کے ساتھ بیعت النساء کی یعنی حلف وفاداری اٹھایا۔ اہل عرب اسے بیعت النساء سے اس لیے تعبیر کرتے ہیں کہ بیعت کرنے والا وفاداری وفداکاری کی قسم کھاتا ہے کہ جس طرح اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کروں گا شخص معبود کی بھی کروں گا (النساء کے معنی عورتوں کے ہیں) جب یہ بارہ آدمی حلف وفاداری اٹھا چکے تو آپ نے ان سے فرمایا، ''اگر تم اپنی قسم کو پورا کرو گے تو بہشت میں جاؤ گے ورنہ پھر تمہارا معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہو گا وہ چاہے گا تو تمہیں سزا دے دے گا اور اگر چاہے گا تو معاف کر دے گا'' یہ لوگ واپس مدینہ جانے لگے تو آپ نے ایک صحابی حضرت ابن عمیر کو ان کے ساتھ کر دیا تا کہ مسلمانان مدینہ کو قرآن سکھائیں۔ ابن عمیر بوڑھے تھے مگر بہت خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھا کرتے تھے، مدینہ پہنچ کر انہوں نے چند ایک مشرکوں کو مسلمان کیا۔ مدینہ میں اسلام اس طرح ہر روز ترقی کرتا رہا حتیٰ کہ 621ء کے آخر میں سوائے یہودیوں کے تمام باشندگان مدینہ مسلمان ہو گئے۔ یہودی گو اسلام لانے کے لئے تیار نہ تھے مگر حضرت محمد (ﷺ) کے مدینہ چلے آنے پر راضی تھے تا کہ ان کے آپس کے اختلافات حل کرا دیں۔

رسول پاک نے مدینہ کے حالات کا جائزہ لیا اور ہجرت کے لیے تیار ہو گئے وہ جانتے تھے کہ ایک بڑے کام کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ باوجود انتہائی سخت مصائب کے آپ نے اپنے قبیلہ قریش کو نہ چھوڑا اور مکہ ہی میں رہے، کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اگر مکہ سے مہاجرت کی تو قریش سے تعلقات ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائیں گے۔ عربی زبان میں قطع تعلق کے لئے ایک خاص اصطلاح ہے جسے لوگوں نے غیر اصلی معنوں میں بھی استعمال کیا ہے یعنی فتنہ۔ (عربی زبان میں فتنہ قطع ارتباط کے معنی میں آتا ہے اور عزیز و اقارب سے قطع تعلقات کو کہتے ہیں، چونکہ یہ لفظ دوسرے معانی میں استعمال ہونے لگا لہٰذا لوگ خیال کرنے لگے کہ اس کے معنی فتنہ پردازی

کے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔) آپ جانتے تھے کہ مکہ سے مدینہ جانا "فتنہ" یعنی قطع ارتباط ہے اور ہجرت کرنے سے ایک نیا اتحاد قائم ہو جائے گا جو پرانے اتحاد سے مختلف ہوگا۔ نئے اتحاد میں نہ حسب ونسب کا لحاظ ہوگا نہ سرمایہ وشجرۂ خاندانی، مدار شخصیت ہوگا، سفید، سیاہ، غنی وفقیر، شریف زادہ اور عوام سب برابر ہوں گے۔ یہ اتحاد جسے امت کہتے ہیں ہر شخص کو برابر سمجھتا ہے کیونکہ سب مسلمان ہیں اس امت کا سرپرست خدا ہے اور وہی سرپرست رہے گا۔ امت میں خدا کا نمائندہ پیغمبر ہے۔ تمام افراد ایک دوسرے کے سامنے اور خدا کے آگے برابر ہیں حتیٰ کہ مرد وزن میں کوئی فرق نہیں ہے عورت کے بھی وہی حقوق ہیں جو مردوں کے ہیں۔

امت، قبیلہ کی طرح ایک گروہ نہیں ہے کہ بربنائے حسب ونسب وخون دوسرے افراد سے ممتاز ہو، امت کو جو چیز تمام افراد بشریت سے ممتاز کرتی ہے وہ قانون ہے۔ امت اور تمام افراد بشریت کے درمیان ایک دیوار حائل ہے جسے قانون کہتے ہیں مگر قانون کسی کے لئے خواہ وہ کسی بھی نسل، ملت، طائفہ اور قبیلہ سے ہو ناقابل عبور نہیں ہے۔ امت میں ہر شخص شامل ہو سکتا ہے اور خدا کی سیادت کو تسلیم کر کے مسلمان ہو سکتا ہے جونہی وہ امت میں شامل ہوتا ہے تمام مجتمع اسلامی کے افراد کے ساتھ برابر ہو جاتا ہے۔ حضرت محمدؐ جانتے تھے کہ اس سے ایسا انقلاب برپا ہوگا جس میں حسب نسب، خون قبیلہ، ثروت، نسل، رنگ اور جلد وجسم کو کوئی اہمیت نہیں ہے، پھر اس امر کو بھی خوب محسوس کرتے تھے کہ عرب میں انقلاب عظیم برپا ہونے کے بعد دنیا میں اس سے کیا انقلاب ہوگا۔

انقلاب فرانس، بمقابلہ اسلامی انقلاب

عربستان میں جو انقلاب حضرت محمد برپا کرنا چاہتے تھے وہ انقلاب فرانس سے کہیں بڑا تھا کیونکہ آپ رسوم وشعائر عرب، نفوذ روسائے قبائل اور اتحاد قبائل کے خلاف کھڑے ہوئے تھے۔ انقلاب فرانس، فرانسیسیوں کے درمیان مساوات پیدا نہ کر سکا مگر اسلامی انقلاب نے مسلمانوں کے درمیان مساوات قائم کر دی اور ہر قسم کے خاندانی، طبقاتی اور مادی امتیازات کو مٹا دیا۔ 622ء میں مدینہ کے باشندے پھر مکہ حج وعمرہ کی غرض سے آئے اور اسی تنگنائے میں حضرت محمد سے ملاقات کی۔ اس مرتبہ حلف وفاداری اٹھانے والے بارہ انصار کے علاوہ مدینہ

کے اور مسلمان بھی تھے۔ یہ تہتر مرد اور دو عورتیں تھیں۔

جب لوگ تنگنائے میں جمع ہو گئے تو آپ نے قرآن کی چند ایک آیات پڑھ کر سنائیں، اس کے بعد ان لوگوں، سے جو نو وارد تھے، فرمایا کہ جنھوں نے بیعت نہیں کی ہے وہ بیعت النسا کریں۔ ان لوگوں نے بھی حلف وفاداری اٹھایا کہ ہم اپنی عورتوں اور بچوں کی مدافعت کرنے کی طرح آپ کا دفاع کریں گے بیعت لینے کے بعد آپ نے فرمایا، "تم لوگوں نے میرے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے، اگر میں کسی خطرے میں گھر جاؤں گا تو تمھیں اپنے بچوں اور عورتوں کی حمایت کی طرح میری حمایت کرنی پڑے گی۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں اسلام کی ترقی کے لئے مجبوراً جنگ کرنی پڑے کیا تم لوگ اللہ کی راہ میں لڑنے کے لئے تیار ہو یعنی جنگ میں آگے بڑھو گے اور کیا میرے ہاتھ پر بیعت حرب کرنے کے لئے تیار ہو؟"

(بیعت حرب اور بیعت النساء میں فرق ہے۔ اگر ہم عربی کی ان دونوں اصطلاحوں کو موجودہ دور کی اصطلاحوں پر منطبق کرنا چاہیں تو کہنا چاہئے کہ بیعت الحرب ایک پیمان جنگ ہے اور بیعت النساء ایک پیمان مدافعت ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ بیعت النساء کرتا تو وہ اس امر پر مجبور نہ تھا کہ اگر عہد لینے والا کسی پر حملہ کرے تو وہ اس کا ساتھ دے۔ البتہ اگر کوئی دوسرا اس پر حملہ آور ہوتا تو وہ اپنی تمام طاقت اس سے مدافعت کرنے میں صرف کر دیتا تھا۔ بیعت حرب، بیعتِ النساء سے بہ نسبت مفہوم کے وسیع تر ہے، کیونکہ جو شخص کسی کے ساتھ بیعت حرب کرتا ہے وہ جنگ مدافعت اور جنگ حملہ آوری، دونوں میں شرکت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔)

مدینہ کے مسلمان حضرت محمد (ﷺ) کے ہاتھ پر بیعت حرب کرنے والے ایک ایسے پیمان میں داخل ہو گئے جو مدافعانہ بھی تھا اور جارحانہ بھی۔ مگر بیعت سے پہلے انہوں نے عرض کی، یا رسول اللہ (ﷺ) ہمیں اس بات کا ڈر ہے کہ اگر آپ فتح پا گئے تو ہمیں چھوڑ کر مکہ تشریف لے جائیں گے۔ لہٰذا آپ نے حلف وفاداری دیتے ہوئے فرمایا، "اے مسلمانانِ مدینہ! تمہارا خون میرا خون ہے، میرا خون تمہارا خون ہے میں تمہارا ہوں تم میرے ہو جو کوئی تم سے لڑے گا میں اس سے لڑوں گا اور جس شخص کے ساتھ بھی تم راہ خدا میں جنگ کرو گے میں اس کے ساتھ جنگ کروں گا" آپ نے ان پچھتر نفوس (تہتر مرد اور دو عورتوں) کے لئے بارہ سردار منتخب کئے، جن میں سے نو سردار ایک قبیلے سے اور تین دوسرے قبیلے سے تھے۔ حضرت محمد نے ان بارہ سے

فرمایا۔ ''تم لوگ میری طرف سے نمائندہ ہو، مدینہ لوٹ کر جاؤ تو مسلمانوں کو احکام خداوندی سنا دو اوران سے کہہ دو کہ مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''انما المومنون اخوۃ فا صلحوا بین اخویکم''۔

(مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں لہٰذا ان میں آپس میں صلح کرادو (اگر لڑائی ہو جائے)

یہ آیت قرآن کی انچاسویں سورت، الحجرات کی دسویں آیت ہے۔ یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی تھی لہٰذا اس موقع پر آپ یہ آیت تلاوت نہ فرما سکے اس لیے کہ ابھی تک اس کا نزول ہی نہیں ہوا تھا مگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے گو، یہ آیت تلاوت نہیں فرمائی تھی لیکن جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ اسی معنی میں تھا۔ خواہ حضرت محمد نے بھی الفاظ فرمائے ہوں یا اس کے قریب قریب مفہوم ادا کیا ہو یہ بات، بہر حال محقق ہے کہ جب آپ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کرنا چاہی تو ہر قسم کے طبقاتی اور قبائلی نظام کو ختم کرنا چاہا تھا۔

سورۃ الحجرات جو مدینہ میں نازل ہوئی تھی اس کی تیرھویں آیت یہ ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَـٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَـٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ.

(اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مذکر و ایک مونث سے پیدا کیا اور تمہیں گروہ اور قبائل میں تقسیم کیا تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو بے شک تم میں سب سے شریف اللہ کے نزدیک سب سے متقی ہے)۔

مطلب یہ کہ ہم نے تمہیں ایک مرد یعنی آدم اور ایک عورت یعنی حوا سے پیدا کیا، اس لئے تم سب حسب و نسب کے اعتبار سے برابر ہو اور ایک دوسرے پر فضیلت نہیں رکھتے کیونکہ تمہارے ماں باپ ایک ہی ہیں۔ جب تمہاری تعداد بہت بڑھ گئی تو ہم نے تمہیں مختلف قبیلوں اور گروہوں میں بانٹ دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو اور اس تعارف کی بنا پر اپنی ضروریات کو پورا کر سکو تم میں سب سے زیادہ شریف وہ لوگ ہیں جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہیں۔

جو لوگ عربی زبان سے آشنا ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ کلمہ ''تعارفوا'' جو اس آیت میں آیا ہے مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے اس سے مراد صرف معمولی شناسائی نہیں ہے بلکہ ایک

دوسرے کے اوضاع واحوال سے تعارف اور رفع ضروریات کے لئے شناسائی پیدا کرنا ہے۔ اس زمانے تک حضرت محمد ایک پیغمبر تھے مگر اس دن کے بعد رسالت کے علاوہ وہ ایک ملت کے سربراہ بھی ہو گئے تھے۔

ہجرت...... تاریخ کا عظیم واقعہ

بیعت حرب رجب 622ء میں ہوئی۔ اس کے بعد دو نئی اصطلاحیں زبانِ عرب اور بالخصوص زبانِ اہلِ اسلام پر جاری ہوئیں۔ ایک اصطلاح ''انصار'' اور دوسری اصطلاح ''مہاجرین'' ہے۔ انصار ان مسلمانانِ مدینہ کو کہتے تھے جنہوں نے رجب 621ء اور رجب 622ء میں حضرت محمدؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی اور مہاجرین ان مسلمانانِ مکہ کو بولتے تھے جنہوں نے آپ کے اشارے پر آزارِ قریش سے بچنے کے لئے مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ تاریخ اسلام میں ان دونوں فریقوں میں سے کوئی کسی پر فضیلت نہیں رکھتا کیونکہ راہ اسلام میں دونوں نے تکالیف برداشت کیں۔ شروع شروع انصار صرف وہ لوگ کہلاتے تھے جنہوں نے ماہ رجب 621ء اور 622ء میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی مگر بعد ازاں ان تمام باشندگان مدینہ کو انصار کہنے لگے جو اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ بیعتِ حرب بالکل پوشیدہ طور پر ہوئی تھی مگر اہل قریش کو پتہ چل گیا کہ حضرت محمد اور مدینہ سے آنے والوں کے درمیان کوئی گفت وشنید ہوئی ہے اور کوئی معاہدہ ہو گیا ہے۔ لہٰذا وہ اس بات کے درپے ہوئے کہ جو باشندگان مدینہ، حج عمرہ کے لیے آئے ہیں ان سے تحقیق کریں کہ تم لوگ کہاں اور کب حضرت محمد سے ملے اور کیا گفت وشنید ہوئی؟ زائرین مدینہ جو کہ بت پرست تھے اور بتوں کی زیارت کے لئے مکہ آئے تھے انہیں معلوم نہ تھا کہ حضرت محمد (ﷺ) سے مدینہ والوں کی کیا بات چیت ہوئی۔ ان میں سے ایک تاجر کو پکڑ کر اس سے استفسار کیا گیا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کر دیا، اس سے قریش کا شبہ بڑھ گیا کہ یہ اس معاہدے کو چھپانا چاہتا ہے۔ مگر بعد میں انہیں خیال آ گیا کہ یہ بڑے قبیلے والا ہے۔ مکہ میں بھی اس کے بااثر دوست ہیں چنانچہ اسے چھوڑ دیا گیا اور دو جاسوس مدینہ کی طرف روانہ کر دیئے گئے تاکہ مسلمانوں سے حالات کی اطلاع لیں اور معاہدے کی نوعیت کے بارے میں معلوم کریں۔ ممکن ہے آپ یہ سوال کریں کہ کفار خود حضور (ﷺ) کو گرفتار کر کے ان سے کیوں نہیں دریافت کرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ (ﷺ) کو ایک سردار قبیلہ کی حمایت

حاصل تھی جس کی تشریح گزر چکی ہے۔ لہٰذا قریشی آپ کو گرفتار نہیں کر سکتے تھے نہ آزار پہنچا کر دریافت کر سکتے تھے کہ کیا معاہدہ طے پایا ہے؟

معاہدہ کر کے واپس جانے والوں کی تعداد 75 تھی۔ جب وہ مدینہ پہنچ گئے تو آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ یہاں سے ہجرت کر کے مدینہ چلے جائیں اور انصار کے گھروں میں قیام کریں۔ مسلمانان مکہ چھوٹے چھوٹے دستوں کی صورت میں شہر سے باہر ہو گئے اور مدینہ کی راہ لی، انہوں نے اس بات کی بڑی احتیاط کی کہ اہل مکہ کو ان کی روانگی کی اطلاع نہ ہو مگر مکہ جیسے شہر میں جہاں سب ایک دوسرے کو پہچانتے تھے (آج بھی عرب کے شہروں کے باشندے ایک دوسرے کو خوب پہچانتے ہیں خواہ وہ جدہ ہو یا مکہ، تو اس زمانے کا کیا حال ہوگا) ایک گروہ کا شہر سے باہر ہو جانا معمولی بات نہ تھی، قریشیوں کو پتہ چل گیا کہ مسلمان نکلے جا رہے ہیں لہٰذا انہوں نے رکاوٹ ڈالنے کی ٹھان لی۔ تین مسلمانوں عیاش بن ربیعہ اور دو بھائی ہاشم اور امیہ، فرزندان عاص نے ارادہ کیا کہ تینوں مل کر مکہ سے نکل چلیں، سفر کے لئے جو رات انہوں نے مقرر کی تھی اس رات کو ہاشم بن عاص کا کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں گئے۔ وہ دونوں مسلمان ایک ساتھ روانہ ہو گئے، اگلے روز اہل مکہ کو پتہ چلا کہ ہاشم مسلمان ہیں اور مکہ سے بھاگنا چاہتے ہیں لہٰذا قریش نے انہیں گرفتار کر لیا۔

اس زمانے میں مکہ کے اندر کوئی جیل نہ تھی، عرب میں سب سے پہلا زندان رحلتِ پیغمبر کے عرصہ بعد کوفہ میں بنایا گیا تھا اس لئے جس کسی کو گرفتار کیا جاتا تھا اس نے زنجیر سے باندھ دیتے تھے اور تپتے ہوئے صحرا میں ڈال دیتے تھے، ہاشم کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا تھا۔ طائفہ قریش نے دو اور مسلمانوں کا تعاقب کیا جو مکہ سے ہجرت کر کے جا رہے تھے مگر وہ ہاتھ نہ لگے۔

قریشی جاسوس مدینہ پہنچے تو حضرت جائشہ کے پاس گئے اور کہا مکہ میں آپ کی والدہ سخت بیمار ہیں ان کا بچنا مشکل ہے اگر مرنے سے پہلے ماں کا منہ دیکھنا چاہتے ہو تو ہمارے ساتھ مکہ چلو، کیونکہ ہم عنقریب مکہ جانے والے ہیں۔ حضرت جائشہ نے سوچا ہو سکتا ہے یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہوں مگر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سچے ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مرنے سے پہلے ماں کا چہرہ نہ دیکھ سکوں لہٰذا وہ ساتھ ہو گئیں۔ جونہی وہ مکہ پہنچے انہیں پابہ زنجیر کر کے ہاشم کے ساتھ صحرا میں چھوڑ دیا گیا۔

حضرت ہاشم بن عاص اور حضرت جائشہؓ کی یہ خوش بختی کہیئے کہ جب انہیں پابہ زنجیر کیا گیا تو موسم گرما ختم ہو کر موسم بہار شروع ہو گیا تھا اور گرمی کی حدت ختم ہو گئی تھی ورنہ دھوپ کی شدت سے دونوں ختم ہو جاتے۔ مدینہ میں حضرت جائشہؓ و ہاشم کی گرفتاری کی خبر پہنچی تو فوراً چند ایک انصاری تیز رو اونٹوں پر سوار ہو کر مکہ پہنچے اور رات کے وقت جا کر ان کی زنجیریں کھول دیں، اونٹوں پر سوار کیا اور مدینہ کی راہ لی حضرت جائشہؓ اور ہاشم کے جسم پر سوائے کھال اور ہڈی کے کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

مکہ کے ایک دولت مند شخص ابو جاش نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو ان کے عظیم الشان گھر پر ابوسفیان نے قبضہ کر لیا۔

حضرت صہیب ﷜ بن سنان الرومی ایک مال دار مسلمان نے ہجرت کا ارادہ کیا تو قریشی ان کے گرد جمع ہو گئے کہنے لگے "اے صہیب! جس دن تو مکہ میں آیا تھا ایک فقیر آدمی تھا، باہر سے آ کر تو نے سوداگری شروع کی، ہماری مدد اور ہم سے استفادہ کر کے مال دار بنا، اب یہ چاہتا ہے کہ جو کچھ دولت یہاں پیدا کی ہے، اسے لے اڑے، ہم تو تجھے یہاں سے مدینہ جانے نہ دیں گے" حضرت صہیب ﷜ سارا مال و دولت چھوڑ کر مدینہ کو روانہ ہو گئے اسی لیے قرآن کی دوسری سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 207 میں اللہ تعالیٰ نے ان کی مثال دی ہے اگر چہ آیت میں ان کا نام نہیں مگر تمام محققین اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد حضرت صہیب ﷜ ہی ہیں۔ وہ آیت یہ ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ ۢ بِالْعِبَادِ.

(بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنی جان کو راہ خدا میں بیچ دیتے ہیں اور اللہ بندوں پر بہت مہربان ہے۔) مطلب یہ کہ مہاجرین مکہ میں ایسے لوگ ہیں کہ حصول رضائے خداوندی کے لئے مالِ دنیا سے ہاتھ دھو لیتے ہیں اور مالِ دنیا کے عوض اپنی روح کو بچا لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے ایسے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ قریشیوں کو حضرت صہیب ﷜ کے اس عمل پر بڑی حیرت ہوئی کیونکہ انہیں اس کا سان و گمان بھی نہ تھا کہ کوئی شخص اپنے دین کی حفاظت کے لئے اتنی بڑی دولت چھوڑ سکتا ہے۔ اہل مکہ میں روپیہ اور دولت سے زیادہ کوئی بھی چیز قیمتی نہ تھی، وہ تو صرف اسی لئے زندہ تھے کہ دولت کمائیں اور سرمایہ پیدا کریں۔ اہل قریش، حضرت صہیب ﷜ کو

دیوانہ سمجھتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں ایک دیوانہ ہی مذہب کے لئے اپنی دولت سے صرف نظر کرسکتا ہے۔ حضرت صہیب ؓ کے بعد کئی مسلمان اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ چلے گئے حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ ہم یہاں سے جائیں گے تو قریش ہمارے مکانوں پر قبضہ کرلیں گے۔

مسلمانوں کی ہجرت روز بروز بڑھتی ہی جارہی تھی، یہ دیکھ کر قریشی پریشان ہوگئے۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہوگئی جس کے گھر میں سیلاب در آیا ہو، سارے گھر میں پھیل گیا ہو اور وہ اس کی روک تھام نہ کرسکتا ہو۔ لہٰذا قریشیوں نے اس سیلاب کو روکنے کا فیصلہ کرلیا اور حضرت محمد کے خطرے کا خاتمہ کرنے کا تہیہ کرلیا۔

ہم یہ بیان کرچکے ہیں کہ طائفہ قریش دس شاخوں میں منقسم تھا اور سب قبیلے مکہ میں رہتے تھے۔ ان کی آبادی دو سو کلو میٹر مربع میں تھی یعنی یہی مکہ کی وسعت تھی۔

روایت ہے کہ وہ دو سو کلو میٹر مربع جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کے لئے منتخب کی تھی اور انہوں نے ہی یہ حدود قائم کی تھیں۔ ہر ایک قبیلہ ایک علیحدہ مقام میں رہتا تھا اور ہر قبیلہ مکہ سے باہر کسی کوہستانی منطقہ میں ایک شعب (درہ) کا مالک تھا، جہاں قبیلے کے غلام یا پناہ گیر رہتے تھے۔ ان میں سے ہر قبیلے میں تین طبقے کے افراد تھے:

(1) مولیٰ: جس کے لفظی معنی بمنزلہ مشتری کے ہیں اور مجازاً رب، صاحب اور مالک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ موالی اس کی جمع ہے۔ جس کا اطلاق برادران اعضائے قبیلہ پر ہوتا تھا مگر حقیقی رشتہ داروں پر نہیں بلکہ رضاعی بھائیوں پر۔ رضاعت کے سلسلے میں قریشیوں میں یہ رسم تھی کہ ان کی عورتیں اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلایا کرتی تھیں بلکہ دایہ کے سپرد کر دیتی تھیں۔ اگر دایہ کے کوئی لڑکا ہوتا تو وہ ان کے فرزند کا رضاعی بھائی ہوتا تھا۔

(2) حلیف: جس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا تھا جو باہر سے آیا ہوا ہوتا اور کسی قبیلہ کی پناہ لے کر ان کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا تھا۔

(3) جار: وہ شخص جو کسی قبیلے میں آکر پناہ لیتا لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ ایک خاص مدت کے لئے ان کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا تھا، برخلاف حلیف کے کیونکہ وہ ہمیشہ کے لئے ان کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا تھا۔

ان تینوں زمروں کے اشخاص، قبائل قریش میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتے تھے مگر یہ

غلام، کنیز، لوگ شعب میں رہتے تھے، پناہ دینے والے قبیلے کے اندر نہ رہ سکتے تھے۔ غلام اور کنیزیں مذکورہ بالا تین طبقوں یعنی مولیٰ، حلیف اور جار میں شمار نہ ہوتے تھے، کیونکہ انہیں اس قابل ہی نہیں سمجھا جاتا تھا کہ وہ ان میں شمار ہوں اس لیے کہ قبائل قریش غلاموں کو منجملہ اثاث البیت یا جانوروں کے قبیل میں شمار کرتے تھے۔ دسوں قبیلوں میں سے ہر ایک کی مجلس شوریٰ تھی جسے نادی کہتے تھے پھر تمام قبیلوں کی ایک مجموعی مجلس شوریٰ علیحدہ تھی جسے دارالندوہ بولتے تھے۔ دارالندوہ میں صرف وہ لوگ شرکت کر سکتے تھے جو کسی نادی کے سردار ہوتے تھے اور وہ لوگ بھی شریک ہو سکتے تھے جو قبائل قریش سے ہوں گے مگر چالیس سال سے زائد عمر رکھتے ہوں۔ ابو لہب بطور استثناء، چالیس سالہ ہونے سے پیشتر دارالندوہ میں شرکت کیا کرتا تھا کیونکہ وہ بڑا دانا بینا تھا لہٰذا قریشی اس کی فہم و فراست سے استفادہ کرنا چاہتے تھے۔ دارالندوہ کی مجلسیں ایک بڑے کمرے میں ہوتی تھیں جسے شادی بیاہ کے مواقع پر بھی استعمال کر لیا جاتا تھا۔ شادی کی مجالس میں قریش کی عورتیں، زر و جواہرات سے جڑے ہوئے زیورات پہن کر یہاں آتیں۔ جن عورتوں کے پاس جواہرات نہ ہوتے تھے وہ خیبر کے جوہریوں سے کرایہ پر لے آتی تھیں۔

ہم آگے چل کر یہ واضح کر دیں گے کہ خیبر کہاں واقع ہے اور وہاں کیا واقعہ درپیش آیا تھا؟

جب اہل قریش نے مسلمانوں کی ہجرت کو روکنا چاہا تو وہ دارالندوہ میں جمع ہوئے تاکہ اس کی روک تھام کر سکیں اور آنے والے خطرے کی پیش بندی ہو سکے۔ پہلے پہل انہوں نے یہ تدبیر سوچی کہ حضرت محمد کو ہاشم و جائشہؓ کی طرح پابہ زنجیر کر کے تپتے ہوئے صحرا میں چھوڑ دیں مگر وہ کہنے لگے کہ مدینہ کے لوگوں کو اطلاع ہو جائے گی اور وہ آ کر آپ کو آزاد کر دیں گے۔ پھر سوچنے لگے کہ رسول کریم کو مکہ سے باہر کر دیں مگر کہا گیا کہ اس میں تو بڑا خطرہ ہے کیونکہ اگر انہیں مکہ سے دیس نکالا دیا گیا تو وہ لامحالہ مدینے چلے جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ وہاں سے ایک فوج لا کر مکہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیں۔ بالآخر اس پر اتفاق ہو گیا کہ آپ کو شہید کر دیا جائے تاکہ کسی قسم کا خطرہ نہ رہے یعنی وہی بات جو پہلے سوچی تھی مگر اس پر عمل نہ کر سکتے تھے، اسی پر آ گئے۔

عربستان میں کسی شخص کو قتل کر دینا، نہ مذہبی اعتبار سے کوئی برا کام تھا نہ اخلاقی اعتبار سے۔ اسے صرف مادی نقصان سمجھا جاتا تھا۔ عرب میں قتل انسان، اسلام کے آنے کے بعد گناہ سمجھا گیا اور مذہبی و اخلاقی نقطہ نگاہ سے فعل قبیح قرار دیا گیا۔ اہل عرب ایک فرد کو مال سے زیادہ

وقعت نہ دیتے تھے۔ جب بھی کوئی شخص قتل کر دیا جاتا اور قاتل روپیہ پیسہ بکریاں یا اونٹ دے دیتا تو وہ بری الذمہ ہو جاتا۔ خون بہا، چھوٹے بڑے، سردار اور غیر سردار قبائل کے افراد کے اعتبار سے مختلف ہوتا تھا۔ قبائل قریش کے لئے آپ کا شہید کر دینا کوئی مشکل مسئلہ نہ تھا مگر یہ کہ ابولہب جائے اور اس کی جگہ کوئی دوسرا سردار بن جائے تو خطرہ تھا کہ وہ بنو ہاشم کی طرف سے قریشیوں سے ان کا خوں بہا طلب کرے گا۔

خوں بہا سے بچنے کی انہوں نے یہ ترکیب بھی کی کہ قریش کے تمام قبیلے آپ کو شہید کرنے میں شرکت کریں اور ابولہب بھی اس میں حصہ لے۔ تمام قبیلوں کی شرکت اور بنو ہاشم کی شرکت سے یہ فائدہ ہوگا کہ کوئی بھی قریش سے آپ کے خوں بہا کا مطالبہ نہیں کر سکے گا کیونکہ سب کی شرکت سے قاتل کا علم ہی نہیں ہوگا اور کوئی بھی یہ سوال نہ کر سکے گا کہ انہیں کس نے شہید کیا؟ پھر بھی اگر کوئی دعویدار پیدا ہوا اور خوں بہا کا طالب ہوا تو وہ جرأت نہ کر سکے گا کہ دس قبیلوں کے ساتھ مقابلہ کرے۔

جب ان لوگوں نے عزم کر لیا کہ اجتماعی طور پر آپ کی شہادت میں شریک ہوں تو قاتلوں کے نام شمار کرنے شروع کر دیئے اور ہر قبیلہ کے سردار کا نام شامل کیا تاکہ قاتلوں کی فہرست طویل ہو جائے اور اس طرح ان کو زیادہ خسارہ برداشت نہ کرنا پڑے (اگر کسی وقت خون بہا طلب کیا گیا) ہم اس دور میں ان کی اس قدر پیش بینی پر تعجب کرتے ہیں لیکن یہ بات خیال میں رکھنی چاہئے کہ اہل مکہ تاجر تھے، تاجر ہمیشہ مال اندیش ہوتے ہیں اور سود و زیاں کا حساب کرتے ہیں لہٰذا اس وقت بھی انہوں نے حسب عادت غور و فکر کیا کہ اگر کسی زمانے میں ان سے خوں بہا کا مطالبہ کیا گیا تو دسوں قبیلے ادائیگی میں شریک ہوں۔

رسول خدا کی ایک پھوپھی رقیہ بنت ابی سیف کو اس منصوبے کی اطلاع مل گئی۔ وہ فوراً رسول اللہ کی خدمت میں پہنچیں اور عرض کی "اپنے بچاؤ کی فکر کیجئے اگر کل رات سے بچنے کی فکر نہ کی تو شہید کر دیئے جائیں گے" رسول اللہ حضرت ابوبکر کے گھر چلے گئے اور حالات بیان کئے۔ حضرت ابوبکر نے اسی رات آپ (ﷺ) کو ہمراہ لے کر غار ثور میں چلے گئے۔ یہ پہاڑ مکہ سے باہر واقع ہے اور آپ سے عرض کی کہ "یہاں سے باہر نہ نکلیں، میرے پاس دو سفید اونٹنیاں ہیں میں ان کے ذریعہ آپ کو مدینہ پہنچا دوں گا (سفید اونٹنیاں عربستان میں سب سے زیادہ تیز رو

ہوتی ہیں)۔ اگر میں اسی وقت مکہ سے اونٹ لایا تو لوگ چوکنے ہو جائیں گے، مجھے اس طرح یہ کام انجام دینا ہے کہ اہل مکہ کو خبر تک نہ ہو۔"

رسول اللہ نے حضرت ابوبکر سے فرمایا، شہر میں جا کر میرے چچازاد علی سے کہو کہ میرے پاس آ جائے"۔ حضرت علی آئے۔ تو آپ نے فرمایا "میری چادر اوڑھ کر سارا دن چارپائی پر لیٹے رہو اور اگلی رات بھی اسی طرح میری جگہ پر لیٹے رہو تاکہ قریش یہی سمجھتے رہیں کہ میں گھر کے اندر ہی ہوں"۔ حضرت علی نے حضرت ابوبکر کے سامنے آپ سے عرض کیا "یارسول اللہ آپ نے ہمیشہ میرے ساتھ احسانات کئے ہیں اور اپنے فرزند کی طرح رکھا ہے اگر میں آپ کے لیے اپنی جان قربان کر دوں تو میری خوش بختی ہوگی" حضرت علی ابوبکر اور رسول اللہ کے آپس کے مشورے سے یہ طے پایا کہ حضرت محمد اور ابوبکر دونوں ایک ایسے غار میں جا کر چھپ جائیں جو غار ثور کی نسبت سے مکہ سے دور ہو اور چند رات دن وہیں چھپے رہیں۔ کیونکہ قریش کو جب پتہ چلے گا کہ آپ مکہ سے باہر تشریف لے گئے ہیں تو فوراً چاروں طرف مکہ کے بیابانوں میں شتر سوار دوڑا دیں گے لہٰذا دونوں کو موقعہ کا منتظر رہنا چاہئے، جب وہ دیکھیں کہ قریش مایوس ہو گئے ہیں اور آپ کی تلاش کے سلسلہ میں صحرانوردی نہیں کریں گے تو حضرت علی دو معتمد آدمیوں کے ساتھ دو سفید اونٹنیاں بھیج دیں گے۔ اس طرح دونوں حضرات سوار ہو کر مدینہ جا پہنچیں گے۔

اس دن حضرت علی نے آپ کی چادر مبارک لی اور چارپائی پر قریشیوں کی طرف سے پشت پھیر کر بیٹھ گئے، اسی دن حضرت محمد اور ابوبکر غار ثور سے نکلے اور بیابان میں ایک اور غار میں پناہ لی۔ حضرت ابوبکر آپ کو ایک ایسی راہ سے لے جا رہے تھے جدھر سے قافلے یا مسافر نہیں گزرتے تھے، رات آنے تک دونوں حضرات سارا دن چلتے رہے حتیٰ کہ ایک غار تک جا پہنچے۔ چونکہ راستے کا بڑا حصہ سنگلاخ تھا لہٰذا رسول خدا کے پاؤں زخمی ہو گئے مگر آپ نے کوئی پرواہ نہ کی۔ حضرت ابوبکر دیکھ رہے تھے کہ آپ سخت متفکر ہیں لہٰذا خاموش رہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ کس فکر میں ہیں۔

سب سے بڑی قربانی

ہجرت کے متعلق پیغمبر اسلام کو سب سے بڑی فکر اس بات کی تھی کہ ہجرت کر جانے کے

بعد ان کا رابطہ عزیزوں اور شجرہ خاندانی سے منقطع ہو جائے گا اور جدی تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ اجداد سے تعلقات کا ختم ہو جانا ایک عرب کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں اگر ہمارا شجرہ نسب ضائع ہو جائے تو ہم دوسرا شجرہ دستیاب کر سکتے ہیں مگر عرب کا شجرہ گم ہوا تو گویا وہ خود فنا ہوا اور اس کے سارے مادی و روحانی وسائل معاش ختم ہوئے۔

میں اس بارے میں ذرا تفصیل سے بحث کروں گا کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی تذکرہ نویس ادھر متوجہ نہیں ہوئے اور ہجرت کر کے جو عظیم الشان قربانی آپؐ نے دی اس کا احساس نہ کر سکے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ راہ ایمان میں حضرت محمد کی سب سے بڑی قربانی یہی تھی کہ اپنے قبیلے سے قطع تعلق کر کے مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ آپ نے ایک آرا ہاتھ میں لیا اور اسلام کی خاطر اپنے شجرہ خاندانی کو قطع کر دیا یعنی ایک ایسے درخت کو کاٹ ڈالا جس کے بغیر دو نا محدود وسعتوں کے درمیان کسی عرب کے لئے زندگی گزارنا ممکن نہ تھا۔ ایک بے پایاں تپتا ہوا صحرائے عرب اور دوسرا آتشیں آسمان۔ عربی کو شجرۂ خاندانی ہی اجداد و اقارب کے ساتھ ملاتا ہے۔ وہ زندگی گزارنے کے لئے اپنے اجداد سے نمونہ اور عزیزوں سے مدد حاصل کرتا ہے۔ جب بھی کسی عربی کا شجرہ نسب منقطع ہوا، تو نہ اجداد اس کے لئے نمونہ زندگی پیش کرتے ہیں نہ عزیز و اقارب اس کی دست گیری کرتے ہیں۔ حضرت محمد رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے سب سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہو گئے اور قبیلہ سے قطع تعلق کر لیا، وہ اس پر خوش تھے مگر قطع علائق کی فکر سے آزاد نہ ہو سکتے تھے۔

جب رات ہو گئی تو دونوں نے راہ پیمائی شروع کر دی اور سنگلاخ زمین ختم ہو گئی اور نرم زمین سامنے آ گئی۔ بالآخر سورج نکلتے ہی ایک ایسے غار کے دہانے پر پہنچ گئے جہاں حضرت ابوبکر آپ (ﷺ) کو چھپانا چاہتے تھے۔ غار کو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اسے صاف کیا اور اپنی چادر پھاڑ کر سارے سوراخ بند کر دیئے۔ تاکہ کہیں سے سانپ نمودار ہو کر آپ کو گزند نہ پہنچائے۔ جب اچھی طرح دیکھ لیا کہ غار ہر طرح تو عرض کی کہ اندر تشریف لے جائیں۔ غار میں اترنے کے بعد حضرت ابوبکر نے آپ کے مجروح پائے مبارک پر پٹیاں باندھ دیں چونکہ سر مبارک کے نیچے رکھنے کے لئے کوئی چیز موجود نہ تھی لہٰذا درخواست کی کہ میری ران پر سر رکھ کر سو جائیں۔ حضرت محمد جانتے تھے کہ ابوبکر بھی بے حد تھک چکے ہیں لہٰذا ان کی درخواست کو منظور نہ

کیا اور زمین پر سر رکھ کر سو گئے۔ روایت ہے (میں کہہ چکا ہوں کہ جہاں کہیں موضوع بحث کا تعلق روایت سے ہوگا میں ذکر کردوں گا کہ یہ روایت ہے تاریخ نہیں ہے) کہ سونے سے پہلے حضرت ابوبکر نے دیکھا ایک سوراخ باقی رہ گیا ہے جس کو چادر سے بند نہیں کیا جاسکا لہٰذا اسے اپنی ایڑی سے بند کردیا اور سو گئے۔ وہ سانپ جو اس سوراخ کے اندر رہتا تھا باہر آنا چاہتا، اس نے ایڑی میں کاٹ دیا، شدت درد سے حضرت ابوبکر بے چین ہو گئے اور پسینہ جاری ہو گیا، پسینہ آپ کے چہرہ مبارک پر ٹپکا تو بیدار ہو گئے۔ ابوبکر کو پریشان دیکھ کر وجہ پوچھی تو پتہ چلا کہ سانپ نے کاٹ لیا ہے تو آپ نے فوراً زخم چوس کر زہر کو تھوک دیا اور ابوبکر کو آرام آ گیا۔

اس شب جب کہ حضرت محمد وابوبکر غار تک پہنچنے کے لئے راہ پیمائی کر رہے تھے۔ قریش آپ کے خانہ مبارک میں جا گھسے دیکھا کہ موجود نہیں ہیں تو حضرت علی سے دریافت کرنے لگے، کیا آپ مکہ سے باہر چلے گئے ہیں؟ حضرت علی ایک راست گو انسان تھے، جھوٹ نہ بول سکتے تھے، فرمایا۔ ''ہاں'' چنانچہ قریش اسی رات جستجو میں مکہ سے روانہ ہو گئے اور بیابانوں میں تلاش شروع کردی۔ ادھر مکہ میں منادی کرادی گئی کہ جو کوئی حضرت محمد کو گرفتار کر لائے گا یا اس جگہ کا پتہ بتادے گا تو اسے ایک سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔ قریش کے چند ایک افراد جن کے پاس تیز رفتار اونٹ تھے اگلے دن سانپ والے غار تک جا پہنچے۔ انہوں نے غار کو دیکھا مگر اس کے اندر نہ گئے کیونکہ جیسا کہ روایت ہے اللہ تعالیٰ نے چند ایک مکڑیوں کو بھیجا تاکہ غار کے دہانے پر جالا تن دیں، اہل قریش غار کے کنارے پہنچے تو جالا تنا ہوا دیکھ کر سمجھے کہ آپ غار میں داخل نہیں ہوئے اس لیے کہ اگر غار میں گھستے تو جالا ٹوٹا ہوا ہوتا۔ قریشیوں کا دوسرا دستہ غار کے دہانے پر پہنچا تو انہوں نے دیکھا کہ غار میں ایک پرندے نے گھونسلہ بنا رکھا ہے اور انڈے دیئے ہیں لہٰذا ایک دوسرے سے کہنے لگے اگر حضرت محمد غار میں جاتے تو پردۂ عنکبوت ٹوٹ جاتا اور پرندہ غار میں اپنا گھونسلہ نہ بناتا۔

اس کے علاوہ (حسب روایت) دوسرے دستے کے عبور کر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کے اوپر سے ایک چٹان گرادی اور غار کے دہانے کو بند کردیا تاکہ کوئی بھی اندر نہ جاسکے۔ چونکہ ابوبکر بہت خستہ حال اور سانپ کے کاٹنے کی وجہ سے تکلیف میں تھے لہٰذا گھبرا گئے، رسول اللہ نے انہیں تسلی دی اور مدد الٰہی کی امید دلائی۔

نویں سورۃ التوبہ کی چالیسویں آیت میں اس واقعہ کے متعلق اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے:

اِلَّا تَنْصُرُوْہُ فَقَدْ نَصَرَہُ اللّٰہُ اِذْ اَخْرَجَہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ.

''اگر تم نے رسول کی مدد نہیں کی تو اللہ نے ان کی مدد کی جب کہ کافروں نے (مکہ سے) اسے نکال دیا تھا، وہ ان دو میں کا دوسرا تھا جب وہ دونوں غار میں تھے جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اللہ نے اس (ابوبکر ؓ) پر اپنی تسکین نازل کی۔''

تین دن کی تلاش کے بعد اہل قریش تھک کر لوٹ گئے۔ حضرت ابوبکر (ؓ) کا غلام عامر بن فہیرہ وہاں دو سفید اونٹنیاں لے آیا۔ دونوں سوار ہوئے اور مدینہ کی راہ لی۔ مگر یہ سوچ کر کہ کہیں تعاقب کرنے والے گرفتار نہ کر لیں، سمندر کے کنارے کنارے چلے۔ حضرت ابوبکر (ؓ) کے پاس کوئی چادر نہ تھی اور حضرت محمد چونکہ جلدی میں ان کے گھر چلے آئے تھے لہٰذا کپڑے ساتھ نہ لا سکے تھے۔ دونوں بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے سپید اونٹنیوں پر سوار (جو اہل عرب میں بہت قیمتی سمجھی جاتی ہیں) جا رہے تھے۔ جو کوئی دیکھتا حیرت کرتا کہ ایسے بوسیدہ کپڑوں والے اتنی قیمتی اونٹنیوں پر سوار ہیں۔ اہل قریش نے ہر جگہ منادی کرا دی تھی کہ جو کوئی بھی حضرت محمد (ﷺ) کو گرفتار کر کے لائے گا یا ان کا صحیح صحیح پتہ دے گا اسے سو اونٹ دیئے جائیں گے۔

ایک دن سراقہ بن مالک سردار قبیلہ بنی مدلج چند لوگوں کے ساتھ اپنے خیمے میں بیٹھا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا ''اے سراقہ! میں نے دو شتر سوار سفید اونٹنیوں پر جاتے دیکھے ہیں، وہ سمندر کے کنارے کنارے جا رہے تھے میں خیال کرتا ہوں کہ ان میں سے ایک محمد تھے'' سراقہ نے جونہی یہ بات سنی وہ اس شخص کی بتائی ہوئی نشانیوں سے سمجھ گیا کہ بلاشک ان میں سے ایک محمد ہیں جن کے سر کی قیمت ایک سو اونٹ ہے مگر اسے یہ لالچ ہوا کہ کہیں یہ شخص بھی انعام میں شریک نہ ہو جائے، لہٰذا کہنے لگا تجھے شبہ ہو گیا ہے وہ دونوں تو کل میرے ہاں مہمان تھے آج ہی یہاں سے گئے ہیں۔

وہ شخص چلا گیا تو سراقہ نے اپنے قبیلے کے چند آدمی ساتھ لئے اور گھوڑے پر سوار ہو کر آپ کو گرفتار کرنے روانہ ہو گیا (بنو مدلج قریشیوں کے حلیف تھے) چونکہ وہ گھوڑے پر سوار تھا لہٰذا اس نے حضرت محمد اور ابوبکر کو جا لیا اور ایڑ لگا کر قریب پہنچنا چاہا تو اس کا گھوڑا ٹھوکر کھا گیا۔

تین بار اس نے ایڑ لگائی کہ آپ کے قریب پہنچے مگر گھوڑا ٹھوکریں کھاتا گیا۔

دور جاہلیت میں اہل عرب فال بہت زیادہ لیتے تھے چونکہ سراقہ کے گھوڑے نے تین بار ٹھوکر کھائی لہٰذا اس نے فال لی، آیا مجھے حضرت محمد کو گرفتار کر کے قریشیوں کے سپرد کرنا چاہیے یا نہیں؟ فال بد نکلی۔ اس نے باوجود اس کے، چوتھی بار گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا پھر ٹھوکر کھا گیا۔

بعض تذکروں میں لکھا گیا ہے کہ اس سفر میں عامر بن فہیرہ غلام ابوبکر اور ایک دوسرا غلام، دونوں حضرات کے ساتھ ہم رکاب تھے، یہ دونوں آزاد کردہ غلام تھے۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ عامر بن فہیرہ رہبر تھے حضرت ابوبکر نے انہیں اس لیے ساتھ لیا تھا۔

جب سراقہ نے دیکھا کہ اس کے گھوڑے نے چار بار ٹھوکر کھائی اور گرفتار کرنے کے متعلق فال بھی غلط آئی ہے اور اس نے گھوڑے سے اتر کر درخواست کی "اے محمد! ذرا ٹھہرو مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے" سراقہ گھوڑا کسی ساتھی کے سپرد کر کے پیادہ پا حضرت محمد و ابوبکر کی طرف بڑھا اور کہنے لگا، "میں قریشیوں کے ساتھ متفق الرائے تھا، چاہتا تھا کہ آپ کو گرفتار کر کے ان کے سپرد کر دوں اور بطور انعام ان سے ایک سو اونٹ وصول کر لوں مگر میں اب سمجھا کہ آپ تو ایک برحق انسان ہیں کیونکہ میرے گھوڑے نے چار بار ٹھوکر کھائی اور قریب تک نہ آ سکا، میں سمجھتا ہوں کہ آپ (ﷺ) سے (ایک دن قریش پر غالب آ جائیں گے) اس دن کے لئے میں امان چاہتا ہوں"۔

حضور نے فرمایا "کیا چاہتے ہو؟" سراقہ نے کہا، "میں یہ وعدہ چاہتا ہوں کہ جس دن آپ قریش پر غالب آ جائیں گے مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کرنے کے جرم میں قتل نہیں کریں گے اور میرے قبیلے سے انتقام نہیں لیں گے" آپ نے فرمایا، "اس دن تجھے امان ہوگی، کوئی بھی تجھے یا تیرے قبیلے کو کچھ نہیں کہے گا" (سراقہ بن مالک جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے اور اسلام کے مشہور سرداروں میں سے ہوئے ہیں) اس دن اور اس دن کے بعد جو کوئی بھی حضور (ﷺ) کی تلاش میں آتا سراقہ اسے بھگا دیتا اور کہتا حضرت محمد دوسرے راستے سے گئے ہیں۔

دو دن کے بعد دونوں حضرات ایک ایسے قافلہ سے جا ملے جس میں آپ کے چچا زاد زبیر بن العوام تھے۔ اس سے دونوں نے کپڑے اور خوراک حاصل کی۔ اس کے دو روز بعد قبیلۂ اسلم میں پہنچے وہاں کے سردار اوس بن حجر نے مسعود کو راہنمائی کے لئے ساتھ کر دیا تا کہ

آپ کو مدینہ پہنچا دے۔

صحرائے عرب میں راہبر صرف راہنمائی ہی نہیں کرتا بلکہ وہ پاسپورٹ کی سی حیثیت رکھتا ہے اور بھوک پیاس سے محفوظ رہنے کا بیمہ ہوتا ہے۔ جو کوئی صحرائے عربستان میں راہبر ساتھ لیتا ہے، راستہ گم نہیں کرتا نہ راہزنوں کے ہتھے چڑھتا ہے اور نہ بھوکا پیاسا مرتا ہے کیونکہ صحرا میں ہر شخص راہنما کو پہچانتا اور راہنما ہر شخص کو جانتا ہے۔ جونہی دور سے اپنا تعارف کراتا ہے تو رہزن ہٹ جاتے ہیں اس طرح اس کا جان و مال بالکل محفوظ رہتا ہے اور اسے کسی قسم کی گزند نہیں پہنچتا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت محمد نے اوس بن حجر کی پیش کش کو قبول کر لیا اور مسعود کو اپنا راہبر بنا لیا، مسعود نے عرض کی، ''میں صرف اپنے قبیلے کی حدود تک آپ کو پہنچاؤں گا حضرت محمد نے یہ بات مان لی اور اس کی رہنمائی میں چل کھڑے ہوئے۔ مسعود آپ کو اپنے قبیلہ کی آخری حد تک لے گیا پھر کہا کہ میں آگے نہیں جا سکتا کیونکہ ہمارے قبیلے کی زمین یہیں تک ہے۔

اس سرزمین کے بعد آپ (ﷺ) ایک ایسے قبیلے کی سرزمین میں داخل ہوئے جو قباء کے منطقہ تک جاتی تھی۔ جب قبا پہنچے تو ٹھہر گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ ''اس اونٹنی کو جس پر میں سوار ہوں میرے ہاتھ بیچ دو'' انہوں نے عرض کی ''یارسول اللہ بیچنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ قصیہ آپ کی نذر ہے'' (قصیہ اہل عرب اس اصیل اونٹنی کو بولتے تھے جس سے بار برداری کا کام نہیں لیا جاتا تھا بلکہ صرف سواری یا دوڑ کے کام میں آتی تھی) آپ نے فرمایا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم نے اپنی ساری دولت راہ خدا میں خرچ کر دی ہے، اس اونٹنی کی سواری کو میں پسند کرتا ہوں، کہیں تم اسے صرف نہ کر ڈالو لہٰذا اس کی قیمت بتا دو تا کہ میں ادا کر دوں''۔

اہل عرب بعض اونٹنیوں کے کان قدرے کاٹ دیا کرتے تھے جو اصیل اور سواری یا دوڑ کے لئے مخصوص ہوتی تھیں کیونکہ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ تھوڑا سا کان کاٹ ڈالنے سے اونٹنی تیز تر ہو جاتی ہے اس قسم کی گوش بریدہ اونٹنی کو اہل عرب قصویٰ کہتے تھے چونکہ اس اونٹنی کے بھی کان کٹے ہوئے تھے لہٰذا آپ (ﷺ) نے اسے قصویٰ فرمایا۔

حضرت ابوبکر نے یہ دیکھا کہ آپ کسی طرح ہدیہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو چار سو درہم میں اسے آپ کو فروخت کر دیا۔ اس طرح یہ اونٹنی آپ کی ملکیت میں آ گئی اور تاریخ اسلام میں اس کا نام آ گیا۔ عام طور پر جو مسلمان ہجرت کے واقعات سے آگاہ ہیں یہ جانتے

ہیں کہ آپ (ﷺ) نے مکہ سے مدینہ کو ہجرت جس اونٹنی پر کی تھی اس کا نام قصوئی تھا۔

تاریخ میں ہجرت کی وجہ شہرت

تاریخ اسلام میں حضرت محمد (ﷺ) کی ہجرت بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے بعد مجتمع اسلامی نے ایک امت کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور اختلاف نسل و طبقات، بالخصوص اشراف و رؤسائے قبائل کی برتری ختم ہو گئی تھی اسی طرح مختلف قبائل سے وابستگی کا شرف بے معنی ہو گیا تھا اور تمام مسلمان برابر ہو گئے تھے۔ دنیائے قدیم و جہان جدید کے درمیان ہجرت حد فاصل بنی، عہد جاہلیت، عہد اسلام سے علیحدہ ہوا اور اس طرح طبقاتی و قبائلی تفوق ختم ہوا کہ جب آپ (ﷺ) قبا میں مسجد تعمیر کرنے لگے تو عمر بن الخطاب جیسا انسان مسجد کی تعمیر کے لئے مٹی اٹھا اٹھا کر لاتا تھا اور حضرت محمد و ابوبکر اس کا گارا تیار کرتے تھے وہ عمر جو مکہ کے اول درجے کے سرداروں سے تھے جن کا قد دو گز کا تھا جن کی آواز فضا میں رعد کی طرح گونجتی تھی اور جن کے بارے میں لوگ کہا کرتے تھے کہ شیطان بھی ان سے ڈرتا ہے۔ حالانکہ اسلام لانے سے پہلے اگر کوئی شخص پورے عرب کی دولت بھی انہیں بخش دیتا اور یہ کہتا کہ ایک پتھر یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دو یا ایک مٹھی مٹی ادھر سے ادھر رکھ دو تو وہ ہرگز گوارا نہ کرتے، کیونکہ تعمیر کا تمام کام مکہ کے شریف گھرانوں میں غلام انجام دیتے تھے، شریف لوگ اپنی ذات اس سے بالاتر و برتر سمجھتے تھے کہ وہ خاک سے اپنے ہاتھ آلودہ کریں۔

قباء مدینہ کے جنوب میں واقع ہے اور اس کا ایک جزو شمار ہوتا ہے، مورخین یورپ کہتے ہیں کہ حضرت محمد 2 ستمبر 622ء کو وارد قبا ہوئے مگر اسلام کے مورخین لکھتے ہیں کہ آپ 16 جولائی 622ء کو قبا پہنچے، چونکہ یہ ماہ محرم کے دن تھے لہٰذا مسلمان یکم محرم 622ء سے اپنی تاریخ جدید کا آغاز کرتے ہیں۔

قبا میں درود

اگر آپ 16 جولائی میں وارد قبا ہوئے جیسا کہ اسلامی مورخین لکھتے ہیں تو یہ زمانہ سخت گرمی کا تھا اہل قبا کو معلوم تھا کہ آپ فلاں دن تشریف لا رہے ہیں لہٰذا وہ صبح سویرے ہی گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور گلی کوچوں میں آپ کا انتظار کرنے لگے مگر جب سورج بلند ہوا اور ہوا

میں گرمی آ گئی تو وہ حرارت کو برداشت نہ کر سکے اور گھروں کو لوٹ گئے۔

جب آفتاب بیچ آسمان میں پہنچا اور زمین عرب اتنی گرم ہو گئی کہ اگر کوئی پا برہنہ نکلے تو پاؤں جل جائیں، ایسے وقت حضرت محمد وابوبکر قبا میں داخل ہوئے۔ گلی کوچوں میں کوئی شخص نہ تھا، صرف ایک یہودی جس کا نام تاریخ میں نہیں ملتا، موجود تھا۔ اسے پتہ چلا تھا کہ آج آپ تشریف لا رہے ہیں اس نے جو دو سفید اونٹنیاں اور دو سوار دیکھے تو سمجھ گیا کہ محمد آ رہے ہیں۔ وہ بھاگا بھاگا قبا کی گلیوں میں گیا اور بلند آواز سے پکارا۔ ''اے یہودیو! خبردار ہو جاؤ تمہارا اقبال آ رہا ہے''۔

ہم یہ بات پہلے بتا چکے ہیں کہ یہودی بھی مسلمانوں کی طرح آپ کی آمد کے منتظر تھے تا کہ ناگوار اختلافات ان کے آنے سے ختم ہو جائیں۔ لوگوں نے جو اس کی آواز سنی تو گھروں سے نکل پڑے، نہ صرف مرد بلکہ عورتیں اور بچے تک اس تپتی ہوئی گرم میں باہر نکل آئے تا کہ آپ کی زیارت کریں اور دیکھیں کہ جو پیغمبر اہل عرب کے لئے خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے وہ کیسا ہے؟

حضرت محمد وابوبکر نے کھجوروں کے دو درختوں کے نیچے اپنی اونٹنیاں باندھ دیں اور اتر کر کھجور کے سائے تلے بیٹھ گئے۔ قبا کے سارے انسان خواہ یہودی ہوں یا مسلمان سب آپ کے اردگرد جمع ہو گئے مگر انہیں یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ان دونوں میں محمد کون سے ہیں۔

حضرت ابوبکر (ﷺ) چونکہ آپ سے تین سال بڑے تھے سوچنے لگے کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ مجھے پیغمبرِ اسلام سمجھنے لگیں لہٰذا آپ (ﷺ) رسول اللہ (ﷺ) کے پیچھے بیٹھ گئے اور وہ چادر جو زبیر بن العوام سے لی تھی بدن سے اتار کر آپ کے سر پر تان دی تا کہ دھوپ سے محفوظ رہیں کیونکہ ان دنوں درختوں کی چھاؤں اس قدر نہ تھی کہ دونوں کو دھوپ سے بچا سکتی، البتہ اس ''سائبان'' سے بہتر بچاؤ ہو گیا تھا۔ تب باشندگان مدینہ نے آپ کو پہچانا اور خیر مقدم کے نعرے بلند کرنے لگے۔

آپ جس مقام پر اترے تھے اسے محلہ بنی عمرو بن عوف کہتے ہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا، ''یہ زمین کس کی ملکیت ہے؟'' ایک نوجوان آگے بڑھا اس نے کہا۔ ''یہ زمین میری ملکیت ہے اور یہ دو درخت میں نے خود لگائے تھے'' آپ نے فرمایا۔ ''میں یہ بات اس لیے دریافت کر

رہا ہوں کہ آیا اس زمین کا مالک ہمیں اس امر کی اجازت دیتا ہے کہ ہم یہاں رات گزار لیں اور ان کھجوروں کے درختوں کے نیچے آرام کر لیں" نوجوان نے کہا، "کیوں نہیں آپ جب تک چاہیں یہاں قیام فرما سکتے ہیں میں خوشی سے اجازت دیتا ہوں۔"

قبا کے ایک باشندے نے جس کا نام کلثوم تھا دونوں کی خدمت میں درخواست کی کہ میرے گھر چل کر آرام فرمائیں۔ رسول اللہ نے یہ درخواست قبول نہ کی، فرمایا۔ "ہماری وجہ سے تمہیں زحمت ہوگی" کلثوم نے کہا۔ "یا حضرت! میرے گھر میں ایک کمرہ خالی ہے جسے نہ میں استعمال کرتا ہوں نہ میرے کسی کام کا ہے، آپ دونوں صاحبان، وہاں ٹھہر سکتے ہیں، میں آپ کے اونٹوں کی نگہبانی کروں گا اور انہیں کھلا پلا دوں گا" یہ سن کر آپ نے اس کی درخواست قبول کر لی، اس کے گھر تشریف لے گئے اور اس کے خالی حجرے میں قیام کیا۔

اہل مدینہ کو اسی دن آپ کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی، سب سے پہلے حضرت عمر بن الخطاب مدینہ سے آپ کے دیدار کے لئے تشریف لائے۔ بعد ازاں اور مسلمان بھی آئے۔ زیارت کرنے والوں کی اتنی کثرت ہوگئی کہ اس چھوٹے سے حجرے میں جگہ نہ رہی۔ حضرت سعد بن خیثمہ جو مسلمان ہو چکے تھے انہوں نے یہ حالت دیکھی تو اپنا وسیع گھر آپ کے لیے پیش کر دیا تاکہ وہاں آنے والے مسلمان آرام سے بیٹھ سکیں۔ دن میں آنے جانے والوں سے اس مکان میں ملتے اور رات میں اسی حجرے میں آرام فرماتے۔

تاریخ کی پہلی مسجد

قبا میں پہنچنے کے تیسرے دن بعد رسول خدا نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ایک مسجد تعمیر کریں، مسلمانوں میں سے ایک شخص نے مسجد کی تعمیر کے لئے اپنی زمین پیش کر دی مگر آپ نے اس کے ہدیہ کو قبول نہ کیا۔ فرمایا، "میں یہ زمین تجھ سے خریدنا چاہتا ہوں" چنانچہ اسے خرید لیا۔ اسلامی تاریخوں میں مسجد کی زمین کی قیمت درج نہیں ہے۔ مگر تمام مورخین اسلام یہی لکھتے ہیں کہ اس کی خریداری رسول اللہ کی طرف سے ہوئی۔

مسجد قبا سب سے پہلی مسجد ہے جو مسلمانوں نے تعمیر کی اور اس کی تعمیر کے لئے تمام مسلمانانِ مدینہ نے شرکت کی خواہ وہ حضرت عمر جیسے مہاجر ہوں یا دوسرے مہاجر اور خواہ مسلمانان

مدینہ ہوں جنہیں انصار کہتے تھے۔ رسول خدا حضرت ابو بکر کے ساتھ گارا اور اینٹیں تیار کر رہے تھے اور عمر بن الخطاب بہت دور سے کندھوں پر رکھ کر پتھر یا مٹی کے بورے لا رہے تھے تاکہ گارا اور اینٹیں تیار کریں۔ مسجد قبا حقیقی معنوں میں مسلمانوں کی سب سے پہلی جامع مسجد ہے کیوں کہ تمام مسلمانوں نے اس کی تعمیر میں شرکت کی اور عمر بن الخطاب ابو بکر اور صہیب بن سنان رومی جیسے شریف لوگ، فقیر مسلمانوں کے دوش بدوش مسجد کی تعمیر کے لئے پتھر اور مٹی لائے، خود حضرت محمد بھی صبح سے شام تک مسجد کی تعمیر میں لگے رہے۔ آپ نے کوئی بیس دن قبا میں قیام کیا حتی کہ مسجد مکمل ہو گئی، تب شہر مدینہ میں قدم رکھا جسے اس زمانے میں یثرب کہتے تھے۔

عرب زبان میں یثرب اس مقام کو کہتے ہیں جو انسان کو تکلیف دے یا اسے بیمار کر دے۔ بدو عربوں نے اس لیے اس شہر کا نام یثرب رکھا تھا کہ وہ صحرا میں زندگی گزارتے تھے جہاں بارش نہیں ہوتی تھی البتہ وہ ہے گا ہے موسم بہار میں بونداباندی ہو جاتی تھی۔ یہ بدو جب مدینہ آتے تو وہاں کی مسلسل بارشوں سے بیمار پڑ جاتے اسی لیے اہل دیہات مدینہ کو خراب آب و ہوا والا شہر سمجھتے تھے اور اسے یثرب کے نام سے یاد کرتے تھے دراں حالیکہ خود وہاں کے باشندے اسے طیبہ بولتے تھے یعنی ایک محبوب شہر۔

مدینہ کا پہلا نام طیبہ تھا کیونکہ جب بھی کوئی آدمی بیابان عرب سے یہاں آ جاتا اسے ایسا معلوم ہوتا کہ جنت میں داخل ہو گیا ہے لیکن بدو عرب جو بیابانوں کی خشک ہواؤں میں پلے بڑھے تھے ادھر آ جاتے تو یہاں کی مرطوب آب و ہوا کی تاب نہ لا سکتے تھے اور بیمار پڑ کر بڑے کمزور ہو جاتے پھر آہستہ آہستہ عادی ہو جاتے اور مدینہ کی آب و ہوا ان کے ساتھ ساز کر جاتی مکہ کے بیشتر مہاجر یہاں آ کر بیمار ہو گئے تھے حتی کہ حضرت محمد و ابو بکر اور ان کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ بھی مدینہ آ کر علیل ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک گروہ نے اس کا نام طیبہ رکھا تو دوسرے نے یثرب۔ جو پہلے نام کے بالکل متضاد تھا۔

یثرب، طیبہ اور مدینہ

جب رسول پاک مدینہ تشریف لائے تو انہوں نے یہ متذکرہ دونوں متضاد نام سنے لہٰذا آپ نے دونوں کو منسوخ کر کے مدینہ نام رکھ دیا یعنی "شہر" تاکہ مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ کے

درمیان اس کے نام کے بارے میں کسی قسم کا اختلاف نہ رہے۔

مدینہ کا لفظ ایسا ہے کہ نہ اس نے برے معنی پر دلالت ہوتی ہے اور نہ اچھے پر، اس دور میں مدینہ کا رقبہ آج کل کے حساب سے تین کلومیٹر مربع تھا۔ اس شہر میں معمولی گھروں کے علاوہ بہتر 72 قلعے تھے جس میں سے انسٹھ (59) قلعے یہودیوں کے اور تیرہ (13) اہل عرب کے تھے۔ یہ قلعے بڑے مضبوط حصار تھے جہاں عرب اور یہودی خطرے کے وقت پناہ حاصل کرتے تھے اور دشمنوں سے محفوظ رہتے تھے۔ مدینہ ایک بلند جنگل میں واقع ہے اس زمانے میں اونٹ کے ذریعے ایک دن میں اس جنگل کے طول کو طے کر سکتے تھے اور عرض کو آدھے دن میں۔ دو پہاڑ شہر کے جنوب وشمال میں واقع ہیں اور تین صحرا شرق وغرب، جنوب میں مواد آتش فشاں سے بھرپور ہیں۔

مدینہ کی آب وہوا آج کل کی طرح معتدل تھی اور بہ نسبت دوسرے عرب علاقوں کے، یہاں بارش زیادہ تھی، شہر کے کنارے ایک تالاب تھا جو بارش کے پانی سے بھر جاتا تھا اور سارا سال خشک نہ ہوتا تھا۔ مدینہ کے باشندے مکہ کے باشندوں کی طرح کسی نہ کسی قبیلے یا گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور ہر فرد کسی نہ کسی طائفہ کے ساتھ منسلک تھا۔ یہاں بھی مکہ کی طرح نہ پولیس تھی نہ قید خانہ، اگر کوئی شخص مظلوم ہوتا تو وہ اپنے قبیلہ سے امداد چاہتا تھا تاکہ ظلم کا بدلہ لے سکے۔

مدینہ میں بھی مکہ کی طرح قتل نفس کوئی گناہ شمار نہیں ہوتا تھا بلکہ صرف ایک نقصان عظیم گنا جاتا تھا، صرف اتنا تھا کہ قاتل کا قبیلہ مقتول کے قبیلے کو خون بہا دیتا تھا، خون بہا کی کم سے کم حد سو اونٹ تھی، بڑے آدمیوں کا خون بہا اس سے بھی زیادہ ہوتا تھا۔ مدینہ کے آدھے باشندے یہودی تھے اور آدھے عرب۔ یہودیوں کے یہاں تین بڑے گروہ تھے اور عرب کے بھی تین۔ بعض عرب زراعت پیشہ تھے بعض جانور پالتے اور بعض لوگ تجارت کیا کرتے تھے۔ مدینہ کے یہودیوں کے تین معاشی گروہ تھے۔ ایک گروہ کھیتی باڑی کرتا، دوسرا زرگری اور جواہر فروشی کرتا اور تیسرا کھالوں کے رنگنے کا کام کیا کرتا تھا۔ عربی گروہ کبھی کبھی آپس میں لڑتے بھڑتے تھے۔ اسلام سے پیشتر مدینہ کے دو عربی طائفوں میں سخت جنگ رہتی تھی۔ ان دونوں گروہوں کو آپس کے نزاع سے کوئی بھی فائدہ نہ پہنچا البتہ ایک شخص عبداللہ بن ابی کے حق میں یہ جنگ وجدل سود

مند رہی کیونکہ بعض باشندگان مدینہ کو یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اسے اپنا بادشاہ بنا لیا جائے مگر جب اہل مدینہ نے سنا کہ حضرت محمد مدینہ آ کر لوگوں کے فیصلے کیا کریں گے اور آپس کے اختلافات مٹا دیں گے تو انہوں نے عبداللہ بن ابی کے انتخاب کی ضرورت نہ سمجھی۔

رسول اکرم کے مدینہ پہنچنے سے پہلے مدینہ میں ایک شخص اشنق رہتا تھا وہ قتل کے خون بہا اور دیگر جرائم کے عوضانہ کا تعین کیا کرتا تھا۔ مکہ میں حضرت ابوبکر یہ خدمت انجام دیا کرتے تھے جب بھی قتل یا آنکھ پھوڑ نے یا دانت توڑ دینے کی کوئی واردات ہوتی تو لوگ انہی سے رجوع کرتے اور وہ خوں بہا یا معاوضے کا تعین کرتے۔ مدینہ میں خون بہا، یا عوضانہ کا طریقہ وہی تھا جو مکہ میں تھا۔ یہاں بھی ایک معمولی شخص کے قتل پر سو اونٹ، دیت مقرر تھی اور ایک آنکھ کے پھوڑ دینے کا جرمانہ پچاس اونٹ تھے مگر دانت کے بدلے دانت توڑا جاتا تھا۔ جس کسی کا دانت توڑا جاتا تھا اسے یہ حق حاصل تھا کہ وہ مجرم کا وہی دانت توڑ دے جو اس نے توڑا ہے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں مدینہ کے یہودی آپ کی آمد سے خوش ہوئے انہیں اس امر کی بڑی توقع تھی کہ رسول اکرم ان کے دین کو قبول کر لیں گے۔ رسول اللہ کا رویہ بھی مدینہ پہنچنے کے بعد حسب احکامات خداوندی کچھ ایسا ہی رہا کہ انہیں اس بات کی توقع اور زیادہ قوی ہو گئی تھی منجملہ ان کے ایک یہ بات بھی تھی کہ جب رسول اللہ (ﷺ) نے مسجد قبا بنائی تو محراب مسجد کو بیت المقدس کی طرف رکھا۔ یہودیوں نے جو یہ دیکھا کہ مسجد قبا کا محراب بیت المقدس کی جانب ہے اور قرآن میں گزشتہ پیغمبروں حضرت ابراہیم اور موسیٰ وعیسیٰ کے نام بڑے احترام سے لئے گئے ہیں تو انہیں یقین ہو گیا کہ حضرت محمد دین موسوی کو قبول کر لیں گے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ صرف دین یہود ہی یہ قابلیت رکھتا ہے کہ اس میں کوئی نبی آئے۔ دوسری ملتوں میں نبی نہیں آ سکتا۔

یہود کی اصل ذہنیت

جن دنوں رسول کریم (ﷺ) مسلمانوں کے ساتھ مسجد قبا تعمیر فرما رہے تھے چند ایک علمائے یہود حضور کی خدمت میں، اس بات کا جائزہ لینے کے لئے آئے کہ آیا وہ دین یہود کو قبول کر لیں گے؟ سوالات کے جوابوں سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ آپ یہودی مذہب کو قبول نہیں کریں گے لہٰذا کہنے لگے۔ ”اگر آپ پیغمبر“ بننا ”چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ دینِ یہود کو قبول

کریں کیونکہ جو بھی نبی آیا ہے یہودی قوم سے ہوا ہے، صرف یہودی ایک ایسی قوم ہیں جن سے خدا کے برگزیدہ افراد پیدا ہو سکتے ہیں اور خدا سے ہم کلام ہو سکتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ خدا کسی اور کے ساتھ بھی ہم کلام ہو مگر ایسا تب ہی ہو سکتا ہے وہ ملتِ یہودیت سے رابطہ رکھتا ہو اس لیے کہ یہودی اول درجے کے لوگ ہیں اور باقی اقوام دوم، سوم اور چہارم درجے کی ہیں۔

رسول اللہ (ﷺ) نے جواب میں فرمایا: ''میں خود بخود پیغمبر نہیں بنا بلکہ خدا نے مجھے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، اللہ کی نظر میں سب اقوام برابر ہیں۔ کوئی کسی سے برتر نہیں ہے، سارے افراد اور ساری قومیں خدا کی نگاہ میں مساوی ہیں، خدا جب چاہے اور جس سے چاہے گفتگو کر سکتا ہے۔''

پہلی نماز جمعہ

سب سے پہلی بار مسلمانوں نے جو نماز باجماعت مسجد قبا میں پڑھی وہ نماز جمعہ تھی، پیغمبر اسلام نے جمعہ کے دن کو عبادت کے لئے مخصوص فرمایا۔ یہودیوں کو یہ بات بھی ناگوار گزری کیونکہ وہ اس امر کے منتظر تھے کہ آپ سنیچر کا دن عبادت کے لئے متعین فرمائیں گے اس لیے کہ یہی دن ان کی عبادت کا دن ہے۔ قبا میں کسی بھی یہودی نے مذہب اسلام کو قبول نہ کیا، البتہ صرف ایک یہودی اسلام لایا، یہ وہی شخص تھا جس نے سب سے پہلے آپ (ﷺ) کے آنے کی اطلاع تمام قبا والوں کو دی تھی۔ ہم یہ پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ تاریخ میں اس شخص کا نام نہیں ملتا مگر بعض تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ اس کا نام شلوم تھا۔ جمعہ کے دن جب مسلمان مسجدِ قبا میں نماز کے لئے جمع ہوئے تو کچھ یہودی بھی مسجد میں آئے۔ اس دن آپ نے مسجد قبا میں یہودیوں کے ساتھ کچھ دیر بات چیت کی اور یہ چاہا کہ ان کے اچھی طرح ذہن نشین کر دیں کہ تم لوگ دنیا میں کوئی امتیازی شان نہیں رکھتے ہو اور اللہ نے ایک قوم کو دوسری قوم پر کوئی امتیاز نہیں دیا۔ سارے افراد اللہ کے نزدیک برابر ہیں صرف پرہیزگاری ہی اللہ کے قرب کا سبب بن سکتی ہے۔

جب یہودی مسجد سے نکلے تو آپس میں کہا کہ ''محمد یہودی نہیں بنیں گے'' اسی دن سے وہ پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے، انہوں نے مخالفت کی ابتداء پروپیگنڈے سے کی، سارے شہر میں مشہور کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے جو عورت بھی مسلمان ہو گی بانجھ ہو جائے گی اور جتنی بھی مسلمان عورتیں ہیں سب بانجھ بن جائیں گی۔ یہ پروپیگنڈا اس زمانے میں ہوا

جب کہ شروع شروع مسلمان مکہ سے مدینے پہنچے اور مرطوب آب وہوا کی وجہ سے بیمار پڑ گئے۔ عورتیں بھی مردوں کی طرح بیمار تھیں جب انہوں نے سنا کہ بانجھ ہوگئی ہیں تو ڈر گئیں کیونکہ بیماری نے ان کے دلوں کو کمزور کر دیا تھا۔ آپ نے مسلمانوں کو مسجد میں جمع کر کے فرمایا۔ "یہ جو کچھ پروپیگنڈا اللہ کی طرف منسوب کر کے کیا جا رہا ہے، بے حقیقت ہے، تم لوگوں کو چاہئے کہ عورتوں کی دل داری کرو اور انہیں سمجھاؤ کہ یہ پروپیگنڈا ان لوگوں کی طرف سے ہوا ہے جو اسلام لانا نہیں چاہتے، اچھی طرح سمجھ لو جو کوئی کسی کے دل کو اچھی اچھی باتیں کر کے مطمئن کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اجر دے گا" بعد ازاں حکم الٰہی ہوا کہ بجائے بیت المقدس کے قبلہ مسلمین، خانہ کعبہ ہو۔ لہٰذا مسجد قبا کا قبلہ بھی بدل دیا گیا چونکہ مسجد مذکورہ کا پہلا قبلہ بیت المقدس تھا پھر خانہ کعبہ بنا لہٰذا تذکرہ نگاران اسلام اس مسجد کو ذوقبلتین کہتے ہیں۔ یعنی وہ مسجد جو دو قبلوں والی ہے۔

مدینہ میں داخلہ

جب مسجد قبا کی تعمیر مکمل ہوگئی تو آپ نے مدینہ کا عزم کیا اور اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار ہو کر مدینہ کی راہ لی۔ مدینہ کے لوگ گلیوں میں کھڑے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ وہاں پہنچے تو ہر شخص نے آپ کی اونٹنی کی مہار پکڑ کر یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کے گھر قیام کریں یا اس کے محلّہ کی طرف قدم رنجہ فرمائیں۔ حضرت محمد (ﷺ) نے سوچا اگر کسی ایک شخص کے گھر کا رخ کیا یا کسی خاص محلّہ کا رخ کیا تو مبادا کسی کو ناگواری ہو اور دوسرے یہ سمجھیں کہ رسول خدا نے بہ نسبت ان کے ہم سے محبت نہیں کی اور جو سعادت دوسروں کے حصے میں آئی ہم اس سے محروم رہے۔ لہٰذا آپ نے فرمایا میری اونٹنی کی مہار چھوڑ دو۔ اسے آزادانہ جانے دو کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میری اونٹنی مجھے وہاں لے جائے گی جہاں میرا خدا مجھے ٹھہرانا چاہے گا۔ آپ کی اونٹنی قصویٰ مدینہ کے کئی محلے پار کر کے محلہ بنو نجار میں پہنچ گئی، دور سے آپ نے ایک سفید عمارت دیکھی جسے آپ پہچان گئے کہ مادر عبدالمطلب یہاں رہتی تھیں (یہ ہاشم کی بیوی تھیں) ہر مسلمان یہ خیال کرتا تھا قصویٰ اس مکان کے آگے ٹھہرے گی مگر وہ وہاں بھی نہ ٹھہری اور چلتی رہی، سارے مسلمانان مدینہ، اونٹنی کے پیچھے پیچھے تھے کہ دیکھیں وہ کہاں ٹھہرتی ہے؟ اونٹنی آپ (ﷺ) کے پدر بزرگوار حضرت عبداللہ کی قبر تک جا پہنچی، سب جانتے تھے آپ کی والدہ ماجدہ کی قبر وہاں نہیں ہے کیونکہ ان کی

قبر مدینہ سے باہر ہے۔ مسلمانوں نے خیال کیا کہ اونٹنی اس قبر پر ٹھہرے گی مگر وہ وہاں بھی نہ ٹھہری اور چلتی رہی حتیٰ کہ ایک عورت کے گھر کے پاس پہنچ گئی جس کا نام انیسہ تھا، انیسہ آپ (ﷺ) کی والدہ کے پاس آیا جایا کرتی تھی، قصویٰ یہاں بھی نہ ٹھہری، لیکن محلّہ بنونجار سے باہر نہ جاتی تھی۔ حضرت محمد نے جو یہ دیکھا کہ اونٹنی اسی محلّہ کے گرد چکر لگائے جاتی ہے تو والدہ ماجدہ کا گھر یاد آنے لگا کیونکہ آپ کا شجرہ مادری قبیلہ نجار سے مربوط تھا۔

ہم یہ بات پہلے لکھ چکے ہیں کہ اہل عرب کے نزدیک شجرہ خاندانی بڑی اہمیت رکھتا ہے اگرچہ آپ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ چلے آئے تھے اور اس طرح اپنے سلسلۂ پدری کو منقطع کر دیا تھا مگر مدینہ آنے کے بعد شجرۂ مادری سے ارتباط ہو گیا تھا۔ قصویٰ بڑی دیر تک بنونجار کے محلے میں گھومتی رہی پھر ایک افتادہ زمین پر ٹھہر گئی اور وہیں بیٹھ گئی۔ آپ نے یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ آیا اونٹنی یہیں بیٹھی رہے گی یا صرف تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئی ہے۔ اسے اٹھانا چاہا مگر وہ نہ اٹھی۔ یہ زمین جہاں اونٹنی بیٹھی تھی اس پر کسی کا گھر نہ تھا۔ لوگ اسے کھجوریں خشک کرنے کے لئے استعمال کیا کرتے تھے۔ جہاں اونٹنی بیٹھی تھی اس سے نزدیک ترین گھر بھی دور تھا، آپ کے ساتھ جو مسلمان تھے انہوں نے کہا یہ گھر ابوایوب کا ہے۔ مسلمانوں نے جو یہ دیکھا کہ پیغمبر کا ناقہ اس زمین پر ٹھہرا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ پیغمبر اسلام یہاں مسجد اور خانہ مبارک کی تعمیر کریں گے گویا یہ زمین مرکز اسلام بنے گی۔

مسجد نبوی کی تعمیر

آپ (ﷺ) نے دریافت فرمایا، ''یہ زمین کس کی ہے؟'' ایک مسلمان آگے بڑھا اور عرض کی، ''یا رسول اللہ یہ زمین دو خورد سال یتیموں کی ہے، میرا نام، اسعد بن زرارہ ہے میں ان دونوں کا کفیل ہوں۔ یہ زمین آپ کو پیش کرتا ہوں تاکہ یہاں مسجد اور اپنا گھر تعمیر فرمائیں'' آپ نے فرمایا، ''اگر یہ زمین یتیم بچوں کی نہ ہوتی اور صرف تمہاری ہوتی تب بھی میں یہ ہدیہ قبول نہ کرتا۔ اب جب کہ یہ دو یتیموں کی ہے میں اسے ہرگز ہرگز مفت قبول نہیں کر سکتا، میں بچپن میں یتیم تھا نہ میری ماں تھی نہ باپ، میں جانتا ہوں کہ یتیموں کو کتنی تکلیفیں پہنچتی ہیں اور کس قدر صدمات اٹھانے پڑتے ہیں۔ صرف ایک شرط پر میں اسے قبول کر سکتا ہوں کہ تم عام قیمت سے

زیادہ مجھ سے اس کی قیمت وصول کرو اور پھر میرے سپرد کر دو" اسعد بن زرارہ نے کہا۔ "اس کی قیمت سات دینار ہے" آپ نے مسلمانوں سے دریافت فرمایا۔ "کیا یہ ٹھیک کہتا ہے؟" سب نے اس کی تصدیق کی تو آپ نے فرمایا۔ "میں اس زمین کو دس دینار میں خریدتا ہوں تاکہ اسعد اس سے بہتر زمین ان یتیموں کے لئے خرید سکے"۔

اسلام کے خزانچی حضرت ابوبکر، رسول اللہ کے پیچھے کھڑے تھے انہوں نے فوراً اپنا کیسہ کھولا اور سونے کے دس سکے نکال کر اسعد کو پیش کر دیئے۔ یہ بات خیال میں رکھنی چاہئے کہ اس زمانے میں دس دینار کی بڑی اہمیت تھی کیونکہ اس دور میں نہ مکہ میں کوئی سکہ رائج تھا نہ مدینہ میں۔ ان دونوں شہروں میں جو سکہ رائج تھا وہ ایرانی و رومی سکہ تھا، روم سے مراد رومتہ الصغریٰ ہے جس کا پایہ تخت شہر بیزانس تھا۔ اس لئے اس زمانے میں رومتہ الصغریٰ کو بیزانس کہتے تھے آج کل بیزانس شہر کو استنبول کہتے ہیں۔ دینار سونے کا ایک سکہ تھا۔ ایرانی دینار کو دینار خسروی یا دینار خسرداں کہتے تھے اور رومی کو دینار ہرقلی کہتے تھے جو ہرقل شاہ روم کی طرف منسوب تھا۔

نبی نے خود پتھر ڈھوئے

ایک دن کے بعد آپؐ نے مسلمانوں کی مدد سے مسجد کی تعمیر شروع کر دی، سارے مرد حتیٰ کہ خود پیغمبر بھی مٹی پتھر لا رہے تھے۔ اس مسجد کا طرز تعمیر، صدر اسلام میں تمام مسجدوں کے لئے نمونہ بنا رہا، تین تین ہاتھ کے پتھر رکھ کر دیواروں کو اینٹوں سے بلند کرتے اور مسجد کی چھت کو کھجوروں کے تنوں اور کھجوروں کے پتوں سے بناتے تھے۔ اس مسجد کی تعمیر سات ماہ جاری رہی، مسلمانوں نے اسے بڑی مضبوطی سے بنایا اس لیے کہ مدینہ میں بارشیں ہوتی تھیں، اگر مضبوط نہ بناتے تو مسجد بارش کی نذر ہو جاتی۔ اس کا قبلہ بھی بیت المقدس کی جانب تھا کیونکہ ابھی تک آپ کو حکم خداوندی تحویل قبلہ کے بارے میں نہ پہنچا تھا کہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کریں۔

وہ مسلمان جو ہجرت کر کے آئے تھے ان کے پاس سونے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ لہٰذا آپ نے مسجد میں ایک بڑا سا چبوترہ مٹی اور اینٹوں کا بنوایا تاکہ رات کے وقت لوگ وہاں سو سکیں۔ اس چبوترے یا صفہ پر خرما کی شاخوں اور پتوں کا سائبان تھا تاکہ وہ فقراء دھوپ سے محفوظ رہیں۔ چونکہ اس چبوترے کو صفہ کہتے تھے، لہٰذا جو لوگ یہاں اٹھتے بیٹھتے تھے انہیں اصحاب

صفہ کہتے تھے۔ یہ لوگ جو بزرگان اسلام سے شمار ہوتے تھے۔ یہ چبوترہ جو فقرائے اسلام کی خواب گاہ تھا اسلام کا دارالعلوم اور سب سے پہلی اسلامی درس گاہ بنا کیونکہ درس و تدریس کی ابتداء یہیں سے ہوئی تھی۔

رسولِ اکرم نے جب سرزمین مدینہ پر قدم رکھا تو خود دستِ مبارک سے اپنا سامان اونٹنی سے اتارا اور چاروں طرف نظر دوڑائی کہ رات کہاں گزار سکوں گا۔

حضرت ابوایوبؓ جن کا پورا نام خالد بن زید تھا، حاضر خدمت ہو کر عرض کی کیونکہ ان کا گھر سب گھروں سے قریب تر تھا۔ "یارسول اللہ! آپ کو میرے گھر میں آرام فرمانا چاہئے"۔ آپ نے دریافت فرمایا، "کیا تمہارے گھر میں اتنی وسعت ہے کہ میں وہاں ٹھہر سکوں؟" انہوں نے عرض کی، "کیوں نہیں یارسول اللہ" آپ نے فرمایا، میرے قیام کرنے کی ایک شرط ہے وہ یہ کہ تم کھانے کے لئے زیر بار نہ ہونا" ابوایوب ؓ نے عرض کی۔ "یارسول اللہ آپ ایک فرد ہیں کتنا کھانا تناول فرمالیں گے جو زیر بار کا سوال پیدا ہو؟" آپ نے فرمایا، "میری غذا کم ہو یا زیادہ بہر حال تم پر کچھ نہ کچھ تو بوجھ پڑے گا ہی" حضرت ابوایوب نے جب یہ دیکھا کہ آپ کو اس پر اصرار ہے تو خاموش ہو رہے۔ رسول کریم رات کو آتے اور آرام فرماتے۔ مسجد کی تعمیر گویا امت کے لئے ایک مرکز کی تعمیر تھی۔

مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والے اکثر و بیشتر لوگ فقیر تھے کیونکہ وہ اپنا سرمایہ پیچھے چھوڑ آئے تھے، اپنے قبیلوں سے جدا ہو چکے تھے اور مدینہ میں دکھ بھری زندگی گزار رہے تھے۔ یہودیوں کا یہ پروپیگنڈا کہ مسلمان عورتیں بانجھ ہو گئی ہیں انہیں غم ناک کئے ہوئے تھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کے ہاں ایک خوبصورت تندرست لڑکا پیدا ہوا تو تمام مسلمان خوش ہو گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ مسلمان عورتیں بانجھ نہیں ہوئیں۔

اسلامی اخوت

چونکہ مکہ سے آنے والے مسلمان فقیر تھے لہٰذا رسول اکرم نے انصار کو حکم دیا کہ ہر ایک شخص، ایک مہاجر کے ساتھ بھائی چارہ کرے، اسے اپنے گھر میں جگہ دے اور اپنے ذرائع معاش میں شریک کرے تاکہ مسلمانان مکہ کی سی زندگی بن سکے۔ جب مہاجرین اس قابل ہو

جائیں گے کہ وہ اپنے لئے جائے رہائش و معاش کا انتظام کر سکیں گے تو ان سے جدا ہو جائیں گے۔ مسلمانانِ مدینہ آپ کے حکم کو اس قدر مانتے تھے کہ سب نے آپ کی تجویز پر لبیک کہی ایک سو چھیاسی مسلمانانِ مکہ نے انصار کے ساتھ عہد اخوت باندھا اور ان کے گھروں میں رہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی آٹھویں سورت، سورۃ الانفال کی 74 ویں آیت میں مسلمانان مدینہ کی تعریف کی ہے کہ انہوں نے مسلمانان مکہ کو رہائش کے لئے جگہ دی۔

74 ویں آیت میں فرماتے ہیں

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ.

"وہ لوگ جو ایمان لائے، وطن سے ہجرت کی اور راہ خدا میں جہاد کیا اور جنہوں نے ان کی مدد کی اور پناہ دی یہ ہیں سچے مومن، ان کے لئے بخشش اور عزت کی روزی ہے"۔

چونکہ تمام مسلمانانِ مدینہ کو مسجد تعمیر کرنا تھی لہٰذا بھائی چارے کے قیام کے بعد یہ قرار پایا کہ جو بھی مہاجر کسی انصاری کے گھر ٹھہرا ہوا ہے وہ ایک دن راہ خدا میں مسجد کی تعمیر پر صرف کرے۔ اور ایک دن معاش کے لئے کام کرے اور جس کے گھر فروکش ہے اس کے پاس اپنی کمائی امانت رکھ دے۔

حضرت محمد نے کسی کے ساتھ بھی عہد اخوت نہ باندھا کیونکہ آپ کو یہ خدشہ تھا کہ میری وجہ سے کسی کو زیر بار ہونا پڑے گا اور دوسرے لوگ یہ خیال کریں گے کہ ہمیں رسول اللہ نے اس قابل نہ سمجھا کہ اپنا بھائی بناتے۔ لہٰذا آپ نے اپنے چچا زاد بھائی، علی بن ابی طالب کے ساتھ عہد اخوت باندھا اور ان سے فرمایا۔ "اے علی! تم ایک دن ہم دونوں کے لئے فکر معاش کرو اور ایک دن میں کام کروں گا" حضرت علی نے فرمایا، "یا رسول اللہ! مسجد کی تعمیر کے لئے آپ کا وہاں موجود رہنا ضروری ہے اس کے علاوہ مسلمان ہر روز آپ سے کوئی نہ کوئی کام رہے گا اور وہ اپنے ضروری مسائل کے حل کے لیے آپ کے پاس آتے رہیں گے لہٰذا آپ ہر روز مسجد میں رہیں، تعمیر کی تکمیل کی فکر کریں، مسلمانوں کے مسائل کو حل فرمائیں، میں اپنے اور آپ کے، دونوں کے لئے فکر معاش کروں گا"۔

آپ نے ان کی تجویز کو منظور فرمایا۔ حضرت علی ہر صبح روزی کمانے کے لئے نکل جاتے۔

ممکن ہے آپ یہ خیال کریں کہ روزینہ حاصل کرنے کے لئے جو کام حضرت علی کرتے تھے وہ ان کی شایان شان تھا یا نہیں۔

حضرت علی بطور محنت کش

حضرت علی حضرت محمد کی طرح بنو ہاشم سے تھے اور مکہ کے معزز لوگوں سے شمار ہوتے تھے مگر مدینہ میں حصول معاش کے لئے پانی بھرتے تھے۔ مدینہ کا ایک مال دار شخص اپنا گھر تعمیر کرا رہا تھا، اسے گارا اور اینٹ بنانے کے لئے پانی درکار تھا، پانی کے چشمے اور اس مکان کے درمیان اتنا بڑا فاصلہ تھا کہ صبح سے شام تک حضرت علی سولہ ڈول سے زیادہ پانی نہ پہنچا سکتے تھے۔ ہر ڈول پانی کی مزدوری ایک کھجور تھی لہذا صرف سولہ کھجوریں مزدوری بنتی تھیں جن میں آدھی کھجوریں آپ رسول اکرم کو پیش کر دیتے اور آٹھ خود رکھ لیتے۔ اس طرح ایک مدت تک دونوں حضرات آٹھ آٹھ کھجوروں پر زندگی گزارتے رہے۔

یہ تھے وہ لوگ جنھوں نے اسلام کی بنیاد رکھی مگر جیسا کہ ہم آغاز بحث میں لکھ چکے ہیں کہ ان کی یہ عادت آغاز زندگی سے تھی، اہل عرب بچپن ہی سے بھوک پیاس کے عادی ہوتے تھے۔ بھوک پیاس کو برداشت کرنا ان کے لئے زیادہ شاق نہ ہوتا تھا۔ مدینہ کے آدھے باشندے یہودی تھے۔ حضرت محمد کی شروع ہی سے یہ کوشش رہی کہ وہ اسلام کے معاون رہیں۔

علمائے اسلام لکھتے ہیں کہ اسلام کے آنے کے بعد اس کے قوانین اسلام ایک دم نازل نہیں ہوئے بلکہ آہستہ آہستہ تیئس سال میں اترے۔ علما یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب تک کسی امر کے بارے میں اللہ کی طرف سے قانون نازل نہ ہوتا آپ قوانین تورات پر عمل کرتے تا آنکہ قانون جدید نازل ہو جاتا۔ تورات یہودیوں کی کتاب تھی۔ اس تدریجی نزول قوانین کا یہ سبب تھا کہ اگر تمام گزشتہ قوانین مسلمانوں کے لیے غیر ضروری ہو جاتے اور نئے قانون آہستہ آہستہ نازل نہ ہوتے تو مسلمان اپنی راہ متعین نہ کر سکتے اور قوانین جدید پر عمل پیرا نہ ہو سکتے کیونکہ وہ تدریجی طور پر اترنے تھے۔ نئے قوانین کو رفتہ رفتہ ہی نازل ہونا چاہیے تا کہ لوگ ان سے مانوس ہوتے رہیں۔

آج کل جب کہ سرزمین مغرب میں علم بہ نسبت اس دور عرب کے بہت زیادہ پھیل چکا

ہے اور وسائل اطلاع وتبادلہ خیالات بڑے وسیع ہو چکے ہیں، اخبارات، رسالے، کتابیں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن حد سے بڑھ چکے ہیں کسی حکومت کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ چند روز میں نئے قوانین وضع کر کے رائج کر دے اور اگر کوئی حکومت ایسا کرے بھی تو وہ لوگوں کے اعصاب کو شل کر دے گی۔ اجتماعی مفاسد پیدا ہو جائیں گے اور سر رشتہ زندگی ہاتھوں سے چھوٹ جائے گا۔

جزیرۃ العرب کے بدو تو خصوصیت سے یہ طاقت نہ رکھتے تھے کہ وہ نئے قانون کو تھوڑی سی مدت میں یک لخت برداشت کر لیتے اور سمجھ لیتے۔ یہی وجہ تھی کہ بعثت ورسالت کے بعد پرانے قوانین اسی طرح رہے اور مسلمانوں کے لئے وہی لائحہ عمل رہے اور یہی سبب تھا کہ مسلمانوں کے لئے نماز میں بیت المقدس کی طرف منہ کرنا ضروری تھا کیونکہ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے اس قانون کو منسوخ نہیں کیا تھا۔ قوانینِ گزشتہ کی رعایت ہی اس بات کا سبب بنی کہ یہودی یہ خیال کرتے تھے کہ حضرت محمد یہودی ہو جائیں گے۔ وہ آپ سے کہا کرتے تھے۔ ''اے محمد! آپ پیغمبر نہیں ہو سکتے کیونکہ آپ تو ایک عرب ہیں، یہودی نہیں ہیں، آپ صرف اسی دن پیغمبر ہو سکتے ہیں جب کہ یہودی بن جائیں گے'' تحویل قبلہ سے بہت پہلے رسول اللہ پر یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ یہ آیت دوسری سورت کی آیت نمبر 115 ہے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ

''مشرق ومغرب سب خدا ہی کا ہے جدھر بھی تم منہ کرو گے اسی طرف اللہ کی ذات ہے''

جب یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ یہودی کسی طرح بھی مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دے دیا کہ نماز پڑھتے وقت خانہ کعبہ کی طرف منہ کریں۔ قرآن کی دوسری سورت کی آیات نمبر 136,138,143,144 میں یہ احکامات نازل ہوئے۔

اس سورت یعنی سورہ البقرہ کی آیت نمبر 142 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ.

''احمق لوگ کہیں گے کس چیز نے انہیں پھیر دیا اس قبلہ سے جس کی طرف وہ منہ پھیرتے تھے۔ آپ کہہ دیجئے کہ مشرق ومغرب اللہ ہی کے لئے ہے وہ جسے چاہے ہدایت کرتا

ہے سیدھی راہ کی طرف۔"

مسلمان عارفین ان آیتوں سے جو مشرق و مغرب کے عدم تفاوت کو ظاہر کرتی ہیں یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اللہ کے لیے سب سمتیں برابر ہیں۔ بعض عارفوں کے اشعار سے جو یہ مترشح ہوتا ہے کہ گرجے، بت خانے اور کعبہ میں کوئی فرق نہیں ہے انہی آیت کا عکس ہے مگر ان آیتوں میں ایک اور نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ خدا کی نظر میں مشرق و مغرب برابر ہیں لیکن جب اس نے اپنے بندوں کو حکم دیا اور کہا کہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں تو وہ یہ عذر پیش نہیں کر سکتے کہ مشرق و مغرب سب برابر ہیں۔

سورۃ البقرہ کی مذکورہ بالا آیتوں میں جن کے نمبر درج کئے گئے ہیں اللہ تعالیٰ یہودیوں اور عیسائیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہم نے قبلہ کو اس لیے بدل دیا ہے کہ دیکھیں کون رسولِ خدا کی پیروی کرتا ہے اور قبلہ کو بدل لیتا ہے اور کون رسول خدا کی اتباع نہیں کرتا اور کفر پر قائم رہتا ہے۔ تحویل قبلہ کا حکم، تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس حکم نے مسلمان کو یہودیوں اور عیسائیوں سے کلی طور پر علیحدہ کر دیا تھا اور دین اسلام کو ان دو ادیان سے بالخصوص دین یہود سے بالکل ممتاز کر دیا تھا۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ایک عربی پیغمبر پر بزبان عربی نازل ہوا اور کعبہ بھی ایک عربی گھر تھا جس کی بنیاد حضرت ابراہیم جدِّ اعراب نے رکھی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں تو اس کا یہ مطلب تھا کہ اس کے بعد اسلام، دین یہود اور دین نصاریٰ سے وابستہ نہیں رہے گا، خصوصاً دین یہود سے۔ بلکہ وہ ایک مستقل مذہب ہوگا۔

اسلام کا اولین قانون اساسی

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں چند جگہ ملتِ ابراہیمی کا ذکر کیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے کعبہ کی بنیاد رکھی، اس لیے ملت ابراہیمی جو اساس دینِ اسلام ہے، دین عیسوی و دین موسوی، ہر دو اس میں شامل ہیں۔ اسلام کی اساس ملتِ ابراہیمی تھی لہٰذا دین اسلام نے ایک عمومی اور جامع شکل اختیار کر لی۔ چونکہ دین یہود نسلی برتری پر مبنی

سمجھا جاتا تھا اور یہودی کہا کرتے تھے کہ اسرائیل کی اولاد ہی تمام دنیا کی آقا ہے اور خدا کے ساتھ اگر کوئی قوم ہم کلام ہو سکتی ہے تو وہ صرف اسرائیل ہی کی نسل ہے۔ لہٰذا دین یہود ایک عالمی مذہب نہیں بن سکتا۔ دین مسیح بھی چونکہ دینِ یہود کی تکمیل کے لئے آیا تھا اسے لیے وہ بھی ایک عالمگیر مذہب نہیں بن سکتا۔

دینِ اسلام کلی طور پر دینِ کلیمی و عیسوی سے جدا تھا اور قبلہ بھی جداگانہ رکھتا تھا تا کہ وہ جامعیت پیدا کرے لہٰذا اس میں یہ قابلیت ہے کہ وہ ہر شخص، ہر نسل، ہر ملک اور ہر رنگ والے انسان کا مذہب بن سکے۔ اہلِ عرب خصوصاً مسلمان جو کہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے تغیر قبلہ اور کعبہ کے قبلہ بننے سے بہت خوش ہوئے کیونکہ علاوہ کعبہ کے اہل عرب میں مقدس سمجھے جانے کے، جن مسلمانوں نے مکہ سے ہجرت کی تھی اس شہر کو نہ بھول سکتے تھے۔ دوسرے تغیر قبلہ اور سوئے کعبہ نماز پڑھنے سے، مسلمان اس وجہ سے بھی خوش ہوئے کہ اس حکم سے ان کے اجداد کی تعظیم ہوتی ہے۔

دورِ جاہلیت میں یعنی قبل از اسلام، جو عربی قصیدے لکھے گئے جنہیں فخریہ قصائد کہتے ہیں ان میں اجداد پر فخر ہوتا تھا اور ان کی تعظیم و توصیف ہوتی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں تو وہ جب بھی کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے اپنے اجداد حضرت ابراہیم و اسماعیل کی عظمت ان کے دلوں میں جاگزین ہو جاتی اور ان کی عظمت کے ساتھ ساتھ باقی اجداد کی تعظیم بھی ان کے دلوں میں سما جاتی، کیونکہ خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیم پدرِ اسماعیل نے بنایا تھا اور اہلِ عرب اپنے آپ کو فرزندانِ اسماعیل سمجھتے تھے۔

جس زمانے میں حضرت محمد (ﷺ) نے مسجد کی تعمیر مسلمانوں کے ساتھ مل کر کی وہ اس کے جوار میں مسلمانوں کے لئے ایک گھر بھی تعمیر کر رہے تھے، بعض مسلمانوں نے جن میں خود رسول اللہ بھی شریک تھے مکہ سے مہاجرت کے بعد اپنی اولاد کو چھوڑ دیا تھا۔ مگر ضرورت اس امر کی تھی کہ مکہ والے، مدینہ آئیں اور اپنے خاندان کے سردار کے ساتھ مل جائیں کیونکہ ایک خاندان کے اعضاء ایک شاخ درخت کی مانند ہیں، لہٰذا ساری شاخوں کو اپنے تنے سے وابستہ ہونا چاہئے۔ اگر شاخ اپنے تنے سے جدا رہے تو وہ ایسے ہے جیسے ہاتھ بدن سے کٹ گیا ہو۔ حضرت محمد یہ چاہتے تھے کہ اپنے گھرانے کے تمام افراد کو مکہ سے مدینہ لے آئیں تا کہ ایک چھوٹا سا خاندان

بن جائے۔ایک دن آپ حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر مدینہ کے بازار میں گئے اور تین اونٹنیاں خریدیں اور اونٹنیوں کی قیمت، حضرت ابوبکر نے ادا کی۔

جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں حضرت محمد اور حضرت ابوبکر کے پاس مدینہ میں آمد کے وقت صرف دو اونٹنیاں تھیں ان تین اونٹنیوں کے بعد وہ پانچ اونٹنیوں کے مالک ہو گئے تھے۔پیغمبر اسلام نے اپنے چچا زاد حضرت علی سے فرمایا۔''اے علی! تم جانتے ہو کہ میری بیٹیاں اور اسی طرح میری دو بیویاں سودہؓ اور عائشہؓ بھی مکہ میں ہیں، جاؤ ان کو اونٹنیوں پر سوار کر کے مدینہ لے آؤ، زید کو اپنے ساتھ لے جاؤ (زید وہ غلام تھے جنہیں آپ نے آزاد کر کے فرزندی میں قبول فرمایا تھا) اور ام ایمنؓ زوجہ زید کو بھی ساتھ لیتے آنا۔''

ہم پیچھے لکھ چکے ہیں کہ حضرت محمد کی چار بیٹیاں تھیں فاطمہؓ، ام کلثومؓ، رقیہؓ، اور زینبؓ۔ان میں سے حضرت رقیہؓ اپنے شوہر عثمان کے ساتھ مدینہ چلی آئی تھیں۔مگر آپ (ﷺ) کی تین بیٹیاں مکہ ہی میں تھیں، حضرت علی اور زید دونوں مل کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ ازواج نبی اور فاطمہؓ ام کلثوم دو صاحبزادیوں اور ام ایمنؓ زوجہ زید کو اپنے ساتھ لے آئے۔حضرت زینبؓ دختر چہارم مکہ کو ترک نہ کر سکیں کیونکہ ان کے شوہر ابوالعاص مسلمان نہ تھے لہٰذا وہ اس بات کی اجازت نہ دیتے تھے کہ ان کی زوجہ مدینہ جائیں۔آپؐ کے گھرانے کے سب افراد سوائے حضرت زینبؓ کے، مدینہ چلے آئے تھے اور اپنے خاندان کے سرپرست کے زیر سایہ آ گئے تھے۔مسلمانوں کے دوسرے خاندانوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا کہ جو زن و شوہر ایک دین نہ رکھتے تھے وہ وہیں رہ گئے یعنی جس کی بیوی مسلمان نہ ہوئی تھی مکہ ہی میں رہ گئی اور شوہر مدینہ چلا آیا البتہ جن کی بیویاں مسلمان ہو چکی تھیں وہ اپنی بیویوں کو مکہ سے مدینہ لے آئے تھے اس طرح مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔حضرت محمد نے اپنی اور ابوبکر کی پانچوں اونٹنیاں اس کام پر لگا دی تھیں کہ وہ مکہ سے مسلمانوں کے خاندان والوں کو منتقل کریں۔اہل مدینہ ان اونٹنیوں کی تعظیم کرتے تھے یعنی جہاں بھی ان کا جی چاہتا چرتی پھرتیں اور جہاں سے جی چاہتا پانی پیتیں۔ان کے لئے کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔جب مسجد مدینہ مکمل ہو گئی اور مسلمان اپنی بیویوں کو مکہ سے مدینہ لے آئے تو آپ نے مدینہ کے لئے، جو ایک مستقل شہر کی صورت اختیار کر چکا تھا ایک قانون اساسی لکھا دیا۔

یہ قانون اساسی جس کی باون دفعات تھیں، خود حضرت محمد نے مدوّن کیا تھا، آیاتِ قرآنی کی طرح وحی نہ تھا۔ (یہ ارشاد قرآنی ہے کہ حضور نے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہی۔ وہ وہی بات کہتے تھے جو اللہ تعالیٰ ان سے کہلواتا تھا...... مولف) اس قانونِ اساسی کی پچیس دفعات مسلمانوں سے متعلق تھیں اور باقی ستائیس دوسرے مذاہب والوں سے متعلق تھیں۔

مدینہ کا یہ قانونِ اساسی اس طرح کا تھا کہ دوسرے مذاہب کے پیرو مسلمانوں کے ساتھ بغیر کسی قسم کے ٹکراؤ کے مزے میں مدینہ میں رہ سکتے تھے اور اپنے معمولات مذہبی پر عمل کر سکتے تھے۔ یہ قانونِ اساسی، پہلے سال ہجری یعنی 632ء میں جب کہ ایک سال مسلمانوں کو مدینہ آئے ہو گیا تھا، تیار ہوا۔ اس قانون کی رو سے مدینہ کا ہر گروہ اپنے دین کی حفاظت کے لئے آزاد تھا ان سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا تھا کہ اپنے مذہبی وظائف کو کیوں انجام دے رہے ہو۔ البتہ مختلف مذاہب کے پیروکار جو مدینہ میں زندگی بسر کرتے تھے اس بات کے پابند تھے کہ اگر کوئی طاقت باہر سے مدینہ پر حملہ آور ہوتی ہے تو وہ سب مل کر اس کا مقابلہ کریں۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت محمد نے یہ قانون قرآنی ہدایات کی روشنی میں بنایا تھا۔

قرآن کی سورۃ المائدہ آیت نمبر 69 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ.

''وہ لوگ جو اسلام پر ایمان لائے، یہودی، نصرانی اور صابی ان میں سے جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور نیک کام کئے بے شک اس کے لئے نہ خوف ہے نہ ڈر (قیامت کے دن)''

اس آیت میں صابیوں کا ذکر ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ستاروں اور فرشتوں کی پرستش کرتے تھے اور خدا پر بھی عقیدہ رکھتے تھے، جیسا کہ آیت سے ظاہر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہودیوں، عیسائیوں، حتیٰ کہ صابیوں کو بھی اپنی رحمت سے محروم نہیں کیا۔ بشرطیکہ وہ ایمان والے ہوں اور نیک اعمال کرتے ہوں یعنی ان کا ایمان، واقعی ہو، ریائی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ایک اور آیت میں یہودیوں اور نصرانیوں کے بارے میں فرماتا ہے۔ یہ آیت پانچویں سورہ المائدہ کی 66ویں آیت ہے۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ

فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ.

''اگر وہ تورات و انجیل پر عمل کرتے (یہودی اور عیسائی) اور جو کچھ اللہ نے ان پر اتارا ہے تو زیر و بالا سے اللہ کی نعمتیں کھاتے، آسمان سے بارش اور زمین سے غلہ، بعض ان میں سے میانہ رو ہیں (عدل و عمل والے ہیں) اور بہت سے بد عمل ہیں''۔

اس آیت کے نقل کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ جو قانون اساسی حضرت محمد نے ہجرت کے پہلے سال اہل مدینہ کے لیے بنایا تھا، احکامات قرآن سے اخذ کیا تھا گو وہ قرآن کا جزو نہیں ہے۔ اس قانون اساسی کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ بانیان ادیان میں سے کوئی ایک بھی حضرت محمد کی رواداری کو نہیں پہنچتا۔

آپ نے بڑی وسعتِ قلبی کے ساتھ مدینے کے تمام پیروانِ مذاہب سے فرمایا کہ وہ اہل اسلام کے ساتھ ساتھ نہایت آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں، ان سے کوئی بھی مزاحمت نہیں کرے گا۔ حضرت محمد یہ جانتے تھے کہ ان کے مذہب کی بنیاد آزادی و مساوات پر ہے لہٰذا انہیں دوسرے مذاہب سے خوف زدہ نہ ہونا چاہئے۔ ممکن ہے کہ دین اسلام دوسرے مذاہب کو اپنی شعاعوں سے منور کر دے لیکن دوسرے مذاہب اسلام کو پیچھے نہیں ہٹا سکتے۔

قانونِ اساسی کی پہلی دفعہ میں، ان قبائل کا ذکر کرنے کے بعد جو مدینہ میں تھے، آپ (ﷺ) نے فرمایا، ''مسلمانوں کو یہ نہ چاہئے کہ وہ سنگین ذمہ داریوں کے سامنے پشت خم کریں، ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ذمہ کوئی سنگین ذمہ داری ہے تو وہ اس کی مدد کریں، اگر کسی کو اپنی آزادی کے لئے فدیہ دینا ہے یا دیت ادا کرنی ہے تو سب کو مل کر اس کی ادائیگی کرنی چاہئے'' جیسا کہ ہم پیچھے کئی جگہ ذکر کر چکے ہیں کہ اسلام سے پہلے ہر شخص، جزیرۃ العرب میں کسی ایک قبیلے کا جزو تھا جب بھی کوئی شخص قتل کیا جاتا تو اس کا خوں بہا پورے قبیلے سے لیا جاتا تھا۔ حضرت محمد جب دین اسلام لائے تو انہوں نے سب کو مساوی قرار دے دیا اور جو امتیازات کسی قبیلے کے ساتھ منسلک ہونے سے تعلق رکھتے تھے، انہیں مٹا دیا۔ البتہ مدینہ کے قانون اساسی کی رو سے اس امتیاز کی جگہ ایک دوسرے امتیاز نے لے لی یعنی مومن کا ممتاز ہونا اور ایک امت کا فرد بن جانا۔ اگر کوئی شخص امت کا فرد ہوتا یعنی مسلمان ہوتا اور گرفتار ہو جاتا اور اغیار اس سے فدیہ کا تقاضا کرتے تو تمام مسلمانوں کا یہ فرض ہوتا کہ اس کا ہاتھ بٹا کر اسے آزاد

کرائیں اور اگر کوئی مسلمان کسی کو قتل کر دیتا تو تمام مسلمانوں کو اس کی طرف سے دیت فراہم کرنی پڑتی۔ بشرطیکہ وہ قتل مجرمانہ نہ ہوتا جیسا کہ قانون اساسی کی تیرھویں دفعہ سے مترشح ہوتا ہے۔اس تیرھویں دفعہ میں کہا گیا ہے۔

''اگر کوئی مسلمان ظلم، جبر یا جرم کرتا ہے یا کسی کے حق کو پامال کرتا ہے یا مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالتا ہے وہ دفعہ 1 اور 2 سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ ایسے موقع پر تمام مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کی بیخ کنی کے لئے آمادہ ہو جائیں اگرچہ وہ مجرم، ان کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو'' پندرھویں دفعہ یہ ہے کہ:

''ہر وہ حق جس سے ایک مال دار ترین انسان مستفید ہو سکتا ہے، غریب ترین مسلمان بھی اسی طرح اس سے مستفید ہو سکتا ہے'' 16 ویں دفعہ میں کہا گیا کہ:

''جو شخص کسی کو قصداً قتل کرتا ہے اسے قتل کر دیا جائے، کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ قاتل کو پناہ دے'' 23 ویں دفعہ یہ ہے کہ:

''تم لوگوں میں جو بھی اختلاف ہو، اس کے بارے میں خدا سے رجوع کرو اور بوسیلہ نمائندہ خدا (یعنی پیغمبر) اس اختلاف کو حل کرو'' 26 ویں دفعہ میں لکھا گیا ہے کہ:

''یہودی اپنے دین کی حفاظت کر سکتے ہیں، مسلمان بھی اپنے دین کی حفاظت کر سکتے ہیں، جو لوگ ان کے غلام ہیں یا ان کی پناہ میں ہیں، ان کے ساتھ بھی یہی عمل کیا جائے گا'' ایک اور دفعہ میں لکھا ہے کہ:

''یہودیوں کے ذمہ جو رقم ہو گی وہ انہیں ادا کرنی ہو گی، مسلمانوں کے ذمہ جو رقم ہو گی وہ اسے ادا کریں گے۔ اگر کوئی شخص اس تحریر کے خلاف کرے گا خواہ وہ یہودی ہو یا مسلمان، دونوں قومیں مل کر اس سے جنگ کریں گی، یہودیوں اور مسلمانوں کا یہ فرض ہو گا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کریں اور ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔ مدینہ کے باشندے (خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہودی یا کوئی اور، قریشیوں یا ان کے حلیفوں کی حمایت نہیں کریں گے) اس دفعہ میں قریشیوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو مکہ میں مسلمانوں کو ستاتے تھے اور اسلام قبول نہیں کرتے تھے۔ وہ قریشی، مراد نہیں ہیں جو داخلِ اسلام ہو گئے تھے اور مدینہ کو ہجرت کر آئے تھے''۔

قانون اساسی کی ایک دفعہ یہ بھی ہے: ''سرزمین شہر مدینہ (یثرب) حرم ہے یعنی ایک

مقدس زمین ہے یہاں جدال وقتال نہ کرنا چاہئے۔"

جدید قانون اساسی کی وجہ سے تمام باشندگان مدینہ خوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے کیونکہ جولوگ مدینہ میں زندگی بسر کرتے تھے، وہ سب کے سب مساوی حقوق کے مالک تھے، جتنے بھی اہل عرب مدینہ میں رہتے تھے سب کے سب مسلمان تھے سوائے ان چند لوگوں کے جوعبداللہ بن ابی کی سرکردگی میں تھے جنہیں قرآن نے منافق کہا ہے۔ منافقوں یا منافقین جیسا کہ اسلامی تذکرہ نویس سمجھتے ہیں "اینٹی اسلام" کے معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ منافقین، اسلام کے مخالف نہ تھے مگر دلی طور پر اسلام کے طرف دار بھی نہ تھے، یہ لوگ بین بین تھے۔

قرآن کی چوتھی سورۃ النساء کی آیت نمبر 137 میں منافقوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا.

"جولوگ ایمان لائے پھر کفر کیا پھر ایمان لائے اور پھر کفر کیا پھر، کفر پر ثابت قدم ہو گئے، خدا انہیں نہیں بخشے گا اور نہ انہیں راہ ہدایت دکھائے گا"

اسی سورہ النساء کی آیت نمبر 145 میں اللہ تعالیٰ انہیں منافقین کے بارے میں پھر فرماتا ہے:

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا.

"منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے (جہاں سخت عذاب ہوگا) اور کوئی بھی ان کا مددگار نہ ہوگا"۔

یہاں یہ بات قابل وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا عذاب کافروں کے لئے بھی نہیں رکھا جیسا کہ منافقوں کے لئے ہے۔ یعنی منافق کا عذاب (جو نہ طرفدار اسلام ہے، نہ مخالف، بلکہ غیر جانبدار ہے حسب فیصلۂ الٰہی اس کے لئے عذاب، کافر کے عذاب سے شدید تر ہے۔ (جو کہ اسلام کا مخالف ہوتا ہے)۔

اٹالین رائٹر ڈانٹے مصنف "طربیۂ خدائی" کے بارے میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس کی کتاب کا ماخذ قرآن ہے، وہ بھی قرآن کی طرح غیر جانبدار لوگوں کو (جو موافق ہیں نہ مخالف)

جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جگہ دیتا ہے۔ قرآن مجید کے مطالعے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حسب، فیصلہ خداوند، دین کے بارے میں غیر جانبدار ہونا سب سے بڑا گناہ ہے۔

قریش جیسا کہ ہم پیچھے لکھ چکے ہیں یہ ارادہ رکھتے تھے کہ حضرت محمد (ﷺ) کو مکہ میں شہید کر دیں مگر وہ ایسا نہ کر سکے کیونکہ آپ (ﷺ) ان کی دسترس سے نکل کر مکہ سے مدینہ چلے آئے تھے۔ جب آپ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ چلے آئے تو قریشیوں کا کینہ اور زیادہ بڑھ گیا اور دو سرداران قریش ابو سفیان و ابی بن خلف نے بطور الٹی میٹم کے ایک خط، انصار یعنی مسلمانان مدینہ کے نام لکھا:

''تمہارا ہم سے قطع تعلق، ہمارے لئے بڑا ہی گراں گزرا کہ سارے قبائل عرب سے قطع تعلق کر لیا۔ جو کام تم نے کیا ہے اس سے ہمارے تمہارے تعلقات خراب ہو گئے تم نے ایک ایسے شخص کو پناہ دی ہے جو مکہ کے سرداروں میں سے ہے۔ اسے پناہ دینا اس بات کا سبب بنا ہے کہ ہم مداخلت کرنے پر مجبور ہیں، ہم تمہیں نصیحت کرتے ہیں کہ اپنے اور ہمارے درمیان اس شخص کو نہ ڈالو۔ اگر وہ ایک نکوکار مرد ہے جسے ہم تم سے بہتر سمجھتے ہیں تو ہمیں اس سے استفادہ کرنے دو اور اگر بدکار ہے (نعوذ باللہ) تو ہمیں اسے سزا دینے دو''۔

اس خط کے پہنچنے پر انصار نے حضرت کعب بن مالک، (مسلمان شاعر) سے درخواست کی کہ قریش کی ہجو کریں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ کلام خواہ نظم ہو یا نثر اہل عرب کے نزدیک اثر رکھتا ہے حتیٰ کہ مسلمانوں کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ ایک ہجو ایک تیر کی مانند ہوتی ہے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ بن مالک نے جو قصیدہ قریش کی ہجو میں کہا انہیں بھیج دیا مگر قریشی اس قصیدے کے پہنچنے کے بعد بھی اپنے اقدام سے باز نہ رہے۔ دوسری بار پھر انہوں نے باشندگان مدینہ کو چٹھی بھیجی۔ اس دفعہ انہوں نے عبداللہ بن ابی (رئیس منافقین) کے نام خط ارسال کیا۔ عبداللہ بن ابی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا:

''تم نے، ہمارے ایک شناسا کو جو مکہ سے بھاگا ہے اور اس نے مدینہ میں سکونت اختیار کی ہے، پناہ دی ہے۔ اگر تم نے اسے ہمارے حوالہ نہ کیا تو ہم مدینہ پر چڑھائی کر دیں گے۔ تمہیں مار ڈالیں گے اور تمہاری عورتوں پر قبضہ کر لیں گے۔'' عبداللہ بن ابی اور تمام منافقوں نے اس چٹھی پر کوئی اقدام نہیں کیا، اگر وہ ایسا کرتے تو غیر جانبدار شمار نہ ہو سکتے۔

اہل عرب کہتے ہیں کہ منافق وہ لوگ تھے جو اول سے لے کر آخر عمر تک نہ کوئی مثبت قدم اٹھا سکے نہ منفی، ہمیشہ یہی سوچتے رہتے تھے کہ کیا اقدام کریں اور کونسا منفعت بخش قدم بڑھائیں۔ مگر نہ منفی رائے دے سکتے تھے نہ مثبت۔ جب اہل قریش نے دیکھا کہ انصار اور منافقین کے نام جو چٹھیاں لکھیں۔ ان سے کچھ بھی اثر نہ ہوا تو انہوں نے ایک چٹھی مدینہ کے یہودیوں کو لکھی اور ان سے حضرت محمد کی واپسی کے لیے مدد چاہی۔ یہودیوں نے کوئی صریح جواب نہ دیا کہ حضرت محمد کے ساتھ جنگ کریں گے اور انہیں گرفتار کرا دیں گے مگر یہ وعدہ کیا کہ بوقت ضرورت قریش کی مدد کریں گے۔ قریش نے جب یہ دیکھا کہ انصار، منافقوں اور یہودیوں کو خط لکھنے سے کچھ حاصل نہ ہوا تو انہوں نے حضرت محمد کے ساتھ اقتصادی جنگ کا فیصلہ کر لیا۔

سارے قریشی تاجر تھے، تاجروں کا سب سے موثر ہتھیار اقتصادی جنگ ہوتی ہے جس کا لازمی نتیجہ اقتصادی محاصرہ ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں قریش کے دس قبیلے تھے انہوں نے شمالی جزیرۃ العرب کے تمام راستے بند کر دیئے اس طرح وہ شہر مدینہ کے اقتصادی محاصرہ پر قادر ہو گئے حتیٰ کہ مدینہ میں غلہ نہ پہنچ سکا۔ اگر یہ واقعہ مکہ میں رونما ہوتا تو مکہ کے سارے آدمی بھوکوں مر جاتے کیونکہ مکہ میں نہ کھیتی تھی نہ باغ۔ مگر مدینہ کے اطراف میں کھیت اور باغ تھے جہاں سے شہر کے لئے خوراک آتی تھی اس کے باوجود اہل مدینہ کو سامان رسد کی تکلیف ہوئی اور قیمتیں بہت زیادہ چڑھ گئیں۔ گو پیغمبر اسلام اپنے گھر میں (جو مسجد کے قریب تھا) زندگی بسر کرتے تھے مگر آپ کو اس اقتصادی محاصرہ سے بڑی تکلیف پہنچی کیونکہ آپ دیکھ رہے تھے کہ قبیلہ قریش ایک پورے شہر کو بھوکا مار رہے ہیں حالانکہ ان کی دشمنی صرف ان کی ذات یا مسلمانوں سے ہے۔

آپ مدینہ میں نہایت سادگی کی زندگی بسر کرتے تھے، خانہ نبی لکڑی اور کھجور کے پتوں کا تھا۔ اس خیال سے کہ گزرنے والوں کو گھر کے آدمی دکھائی نہ دیں اور وہ آرام سے اٹھ بیٹھ سکیں، کھجور کے تنوں پر کھال تان دی گئی تھی۔ زمین پر بکری کی کھال بچھا دی جاتی جس پر آپ آرام فرماتے، کبھی کھجوریں تناول فرماتے اور کبھی روٹی۔ دونوں کو آپ ایک ساتھ نہ کھاتے یا کھجوریں کھاتے یا صرف روٹی۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ جس زمانے میں مدینہ اقتصادی محاصرے کے زیر اثر تھا

سامان خوراک کی قیمتیں بہت چڑھ گئی تھیں۔ ہمارے گھر آگ نہیں جلتی تھی، اس زمانے میں ہم نے کبھی بھی دو دن متواتر روٹی نہیں کھائی۔ گو پیغمبر اسلام "صاحب زن" تھے مگر پھر بھی گھر کے تمام کام کاج خود انجام دیتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، چولہے میں آگ خود جلاتے (اگر اس کی ضرورت پڑتی) گھر کا کھانا کیا ہوتا تھا؟ ایک قسم کا آش یا شوربا۔ گھر کی عورتیں گوشت کی خواہش ظاہر کرتیں تو کبھی کبھار گوشت آجاتا۔ رسول اکرم اپنے کپڑے بھی کبھی کبھی خود ہی دھو لیتے تھے۔ دن میں کئی کئی بار مسواک کرتے اور فرمایا کرتے تھے کہ پاکیزگی نصف ایمان ہے۔

پیغمبرِ اسلام کی زندگی میں تجمل و زینت کی صرف ایک بات ملتی ہے جس کا تمام مورخین ذکر کرتے ہیں۔ آپ ایک رومال رکھا کرتے تھے جس سے کھجوریں تناول فرمانے کے بعد ہاتھ صاف کیا کرتے تھے۔ ان کے گھر میں سوائے ایک رومال کے اور کوئی بھی چیز ایسی نہ تھی جسے قابل تجمل و زینت کہا جا سکے۔ آپ اور آپ کی زوجہ مطہرہ کھانا تناول کرنے بیٹھتے تو کھجور کے پتوں کا ایک بوریا بچھا دیا جاتا، جس پر دسترخوان رکھ دیا جاتا۔ یہ دسترخوان بھی کھجور کے پتوں سے بنا ہوا تھا۔ جب مدینہ کا اقتصادی محاصرہ شدت اختیار کر گیا یعنی لوگ سامان خوراک کے لئے بے حد تنگ دست ہو گئے اور عوام بھوکوں مرنے لگے تو آپ نے بحیثیت سیاسی حاکم کے، اپنا فرض ادا کیا اور فیصلہ کر لیا کہ اب دفاع کے لئے تلوار اٹھانی ہی پڑے گی۔

مکی قافلوں کی روک ٹوک

پیغمبر اسلام نے قریش کو پیغام بھیجا۔ "چونکہ تم لوگوں نے مدینہ کی اقتصادی ناکہ بندی کر دی ہے لہٰذا آج کے بعد تمہارے قافلے مدینہ سے گزرنے نہ پائیں، اگر وہ مسلمانوں کے علاقہ سے گزرنا چاہیں گے تو انہیں روک دیا جائے گا" اس کے بعد حضرت محمد نے چالیس بہادر مسلمانوں کا انتخاب کیا اور ان کا سپہ سالار حضرت حمزہ کو بنایا جو ایک نامور پہلوان تھے آپ نے ان لوگوں کو بیس اونٹ دیئے اور حکم دیا کہ مدینہ اور بحر احمر کے درمیان سے مکی قافلوں کو نہ جانے دیں۔ یہ چالیس مرد مہاجر تھے، انہیں اس خدمت پر کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا، ان کے پاس گھوڑے نہ تھے اگرچہ پیغمبر اسلام جانتے تھے کہ جنگ کے موقع پر گھوڑے اونٹوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ مسلمان ابھی اس قدر مالدار نہ تھے کہ گھوڑے خرید سکتے۔ اس سے حضرت حمزہ

بڑے غم زدہ تھے اور سوچ رہے تھے کہ اگر گھوڑے ہمارے پاس ہوتے تو ہم اس خدمت کو خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے۔ ان سرفروشوں کی نگاہ مدینہ اور بحر احمر کے درمیان ایک سوتیس کلومیٹر رقبہ پر تھی، مکہ کے کارواں اس علاقے سے گزرنے پر مجبور تھے۔ کئی دن یہ حضرات وہاں بیٹھے راہ دیکھتے رہے کہ ایک دن ایک مکی کارواں نظر آیا، بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ اس کا سردار ابو جہل ہے جو پیغمبر اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

ابو جہل وہی تھا جو یہ چاہتا تھا جس نے آپ (ﷺ) کے سر مبارک کے لیے انعام مقرر کیا تھا، اسی نے خانہ کعبہ میں آپ کے رخ انور کو اونٹ کی اوجھ میں بند کر دیا تھا اور اونٹ کی آنتیں آپ کے گلو میں دے کر گلا گھونٹنا چاہا تھا۔

مسلمانوں نے جو یہ دیکھا کہ سردار قافلہ ابو جہل ہے تو حملہ کے لئے تیار ہو گئے مگر اس سرزمین کا سردار محمد بن عمرو آڑے آیا اور حضرت حمزہ سے کہا۔ "کہ حملہ کرنے سے باز رہیں کیونکہ ہمارے قبیلے کا ان کے ساتھ معاہدہ ہے کہ ان کے سارے قافلے ہماری زمین سے امن و امان سے گزریں گے، نہ ہم خود حملہ کریں گے نہ کسی دوسرے کو حملہ کرنے دیں گے۔ وہ معاہدہ جو ہم نے قریشیوں کے ساتھ کیا اس کی رو سے ہم ہر سال ان سے دو بار خراج وصول کرتے ہیں۔ مدینہ کے کاروان بھی ادھر سے امن و امان سے گزرتے ہیں، ہم کسی کو ان پر حملہ کرنے نہیں دیتے۔ ہر عہد و میثاق مقدس ہے اس کا احترام کرنا چاہیے۔"

حضرت حمزہ خوب جانتے تھے کہ عہد و پیان کو توڑا نہیں جا سکتا اور اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے کاروانِ مکہ پر حملہ کیا تو مقامی قبیلے سے جنگ کرنے کے علاوہ آئندہ کے لئے مدینہ کے قافلوں کو غیر محفوظ کر دیں گے۔ ابو جہل نے مکہ پہنچ کر جو یہ واقعہ بیان کیا تو اہل قریش نے مسلمانوں کے اس حملے کو کوئی اہمیت نہ دی اور اسی راستے سے گزرنے کا تہیہ کر لیا۔

دوسری بار مسلمانوں نے کاروانِ مکہ کو گھیرا تو مسلمانوں کی تعداد ساٹھ تھی اس بار حضرت عبید بن حارث بن عبدالمطلب جو آپ (ﷺ) کے چچا تھے اس چھوٹے سے طائفہ کے سردار تھے۔ یہ ساٹھ افراد بھی ان چالیس کی طرح مکہ کے مہاجر تھے۔ یہ بھی مدینہ اور بحر احمر کے درمیان گھات لگائے بیٹھے رہے۔ دو ہفتے گزر جانے کے بعد انہیں ایک مکی کارواں نظر آیا، معلوم ہوا کہ سالارِ قافلہ پسرِ ابو جہل ہے۔ کاروان میں ایک سو چالیس افراد تھے یعنی مسلمانوں سے دو گنا

تھے۔ یہ لوگ مسلمانوں کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے مگر ان میں سے دو آدمی نہ بھاگے بلکہ مسلمانوں سے آملے کیونکہ وہ مسلمان تھے۔ ان میں سے ایک مقداد بن عمرو اور دوسرے عتبہ بن غزوان تھے۔ یہ دونوں حسب فرمانِ نبوی مکہ سے حبشہ ہجرت کر کے گئے تھے اور وہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد مکہ کی طرف لوٹ آئے مگر اس زمانے میں رسول اللہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔ کئی بار ان دونوں نے چاہا کہ مدینہ چلے آئیں۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکے حتیٰ کہ انہیں معلوم ہوا کہ ایک قافلہ مکہ سے عکرمہ کی سرکردگی میں روانہ ہوگا اور مدینہ کے قریب سے گزرے گا لہٰذا وہ مدینہ جانے کے لئے ان کے ساتھ ہو لیے اور قافلہ والوں کے فرار سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے ساتھ آملے۔ دو مزید مسلمانوں کے مدینہ پہنچنے سے مسلمان بہت خوش ہوئے۔ ان کے آنے کے کچھ دنوں بعد مسلمانوں کا تیسرا دستہ جو بیس شتر سواروں پر مشتمل تھا کاروانِ مکہ کو روکنے کے لئے گیا۔ اس کے سردار سعد بن ابی وقاص تھے۔

حملہ آوروں کی تبدیلی کی یہ وجہ تھی کہ ہر مسلمان یہ چاہتا تھا کہ وہ اس خدمت میں حصہ لے لہٰذا رسول اللہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ ہر مرتبہ نئے آدمی بھیجیں تا کہ کوئی محروم نہ رہے سعد بن ابی وقاص حضرت آمنہ والدہ ماجدۂ رسول اللہ کے برادر زاد تھے وہ سب سے پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے راہِ اسلام میں کسی کافر کا خون بہایا تھا (اس کا ذکر پیچھے آچکا ہے)۔ سعد بن ابی وقاص ایک مقام موسوم بہ خراد پر مکی مہاجروں کا ایک گروہ لے کر حملہ کرنے کے لئے پہنچ گئے۔ مگر ایک سردار راہ میں رکاوٹ بن گیا اس نے کہا۔ یہ علاقہ جہاں میرا قبیلہ رہتا ہے دارالامان ہے۔ یہاں ہم نہ مکی قافلوں پر حملہ کرتے ہیں نہ مدنی پر، نہ کسی دوسرے کو ان پر حملہ آور ہونے دیتے ہیں کیونکہ ہم ان سے خراج لیتے ہیں۔ یہ قبیلہ علاوہ خراج لینے کے، قافلہ والوں سے چارہ اور سامان رسد بھی لیتا تھا، اگر قافلہ پر کوئی حملہ ہو جاتا تو وہ قبیلہ جس کی سرزمین پر حملہ ہوتا خراج سے محروم ہو جاتا اور چارہ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اس بار بھی مسلمانوں کا قافلہ مکہ والوں پر حملہ کئے بغیر واپس چلا آیا۔ حضرت سعد ؓ بن ابی وقاص نے رسولِ کریم سے عرض کی کہ اس کے لئے کوئی تدبیر سوچیں۔ آپ نے ان سے اور تمام مسلمانوں سے کہا کہ چونکہ صحرا کے بدو اہل مکہ سے استفادہ کرتے ہیں لہٰذا وہ ہمیں مکی قافلوں پر حملہ کرنے نہیں دیتے وہ جو کچھ اہلِ مکہ سے لیتے ہیں بصورت اناج، چارہ وغلہ ہے، میں جو کچھ ان لوگوں کو دوں گا اس کے سامنے یہ سب کچھ بے

حقیقت ہوگا۔ مسلمانوں نے آپ (ﷺ) سے سوال کیا، ''آپ کیا دیں گے؟'' فرمایا، ''وہ ناچیز رقم جو بدوعرب اہل مکہ سے وصول کرتے ہیں، میں ان کے بدلے انہیں بہشت دوں گا'' یہ خیال پیدا ہوتے ہی آپ نے صحرا کے بدوؤں سے گفت وشنید شروع کر دی۔ ان سے کہا۔ ''تم لوگ جو یہ معمولی رقم اہل مکہ سے وصول کرتے ہو اسے چھوڑ دو، میں اس کے بدلے تمہیں بہشت کی بشارت دوں گا۔

اہل یورپ کی منطقی مجبوری

ہم اہل یورپ جو معاملات کو منطقی اعتبار سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں کہیں گے کہ صحرائی عربوں کو رسول اکرم (ﷺ) کی پیش کش ہرگز قبول نہ کرنی چاہئے تھی کیونکہ ہم میں سے کوئی عقل مند نقد رقم کو بہشت کے وعدے پر نہیں دے سکتا۔ مگر اہلِ عرب نے آپ کی پیش کش کو قبول کر لیا اور اس پر راضی ہو گئے کہ اہل مکہ کے مال ومتاع کو ٹھکرا دیں تا کہ مرنے کے بعد اس کے عوض جنت حاصل کریں۔ بدوعرب دو وجہ سے اس پیش کش پر راضی ہوئے ایک تو وہ قرآنی آیات جو بہشت سے متعلق ہیں۔ منجملہ ان کے قرآن کی 76 ویں سورۃ الدھر کی بارہویں آیت ہے:

وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا.

''ان کے صبر کی جزاء جنت اور حریر ہے''۔

یعنی چونکہ انہوں نے تشنگی وگرسنگی پر صبر کیا (مراد روزے کی بھوک اور پیاس) لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں انہیں بہشت دی اور ریشم کا لباس پہنایا۔

اسی سورت کی تیرہویں آیت ہے:

مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّ لَا زَمْهَرِيْرًا.

''تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے ہیں تخت پر، نہ گرمی کا احساس ہے نہ سردی کا''

چودھویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا.

''درختوں کے سائے ان پر پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے میوے جھکے پڑتے ہیں''۔

سورۃ الدھر کی اس آیت کی فصاحت و بلاغت کو یورپ کے لوگ نہیں پا سکتے عرب کا باشندہ ہی سمجھ سکتا ہے کہ ان چند کلمات میں کیا کچھ فصاحت و بلاغت بھری ہے۔ جب ان آیتوں کو خوش الحانی سے کسی بدوی کے سامنے پڑھا جاتا جو فطری طور پر سخن شناس ہوتا ہے، فصاحت و بلاغت سے مستفید ہوتا ہے اور کلام برجستہ وزیبا سے متاثر ہوتا ہے۔ تو یہ کلام ان کی روح میں اس طرح رچ جاتا کہ وہ فراموش نہیں کر سکتا۔

حسین عورتیں

اسی سورۃ کی انیسویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا.

''ان کی خدمت کرتے ہیں سدا نوجوان رہنے والے چھوکرے کہ تم دیکھو تو خیال کرو کہ بکھرے ہوئے موتی ہیں''

یعنی جو لوگ بہشت میں رہتے ہیں ان کی خدمت ایسے نوجوان لڑکے کرتے ہیں جو ہمیشہ نوجوان رہیں گے اگر اے محمد تم انہیں دیکھو تو خیال کرو کہ تازہ مروارید ہیں جو ابھی صدف سے نکالے گئے ہیں مطلب یہ کہ مروارید کی طرح چمکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان آیتوں میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تم لوگ جنت میں ریشمی کپڑے پہنو گے، ایسی شراب پیو گے جو کافور کی طرح سرد مزاج ہو گی اور سونٹھ کے عطر سے معطر ہو گی اور حسین عورتیں جو ہمیشہ دوشیزہ رہیں گی، تمہارے ساتھ رہیں گی۔

خوبصورت عورت دیہاتی اہل عرب کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی تھی، لذت شکم سیری و سیرابی کے بعد سب سے بڑی لذت و سعادت بدو عرب کے لئے حسین و جمیل عورت ہی تھی بلکہ بعض دیہاتی عربوں کے نزدیک وہ آب و شتر سے بھی زیادہ گراں بہا تھی کیونکہ ان میں سے بیشتر جو کہ متواتر بیابان میں زندگی بسر کرتے تھے اور انہیں شہر کی صورت تک دیکھنی نصیب نہیں ہوتی تھی لہٰذا وہ کوئی عورت حاصل نہیں کر سکتے تھے بلکہ بہ سبب بے بضاعتی کے، بہت سے ان میں سے شہر میں آ جانے کے بعد بھی عورت سے محروم رہتے تھے۔ عربستان میں بعض بدو سوائے اپنی ماں کے کسی عورت کی صورت تک نہ دیکھ سکتے تھے کہ یہ تصور کر سکیں کہ دوسری عورتوں کی کیسی شکل

وصورت ہوتی ہے؟ بسا اوقات بعض بادیہ نشین عدم استطاعت کی وجہ سے شادی نہ کر سکتے تھے، وہ یونہی بوڑھے ہو جاتے اور مر جاتے تھے۔ اس لیے حیرت نہ کرنی چاہئے کہ قرآن میں جب بھی اللہ تعالیٰ بہشت کی باتیں سناتے ہیں تو حسین عورتوں کا مردوں کے لئے اور حسین لڑکوں کا عورتوں کے لیے ضرور ذکر کرتے ہیں۔ بہر حال قرآن کی معجز نما تاثیر نے اپنا رنگ دکھایا اور بدو عرب بہشت کے لالچ میں اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اہل مکہ سے خراج وصول نہ کریں اور اس کے بجائے حضرات محمد اور مسلمانوں کے ساتھ متحد ہو جائیں۔ چونکہ یہ بات تاثیرِ آیات قرآن اور تاثیرِ شخصیت حضرت محمد کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے لہٰذا ہم اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

حضرت محمد اس ارادے سے کہ قبائل دیہات کو اپنے ساتھ متحد کریں ساٹھ جری اور بہادر مسلمانوں کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ اس چھوٹی سی سپاہ کے سپہ سالار حضرت محمدؐ خود تھے۔ اس مرتبہ بھی مسلمانوں کے پاس گھوڑے نہ تھے بلکہ وہ اونٹوں پر سوار تھے۔ آپؐ نے سب سے پہلے قبیلہ غفار کا رخ کیا، یہ قبیلہ سب سے پہلے اسلام لایا۔ ابوذر غفاری ؓ جو دس سال پیشتر راہزنی کی زندگی سے پشیمان ہو کر اسلام لے آئے تھے اور راہزنی سے دست کش ہو گئے تھے، حضرت محمد نے انہیں قبیلہ غفار کی طرف تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا اور دس سال کے اندر اندر تمام قبیلہ غفار مسلمان ہو کر راہزنی سے تائب ہوا۔

نبی اپنی والدہ کی قبر پر

بنو غفار کا مسکن مدینہ وینبوع کے درمیان تھا اس سے پیشتر کہ آپؐ بنو غفار کی سرزمین میں پہنچیں، ابواء میں توقف کیا کیونکہ وہاں آپ کی والدہ ماجدہ کی قبر تھی۔ والدہ کی قبر پہ پہنچے تو سواری سے اتر گئے اور قبر کی طرف بڑھے، مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ یہاں آپ کی والدہ صاحبہ کی قبر ہے تو وہ ٹھہر گئے، صرف حضرت عمر بن الخطاب آپ کے ساتھ قبر تک گئے۔

آپ قبر کے سامنے دوزانو بیٹھ گئے، سر مبارک قبر پر دھرا اور رونے لگے۔ اس زمانے میں والدہ ماجدہ کے انتقال کو پچاس سال گزر چکے تھے مگر پیغمبر اسلام ایک چھوٹے سے بچے کی طرح رو رہے تھے جس کی ماں ابھی ابھی اس سے جدا ہوئی ہو کیونکہ وہ تکالیف جو ان کی والدہ نے تربیت کے سلسلہ میں برداشت کیں نظروں کے سامنے پھر گئی تھیں۔ جب آپ پیدا ہوئے پدر

بزرگوار عبداللہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، والدہ ماجدہ کے پاس کوئی دوسرا مرد یا کمانے والا نہ تھا انہوں نے یتیمی میں انہیں پالا پوسا حتیٰ کہ زندگی کو الوداع کہہ گئیں۔ والدہ کی قبر پر انہیں وہ سختیاں یاد آنے لگیں جو بچپن میں انہیں پیش آئیں مگر والدہ کے زیر سایہ وہ شدائد آسان ہو گئے تھے کیونکہ جب آپ گھر واپس آتے تو وہ تسلی دیتیں۔ ہاتھ منہ دھوتیں جو کچھ میسر ہوتا سامنے رکھ دیتیں اور انہیں کھانے کی ترغیب دیتیں۔ مگر والدہ کے رخصت ہو جانے کے بعد آپ بالکل تنہا رہ گئے تھے، صحرا سے پابرہنہ گھر لوٹتے تو کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ہاتھ پاؤں اور منہ دھلواتا اور یتیم کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتا، یا اس کے آنے کا منتظر ہوتا۔ مادر و پدر کے علاوہ ایک یتیم بچے کی آمد کا کون انتظار کرتا اور کون آنے سے پہلے اس کے لئے آب و نان مہیا رکھتا کہ آتے ہی کھانا کھائے اور پانی پیے۔ آپ اس قدر والدہ ماجدہ کی قبر پر روئے کہ عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب بھی جن کے بارے میں مشہور تھا کہ شیطان بھی ان سے ڈرتا ہے اور جن کی آواز رعد کی گرج کی طرح تھی، کہنے لگے۔ "یا رسول اللہ! اس قدر نہ روئیے کیونکہ مجھے بھی رونا آ جائے گا۔" ابن سعد بخاری اور ابن ہشام لکھتے ہیں۔ "جب حضرت محمد نے اپنا سر مبارک والدہ کی قبر سے اٹھایا تو عمر بن الخطاب پوچھنے لگے، "یا رسول اللہ اس قدر کیوں روتے ہیں؟ دیکھئے میری آنکھیں بھی اشک آلود ہو گئی ہیں۔"

بنو غفار کی سرزمین پر قدم رکھنے سے پہلے آپ ودان پہنچے یہ قبیلہ بنو ضمرہ کا مسکن تھا، جن میں سے کوئی بھی اسلام نہیں لایا تھا۔ قبیلہ بنو ضمرہ، بنو غفار کا ایک شعب شمار ہوتا تھا۔ آپ نے یہاں ایک ہفتہ تک بنو ضمرہ کے سرداروں سے بات چیت کرنے کے لئے قیام کیا۔ ایک ہفتہ کے مذاکرات اور آیات قرآنی کے سنانے کے بعد مسلمانوں اور بنو ضمرہ کے درمیان ایک پیمان لکھا گیا اور اس پر مہر ثبت کی گئی۔

یہ سب سے پہلا انتظامی معاہدہ جو مسلمانوں اور ایک بدوی قبیلے کے درمیان طے ہوا۔ اس معاہدے میں حضرت محمد نے بحیثیت فرستادۂ خدا، پیغمبر مسلمانان عہد کیا کہ اگر ضمرہ پر کسی نے حملہ کیا تو مسلمان ان کی حمایت کے لئے اٹھیں گے اور اگر حضرت محمد کو ان کی مدد کی ضرورت پڑی تو وہ ان کی مدد کے لئے آئیں گے۔ اس معاہدے کے بعد بنو ضمرہ کو یہ اختیار تھا کہ وہ مکہ والوں کے قافلے کو اپنی سرزمین سے گزرنے دیں۔

سرزمین ودان جو بنو ضمرہ کا مسکن تھی مدینہ سے تین دن کی مسافت اور مکہ سے نو دن

کے فاصلے پر واقع تھی۔ خیال ایسا ہوتا ہے کہ قبیلہ مذکور نے یہ معاہدہ اس لیے بھی کیا تھا وہ دیکھتے تھے مدینہ قریب ہے اور مکہ ان سے دور ہے۔ اگر چہ مکہ ان سے دور تھا مگر اہل قریش بڑے طاقت ور تھے اور بنوضمرہ کا محاسبہ کر سکتے تھے۔ مگر اہل قریش کی پرواہ نہ کرنے کا سبب صرف یہی تھا کہ حضرت محمد کی طرف سے یہ وعدہ تھا کہ اگر تم مسلمانوں میں مل جاؤ گے تو بہشت میں جگہ پاؤ گے۔ جب بنوضمرہ نے یہ سنا کہ بہشت، سرزمین سعادت جاوید ہے اور جو کوئی وہاں جاتا ہے سعادت مند رہتا ہے تو وہ آپ کے ساتھ جنگی معاہدہ کرنے پر راضی ہو گئے۔ چونکہ جنت ایک ایسا مقام ہے کہ اگر انسان وہاں چلا جائے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خوشی و کامرانی سے بسر کرے گا لہٰذا بہشت کے لئے ہر قسم کی دنیوی قربانی انسان پیش کر سکتا ہے جب کہ انسان کا قیام بھی یہاں بہت تھوڑا ہے اور وہ بھی تکالیف سے بھر پور۔ رہا بہشت کا معاملہ، سو وہاں عمر جاوید اور سعادت دائمی ہے۔ دنیا آخرت کے عوض بیچ ڈالنا ایک ایسا سودا ہے جس میں انسان کے لئے نفع ہی نفع ہوتا ہے۔

بنوضمرہ سے معاہدہ کرنے کے بعد آپ بنوغفار کی طرف روانہ ہوئے، قبیلہ غفار آج بھی عربستان میں موجود ہے۔

انگریز سیاح کرنل لارنس جو محتاج تعارف نہیں ہے، جسے سب جانتے ہیں کہ پہلی جنگِ عظیم میں سارے عرب کو ''متحد'' کرنا چاہتا اور ایک ''عظیم'' عربی سلطنت قائم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، ایک مدت تک بنوغفار میں سکونت پذیر رہا۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''افرادِ قبیلہ بنوغفار، بلحاظ روح و اخلاق ویسے ہی ہیں جیسے کہ چودہ صدی پہلے، وہ صدر اسلام میں تھے۔ ان کے نزدیک سیاہ و سپید، نیک و بد، صدق و کذب متعین ہے اور اس معاملہ میں کوئی اور درمیانی راہ نہیں'' (مسلمان کرنل لارنس سے سخت نفرت کرتے ہیں کیونکہ اس نے عرب اتحاد کے نام پر خلافت عثمانیہ کو نقصان پہنچایا تھا...... مولف)

کرنل لارنس قبیلہ غفار کے لوگوں کو قبائل عرب میں پاکیزہ ترین شمار کرتا ہے چونکہ اس کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا لہٰذا یہ رہزنی کیا کرتے تھے، اسلام لانے کے بعد یہ سب کے سب مرد و زن پاکیزہ افراد بن گئے اور پھر کبھی بھی رہزنی کا دھیان تک نہ لائے۔

سچی توبہ کی روایت

یہ لوگ دین اسلام کے احکامات کی اس سختی سے پابندی کرتے تھے کہ اگر ان میں سے کوئی شخص گناہ کا مرتکب ہو جاتا تو خود پیغمبر اسلام کی خدمت میں حاضر ہو کر اعتراف کرتا حالانکہ کسی کو بھی اس کے گناہ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہوتا۔ اسلام لانے کے بعد ایک غفاری، محصنہ عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب ہوا یعنی ایک شوہر رکھنے والی عورت کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کئے کسی نے اسے ایسا کرتے نہ دیکھا تھا کہ وہ زنائے محصنہ کی سزا کا مستحق ہوتا اور اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تب بھی تہمت لگانے کی جرات نہ کرتا کیونکہ چار عینی گواہوں کا ہونا ضروری تھا، جو اس بات کی گواہی دیتے کہ انہوں نے وقت ارتکاب گناہ مرد وزن کو واضح طور پر دیکھا ہے۔ مگر یہ شخص جس نے یہ گناہ کیا تھا، جانتا تھا کہ سنگسار ہو جائے گا کیونکہ یہودیوں اور مسلمانوں میں محصنہ کے ساتھ زنا کرنے کی سزا سنگساری تھی، رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر معترف گناہ اور طالب سزا ہوا۔ جب یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اس کے دماغ میں کوئی فتور نہیں ہے اور جھوٹ نہیں بول رہا تو وہ سنگسار کر دیا گیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک غزوہ میں اونٹوں کی کمی تھی لہٰذا سارے مجاہد اونٹوں پر سوار نہ ہو سکتے تھے تو حضرت محمدؐ نے مسلمان غفاریوں کو اپنے لشکر میں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ فرمایا، ”تم لوگ اپنے گھر چلے جاؤ کیونکہ ہمارے پاس تمہارے سوار کرنے کے لئے اونٹ نہیں ہیں“ بہادران غفار نے دیکھا کہ ہم میدان جنگ میں جانے سے محروم رہے تو اس قدر روئے جیسے عورتیں اپنے مردہ بچے کو روتی ہیں۔ اسی دن سے مسلمان، بنو غفار کو بنو ابکاء (رونے والے) کہنے لگے تھے۔

آپ نے بنو غفار کے ساتھ ایک جنگی معاہدہ کیا جس کی رو سے قرار دیا پایا کہ اگر بنو غفار پر کسی نے حملہ کیا تو مسلمان ان کی مدد کریں گے اور اگر مسلمانوں پر کسی نے حملہ کیا تو بنو غفار ان کی طرف سے لڑیں گے۔ اس کے بعد قبیلہ غفار کو پیغمبر اسلام کا اس قدر اعتماد حاصل ہو گیا تھا کہ ایک مرتبہ آپ نے مدینہ سے سفر کرنا چاہا تو ابوذر غفاری کو تمام مسلمانوں کے سارے امور کا اختیار سونپ دیا۔ جب مسلمانوں اور غفاریوں کے درمیان معاہدہ کی تکمیل ہو گئی تو آپ وہاں سے

روانہ ہو کر قبیلہ جہینہ میں پہنچے، یہ قبیلہ ایک کوہستانی علاقہ میں منطقہ ینبوع میں رہتا تھا یہ بھی مسلمانوں کے ساتھ متحد ہو گیا۔ انہوں نے اپنے خرچ اور اپنی محنت سے مدینہ میں ایک مسجد تعمیر کی تھی جسے بہ استثنائے مسجد قباء مسلمانوں کی دوسری مسجد کہنا چاہئے۔ یہاں سے آپ بنو مدلج کی طرف تشریف لے گئے۔ یہ وہی قبیلہ ہے کہ جب پیغمبر اسلام نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنی چاہی تھی تو اس کا سردار سراقہ بن مالک آپ کی گرفتاری کے لئے بڑھا تھا۔

اگر چہ بنو مدلج بت پرست تھے مگر انہوں نے حضرت محمد کی بڑی محبت و تعظیم سے پذیرائی کی۔ اور آپ کے ساتھ جنگی معاہدہ کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا، کچھ سالوں کے بعد سراقہ بن مالک مسلمان ہوئے اور اسلام کے بڑے سرداروں میں شمار ہوئے۔

ان چاروں قبیلوں کے ساتھ جنگی معاہدہ ہو جانے سے پیغمبر اسلام بہت خوش ہوئے کیونکہ یہ چاروں قبیلے ایک ایسے منطقہ میں آباد تھے کہ مکہ کے قافلوں کو ان میں سے کسی ایک کی سرزمین سے گزرنا پڑتا تھا چونکہ یہ مسلمانوں کے ساتھ متحد ہو گئے تھے لہٰذا وہ مکہ کے قافلوں کو روک سکتے تھے۔ جب آپ مدینہ واپس آئے تو ایک ناگوار خبر سنی کہ شتر سواروں کا ایک گروہ آپ کی مسافرت کے زمانے میں مدینہ آیا، یہ بڑی تیز رو اونٹنیوں پر سوار تھے، ان کا سردار ابن جبیر تھا، مدینہ پر حملہ آور ہوئے، بعض گھروں کو آگ لگا گئے اور مسلمانوں کے اموال کو لوٹ کر لے گئے۔ یہ شتر سوار قریشیوں نے بھیجے تھے۔ اس کے بعد آپ (ﷺ) نے سمجھ لیا کہ مسلمانوں اور بت پرستوں کے درمیان عنقریب جنگ کا آغاز ہو جائے گا۔

ماہ حرام میں حملہ

ماہ نومبر 623ء یعنی ہجرت کے دوسرے سال، پیغمبر اسلام نے پختہ ارادہ کر لیا کہ ایسے مقام سے جہاں قریش کو سان وگمان بھی نہ ہو، کاری ضرب لگائی جائے۔ مکہ کے قافلے مدینہ کی سرزمین عبور کرتے تو وہ ہر طرح مسلح اور طاقتور ہوتے لہٰذا جن قبیلوں نے مسلمانوں کے ساتھ پیمان باندھا تھا، جرأت نہ کر سکتے کہ ان پر حملہ کریں کیونکہ ہر قافلے میں دو ڈھائی ہزار مسلح جنگ جو ہوتے تھے۔ ماہ نومبر 623ء میں پیغمبر اسلام نے آٹھ مسلمانوں کا انتخاب کیا جن کا سردار عبداللہ رضی اللہ عنہ بن جحش کو بنایا یہ کل آٹھ افراد تھے آپؐ نے ایک نامہ لکھا کر مہر لگا کر عبداللہ کو دیا اور

فرمایا نجد (بلند زمین) کی طرف چلے جاؤ وہاں جب کنوئیں پر پہنچ جاؤ اور اونٹوں کو پانی پلا چکو تو اس خط کو کھول کر اس کے مطابق عمل کرنا۔

عبداللہ بن جحش جو تمام مسلمانوں کی طرح حکم نبوی (ﷺ) کو پوری تن دہی سے انجام دیا کرتے تھے دو دن تک مغربی جانب چلتے رہے حتیٰ کہ کنویں پر جا پہنچے اونٹوں کو خوب پانی پلایا اور نامہ مبارک کھول کر پڑھا۔ انہوں نے دیکھا کہ آپؐ نے حکم دیا ہے کہ طائف کی طرف سے مکہ جانے والے قافلہ کو نخلہ کے مقام پر جا کر روک دو، عبداللہ نے یہ حکم پڑا تو ساتوں آدمی ساتھ لئے اور پندرہ دن کے سفر کے بعد ماہ رجب کے آخر میں نخلہ پہنچے تو چھ نفر رہ گئے کیونکہ ان میں سے دو افراد سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان راہ میں گم ہو گئے۔ یہ چھ مسلمان اس بات پر تعینات تھے کہ طائف کی طرف سے جو قافلہ آئے اس پر حملہ آور ہوں۔ واضح رہے کہ عربستان میں ہر جگہ ماہ حرام ایک جیسے نہ تھے۔ مکہ میں ماہ حرام گیارہواں بارہواں مہینہ یعنی ذیقعدہ ذی الحجہ پہلا مہینہ یعنی محرم اور ساتواں مہینہ یعنی رجب تھا۔ ماہ رجب علاوہ ماہ حرام شمار ہونے کے حج صغیر یا حج عمرہ کا مہینہ شمار ہوتا تھا۔ اس مہینے میں زائرین عرب حج عمرہ کے لئے اطمینان کے ساتھ مکہ آتے اور زیارت کرتے۔

عبداللہ بن جحش اپنے ساتھیوں کے سمیت یہاں پہنچے تو صرف ایک دن ماہ رجب ختم ہونے میں رہ گیا تھا۔ اسی دن ایک قافلہ طائف کی طرف سے آ رہا تھا اور مکہ جا رہا تھا۔ قافلہ کشمش، شراب اور پوست لیے ہوئے نخلہ میں آ کر اترا۔ قافلہ والوں کا ارادہ تھا تھوڑی دیر آرام کر کے آگے بڑھیں تا کہ ماہ رجب کے ختم ہونے سے پہلے مکہ جا پہنچیں یعنی ماہ رجب کے ختم سے ایک رات دن پہلے پہنچ جائیں۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ایک دن کے بعد ماہ رجب ختم ہو جائے گا۔ اگر اس سے پہلے مکہ نہ پہنچے تو ممکن ہے صحرا میں کوئی حملہ کر دے۔ حضرت عبداللہ بن جحش حیران تھے کہ کیا کریں، اگر نخلہ میں کارواں پر حملہ آور ہوتے ہیں تو ابھی رجب کے ختم ہونے میں چوبیس گھنٹے باقی ہیں لہٰذا اہل عرب کے عقیدے کے خلاف حملہ ہو گا جب کہ رجب اور اسی طرح ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم میں کسی پہ حملہ کرنا منع تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس قافلے کا نخلہ کے مقام سے پیچھا کرتے تا کہ ماہ حرام کے ختم ہو جانے کے بعد حملہ کریں مگر نخلہ و مکہ کے درمیان فاصلہ بہت تھوڑا تھا، انہیں معلوم تھا کہ چوبیس گھنٹے گزر جانے کے بعد وہ مکہ میں داخل ہو

چکیں گے اور وہاں وہ حملہ نہیں کر سکیں گے کیونکہ حرم میں جنگ کرنا حرام ہے۔ عبداللہ ﷺ یہ بھی جانتے تھے کہ ان پر حملہ کر دینا راہ خدا میں ایک خدمت انجام دینا ہے کیونکہ اشراف مکہ نے اہل مدینہ کا اقتصادی محاصرہ کر کے مسلمانوں کو بھوکوں مار رکھا تھا، مسلمان کہیں سے بھی مال نہیں منگوا سکتے تھے اور اہلِ مکہ کے مال کو نہ روک سکتے تھے۔ بالآخر عبداللہ بن جحش نے ماہ رجب کی حرمت سے صرف نظر کر کے راہ خدا میں جنگ کرنے کو ترجیح دی۔ مسلمانوں نے قافلہ مکہ کے چار قریشیوں پر حملہ کر دیا۔ ان چاروں میں سے ایک مارا گیا، دو گرفتار ہوئے اور چوتھا بھاگ کھڑا ہوا۔ مسلمانوں نے ان کے اونٹوں اور مال پر قبضہ کر لیا۔ قریشی کو جس مسلمان نے قتل کیا تھا ان کا نام وقید بن عبداللہ تھا۔ یہ سب سے پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے راہِ اسلام میں ایک کافر کو قتل کیا۔ جو شخص بچ کر نکل گیا تھا اس نے مکہ پہنچ کر تمام واقعہ بیان کیا تو اہل مکہ مسلمانوں کے گرفتار کرنے کے لئے کھڑے ہوئے مگر وہ مسلمانوں کو گرفتار نہ کر سکے۔ مسلمان اونٹوں اور سامان سمیت مدینہ جا پہنچے اس پر نہ صرف اہلِ مکہ نے اعتراضات کیے بلکہ مدینہ کے بت پرستوں اور یہودیوں نے بھی اعتراضات کرنے شروع کر دیے اور حضرت محمدؐ کے خلاف بدگوئیاں کرنے لگے، کہنے لگے یہ شخص اپنے آپ کو خدا پرست کہتا ہے مگر احترامِ ماہ رجب جو اللہ کی طرف سے ہے اس کی رعایت نہیں کرتا بلکہ حکم دیتا ہے کہ مسلمان اہلِ مکہ پر حملہ آور ہوں۔

جزیرۃ العرب میں قوانین پر خواہ وہ جیسے کچھ بھی تھے سختی سے عمل کیا جاتا تھا کیونکہ اگر اہل عرب بلا استثنا، قوانین پر سختی سے عمل نہ کرتے تو عرب میں زندگی بسر نہ کر سکتے تھے۔ جزیرۃ العرب کے بعض دیہات میں ایک پیالہ بھی بڑی قیمت رکھتا تھا کہ اگر چوری ہو جاتا تو ناقابل تلافی نقصان ہوتا، اسی لیے عربستان میں چور کی سزا ہاتھ کاٹ ڈالنا تھی۔ بے چون و چرا وہ چور کا ہاتھ کاٹ ڈالتے تھے اگر ایسا نہ کرتے تو اپنے مال کو چوروں سے نہ بچا سکتے۔ حرام مہینوں کا احترام بھی جزیرۃ العرب کی خصوصیات زندگی کا پرتو تھا۔ سرزمین عرب کا بیشتر حصہ (منجملہ ان کے مکہ بھی ہے) خشک اور نامزروع تھا، لوگ معاش حاصل کرنے کے لئے مجبور تھے کہ قابل کشت و زراعت حصوں سے خام مواد اور سامان رسد لائیں اور تبادلہ کے لئے اپنی مصنوعات کو ان ملکوں کی طرف لے جائیں لہٰذا وہ تجارت کرنے پر مجبور تھے اور تجارت بغیر قافلوں کی آمد و رفت کے ممکن نہ تھی۔

مگر چونکہ بدو عرب ننگے بھوکے تھے اس لیے ان کے لئے یہ تجارتی قافلے لقمہ تر تھے، یہ لوگ موت سے نہ ڈرتے تھے، جرأت کے ساتھ قافلوں پر حملہ آور ہوتے اور تاجروں کا مال اور اونٹ لے بھاگتے۔ ان وجوہات کی بنا پر اہل عرب نے یہ قانون بنالیا تھا کہ سال میں چار ماہ جنگ وجدل سے ہاتھ روکے رکھیں۔ وہ اس قانون کا بڑا احترام کرتے مگر حضرت عبداللہ ﷺ بن جحش نے کاروان مکہ پر حملہ کر کے اس قانون کو پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ مکہ میں چند اشراف کے ذمہ حرام مہینوں کا انتظام تھا، جونہی ماہ ذی قعدہ شروع ہوتا، سردار، خانہ کعبہ میں آکر بلند آواز سے اعلان کرتا کہ ماہ حرام شروع ہوگیا ہے۔ اب کوئی شخص کسی کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتا، ساری لڑائیاں جھگڑے ملتوی ہو جانے چاہئیں۔ حرام مہینوں کو ختم ہو جانے پر یہی سردار پھر خانہ کعبہ میں آکر اعلان کرتا کہ حرام مہینے ختم ہو چکے ہیں اب لڑائیاں جھگڑے شروع کئے جا سکتے ہیں۔

واضح رہے جیسا کہ ہم لوگ خیال کرتے ہیں کہ اہل عرب صرف قمری حساب رکھتے تھے، ایسا نہیں ہے، بلکہ مدتوں شمسی حساب پر بھی کار بند رہے۔ ہر تیسرے برس، سال کو تیرہ ماہ کا قرار دیتے تھے۔ اس طرح کہ دو سال برابر سال کو بارہ مہینے کا قرار دیتے اور تیرھویں سال تیرہ ماہ کا، اس تیسرے مہینے کو ماہ خالی یا ماہ صفر کہتے تھے۔ یہ مہینہ آغاز میں بارہ مہینوں کے ناموں میں کسی ماہ کا نام نہ تھا بلکہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے یہ ایک زائد مہینہ تھا اس طرح محرم کے دو ماہ تھے ایک ماہ حلال اور دوسرا ماہ حرام، رفتہ رفتہ بارہ مہینے والے سالوں میں دوسرے مہینے کو ماہ صفر کہنے لگے۔

حضور (ﷺ) کا موقف

بہر حال جب مسلمان مال اور اونٹ لے کر مدینہ آئے تو حضرت محمد کو بھی اس بات کا صدمہ ہوا کہ حرام ماہ میں مسلمانوں نے قافلے پر حملہ کیا ہے۔ آپ اس قدر اس واقعہ سے متاثر ہوئے کہ فرمایا نقضِ حکم ماہ حرام ایک بڑا برا واقعہ ہے۔

مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا کہ انہیں اس واقعہ سے متاثر نہ ہونا چاہیے۔ یہ آیت سورۃ بقر کی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۚ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۚ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ

اللّٰهِ وَ كُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ. (الٰی آخر الآیت)

"آپ سے ماہ حرام میں قتال کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجئے اس میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے۔ مگر راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ روکنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ خون ریزی سے شدید تر ہے (آخر آیت تک)۔

یعنی اے حضرت محمد (ﷺ)! آپ سے ماہ حرام اور اس میں قتل وقتال کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، ان سے کہہ دیجئے کہ یہ ایک بڑا بھاری گناہ ہے کیونکہ لوگ حرم کی طرف بے خوف وخطر آ جا نہیں سکتے اور خدا کی نافرمانی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی نظر میں بہ نسبت ماہ حرام کی بے حرمتی کے، حرم کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ حضرت محمد اور ان کے پیروکاروں کو مکہ سے نکالنا ماہ حرام میں جنگ کرنے سے کہیں بدتر ہے۔

یہ پوری آیت سورۃ بقرہ کی جو ہم نے درج کی ہے، بڑی مفصل ہے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں، ماہ حرام میں قتل وقتال کی مخالفت کو حسب سابق برقرار رکھا مگر ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ماہ حرام میں قتل وقتال کرنے سے زیادہ بڑا گناہ، قریشیوں کا مسلمانوں کو خانہ کعبہ سے نکالنا انہیں خانہ کعبہ کی زیارت سے روکنا یا فتنہ بھڑکانا ہے، فتنہ کے بہت سے معانی ہیں، یہاں اللہ تعالیٰ کا مقصود، فتنہ سے مسلمانوں کا وطن سے دور کر دینا اور ان کا نکال دینا ہے۔

اس آیت کے نزول کے بعد آپ مطمئن ہو گئے کیونکہ انہیں معلوم ہو گیا کہ اللہ کے نزدیک ماہ حرام میں جنگ کرنا برا نہیں ہے بلکہ اس آیت سے آپ سمجھ گئے کہ جہاں کہیں بھی کسی بات سے دین خداوندی کی اشاعت میں رکاوٹ پڑتی ہے، اس کی مخالفت جائز ہے اور ماہ حرام کے تقدس کو توڑا جا سکتا ہے۔

مکہ سے ایک وفد مدینہ آیا تا کہ اپنے اونٹ، قیدی اور سامان کا آنحضرتؐ سے مطالبہ کرے کہ وہ انہیں واپس فرما دیں۔ آپ نے ان کی بات نہ مانی البتہ اسیروں کے بارے میں فرمایا کہ ہر قیدی کے عوض ایک ہزار چھ سو درہم بطور فدیہ مسلمانوں کو ادا کریں۔ ان میں سے ایک قیدی مسلمان ہو گیا اس لیے کہ اس نے مدینہ سے واپس جانا نہ چاہا، اس واقعہ سے

مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔

بدر میں رسول اللہ کا طرز حرب

نخلہ میں چھ ہفتے کی تگ و دو کے بعد جب مسلمان، کارواں مکہ پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مسلمانوں کے جاسوسوں نے اطلاع دی کہ ایک بڑا کارواں جس میں دو ہزار اونٹ اور پچاس ہزار دینار کا مال ہے، مدینہ کے قریب سے گزرنے والا ہے، قافلہ سالار ابوسفیان ہے اور مکہ کی طرف جا رہا ہے۔

مکہ کے سارے خاندانوں کے افراد خصوصاً قریشی اس نفع بخش کارواں میں شامل تھے اور مکہ میں اس کے ورود کے منتظر تھے۔ قافلہ کے سرزمین مدینہ میں پہنچنے سے چند روز پہلے حضرت عبدالمطلب کی دختر نے مکہ کی گلیوں میں چلا چلا کر اعلان کرنا شروع کیا کہ مکہ کے باشندوں پر بہت جلد ایک مصیبت آنے والی ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ بدبختی چند روز تک وقوع پذیر ہو جائے۔ یہ لڑکی غیب کی خبریں دیا کرتی تھی۔

باشندگان مکہ کے لئے جو سب کے سب تاجر تھے، سب سے بڑی مصیبت یہی ہو سکتی تھی کہ ان کا مال ضائع جائے چونکہ وہ جانتے تھے کہ دختر عبدالمطلب کی بیشتر پیش گوئیاں صحیح ثابت ہو چکی ہیں لہٰذا انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ آنے والی مصیبت کاروان مکہ کو درپیش ہو گی۔

جب کوئی قافلہ آنے والا ہوتا تو ایک تیز رو اونٹ سوار اس کی آمد کا اعلان کیا کرتا تھا۔ مگر اس بار وہ بھی نہ آیا جس سے لوگوں کو تشویش ہوئی۔ بالآخر ایک اونٹ سوار آیا۔ اس کے اونٹ کا پالان اس کے پیٹ سے بندھا ہوا تھا اور وہ خود ننگی پیٹھ پر لباس کو الٹا کر بیٹھا ہوا تھا، اس کے بال پریشان تھے اور اس کے اونٹ کے کانوں سے خون ٹپک رہا تھا کیونکہ اس کے کان کاٹ دیئے گئے تھے۔ وہ نوحہ کی طرح بلند آواز سے کہہ رہا تھا، اے قریشیو! آگاہ ہو جاؤ کاروان مکہ ہلاکت کی نذر ہو گیا ہے کیونکہ محمد نے اس کے لوٹنے کا ارادہ کر لیا ہے، جس شخص میں بھی تھوڑی سی غیرت ہے اسے آمادہ جنگ ہو جانا چاہئے۔ تم لوگوں کو چاہئے کہ محمد کو موقعہ نہ دو کہ وہ مکہ کے کارواں کو لوٹ لیں۔

ابھی یہ ڈھنڈورچی اعلان سے فارغ نہ ہوا تھا کہ چند افراد مکہ میں پیادہ پا بدن کو مٹی ملے

ہوئے بالکل ننگے داخل ہوئے انہیں منادیٔ عریاں (ننگے ڈھنڈورچی) کہتے تھے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ کوئی بڑی بھاری مصیبت آئی ہے۔ یہ لوگ اس طرح فریاد کر رہے تھے جیسے اسی دم مسلمان انہیں لوٹ رہے ہوں وہ لوگوں کو بھڑکا رہے تھے کہ بغیر دیر کیۓ فوراً ان کی گلو خلاصی کے لئے روانہ ہو جائیں۔ چند گھنٹوں میں نو سو پچاس مرد سات سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے تیار ہو گئے۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی چلنے کے لئے آمادہ ہو گئیں تاکہ میدان جنگ میں حاضر ہو کر مردوں کو بھڑکائیں کہ وہ مسلمانوں کا قتل عام کر دیں۔ علاوہ جنگ باز مردون، اونٹوں اور گھوڑوں کے مکہ میں چند گھنٹوں کے اندر دو سو پچاس ہزار درہم بھی جنگ کے لئے نقد جمع ہو گئے۔ آج تک ایسا اتفاق نہ ہوا تھا کہ اتنی کم مدت میں مکہ کے اندر اس قدر خطیر رقم تاجروں کی طرف سے جمع ہو جائے کیونکہ آج تک تاجران مکہ نے اپنے منافع کو اس قدر شدید خطرے میں نہیں دیکھا تھا مگر اس وقت وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کی طرف سے تاجرانِ مکہ کو ایک بڑا بھاری خطرہ لاحق ہو گیا ہے اگر اس وقت اسے روکا نہ کیا گیا تو ان کا سارا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا اور ان کی زندگی برباد ہو جائے گی۔

حضرت محمدؐ نے مکی قافلے پر حملہ کرنے کے لئے مدینہ میں ہر قسم کی طاقت مہیا کر لی تھی۔ آپ کے لشکری صرف تین سو تیرہ مرد تھے جو سب کے سب بہترین لڑنے والے تھے۔ انصار میں یعنی مسلمانانِ مدینہ میں دو قبیلے تھے ایک اوس اور دوسرا خزرج، ہر قبیلے میں ستر مردانِ کارزار تھے جو حضرت محمد کے ہمراہ چلنے کے لئے تیار ہو گئے تاکہ مکی قافلے پر حملہ کریں اس طرح ان تین سو تیرہ میں ایک سو چالیس مرد انصاری تھے۔ باقی مہاجر تھے یعنی وہ مسلمان تھے جو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تھے۔ تین سو تیرہ مسلمانوں کے پاس صرف ستر اونٹ اور دو گھوڑے تھے۔ رسول اللہ نے حکم دیا کہ ہر اونٹ پر دو سوار بیٹھیں اور باقی پیدل چلیں پھر سوار پیادہ ہو جائیں اور پیادہ سوار بن جائیں تاکہ ان کی تھکن دور ہو جائے۔ حضرت محمد تین سو تیرہ افراد، ستر اونٹ اور دو گھوڑے ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ مسلمان میدان جنگ کی طرف گھوڑے لے گئے (اور وہ بھی صرف دو عدد)

سترھویں رمضان 2ھ مطابق 624ء حضرت محمد اپنے اس مختصر سے لشکر کے ساتھ وادیٔ بدر میں کاروانِ مکہ کا انتظار کرنے لگے۔ (یہ بیس کلو میٹر قطعہ مدینہ کے جنوب مغرب میں واقع ہے)

مگر کاروان نہ اس دن آیا نہ اس کے بعد۔

چونکہ مدینہ میں مسلمانوں کے علاوہ کچھ یہودی بھی زندگی بسر کر رہے تھے اور کچھ منافق بھی (جو نہ مسلمانوں کی طرف دار تھے نہ مخالف) ان دونوں گروہوں نے اپنے ذرائع سے ابوسفیان، قافلہ سالار مکہ کو اطلاع دے دی کہ حضرت محمد قافلے پر حملہ کرنا چاہتے ہیں لہٰذا اس نے ایک محفوظ راہ اختیار کی جو اگرچہ دور تر تھی مگر مکہ تک پہنچا دیتی تھی۔

مکی قافلہ وادئ بدر کی طرف آیا بلکہ کاروان کی بجائے نوسو پچاس مکی جنگجو تیزی سے بدر کی طرف بڑھے۔ لشکرِ اسلام کے ہراول دستے نے مکیوں کے ہراول دستے کے دو آدمی گرفتار کیے اور انہیں آپ (ﷺ) کی خدمت میں لے آئے۔ آپ (ﷺ) نے ان دونوں سے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ نوسو پچاس سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج ادھر کی طرف بڑھ رہی ہے۔ حکم دیا کہ انہیں قید کر دیا جائے اور مسلمانوں سے فرمایا۔ ''میں خیال کرتا ہوں کہ جس طرح لوگوں نے کاروان مکہ کو یہ اطلاع دی ہے کہ اپنے قافلہ کو مدینے کی طرف سے نہ گزاریں، اسی طرح انہوں نے قریشیوں کو بھی ہماری تیاری کی اطلاع کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابوجہل کی قیادت میں نوسو پچاس لڑاکا مدینہ کا رخ کر رہے ہیں۔ ہم چاہیں تو مدینہ کی طرف واپس ہو سکتے ہیں مگر ہماری مراجعت سے فائدہ کچھ بھی نہ ہوگا کیونکہ اہل مکہ، مدینہ میں گھس کر ہم سے نبرد آزما ہوں گے۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ہم یہاں ان کا انتظار کریں یہ مقام مدینہ سے زیادہ اچھا ہے۔ مدینہ کی نسبت سے یہاں اچھی طرح لڑا جا سکتا ہے اور ہمارے لئے فتح کی زیادہ توقع ہے۔''

وادئ بدر کا کچھ حصہ ریت اور مٹی پر مشتمل ہے اور کچھ سنگلاخ ہے، یہ دو پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے، مشرقی پہاڑ کو العدوۃ القصویٰ اور مغربی کو العدوۃ الدنیا کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور سلسلۂ کوہ جنوبی وادی میں ہے جسے اسفل کہتے ہیں۔ یہاں صدر اسلام میں چند ایک چشمے تھے جہاں مکہ کے قافلے آکر ٹھہرتے اور پانی پیتے تھے۔ جب آپؐ نے جنگ کی ٹھان لی تو لشکر کا مقام بدل دیا۔ اب تک مسلمان وادئ بدر کے مدخل شمالی میں کاروان مکہ کا انتظار کر رہے تھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ مکہ کا قافلہ نہیں آئے گا تو فرمایا کہ اس مقام کو چھوڑ دو اور کوہ اسفل کے دامن میں ڈیرے ڈال دو تا کہ پانی کے چشمے ہمارے قبضے میں رہیں اور دشمن ان سے استفادہ نہ کر سکے۔ مسلمان فوراً آپ کا حکم بجا لائے اور شمال بدر سے جانب جنوب منتقل ہو گئے۔

کوہ اسفل کے دامن میں قیام کیا اور چشموں پر قبضہ کرلیا۔ یہاں پہنچ کر آپ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اب تک اہل عرب جنگ میں تنہا تنہا لڑتے رہے ہیں اور انفرادی جنگ کو ترجیح دیتے رہے ہیں کیونکہ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ وہ انفرادی حالت میں اپنی شجاعت کا اظہار کرے تاکہ دوسرے لوگ اسے بہادر جانیں، مگر ہم اس جنگ میں خدا کے لئے لڑنے آئے ہیں، اپنے لئے نہیں۔ اللہ ہر ایک کی بہادری کے جذبہ پر نظر رکھتا ہے، اگر ہم اس کی راہ میں قربان ہو گئے تو وہ ہمیں جزا دے گا اور بہشت میں پہنچا دے گا۔ دوسرے یہ کہ ہمارے فدائی، سربازان مکہ کے ایک تہائی ہیں۔ اگر ہم منفرد طور پر لڑے تو نیست و نابود ہو جائیں گے، البتہ اگر سب مل کر لڑیں گے تو فتح کی امید ہے۔''

حضرت محمد نے مسلمانوں کو وہ طرز جنگ سکھایا جسے ہزار سال پہلے سکندر کے باپ فلپ مقدونی نے ایجاد کیا تھا اسے یونانی زبان میں فالانز کہتے ہیں۔ ''فالانز'' کا یہ مطلب تھا کہ سپاہی ایک دوسرے کے کاندھے سے کاندھا اور پہلو سے پہلو ملا کر کھڑے ہوتے تھے اور صف کو خم رکھتے تھے حتیٰ کہ مثلث، مربع یا دائرے کی شکل بن جاتی۔ اس مثلث مربع، یا دائرے میں تمام سربازوں کا رخ دشمن کی طرف ہوتا اور پشت مثلث، مربع یا دائرے کی طرف۔ نتیجہ یہ کہ دشمن پیچھے سے حملہ نہ کر سکتا تھا کیونکہ جس طرف بھی منہ کرتا، مقابل سامنے ہوتا۔ یونانی طرز جنگ ''فالانز'' کو حضرت محمد (ﷺ) نے عربستان میں پہلی بار رائج کیا اور جنگ بدر میں اس سے فائدہ حاصل کیا۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کی فتح اور اظہار شجاعت کا یہی سبب بنا مگر اہل عرب اس سے پہلے بالکل نا آشنا تھے۔ یہ کلمہ پھر بھی زبان عرب میں داخل نہیں ہوا۔

''فالانز'' کی صورت میں طرز جنگ سکھانے کے بعد آپ نے مسلمانوں سے فرمایا تمہارا میدانِ جنگ سے فرار بے سود ہوگا کیونکہ اگر تم بھاگو گے تو مدینہ ہی کا رخ کرو گے، وہاں یہودی اور منافق تمہارا پیچھا کر کے قریش کے سپرد کر دیں گے اور وہ تمہیں قتل کر ڈالیں گے۔

اس کے بعد آپ نے نہایت خوش الحانی سے یہ آیت پڑھ کر سنائی جو آٹھویں سورت یعنی سورۃ الانفال میں ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا لَقِيتُمُ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ ٱلْأَدْبَارَ ۝ وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُۥٓ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ ٱللَّهِ

وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ.

''اے ایمان والو! جب تم کفار سے لڑو تو پشت پھیر کو نہ بھاگو (کیونکہ یہ بڑا بھاری گناہ ہے) جو کوئی اس دن پیٹھ دکھائے گا مگر یہ کہ جنگ کے لئے رخ بدلے یا اپنی کسی جماعت سے ملنا چاہے تو وہ غضب الٰہی کا مستحق ہوگا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ جو برا ٹھکانا ہے''۔

سپاہ اسلام کا یہ ''فالانز'' جو حضرت محمد کے طفیل وجود میں آیا، مثلث تھا اور تینوں ضلعوں پر تین پرچم تھے۔ جزیرۃ العرب میں اپنی مہارت تامہ سے آپ نے یہ طرز جنگ ایجاد کیا کہ مثلث کا ہر ضلع ایک دوسرے کا پشتی بان تھا اور اپنی جگہ پر ہر طرح مکمل تھا۔ دشمن جدھر سے بھی حملہ کرتا اسے کسی ایک دستے سے مقابلہ کرنا پڑتا در آنحالیکہ ہر ضلع دوسرے کی تقویت پر موجود تھا اور ہر دستہ پر ایک پرچم لہرا رہا تھا۔ پہلے ضلع کے پرچم بردار حضرت علی ؓ بن ابی طالب، آپؐ کے چچا زاد تھے جن کے ہاتھوں میں سفید جھنڈا تھا۔ اس پرچم پر عقاب کی تصویر تھی۔ دوسرے ضلع کے علم بردار ایک مہاجر مصعب بن عمیر تھے اور تیسرے کے ایک انصاری تھے، جب آپؐ صف بندی سے پورے طور پر مطمئن ہوگئے تو مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''اگر تمہاری فتح ہوئی تو جنت میں جاؤ گے اور اگر مارے گئے تب بھی بہشت میں جاؤ گے کیونکہ تم راہ خدا میں شہید ہوگے۔ کوئی بھی جنتی اس دنیا میں آنا نہیں چاہتا البتہ وہ لوگ جو راہ خدا میں شہید ہوئے ہیں یہ تمنا کرتے ہیں کہ انہیں پھر دنیا میں بھیج دیا جائے اور ہم راہ خدا میں پھر شہید ہوں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ خدا انہیں بہشت میں کیا رتبہ عطا کرے گا''۔

جب آفتاب ڈوبنے لگا تو مکہ کا لشکر دکھائی دیا مگر رات ہو جانے کی وجہ سے نہ مسلمانوں نے لڑنا چاہا نہ کافروں نے جن کا سپہ سالار ابوجہل تھا۔ رات کے وقت پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کے لشکر کے مقام کو بدل دیا تاکہ ایسے مقام سے کھڑے ہو کر جنگ کر سکیں جہاں سورج کی چمک نہ پڑے اور آنکھیں خیرہ نہ ہوں۔

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد فن جنگ سے خوب آشنا تھے ہمیں معلوم نہیں کہ انہوں نے فنون حرب کب اور کہاں سیکھے؟ اس رات آپ نے مسلمانوں سے فرمایا، ''سب سو جائیں، صرف وہ لوگ جاگتے رہیں جو اپنی اپنی باری پر پہرہ دیں گے تاکہ صبح تم لوگ جنگ کے لئے تازہ دم اٹھو۔ میں خدا سے دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں سکون عطا

فرمائے اور تم آرام سے سو سکو"۔

اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے آٹھویں سورت میں فرمایا:

إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ.

"یاد کرو جب تم پر نیند تمہارے سکون قلبی کے لئے اتاری اور تم پر آسمان سے پانی اتارا۔ تمہیں پاک کرنے کے لئے۔(آخر آیت تک)"

مطلب یہ کہ وہ دن یاد کرو جب تم دشمن کے ڈر سے سو نہیں سکتے تھے مگر نصرت خداوندی نے تمہیں سکون خاطر بخشا لہٰذا تم سو گئے۔ اللہ نے تم پر آسمان سے پانی نازل کیا تمہیں پاک کرنے کے لئے اس میں ایک یہ بھی فائدہ تھا کہ زمین کا گردوغبار دب گیا اور وہ صاف ستھری ہو گئی۔ لہٰذا غازیان اسلام بوقت جنگ پاؤں پھسلنے سے محفوظ رہے۔ اس شب گو مسلمان، دشمنوں کے سامنے تھے مگر اس قدر آسودہ سوئے کہ جب تک بارش نہ ہوئی، بیدار نہ ہوئے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس رات مسلمانوں پر بارش ہوئی تا کہ ان کی تطہیر ہو اور اگلے دن غازیان اسلام کے مٹی کے اوپر سے پاؤں نہ پھسلیں۔

کئی ایک مؤرخین اسلام لکھتے ہیں کہ جنگِ بدر، جمعہ کی صبح 17 رمضان 2ھ کو ہوئی، اگر ایسا ہوتا تو یہ ضروری تھا کہ حضرت محمد اور ان کے ساتھی جمعہ سے ایک دن پہلے یعنی جمعرات کے دن وہاں پہنچتے کیونکہ اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ لشکر اسلام میدان جنگ میں ایک رات پہلے سویا تھا۔ اگر یہ لوگ جمعہ کے دن بدر کے مقام پر پہنچے تو لامحالہ جنگ بدر ہفتہ کے دن اٹھارہویں رمضان کو ہوئی۔ حیرت ہوتی ہے حضرت محمد کے فدائی جو اہل مکہ کے مقابلہ میں تہائی تھے کیسے یہ جرات کر سکے کہ مکہ کے لشکرِ کثیر کے مقابلہ کے لئے مقام بدر کی طرف آئے۔ مکہ کے لڑاکا کوئی ڈرپوک نہ تھے کہ ہم یہ خیال کریں حضرت محمد جانتے تھے کہ اہل مکہ اسلام کے لاؤ لشکر کی خبر سن کر بھاگ جائیں گے۔ وہ بھی بدو تھے اور شجاعت کے مالک تھے، تلوار کے دھنی تھے اور میدان کارزار میں موت کی پرواہ کئے بغیر لڑتے تھے خواہ کسی کو ماردیں یا کوئی انہیں ماردے۔

وہ زمانہ اس دور جیسا بھی نہ تھا کہ ایک چھوٹی سی فوج آتشیں اسلحہ سے ایک بڑی فوج کو روک دے۔ دونوں لشکروں کے ہتھیار ایک جیسے تھے صرف فرق اتنا تھا کہ بعض سرفروش بعض سرفروشوں سے جسمانی اعتبار سے زیادہ قوی اور اچھے عضلات والے تھے اسی لئے میدان جنگ

میں تعداد کو ملحوظ رکھا جاتا تھا لہٰذا ہر سپہ سالار کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ میری فوج، دشمن کی فوج سے زیادہ ہو۔ اگر حضرت محمد کے پاس قریشیوں کی نسبت سے اسلحہ زیادہ ہوتا تو ہم سمجھتے کہ آپ ہتھیاروں کے بھروسے پر ان سے نبرد آزما ہوئے مگر ایسا بھی نہیں ہے کیونکہ اہلِ مکہ کے پاس سات سو اونٹ اور یک صد گھوڑے تھے اور حضرت محمدؐ کے پاس صرف ستر اونٹ اور دو گھوڑے تھے۔ لہٰذا اس بارے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ جنگ بدر میں پیغمبر اسلام کا بھروسہ خدا پر تھا وہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرے گا اور ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ مکہ کا لشکر کثیر، مدینہ کے لشکر قلیل کو شکست دے دے۔ جو بھی مسلمان جنگِ بدر میں شریک تھے اس کا بھی رسول خدا کی طرح یہی ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہم اگر مارے گئے تو بہشت میں جائیں گے۔ اس ایمان کے علاوہ دوسرا سبب مسلمانوں کی فتح کا وہ طرز جنگ تھا جو حضرت محمد نے پہلی بار عربستان میں رائج کیا۔

17 رمضان جمعہ کی صبح یا 18 رمضان ہفتہ کی صبح، رسول اکرم (ﷺ) خوب جانتے تھے کہ اگر وہ شکست کھا گئے تو مسلمان بھی مٹ جائیں گے اور اسلام بھی کیونکہ ابھی تک اسلام میں اتنی طاقت نہ آئی تھی کہ بڑی شکست کو برداشت کر سکے۔ اگر اس دن مسلمان شکست کھا جاتے تو اسلام صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہوتا۔

اہل عرب میں یہ رسم تھی کہ میدان جنگ میں سپہ سالار لشکر فوج کے پیچھے کھڑا ہو کر لڑائی کا انتظام کرتا تھا، جنگِ بدر کے سپہ سالار محمد (ﷺ) ایک ذرا بلند ٹیلے پر کھڑے ہو کر جنگ کا نقشہ دیکھ رہے تھے اور احکامات صادر کر رہے تھے، سپہ سالار کے اس مقام کو اہلِ عرب عریش کہتے ہیں۔

آغاز جنگ میں طلوعِ آفتاب کے وقت حسب دستور عرب، فریقین نے رجزیہ اشعار پڑھنے شروع کئے جن میں دشمن کی تحقیر اور اپنے دوستوں کی تعریف ہوتی تھی۔ اشعار پڑھنے کے بعد قریش کی فوج سے تین افراد نکلے اور دونوں صفوں کے درمیان آ کھڑے ہوئے۔ ایک کا نام عتبہ تھا یہ ابوسفیان کا خسر تھا، دوسرا شیبہ، ابوسفیان کی زوجہ کا چچا تیسرا ولید، ابوسفیان کا سالا یہ تینوں جب دونوں صفوں کے درمیان پہنچے تو انہوں نے تلوار بلند کر کے کہا۔ ''ہے کوئی جو ہمارے مقابلہ پر آئے'' (ھل من مبارز؟) مسلمانان مدینہ میں سے تین انصاری آگے بڑھے اور کہا:

''ہم مدینہ کے باشندے ہیں'' وہ تینوں کہنے لگے، ''ہم تم سے آشنا نہیں ہیں لہٰذا تمہارے ساتھ نہیں لڑ سکتے، ہم اشراف مکہ سے ہیں ہمارے مقابلہ کے لئے اشراف مکہ ہی کو آنا چاہیے''۔

یہ سن کر حضرت عمر بن الخطاب نے گرجتی ہوئی آواز سے فرمایا، ''سارے مسلمان برابر ہیں ان میں کوئی بھی کسی پر فضیلت نہیں رکھتا'' قریشی بولے، ''ہم تو صرف اہلِ مکہ کے ساتھ نبرد آزما ہوں گے جنہیں ہم جانتے ہوں''۔ یہ بات سن کر رسول اللہ پکارے، ''اے علی بن ابی طالب! تم ولید سے نبرد آزمائی کرو'' یہ پہلی صف کے علم بردار تھے۔ پھر آپ نے اپنے چچا حضرت حمزہ اور عبید بن حارث کو بلا کر فرمایا، ''تم دونوں ان قریشیوں کے مقابلہ کے لئے بڑھو''۔ یہ تینوں سپاہی جب ان کے مقابل پہنچے تو انہوں نے رجزیہ اشعار پڑھنے شروع کیے۔ رجزیہ اشعار میں رجز پڑھنے والا اپنا تعارف کراتا اور پھر جنگ وغیرہ کا بیان کرتا ہے۔

حضرت علی، زادہ عم پیغمبر نے فرمایا، ''میں علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب ہوں'' پھر آپ نے امری القیس بن حجر الکندی کے مشہور معلقہ کے آخری اشعار پڑھنے شروع کیے، امری القیس کا یہ قصیدہ بہت مشہور ہے۔ وہ جاہلی دور کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ معلقاتِ سبع (سات مشہور قصیدے) میں سے یہ پہلا معلقہ ہے۔ اہل عرب میں ڈیڑھ سو سال تک ان قصائد کا چرچا رہا اور یہ خانۂ کعبہ کی دیوار سے آویزاں رہے۔ ولید، ابوسفیان کا سالا جب اپنا تعارف کرا چکا تو اس نے حارث بن الحازہ الیشکری کے چند اشعار پڑھے۔ اس کا قصیدہ بھی معلقاتِ سبع میں سے ایک ہے، اس کے بعد دونوں نبرد آزما ہو گئے۔

اہل عرب کی جنگ شمشیر، اہل یورپ کی جنگ سے بہت مختلف تھی۔ اہل یورپ جب تلوار اٹھاتے تو تلوار کی نوک سے کام لیتے، ان کی شمشیر زنی کا سارا دارومدار نوک پر تھا۔ اہل عرب تلوار کی نوک سے کام لیتے، ان کی شمشیر زنی کا سارا دارومدار نوک پر تھا۔ اہل عرب تلوار اٹھاتے تو اس کی دھار سے کام لیتے، نوک کو بہت کم استعمال کرتے تھے۔ اسی لیے بعض اہل یورپ یہ خیال کرتے ہیں کہ اہل عرب، شمشیر زنی کے قواعد سے آشنا نہ تھے، حالانکہ گو اہل عرب دم شمشیر سے کام لیتے تھے مگر ان کے مخصوص اصول وقواعد تھے اہل عرب بھی یونانیوں، رومیوں اور تمام اقوامِ یورپ کی طرح مواقع جنگ میں شمشیر زنی سے خوب استفادہ کرتے تھے، مدتوں اس کی مشق کرتے اور فنونِ تیغ بازی سیکھتے۔ ڈھال کو بھی جنگ میں بڑی اہمیت حاصل تھی کیونکہ تلوار

کے وار کو سپر ہی خوبی کے ساتھ روک سکتی تھی۔

علی بن ابی طالب، بڑے اچھے شمشیر زن تھے اور ولید سے زیادہ ماہر تھے لہٰذا ان دونوں کا مقابلہ زیادہ دیر تک نہ رہ سکا، ولید کو ایک بھرپور وار لگا جس سے اس کی شہ رگ اور حلقوم کٹ گیا، وہ زمین پر گرا اور اسی وقت مر گیا۔ حضرت حمزہ نے بھی اپنے حریف کو مار گرایا اور اسلام کے تیسرے جانباز عبید بن حارث جو ابوسفیان کے خسر کے ساتھ برسرِ پیکار تھے زخمی ہو گئے مگر انہوں نے بھی بالآخر اپنے حریف کو مار ڈالا۔ اس طرح اسلام کے تینوں جانباز فتح یاب ہوئے، مسلمانوں نے اسے فال نیک سمجھا اور ان کی ہمت بندھ گئی۔

جب اہل قریش نے یہ دیکھا کہ ان کے تینوں بہادر مارے گئے تو انہوں نے نعرے مار کر، آسمان کی طرف نیزے اچھال اچھال کر ہاتھوں میں دبوچ (یہ اس بات کی علامت تھی کہ عمومی جنگ شروع ہو چکی ہے) اور شدید حملہ کر دیا۔ حملہ کرنے والے یہ جانتے ہوئے کہ مسلمانوں میں ایسے اشخاص بھی ہیں جو ان کے بیٹے، بھائی بھتیجے یا چچا ہیں اس کے باوجود وہ مسلمانوں کے قتل کے لئے حملہ آور ہو گئے۔ اس روز تک عرب میں کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ باپ بیٹے کو بھائی بھائی کو اور چچا بھتیجے کو قتل کرنے پر آمادہ ہو یا اس کے برعکس ہو جائے کیونکہ یہ اپنے تھے اور جزیرہ عرب میں یہ لوگ ایک ہی قبیلے کے اعضاء شمار ہوتے تھے۔ جو آپس میں ہرگز نہ لڑتے تھے۔ حضرت محمد نے جو یہ دیکھا کہ عام جنگ شروع ہو گئی ہے، عریش (یعنی مقام سپہ سالار) سے نیچے اتر آئے اور اپنے لشکر کی صفوں کے بیچ میں تشریف لے گئے اور نہایت خوش الحانی کے ساتھ قرآن کی آیتیں تلاوت کرنے لگے۔ یہ آیتیں، راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کی جزاء کے بارے میں تھیں ان آیات میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے فرماتا ہے کہ جو لوگ راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں وہ خواہ مارے جائیں یا کسی کو مار دیں بہرصورت ان کے لئے بہشت ہے۔

ان آیات کی تلاوت کے بعد حضرت محمد نے با آواز بلند کہا، ''اے میرے آباؤ اجداد! تم کہاں ہو، کاش آج تم یہاں موجود ہوتے اور راہ خدا میں شمشیر زنی کرتے ہوئے مارے جاتے تو اللہ تعالیٰ تمہیں میدان قتال سے سیدھا بہشت میں پہنچا دیتا'' ان آیتوں اور ان باتوں کو سننے سے مسلمانوں میں اس قدر جوش پیدا ہوا کہ حضرت عمیر نے پکار کر کہا۔ ''میرے اور جنت کے درمیان چند قدم کا فاصلہ ہے'' یہ کہہ کر وہ صف سے باہر ہوئے اور مکہ کے سربازوں کی طرف

بڑھے، ان لوگوں نے انہیں گھیر کر شہید کر دیا۔

حضرت محمد (ﷺ) نے بلند آوازِ سے فرمایا، میری باتوں کو فراموش نہ کرو اور بہشت میں جانے کے لئے صفوں سے باہر نہ جاؤ ورنہ بت پرست تم پر غالب آ جائیں گے" قریشی حسب دستور تنہا تنہا لڑ رہے تھے کیونکہ ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ میں فاتح کہلاؤں لہٰذا وہ اپنے رفقائے کار کی طرف ملتفت نہ ہوتا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ مگر حضرت محمد ایک دن رات پہلے مسلمانوں سے فرما چکے تھے کہ تم لوگ اپنی ذات کے لئے تلوار نہیں چلا رہے ہو کہ خواہانِ فخر و افتخار ہو، تم تو خدا کے لئے شمشیر زنی کر رہے ہو تمہیں خودنمائی کی کیا ضرورت، اگر تم نے اپنا فریضہ جنگ ادا کر دیا تو جنت میں جاؤ گے۔

یہی وجہ تھی کہ بہشت میں جلدی سے پہنچنے کی تمنا میں مسلمان اپنی صف سے باہر نہ ہوئے ہم یہ بتا چکے ہیں کہ مسلمانوں کی بشکل مثلث تین صفیں تھیں تینوں ایک دوسرے کی پشتی بان تھیں اور مسلمان اس طرح صف بستہ کھڑے تھے کہ کفار مکہ کسی طرف سے بھی ان کے عقب سے حملہ آور نہ ہو سکتے تھے۔ ہر صف ایک مخصوص نشان کی حامل تھی تاکہ بوقت جنگ مسلمان اپنے دوستوں، دشمنوں میں امتیاز کر سکیں اور انہیں کسی قسم کا اشتباہ نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ ایک صف کا سرپوش زرد تھا، دوسری کا سبز اور تیسری صف کے جانباز، سروں کے اور "پر" لگائے ہوئے تھے۔ حضرت حمزہ ؓ کے سر پر شتر مرغ کے چند "پر" تھے جو ہوا کے جھونکوں سے ہل رہے تھے۔ روایت ہے کہ جب پیغمبر اسلام نے دیکھا کہ قریشی بڑے زوروں پر ہیں تو آپ نے حضرت علی سے کہا، زمین سے ذرا سی خاک اٹھا کر مجھے دے دو" حضرت علی جھکے اور زمین سے ایک مشتِ خاک اٹھا کر دست مبارک میں دے دی، آپ نے وہ خاک قریشیوں کی طرف پھینکتے ہوئے فرمایا، "جاؤ اے بے شرمو"۔

اس کے بعد مسلمانوں نے اجتماعی طور پر ہلہ بولا، تینوں صفیں حرکت میں آئیں اس طرح کہ کوئی بھی اپنی صف سے خارج نہ ہوا۔ ان تینوں صفوں کی حرکت گویا تین قلعوں کی حرکت تھی لہٰذا قریشی حملہ کی تاب نہ لا کر پسپا ہو گئے۔ حضرت محمد کو معلوم تھا کہ ان کے سود خور چچا عباس قریشی سپاہ میں ہیں انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ انہیں زندہ گرفتار کر لاؤ۔

حضرت عباس اگرچہ بدر کے مقام تک سربازانِ قریش کے ساتھ آئے تھے مگر انہوں نے

تین وجوہات سے جنگ میں شرکت نہ کی اور سب سے پیچھے رہے۔

(1) وہ صراف اور سود خور تھے، جنگ کے کام کے نہ تھے۔

(2) وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ اپنے بھتیجے کے ساتھ جنگ کریں۔

(3) ان کی زوجہ مسلمانوں میں شمار کی جاتی تھیں انہوں نے بھی ان سے کہا تھا کہ مسلمانوں کے خلاف نہ لڑنا۔

غازیانِ اسلام میں سے صرف ایک شخص نے حضرت عباس کو دیکھا۔ وہ اپنی صف کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے اچھی طرح پہچان لیا کہ عباس یہی ہیں، یہ غازی پتلے دبلے تھے اور حضرت عباس بہت موٹے تھے مگر وہ انہیں اٹھا کر آپ کی خدمت میں لے آئے اور نہایت تیزی کے ساتھ اپنی صف سے جا ملے تاکہ جنگ جاری رکھ سکیں۔ سپاہ قریش کے سردار اور ابوجہل کے کئی محافظ ساتھ تھے، مسلمان اس کے محافظوں کو دھکیل کر اس تک جا پہنچے۔ ان فدائیان اسلام میں سے ایک نوعمر معاذ بن عمرو نے اس زور سے ابوجہل کے پاؤں پر تلوار کی ضرب لگائی کہ وہ بہت زیادہ مجروح ہو کر بیٹھ گیا، ابوجہل کے فرزند عکرمہ آگے بڑھے اور مدافعت کرتے ہوئے معاذ بن عمرو پر حملہ آور ہوئے، انہوں نے حضرت معاذ پر ایسا وار کیا کہ ان کی داہنی کہنی کٹ گئی اور ہاتھ کھال کے ساتھ لٹک گیا۔ حضرت معاذ کے چہرے پر اس بات کا معمولی سا اثر بھی ظاہر نہ ہوا، انہوں نے اپنے بائیں ہاتھ سے داہنے ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دیا اور فرمایا، ''راہ خدا میں'' پھر اسی ہاتھ کی جانب جھکے اور تلوار زمین سے اٹھا کر لڑائی میں مصروف ہو گئے، کچھ دیر نہ گزری تھی کہ اسی نوجوان کے بھائی حضرت معوذ ﷺ نے ابوجہل کا کام تمام کر دیا۔

ابوجہل کے قتل کے بعد قریش بد دل ہو گئے اور ان پر خوف طاری ہو گیا کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ باوجود عددی کثرت کے بھی وہ مسلمانوں کی صفوں کو نہیں چیر سکے۔ بڑی تیزی کے ساتھ وہ پیچھے ہٹنے لگے، چونکہ ان کا پیچھے ہٹنا، تجدید جنگ کے لئے نہ تھا لہٰذا ہمیں یہ کہنا چاہیئے کہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے، ستر (70) بت پرست قریشی مارے گئے جن کے لاشے وہ میدان جنگ میں پڑے چھوڑ گئے۔ ابوجہل کے علاوہ اور بھی کئی سرداران قریش مارے گئے جن میں ابوسفیان کے خسر اور سالے بھی تھے۔ جنگ بدر میں اگرچہ مسلمان بہ نسبت کافروں کے ایک تہائی تھے مگر ان کے چودہ افراد شہید ہوئے۔ اس جنگ میں چونکہ مسلمانوں کی فتح

ہوئی لہٰذا ان کی ہمتیں بڑھ گئیں۔ یہ چھوٹا سا لشکر اپنی قوت ایمان اور حضرت محمد کے ایجاد کردہ طرز جنگ کی وجہ سے کامیاب ہوا۔

خاتمہ جنگ پر غازیانِ اسلام میں سے ایک مجا ،، میدانِ کارزار میں گیا تا کہ ان لوگوں کو دیکھے جو مارے گئے تھے۔ یہ حضرت عتبہ بن ربیعہ تھے۔ وہ اس لیے کشتگان کو دیکھنے گئے تھے کہ چونکہ وہ خود مہاجر مکی تھے لہٰذا تمام اہل مکہ سے واقف تھے، وہ چاہتے تھے کہ انہیں پہچان سکیں۔ ناگہاں ان کی نظر ایک لاشہ پر پڑی وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئے اور جھک کے دیکھنے لگے، پھر کھڑے ہو گئے، ان کے چہرے سے آثار غم ظاہر تھے۔ کچھ دیر کے بعد رسول اللہ کا ادھر سے گزر ہوا، عتبہ پر نظر پڑی تو انہیں غمگین پایا، اور فرمایا۔ "عتبہ غم نہ کرو، آج تو اللہ نے مسلمانوں کو فتح دی ہے" حضرت عتبہ نے اپنے سامنے پڑے ہوئے لاشہ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور کہا "میں اس شخص کی وجہ سے غمگین ہوں کیونکہ یہ میرا باپ تھا" جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ عتبہ کا باپ ہے تو انہیں تسلی دی۔ عتبہ کہنے لگے۔ "یا رسول اللہ! میں اس لیے غمگین ہوں کہ مجھے یہ توقع تھی کوئی دن ایسا آئے گا کہ میرا باپ متنبہ ہو گا اور بت پرستی سے ہاتھ کھینچ لے گا، اب جو میں نے اس کی نعش کو دیکھا تو بڑا افسوس ہوا کہ بغیر دینِ اسلام قبول کئے وہ کیوں مر گیا"۔

غزوۂ بدر کی تفصیل کتاب ایام العرب میں درج کی گئی ہے، یہ لڑائی زمانہ ماضی کی طرح آج تک بھی تاریخ اسلام کی اہم جنگ ہے۔ اس جنگ میں مسلمان پہلی بار فاتح ہوئے، انہوں نے لذت فتح و نصرت کو چکھا اور اچھی طرح جان گئے کہ ایمان اور صحیح طرز جنگ کی بدولت ایک چھوٹا سا لشکر، بڑی فوج کو شکست دے سکتا ہے۔ اس روز مسلمانوں نے باقی دن اپنے شہیدوں کے دفن کرنے میں گزارا اور مشرکوں کے لاشوں کو چاہ بدر میں ڈال دیا۔

جنگِ بدر کے شروع ہونے سے قبل آپ (ﷺ) نے مسلمانوں سے کہہ دیا تھا کہ کسی مشرک لڑاکے کو مسخ (مثلہ) نہ کرنا، ان کے ہاتھ پاؤں یا جسم کے کسی حصہ کو بطور یادگار محفوظ نہ رکھنا کیونکہ جس طرح بحالت حیات زندوں کے ساتھ احسان کرنا چاہئے، مرنے کے بعد بھی مردوں کے ساتھ احسان کرنا چاہئے۔ جب مسلمانوں کے لاشوں کو قبر میں رکھنے لگے تو حضرت محمد (ﷺ) نے فرمایا، "قبروں کو ایک جیسا خوش نما بناؤ، اچھی طرح دیکھ لو کہ قبر کی ظاہری حالت درست ہے" ایک مسلمان نے سوال کیا، "یا حضرت (ﷺ) اگر قبر کی ظاہری حالت درست نہ ہو تو دنیا اس سے

مردوں کی تکلیف پہنچے گی؟ فرمایا، مردوں کو نہیں، زندوں کو تکلیف پہنچے گی کیونکہ ایک بدصورت قبر کا دیکھنا غم انگیز ہوتا ہے"۔

پہلی بار کے جنگی قیدی...... مستحق رعایت

مسلمان شہیدوں کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر آپ نے اسیرانِ جنگ کے بارے میں گفتگو فرمائی۔ غزوۂ بدر میں قریشی فوج کے ستر آدمی گرفتار ہوئے تھے۔ جزیرہ عرب میں یہ دستور تھا کہ قیدی اس شخص کے حوالے کر دیا جاتا تھا جو اسے گرفتار کرتا تھا۔ وہ فوجی اگر چاہتا تو اسے قتل کر دیتا یا غلام بنا کر فروخت کر دیتا اور اگر اس کا جی چاہتا تو اپنا غلام بنا لیتا۔ اگر کسی قیدی کو قتل کرنا چاہتے تو پہلے اس کے دونوں ہاتھ پیٹھ سے باندھ کر بٹھا دیتے، رسی کی پچھلی جانب ایک تیر اس طرح باندھ دیتے کہ قیدی بھاگ نہ سکتا۔ بعد ازاں تلوار ہاتھ میں لے کر پیچھے سے اس زور سے گردن پر وار کرتے کہ سر علیحدہ ہو جاتا اور خون کا فوارہ پھوٹ پڑتا۔

شہیدوں کے دفن سے فارغ ہونے کے بعد آپ (ﷺ) نے مسلمانوں سے دریافت فرمایا، "اسیروں کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟" حضرت عمر بن الخطاب بولے، "سب کو تہ تیغ کر دینا چاہیے" حضرت ابوبکر نے عرض کیا، "قیدیوں کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنے عزیز اہل مکہ کے ساتھ رابطہ قائم کر سکیں اور ان سے فدیہ ادا کرنے کی درخواست کر سکیں۔"

رسول اکرم کو یہ تجویز پسند آئی۔ اس دن اور اس کے بعد اسیران جنگ کے لیے پیغمبر اسلام نے ایک آئین مرتب کیا جس کے بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ یہ پہلا آئین تھا جو اس عالم میں اسیرانِ جنگ کے لئے وضع کیا گیا۔ آپؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔ اس سے قبل ہر شخص کو اختیار ہوتا تھا کہ وہ اپنے قیدی کو جی چاہے قتل کر دے اور جی چاہے زندہ جلا ڈالے کیونکہ عربستان میں جنگی قیدی، گرفتار کرنے والے کی ملکیت (Sole Property) ہوتا تھا ہاں اگر اس کے عزیز و اقارب یہ چاہتے کہ اس کا فدیہ ادا کر دیں تو وہ ایسا کر سکتے تھے۔ اس طرح قیدی آزاد ہو جاتا تھا، ورنہ اسے غلام بنا کر فروخت بھی کیا جا سکتا تھا اور قتل بھی۔

حضرت محمد (ﷺ) نے اس آئین جنگ میں یہ بھی لکھوایا تھا کہ جو فدیہ کسی اسیر جنگ سے

لیا جائے وہ اس کے عزیزوں کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہئے چونکہ قریشی لشکر کے سارے قیدی مال دار گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ان سے چار ہزار درہم فدیہ لیا جائے۔ اگر کوئی خاندان اتنی رقم ادا نہیں کر سکتا تو وہ اتنے ہی داموں کی تلواریں اور نیزے دے سکتا ہے۔ جو قیدی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں انہیں بصورتِ مال یا بصورت اسلحہ فدیہ دینے سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔ ان کا فدیہ یہ ہے کہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، اس کے بعد وہ آزاد ہیں۔ اس آئین میں اسیرانِ جنگ کے ساتھ حسن سلوک کی اس قدر تاکید کی گئی تھی کہ بعض غازیانِ اسلام نے اسیرانِ قریش کو اپنے کپڑے اور اپنا کھانا تک دے دیا خود بھوکے رہے اور قیدی کو پیٹ بھر کر کھلایا، مبادا قیدی ننگا بھوکا رہے اور اسے ناگوار گزرے۔

اہل مکہ کو جو یہ اطلاع ملی کہ ہم شکست کھا گئے ہیں تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہم اہلِ مدینہ کے ساتھ ایک اور جنگ کر کے اس شکست کا بدلہ لیں گے۔ حضرت محمد (ﷺ) کو شہید کرنے کا جن لوگوں نے پختہ ارادہ کیا تھا ان میں سے ایک ابوسفیان تھا کیونکہ اس کا باپ، خسر اور سالا اس لڑائی میں مارے گئے تھے اور دوسرا لڑکا مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہو گیا تھا، اس نے فیصلہ کر لیا کہ چار ہزار درہم دے کر اپنے بیٹے کو رہا کرا لے گا۔

ابوسفیان نے قسم کھائی کہ جب تک مسلمانوں سے اپنا انتقام نہ لے لوں گا بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا اور اس کی بیوی نے قسم کھائی کہ اگر باپ بیٹے اور بھائی کا قاتل اس کے ہاتھ لگ گیا تو اس کا جگر نکال کر کچا چباؤں گی اور اس بات کی بھی قسم کھائی کہ اگر ان کے قاتل چند افراد ہوں گے تو ان کی زبان، کان اور ناک کاٹ کر ایک ہار بنا کر پہنوں گی جس دن اسلام نیست و نابود ہو جائے گا اس ہار کو پہن کر مکہ کی گلی کوچوں میں رقص کروں گی۔

جن دنوں مکہ میں مسلمانوں کے خلاف آتش انتقام بھڑک رہی تھی مسلمانان مدینہ کی طرف سے اہلِ مکہ کو پیغام پہنچا کہ باشندگانِ مکہ اپنے اسیرانِ جنگ کو زرِ فدیہ دے کر آزاد کرا سکتے ہیں۔ ہر قیدی کا زرِ فدیہ چار ہزار درہم ہو گا لہٰذا ستر قیدیوں کے آزاد کرانے کے لئے انہیں دو لاکھ اسی ہزار درہم ادا کرنے چاہئیں۔

سردارانِ قریش نے اہل مکہ سے کہا۔ ”ہمیں زرِ فدیہ ادا کرنا نہیں چاہئے اس طرح اگر ہم اپنے قیدیوں کو آزاد کرائیں گے تو مسلمان جو کہ غریب ہیں بہت مال دار ہو جائیں گے، تین

لاکھ درہم کے قریب فدیہ ادا کرتا گویا اپنے ہاتھوں ان فقیروں کو مال دار کر دینا ہے'' مگر جن خاندانوں کے قیدی مسلمانوں کے ہاتھوں میں گرفتار تھے انہوں نے ابوسفیان اور جملہ سرداران قریش سے رحم کی درخواست کی کہ انہیں زر فدیہ ادا کرنے کی اجازت دی جائے تا کہ اپنے باپ، بیٹے، بھائی یا شوہر کو آزاد کرا سکیں۔ سرداران قریش نے زر فدیہ ادا کرنے کی اجازت دے دی، اسیران جنگ میں سے ایک ابوالعاص بھی تھے جو پیغمبر اسلام کی زوجہ اول حضرت خدیجہ کے بھتیجے اور دختر پیغمبر حضرت زینب کے شوہر تھے۔ حضرت زینب دختر پیغمبر کی یہ خواہش تھی کہ اپنے شوہر کو کسی طرح آزاد کرا لیں لہٰذا انہوں نے تین ہزار درہم کسی طرح فراہم کر لیے مگر ایک ہزار اور فراہم نہ کر سکیں تو ان کے بدلے دو جواہرات جو ایک ہزار درہم کے تھے، تین ہزار درہم کے ساتھ مدینہ بھیج دیئے اور اپنے شوہر کی آزادی کی درخواست کی۔ یہ درہم اور جواہرات حضرت محمد کے سامنے پیش کئے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان جواہرات میں سے ایک گوہر حضرت خدیجہؓ کے گلوبند کا ہے۔

حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوتو آپ نے وہ گلوبند حضرت زینبؓ کو دے دیا تھا۔ اس گلوبند کو دیکھ کر آپؐ بے ساختہ رونے لگے۔ جو اصحاب آپ کے اردگرد بیٹھے تھے وہ بہت متاثر ہوئے اور ان میں سے بعض اصحاب بغیر وجہ معلوم ہوئے صرف آپ کے رونے کی وجہ سے زار و قطار رونے لگے۔ حضرت عمر بن الخطاب جو ایک بہادر، بلند قامت، چوڑے شانوں والے بلند آواز اور غیرت و حمیت والے انسان تھے، عرض کرنے لگے، ''یا رسول اللہ! آپ کیوں رو رہے ہیں، آپ کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ کر ہمارے دل پارہ پارہ ہوئے جاتے ہیں''۔

آپ نے فرمایا: ''یہ گردن بند جو تم دیکھ رہے ہو میری زوجہ خدیجہ کا ہے، ان کی وفات کے بعد میں نے زینب کو دے دیا تھا۔ اس نے اپنے شوہر کو آزاد کرانے کے لئے یہ ہار ایک دوسرا گوہر اور تین ہزار درہم ہمارے لیے بھیجے ہیں وہ اور زینبؓ یاد آ گئیں۔ حضرت عمر بن الخطاب نے مسلمانوں سے کہا: ''میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ ابوالعاص شوہر زینبؓ کو بغیر فدیہ لیے چھوڑ دیا جائے اور یہ درہم، گوہر اور ہار ان کے سپرد کر کے مکہ کی طرف روانہ کر دیا جائے۔''

رسول اکرم نے فرمایا! ''اے عمر! میرے اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے کہ میرا داماد بغیر فدیہ کے رہا کر دیا جائے مگر یہ کہ ابوالعاص یہ عہد کرے کہ مکہ جا کر

میری دختر کو طلاق دے دے گا اور اسے مدینہ کی طرف بھیج دے گا تا کہ وہ داخلِ اسلام ہو جائے" مسلمانوں نے اس تجویز کو پسند کیا انہوں نے کہا کہ یہ کتنی بری بات ہے کہ نبی کی دختر، مشرک کی زوجہ رہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ابوالعاص نے آزاد ہو کر حضرت زینبؓ کو مکہ سے روانہ کر دیا۔ جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں بیان کریں گے حضرت زینبؓ کو رہا کرنے میں ایک ناگوار واقعہ پیش آ گیا۔ اسیران جنگ میں حضرت عباس بھی تھے جن کے متعلق ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ایک کوتاہ قد دبلا پتلا غازی، انہیں اٹھا کر رسول اللہ کی خدمت میں لے آیا تھا حالانکہ وہ بڑے قد آور اور موٹے تازے تھے۔ چونکہ حضرت محمد بڑے رحم دل تھے لہٰذا اپنے عزیزوں سے بڑی محبت کرتے تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ عباس گرفتار ہو چکے ہیں مگر کچھ نہ کر سکتے تھے یعنی آپ کے اصول اجازت نہ دیتے تھے کہ ان کی کوئی مدد کر سکیں۔

جب اسیروں سے نمٹنے کا موقع آیا تو حضرت عباس نے عرض کی، "یا رسول اللہ میں ایک خفیہ مسلمان ہوں آپ کو چاہئے کہ مجھے آزاد کر دیں" آنحضرت نے فرمایا، "اسلام پوشیدہ مذہب نہیں ہے کہ کوئی شخص مخفی طور پر مسلمان ہو جائے، دوسرے یہ کہ آپ کو میدان جنگ میں اسلحہ بدست دیکھا گیا، آپ کا مشرکوں کی صف میں ہونا (اگرچہ آخری صف میں تھے) اور اسلحہ بدست ہونا، اس امر کی دلیل ہے کہ آپ مسلمانوں اور خدا کے خلاف نبرد آزما تھے۔ اب چونکہ گرفتار ہو چکے ہو لہٰذا فدیہ دینا ہوگا۔"

ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت عباس صراف اور سود خور تھے، لہٰذا کاروباری ذہنیت کے تحت انہوں نے بڑی کوشش کی کہ زرفدیہ کم ہو جائے مگر جب دیکھا کہ رسول اللہ کسی طرح ایک حبہ بھی کم کرنے پر راضی نہیں ہوتے تو کہنے لگے: "میں ایک بے بضاعت انسان ہوں، زرفدیہ ادا نہیں کر سکتا، اگرچہ اس سے پیشتر میں ایک مال دار آدمی تھا مگر مجھے بڑا نقصان ہوا اور میرا سرمایہ تباہ ہو گیا ہے۔ چونکہ آپ نے فرمایا ہے کہ بے سرمایہ لوگ نیزے اور تلوار دے کر رہائی لے سکتے ہیں لہٰذا بصورت جنس فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کر سکتا ہوں۔" پیغمبر اسلام نے فرمایا، "ہم اس کی تحقیق کریں گے، اگر پتہ چلا کہ تہی دست ہو تو جنسِ فدیہ لے کر آزاد کر دیں گے۔"

حضرت عباس کو جو یہ معلوم ہوا کہ ان کے سرمایہ کے بارے میں تحقیقات کی جائے گی کہ آیا وہ زرفدیہ دے سکتے ہیں یا نہیں تو چار ہزار درہم دے کر آزاد ہو گئے۔ فدیہ ادا کرنے سے

پہلے حضرت عباس کے پاس کپڑے نہ تھے، ایک نوجوان مسلمان ابن ابی کو ان کی حالت پر رحم آ گیا وہ کپڑے لائے اور انہیں پہنا دیئے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ بہت خوش ہوئے اور اس نوجوان کے بارے میں دعائے خیر کی۔

اس واقعہ کے دس سال بعد اس نوجوان کا باپ ابی جو کہ باشندگان مکہ سے تھا اور پیغمبر اسلام کا دشمن تھا، انتقال کر گیا۔ اس کے پاس کفن نہ تھا کہ باپ کو پہنا سکتا، پیغمبر اسلام نے اپنا پیراہن اس نوجوان کو عطا کیا تا کہ وہ ابی کو پہنا کر دفن کر دے کیونکہ اس نے جنگِ بدر کے بعد آپ کے چچا عباس کو جامہ دیا تھا۔ اس پیراہن مبارک میں ابی کو دفن کیا گیا۔ مقصود اس واقعہ کے بیان سے یہ ہے کہ اگرچہ حضرت محمد اجرائے احکام خداوندی میں سخت تھے مگر صلۂ رحمی سے نہ چوکتے تھے اور عزیزوں کو دوست رکھتے تھے۔ غزوہ بدر کی وجہ سے اسلام کے لئے ترقی کے دروازے کھل گئے۔ اس کے بعد مسلمان اس قدر طاقت پکڑ گئے کہ وہ کسی بھی جنگ میں دس ہزار گھوڑوں سے شرکت کر سکتے تھے جب کہ غزوہ بدر میں صرف دو گھوڑے ان کے پاس تھے۔ اس کے باوجود مسلمانوں میں جس قدر جنگ بدر کا شہرہ ہے دوسری لڑائیوں کا نہیں ہے۔

پیچھے ہم کسی بیان میں ذکر کر چکے ہیں کہ جب حضرت محمد نے اپنی رسالت کا اعلان کیا تو ابولہب نے اپنے بیٹے کو مجبور کیا کہ وہ دختر پیغمبر حضرت رقیہؓ کو طلاق دے دے۔ حضرت رقیہؓ کا آپ سے بڑا ہی گہرا رابطہ قلبی تھا۔ جب کفار نے اونٹ کی اوجھڑی میں آپ (ﷺ) کا گلا گھونٹنا چاہا تو وہ خانہ کعبہ کی طرف دوڑیں اور وہاں جا کر اپنے پدر بزرگوار کو نجات دی۔ ابولہب کے بیٹے نے حضرت رقیہؓ کو طلاق دے دی تو انہوں نے چند ماہ صبر کیا بعد ازاں حضرت عثمان ؓ سے ان کی شادی ہو گئی۔ حضرت عثمان ایک مال دار جوان تھے شادی کے بعد حضرت رقیہؓ کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔

مؤرخین اسلام لکھتے ہیں جن میں سے اسلام کا معتبر ترین مؤرخ طبری بھی ہے کہ حضرت رقیہؓ جزیرۃ العرب کی حسین ترین خاتون تھیں انہوں نے اپنے شوہر حضرت عثمان کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی تو ان کے حسن و جمال کا چرچا تمام حبشہ میں پھیل گیا، یہ دونوں حبشہ سے واپس آئے تو تمام مسلمانوں کی طرح مدینہ میں رہنے لگے حتیٰ کہ جنگ بدر کا وقت قریب آ گیا۔

ان دونوں حضرت رقیہؓ بیمار تھیں چونکہ مسلمان اور پیغمبر اسلام جہاد کے لئے مدینہ سے باہر جا رہے تھے لہٰذا رسول اکرم نے حضرت عثمان کو اہل مدینہ کی حفاظت اور حضرت رقیہؓ کی تیمار داری کے لئے مدینہ ہی میں چھوڑ دیا۔ جنگ بدر کے اختتام پر مسلمان لوٹے تو حضرت رقیہؓ کی حالت غیر ہو چکی تھی، لہٰذا وہ رحلت کر گئیں۔ حضرت محمد کو بیٹی کے انتقال کا بڑا صدمہ ہوا کیونکہ آپ کو اپنے گھر والوں سے بڑی محبت تھی اور ان کی موت کا صدمہ دیکھنا نہ چاہتے تھے۔ ابھی حضرت رقیہؓ کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ آپ پر ایک اور مصیبت نازل ہو گئی۔ حضرت زینبؓ آپ کی دختر ناکتخدا اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اور آپ کا سب سے پہلا نواسہ بھی جاں بحق ہو گیا اور واقعہ کی تفصیل یوں ہے:

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ابوالعاص، شوہر زینبؓ اسیران بدر سے تھے۔ وہ اس شرط پر آزاد ہوئے کہ مکہ جا کر حضرت زینبؓ کو طلاق دے کر مدینہ بھیج دیں۔ جب آپ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو آپ ﷺ کی تمام بیٹیاں آپ کے ساتھ تھیں، سوائے دختر دوم زینب کے کہ وہ اپنے شوہر ہی کے پاس رہ گئیں۔ ابوالعاص جنگ بدر میں شریک ہوئے اور قید ہوئے، آزاد ہونے کے بعد مکہ پہنچے اور اپنا وعدہ وفا کیا۔ حضرت زینبؓ کو صحیح سلامت مدینہ کی طرف روانہ کر دیا اور ان کی حفاظت کے لئے اپنے چھوٹے بھائی کنہ کو ساتھ کر دیا تا کہ انہیں آرام سے پہنچا دے۔ قریشیوں کو پتہ چلا کہ حضرت زینبؓ مکہ سے روانہ ہو کر حضرت محمد کے پاس جا رہی ہیں، جونہی یہ قافلہ مکہ سے نکلا چند قریشی ہبر کی قیادت میں پیچھے پیچھے گئے تا کہ کارواں پر حملہ کر دیں اور زینبؓ مدینہ نہ پہنچ سکیں۔ کنہ اور دوسرے لوگ جو قافلہ کے ساتھ تھے، انہوں نے مدافعت کی اور حضرت زینبؓ کو واپس لے کر جانے نہ دیا مگر حضرت زینبؓ چونکہ حاملہ تھیں اس وجہ سے جھگڑے میں اونٹ سے گر پڑیں اور حمل ساقط ہو گیا، یہ بچہ (لڑکا) قبل از وقت پیدا ہو گیا تھا لہٰذا بچ نہ سکا اور وفات پا گیا۔ یہ آپ کا سب سے پہلا نواسہ تھا۔ حضرت محمد کو معلوم ہوا کہ ہبر نے حضرت زینبؓ کے قافلے پر حملہ کیا اور اس سبب سے زینبؓ کو اسقاط ہو گیا، تو حکم دیا کہ ہبر کو گرفتار کر کے حاضر خدمت کیا جائے، جن دنوں ہبر کو گرفتار کر کے لایا گیا حضرت زینبؓ اسقاط کی تکلیف کی وجہ سے انتقال کر چکی تھیں۔ اس طرح نبی کی دو بیٹیاں آپ کو داغ مفارقت دے

گئیں۔ ہبر کو مدینہ لایا گیا تو ایک مسلمان نے کہا اسے زندہ جلا دیا جائے، آپ نے فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ جو آتش و انسان کا مالک ہے وہی کسی انسان کو نار جہنم میں جھونک سکتا ہے۔ میں ہرگز کسی انسان کے جلا ڈالنے کا حکم نہیں دے سکتا''۔ دوسرے مسلمانوں نے کہا ہبر کو قتل کر دیا جائے مگر رحم دلی کی بنا پر آپ اس کے قتل کا حکم صادر نہ فرما سکے۔

عورت کے حقوق، صدرِ اسلام میں

حضرت زینبؓ کے مدینہ میں وفات پانے سے پہلے ایک اور واقعہ رونما ہوا جس کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے تا کہ اس امر کا اندازہ لگایا جا سکے کہ صدر اسلام میں عورت کے کیا حقوق تھے۔ ابو العاص کو اپنی بیوی حضرت زینبؓ سے محبت تھی اور زینبؓ کو ان سے محبت تھی لہٰذا وہ چھپ کر مکہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت زینبؓ کو پتہ چلا کہ وہ مدینہ چلے آئے ہیں۔ تو فوراً مسجد میں تشریف لے گئیں۔ اپنے پدر بزرگوار اور مسلمانوں سے کہا، میں نے اپنے سابق شوہر ابو العاص کو حق جوار (پناہ) عطا کر دیا ہے، وہ میرے جوار میں ہے۔

ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ بدو عربوں میں حق جوار کا رواج تھا جو باہر سے آنے والے کو دیا جاتا تھا۔ جب کسی اجنبی کو یہ حق دے دیا جاتا تو وہ مامون و محفوظ ہو جاتا، خصوصاً عورت جس کسی کو حق جوار دیتی اس کا بہت زیادہ لحاظ کیا جاتا تھا۔ یعنی جزیرہ عرب میں عورت کا اس قدر احترام کیا جاتا تھا کہ اگر کوئی اجنبی کسی عورت کے خیمے میں چلا جاتا اور صرف اس کے خیمے کی رسی پکڑ کر پناہ مانگ لیتا تو اسے حق جوار مل جاتا تھا۔ اگر کوئی اجنبی، خواہ وہ مفرور مجرم ہی کیوں نہ ہوتا، کسی عورت کے خیمے میں جا پہنچتا اور وہ عورت اس پر اپنی اوڑھنی ڈال دیتی تو وہ حق جوار والا ہو جاتا تھا اور اس کے بعد وہ اس عورت کا جار (پڑوسی) بن جاتا تھا، پھر کوئی بھی مرد اسے گرفتار نہ کر سکتا۔ جب مسلمانوں نے دیکھا کہ زینب حق جوار عطا کر رہی ہیں تو وہ رسول اکرم (ﷺ) کی طرف دیکھنے لگے کہ دیکھیں وہ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، ''ہاں اپنے سابق شوہر کو زینبؓ حق جوار دے سکتی ہے۔ میری بیٹی اس کی معاش میں مدد دے سکتی ہے مگر اس کے ساتھ ایک گھر میں نہیں رہ سکتی، کیونکہ ایک مسلمان عورت ایک مشرک مرد کے ساتھ ایک گھر میں زندگی نہیں گزار سکتی''۔ بعد ازاں ابو العاص مسلمان ہو گئے اور پھر حضرت زینبؓ کے شوہر بن گئے۔ اس عقد کے

بعد حضرت زینب زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکیں اور پیغمبر اسلام کو یہ دوسرے صدمے کا داغ لگا۔

جنگ بدر کا مکہ پر اثر

پیغمبر اسلام (ﷺ) نے اہل مدینہ کے لئے جو قانون اساسی تدوین کیا تھا اس قانون کی ایک دفعہ یہ تھی کہ یہودی و اہل مکہ کے ساتھ مل کر اسلام کے خلاف جنگ نہیں کر سکتے۔ مگر یہودیوں نے اس قانون کے خلاف عمل کیا۔ چند ایک یہودی شاعر، مدینہ سے مکہ گئے تا کہ قریشیوں اور مکہ والوں کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کر سکیں۔ یہودیوں کا ایک معروف ترین شاعر کعب بن الاشرف بھی تھا، یہ بھی مکہ گیا۔ جس زمانے میں یہ لوگ مکہ گئے اہل مکہ حضرت محمد اور مسلمانوں کے خلاف سخت نفرت وغصہ کے جذ بات رکھتے تھے۔ چنانچہ قریشیوں نے مکہ میں یہ طریقہ رائج کیا تھا "قتل کئے جانے والوں کے لئے رونا نہ چاہئے بلکہ انتقام لینے کا اعلان کرنا چاہیے۔" مقتولوں سے مراد جنگ بدر کے مقتول تھے انہوں نے شہر میں منادی کرادی کہ اگر کسی شخص کو کشتگان بدر پر روتے ہوئے پایا گیا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اسے شہر بدر کر دیا جائے گا، جزیرہ عرب میں شہر بدر (طرد) کیا جانا، موت کے مترادف تھا بلکہ موت سے بھی سخت تھا یہی وجہ تھی کہ جن عورتوں کے بیٹے جنگ بدر میں مارے گئے وہ انہیں رو نہ سکتی تھیں۔ ایک رات ایک غمزدہ ماں نے کسی عورت کے رونے کی آواز سنی۔ اس پر اسے بڑی حیرت ہوئی گھر سے باہر نکلی اور آواز کے رخ پر چلتے چلتے اس عورت کے گھر جا پہنچی، اندر گئی تو دیکھا کہ ایک بوڑھی رو رہی ہے۔ کہنے لگی۔ "اماں کیا نہ رونے کا حکم منسوخ ہو چکا ہے جو تو رو رہی ہے؟" بوڑھی نے پوچھا۔ "تو یہ کیوں پوچھ رہی ہے؟" وہ بولی۔ "میرا بیٹا جنگ بدر میں مارا گیا ہے میرا دل بھرا ہوا ہے چاہتی ہوں کہ اسے روؤں مگر ڈرتی ہوں کہ اگر روئی اور کسی نے میرا نالہ وشیون سن لیا تو نکال دی جاؤں گی۔ میں نے تیرے رونے کی آواز سنی تو ادھر چلی آئی تا کہ دریافت کروں۔ کیا نہ رونے کا حکم منسوخ ہو چکا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہم دونوں مل کر خوب روئیں" غم کی ماری بوڑھی، جرأت نہ کر سکی کہ یہ کہے اسے بیٹے کو رو رہی ہوں جو جنگ بدر میں مارا گیا ہے۔ کہنے لگی، "میں اپنے بیٹے کو نہیں رو رہی ہوں میرے پاس ایک ہی اونٹ تھا وہ کھو گیا ہے میں اسے یاد کر کے رو رہی ہوں، یہ آنسو جو میں بہا رہی ہوں اونٹ کے گم ہو جانے پر ہیں بیٹے کی موت پر نہیں ہیں"۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اہل مکہ قریشیوں سے اس قدر خائف تھے کہ داغ پسر رکھنے والی مائیں، اونٹ کا بہانہ کر کے اپنے بیٹوں کو روک سکتی تھیں۔ غزوہ بدر میں ابو جہل کے مارے جانے کے بعد شہر مکہ میں ایک سہ رکنی کمیٹی سرداران مکہ کی قائم ہوئی۔ ان میں سے ایک ابولہب، دوسرا ابوسفیان اور تیسرا صفوان بن امیہ تھا۔ ان تینوں نے یہ عہد کیا کہ جب تک حضرت محمد اور اسلام کو برباد نہیں کر دیں گے چین سے نہ بیٹھیں گے۔

ابولہب جنگ بدر میں شریک نہ ہوا تھا حالانکہ حسب دستور عرب اسے جنگ میں شریک ہونا چاہئے تھا کیونکہ جنگ بدر کے زمانے میں وہ بستر علالت پر پڑا تھا لہٰذا اس نے اپنی طرف سے ایک شخص عاص بن ہشام کو اجرت پر دے کر جنگ کے لئے بھیج دیا اور اسے عوض چار ہزار درہم دیئے۔ جب مشرکین مکہ جنگ بدر میں شکست کھا گئے اور اسیران جنگ کا فدیہ دینے پر مجبور ہو گئے تو ابولہب آپ (ﷺ) کو شہید کرا دینے کے درپے ہو گیا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک شخص کو اجرت دے کر مدینہ کی طرف روانہ کر دیا مدینہ میں آپ کو شہید کر دینا بہت آسان تھا کیونکہ وہاں کوئی نگہبان یا محافظ نہ تھا، نہ کبھی آپ کا دروازہ بند ہوتا تھا۔ ہر شخص آپ کے گھر جا سکتا تھا جب بھی کوئی شخص آپ کے گھر جاتا تو دیکھتا کہ یا تو اپنا یا گھر والوں کا جوتا ٹانک رہے ہیں یا کپڑوں میں پیوند لگا رہے ہیں یا یہ کہ گھریلو کاموں میں گھر والوں کی مدد کر رہے ہیں۔

پیغمبر اسلام کے پاس صرف ایک خادم تھا مگر وہ، محافظ یا نگہبان نہیں تھا بلکہ اس کے سپرد دو کام تھے ایک یہ کہ جب کوئی شخص یا وفد مدینہ کے باہر سے آپ کی خدمت میں آتا تو وہ انہیں آپ کی خدمت میں لے آتا کیونکہ اکثر ایسا ہوتا کہ اطراف و جوانب سے وفود آپ کی خدمت میں آتے تاکہ آپ سے ملاقات کریں اور مذاکرہ کریں۔ دوسرے یہ کہ جب کبھی آپ مسجد میں تشریف لے جائیں تو وہ جوتوں کی حفاظت کرتا مگر یہ نگہداشت اس لیے نہ تھی کہ کہیں کوئی چور نعل مبارک کو چرا کر نہ لے جائے کیونکہ مسلمانوں میں ایک فرد بھی چور نہ تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ جب بھی مسلمان عبادت سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر جانا چاہتے تو اپنے جوتے گڈمڈ پاتے کیونکہ ایک بدحواس مسلمان آتا اور جوتوں کو گڑبڑ کر دیتا لہٰذا آپ کو اپنے جوتے تلاش کرنے میں بڑی دشواری ہوتی تھی مگر جب خادم نعلین مبارک کی نگہبانی کرتا تو ایسا نہ ہو سکتا تھا۔ آپ آسانی سے اپنے جوتے پہن کر تشریف لے جاتے۔ چونکہ مدینہ میں رسول خدا کی زندگی بے حد سادہ تھی

ان میں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہ تھا لہٰذا کوئی بھی بد بخت ان کو شہید کر سکتا تھا۔ دن یا رات کی کسی بھی گھڑی یا دہ اطمینان سے ایسا کر سکتا تھا۔

اس کام کے لئے ابولہب کو عمیر بن وہب مل گیا جس کا بیٹا غزوہ بدر میں قید ہو چکا تھا۔ عمیر نے یہ ظاہر کیا کہ میں مدینہ اس لیے جا رہا ہوں تا کہ اپنے بیٹے کا زر فدیہ ادا کر کے اسے چھڑا لاؤں۔ ابولہب، ابوسفیان اور صفوان بن امیہ کو اس بات کا علم تھا کہ وہ حضرت محمد کو شہید کرنے کے لئے مدینہ جا رہا تھا۔ ابولہب نے سفر خرچ برداشت کیا اور وعدہ کیا کہ جب تک وہ مدینہ سے نہیں لوٹے گا اس کی بیوی بچوں کا خرچ برداشت کرتا رہے گا۔

عمیر، مدینہ پہنچا اور آپ کا سراغ لگایا، لوگوں نے کہا اس وقت اپنے گھر ہوں گے۔ عمیر وہاں پہنچا تو دیکھا کہ آپ اپنی ردائے مبارک دھو رہے ہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا۔ ''کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟'' عمیر نے کہا، ''اے محمد میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ چادر دھو رہے ہیں جو شخص نبوت کا دعویدار ہو، اس کے یہ شایان شان نہیں ہے'' یہ کام تو کسی غلام یا کنیز کے سپرد کرنا چاہئے'' آپ نے فرمایا، ''میرے پاس کوئی غلام یا کنیز نہیں ہے اپنے کام خود ہی کر لیتا ہوں یقین کر کہ اگر کوئی پیغمبر اپنی چادر خود دھونے لگے تو اس سے اس کی پیغمبری میں کوئی فرق نہیں پڑتا''۔

اس کے بعد رسول خدا نے گفتگو کا رخ بدل دیا، فرمایا۔ ''مجھے پتہ ہے کہ تو یہاں ایک کام انجام دینے آیا ہے'' اس نے کہا، ''کیوں نہیں اے محمد میں اس لیے آیا ہوں کہ یہ دریافت کروں میرے بیٹے کا فدیہ کس قدر ہوگا جس سے وہ رہائی پا سکے؟'' روایت ہے کہ یہ سنتے ہی حضرت محمد نے ارشاد فرمایا، ''اے مرد! تو جھوٹا ہے تو اس لیے نہیں آیا کہ اپنے بیٹے کو چھڑائے بلکہ اس لیے آیا ہے کہ مجھے قتل کر دے''۔

عمیر نے جو یہ بات سنی (جیسا کہ روایت میں آیا ہے) تو خنجر نکال کر پھینک دیا اور کہا اے محمد میرے اور تین باشندگان مکہ کے علاوہ جنہوں نے مجھے اس کام پر لگایا ہے، کسی کو بھی اس بات کی خبر تک نہ تھی کہ میں آپ کو قتل کرنے جا رہا ہوں مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ان تین میں سے کسی ایک نے بھی یہ بات کسی سے نہیں کہی لہٰذا اس بات کا علم ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ آپ نبی برحق ہیں۔ میں اس دم آپ کے دین کو قبول کرتا ہوں'' روایت ہے کہ جب عمیر مسلمان ہو گئے تو کہنے لگے، میں نے اب تک اپنی پوری طاقت اسلام کے خلاف صرف کی ہے مگر آج کے بعد میں

اپنی ساری قوت اسلام کے لئے خرچ کروں گا۔ حضرت عمیر مکہ واپس گئے وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابولہب مر چکا ہے۔ ابولہب کی موت اس طرح واقع ہوئی۔

مکہ میں ایک مقام کا نام مربد تھا، جہاں کارواں ٹھہرا کرتے تھے، قافلے والے یہاں اپنے عزیزوں دوستوں سے ملاقات کیا کرتے اور اس میدان میں مسافر لوگ اپنے چشم دید واقعات بیان کیا کرتے تھے۔ ایک دن ابولہب جب اس مقام سے گزرا تو دیکھا کہ ایک بدو لوگوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں مصروف ہے، لوگ اس کے ارد گرد جمع ہیں اور بڑے شوق سے باتیں سن رہے ہیں۔ ابولہب آگے بڑھا تھا کہ سنے کیا باتیں کر رہا ہے، دیکھا کہ جنگ بدر کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا ''مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس جنگ میں پانچ ہزار فرشتے آسمان سے ہماری مدد کے لئے اترے، وہ لڑے اور انہوں نے قریشیوں کو شکست دے دی'' اس کے بعد وہ بدو کہنے لگا، شاید اس خیال سے کہ لوگوں پر اثر جمائے۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے فرشتوں کی ایک جماعت کو دیکھا ہے کہ آسمان سے اتر رہے ہیں اور ایک جیسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، ان کے چہرے عجیب عجیب قسم کے انوار سے چمک رہے تھے''۔

سننے والے بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ متاثر ہو چکے ہیں۔ ابولہب نے جو یہ رنگ محفل دیکھا تو اسے غصہ آ گیا، کہنے لگا۔ ''تو جھوٹا ہے جنگ بدر میں ایک بھی فرشتہ مسلمانوں میں مدد کے لئے آسمان سے اتر کر نہیں آیا'' وہ شخص بولا۔ ''میں نے تو یہاں تیرے آتے ہوئے بھی چند فرشتوں کو آسمان سے اترتے ہوئے دیکھا ہے'' ابولہب نے پھر اس کی تکذیب کی اور اسے دروغ گو اور بے ہودہ گو کہا۔ سننے والوں میں سے کچھ لوگوں نے اس شخص کی باتوں کی تصدیق کی اور بولے ''اگر جنگ بدر میں آسمان سے فرشتے نہیں اترے تھے تو پھر تین سو تیرہ آدمیوں سے قریش کیسے شکست کھا گئے؟'' کچھ لوگوں نے ابولہب کی حمایت کی اور دونوں میں لڑائی چھڑ گئی، اس جھگڑے میں ابولہب سخت زخمی ہوا، لوگ اسے اس کے گھر اٹھا کر لئے گئے اور لے جا کر سلا دیا۔ سات دن بستر مرگ پر پڑے رہنے کے بعد وہ مر گیا۔

مورخ عرب عیسیٰ لکھتا ہے۔ ''ابولہب علیل ہو جانے کے بعد طاعون میں مبتلا ہو گیا اور اسی مرض میں مر گیا، لوگوں نے چھوت کے ڈر سے اس کی لاش کو شہر سے دور لے جا کر دفن کر دیا''

اس دن کے بعد سے جو بھی مسلمان اس کی قبر سے گزرتا ہے قبر کی طرف پتھر پھینکتا ہے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ وہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ ابولہب کے بعد مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ابوسفیان بنا، اس کی بیوی ہندہ اپنے شوہر سے بھی زیادہ رسول اکرم کی دشمن تھی۔

حملے میں ناکامی

جنگِ بدر کے دس ہفتے کے بعد اشراف مکہ کی طرف سے ایک فوج مسلمانوں کے خلاف زیر سیادت ابوسفیان مدینہ کی طرف روانہ کی گئی۔ ابوسفیان رسول اللہ کا برادر رضاعی تھا کیونکہ دونوں نے ایک ہی دایہ کا دودھ پیا تھا۔ ابوسفیان کا اصلی پیشہ تجارت تھا۔ وہ شعر بھی کہا کرتا تھا اس کے ہجو یہ اشعار حضور کے بارے میں مشہور تھے۔ ابوسفیان چار سو جنگجو لے کر ماہ حرام میں مکہ سے روانہ ہوا۔ (یعنی ایسے مہینے میں جس میں جنگ ممنوع ہوتی ہے) اور مدینہ کی راہ لی۔

قریشیوں اور یہودیوں کے درمیان یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ جب کبھی اہل قریش حضرت محمد اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں گے تو یہودی قریش کی مدد کریں گے۔ ابوسفیان کو اطمینان تھا کہ یہودی اس کے ساتھ ہیں لہٰذا وہ مدینہ پہنچا تو سلام بن میشان کے ہاں ٹھہرا۔ یہ یہودیوں کا سردار تھا۔ سلام بن میشان نے اس کا شاندار استقبال کیا اور بہترین کھانا دانا تیار کرایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ابوسفیان نے کہا۔ ''ہم تمہارے عہد کے بھروسے مدینہ آئے ہیں تاکہ آج رات تمہاری کمک سے حضرت محمد اور مسلمانوں پر حملہ کریں۔''

سلام بولا، ''ہم اپنے عہد پر قائم ہیں، ہم وعدہ پورا کرنے کے لئے تیار ہیں، مسلمانوں کے خلاف تمہارے دوش بدوش لڑیں گے مگر اس بات کا تو ہمیں سان وگمان بھی نہ تھا کہ تم لوگ اتنی جلدی چلے آؤ گے اور جنگ کے لئے آمادہ ہو جاؤ گے ہم اس وقت تو جنگ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، آج رات تو ہم کسی صورت بھی شرکت نہیں کر سکتے نہ کل رات، نہ اگلی رات، البتہ کچھ مہلت مل گئی تو ہم اپنے آپ کو جنگ کے لئے تیار کر لیں گے''۔

ابوسفیان کا یہ ارادہ تھا کہ اسی رات مسلمانوں پہ حملہ کر دے مگر اس کا منصوبہ ناکام ہو گیا تو وہ بہت ہی پریشان ہوا، مدینہ سے لوٹتے ہوئے مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا گیا، دو مسلمانوں کو شہید کر گیا، اور جو کے ستو کے بورے اٹھا کر لے گیا۔ مسلمانوں کو پتہ چلا کہ ابوسفیان مدینہ آیا

تھا آگ لگا کر قتل کر کے اور مال لوٹ کر بھاگ گیا ہے تو انہوں نے اس کا پیچھا کیا۔ ابوسفیان اور اس کے سپاہیوں نے تیز تر چلنے کی خاطر جو کے ستو کی بوریاں اونٹوں اور گھوڑوں کی پشتوں سے اتار کر راہ میں بکھیر دیں اس لیے اس کو غزوۃ السویق کہتے ہیں۔

اہل مکہ کی سرزنش کے لیے پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جو کوئی قافلہ اہل مکہ کا سرزمین مدینہ میں سے گزرے اسے لوٹ لیا جائے۔ ایک دن مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ ایک مکی قافلہ ابوسفیان اور صفوان بن امیہ کی زیر قیادت خیبر سے لوٹ رہا ہے ان لوگوں کے پاس نقرئی ظروف ہیں۔ ایک سو مسلمان مجاہد حضرت زید بن حارث کی زیر سیادت مدینہ سے روانہ ہوئے۔ چشمہ القرادہ کے کنارے جو منطقہ نجد کے کنارے تھا مکی قافلے کو جا لیا اور اس پر حملہ کر دیا ابو سفیان اور صفوان بن امیہ بھاگ کھڑے ہوئے اور کارواں کا تمام نقرئی سامان مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا۔ اس جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھوں ایک لاکھ درہم کے نقرئی ظروف و آلات ہاتھ آئے، یہ پہلا کارواں تھا جو با آسانی مسلمانوں کے ہتھے چڑھا اس طرح وہ اپنے اس نقصان کو پورا کر سکے جو غزوہ ذات السویق میں انہیں پہنچا تھا۔ جب اہل مکہ کو پتہ چلا کہ مسلمانوں نے ان کے کارواں کے مال پر قبضہ کر لیا ہے تو بت پرستوں کی آتش انتقام بھڑک اٹھی اور انہوں نے بڑی تیزی سے اپنے آپ کو جنگ کے لئے مستعد کر لیا۔

یہودیوں کا مکہ سے اخراج

جس زمانے میں اہل مکہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے مدینہ کے وہ لوگ جو اسلام کے دشمن تھے اشعار کے ذریعہ بالخصوص ہجو یہ ابیات سے مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھے۔ ہم اس تاریخی بحث کے بارے میں ذکر کر چکے ہیں کہ عربستان میں کلام کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور وہ اہل عرب کے دلوں پر بہت زیادہ اثر کرتا تھا۔ کلام منظوم کا تو ان کے دلوں پر بہت ہی اثر ہوتا تھا۔ سیاسی جنگ میں شعر کی تاثیر کے بارے میں اہل عرب کا یہ عقیدہ تھا کہ ہجو کا زخم شمشیر و نیزے کے زخم کی طرح قاتل ہوتا ہے۔ شعرائے مدینہ میں ایک شخص کعب بن الاشرف، حضرت محمد اور مسلمانوں کے بارے میں ہجو یہ اشعار بہت کہتا تھا، عام مجمعوں اور ان مرکزوں میں جہاں لوگ جمع ہوتے ایک خاص انداز میں سناتا

یا دوسروں کو دے دیتا تا کہ وہ سناتے پھریں۔ مدینہ کے مشہور شعرا میں سے رسول اکرم کی ہجو کرنے والوں میں ایک عورت اسماء بنت مروان بھی تھی وہ مدینہ کی حسین عورتوں میں شمار ہوتی تھی اور بڑی طباع تھی، رسول اللہ مسلمانوں، قرآن، جبریل اور اللہ پاک کی ہجو کے بارے میں بڑے پر تاثیر شعر کہتی تھی۔

پیغمبر اسلام بہت ہی متحمل مزاج تھے۔ مسلمان ان کی طرح صبر نہ کر سکتے تھے لہٰذا وہ شعراء کی ہجو سے بہت زیادہ تکلیف محسوس کرتے جب کہ وہ دیکھتے کہ مشرک شعراء رسول خدا کی توہین کرتے ہیں۔ مسلمان اپنے بارے میں بدگوئی کو سن سکتے تھے مگر خدا اور رسول (ﷺ) کی ہجو سننا ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ایک رات ایک نابینا مسلمان اسماء بنت مروان کے گھر گیا اور خنجر اس کے سینے میں آر پار کر دیا۔ اسماء وہیں مر گئی۔ جب اگلے دن مسلمانوں کو پتہ چلا کہ اسماء ایک نابینا کے ہاتھوں قتل ہو گئی ہے تو انہیں بڑا تعجب ہوا کیونکہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایک نابینا کس طرح اس کے گھر میں گیا اسے پایا اور خنجر اس کے سینے میں گھونپ دیا حتیٰ کہ لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ نابینا اسماء کا رشتہ دار ہے اس کے گھر آتا جاتا رہا ہے اور سالہا سال اس کے ساتھ رہا ہے لہٰذا وہ اس کے گھر کے گوشے گوشے سے آشنا تھا اور اس کی عادتوں سے واقف تھا کہ وہ کہاں سوتی ہے؟ اسماء کے قتل کی خبر مدینہ میں پھیل گئی کہ ایک نابینا نے اسے قتل کیا ہے۔ سب لوگوں کو حقیقت حال معلوم ہو گئی اور رسول اکرم کو بھی مسجد میں یہ خبر پہنچ گئی۔ وہ نابینا قاتل مسجد میں آیا، رسول اللہ نے اس سے پوچھا، ''کیا تم نے اسے قتل کیا ہے؟''

وہ بولے، ''ہاں یا محمد کل رات میں نے اسے قتل کر ڈالا مجھے اس بات پر معمولی سی بھی پشیمانی نہیں ہے'' رسول اللہ اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے۔ آپؐ ہر قسم کے جرم سے سخت نفرت کرتے تھے البتہ آپ اسماء کے قاتل کے خلاف کوئی اقدام بھی نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ قانون مدینہ کے مطابق ہر قبیلہ اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا۔ اگر قاتل و مقتول ایک قبیلے سے ہوتے تو دوسرا قبیلہ اسے سزا نہ دے سکتا، اس کا انتقام قبیلے والے ہی لے سکتے تھے کیونکہ قبیلے کے سارے افراد خاندان کے اعضاء شمار ہوتے تھے زیادہ سے زیادہ یہ فرق تھا کہ کچھ لوگ قریبی تعلق والے ہوتے تھے اور کچھ دور کے رشتے والے۔ اسماء کے بعد ایک دوسرا شاعر کعب بن الاشرف بھی ایک مسلمان کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس قتل میں بھی قاتل و مقتول ایک ہی قبیلے سے تھے۔

حضرت محمد اس بار بھی قاتل کو کوئی سزا نہ دے سکے مدینہ کا ایک اور شاعر ابوعفک بھی خدا، رسول اور مسلمانوں کے خلاف بدگوئی کیا کرتا تھا۔ وہ بھی اپنے قبیلے کے ایک مسلمان کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس طرح تین ہجوگو شاعر یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ رسول خدا ان تینوں کے خلاف کوئی اقدام نہ کر سکے۔ ان تینوں شاعروں کے قتل ہو جانے کے بعد بھی رسول اکرم اور مسلمانوں کے خلاف ہجوگوئی جاری رہی کیونکہ مدینہ کے یہودی ہجوگوئی کرتے اور مسلمانوں کو ستاتے۔ رسول اللہ نے یہودیوں کو بلایا اور کہا، ''مسلمانوں کو آزار دینا چھوڑ دو تم لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ حسب قانون مدینہ عہد کیا ہے کہ ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھو گے اور ان کے دشمنوں کے ساتھ متحد نہ ہو گے''۔

ایک دن حضرت محمد یہودی زرگروں کے سردار کے گھر تشریف لے گئے تا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کی بہبود کے لئے کچھ کر سکیں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ مدینہ میں یہودیوں کے تین بڑے گروہ تھے۔ ہر ایک گروہ ایک خاص پیشہ رکھتا تھا۔ یعنی کچھ لوگ کھیت کسان تھے، کچھ سنار اور کچھ کھالوں کے رنگنے کا کام کرتے تھے۔ سناروں کے سردار کو یہ معلوم تھا کہ چند ہفتوں میں چند ہزار سربازوں کا ایک بڑا لشکر مسلمانوں کی سرکوبی کے لئے مکہ سے مدینہ آ رہا ہے لہٰذا اس نے حضرت محمد کے ساتھ بڑی سردمہری سے بات چیت کی۔ یہ شخص پوشیدہ طور پر مکہ والوں کے ساتھ پیمان کر چکا تھا کہ جب مکہ کا لشکر مدینہ پہنچ جائے گا تو وہ حضرت محمد اور مسلمانوں کے نابود کرنے کے لئے ان کی مدد کرے گا۔

حضرت محمد جب اس سنار کے گھر تشریف لے گئے تو سب سے پہلے آپ نے مدینہ کے قانون اساسی کے بارے میں گفتگو کی، فرمایا، ''ہر شخص پر خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی، مدینے کے قانون اساسی کا پاس لحاظ رکھنا، فرض ہے۔ کسی کو بھی مدینے کے قانون اساسی کے خلاف چلنا نہ چاہیے'' اس کے بعد آپ نے مسلمانوں اور یہودیوں کے آپس کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا مسلمانوں کی طرف سے ایک معمولی سا بھی اقدام مدینہ کے قانون اساسی کے خلاف کبھی نہیں ہوا، انہوں نے کبھی بھی یہودیوں کو تکلیف نہیں پہنچائی، یہودی ہجویہ اور ہزلیہ اشعار کے ذریعہ مسلمانوں کی دل آزاری کرتے رہے ہیں چونکہ مسلمان صبر کرتے رہے ہیں لہٰذا تم سمجھنے لگے ہو کہ وہ دب گئے ہیں اس طرح تمہاری بے باکی بڑھتی جا رہی ہے حالانکہ مسلمانوں

نے اس آخری جنگ میں دکھا دیا ہے کہ وہ کسی سے نہیں ڈرتے تھے مگر وہ یہ نہیں چاہتے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے تعلقات خراب ہوں۔

سناروں کے سردار نے پیغمبر اسلام کی اہمیت کم کرنے کی خاطر ان کا نام زبان پر لانا گوارا نہ کیا بلکہ آپ کی کنیت کے حوالہ سے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔"اے ابوالقاسم جنگ بدر نے تمہیں اور تمہارے پیروکاروں کو مغرور کر دیا ہے۔تم یہ سمجھتے ہو کہ چند ایک افراد مکہ پر جو تم سے بہت زیادہ تھے غالب آ گئے ہو لہٰذا ہر ایک پر غالب آ جاؤ گے۔تمہیں یہ پتہ نہیں کہ جن کے ساتھ لڑے تھے وہ تم ہی جیسے تھے، ابھی تک یہودیوں سے پالا نہیں پڑا ہے کہ پتہ چل جائے جنگجو کیسے ہوتے ہیں ہم بہادر، ثابت قدم اور فنون جنگ کے ماہر ہیں، ہم سے جو کوئی بھی لڑے گا شکست کھائے گا" رسول اللہ نے فرمایا۔"ہم تمہارے ساتھ لڑنا نہیں چاہتے بلکہ تمہارے ساتھ دوستی رکھنا چاہتے ہیں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے چونکہ یہ بات مشہور ہے کہ مکہ سے ایک بڑا قافلہ مدینہ کی طرف آنے والا ہے لہٰذا اگر تم ہمارے ساتھ دوستی رکھنا نہیں چاہتے مگر ایسا تو کر سکتے ہو کہ جب وہ لشکر آئے تو تم غیر جانب دار رہو" افواج مکہ کے آنے کی خبر سے یہودی اس قدر بلند ہمت ہو رہے تھے کہ سردار زرگراں واضح طور پر غیر جانب داری کا قول بھی نہ دے سکا کہنے لگا،" یہ بات تو مسلمانوں کے رویہ پر موقوف ہے، اگر لشکر مکہ کے آنے کے بعد مسلمانوں کا رویہ ٹھیک رہا تو ہم غیر جانب دار رہ جائیں گے" صرف اس لیے کہ یہودیوں کے ہاتھ کوئی بہانہ نہ آ جائے اور وہ مسلمانوں کے بارے میں بدگمانی نہ کرنے لگیں مسلمان یہودی شعرا کی نیش زنی پر خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر مکی فوجیں آ گئیں اور یہودیوں سے بھی دشمنی ہو گئی تو وہ دو تلواروں کے درمیان گھر جائیں گے افواج مکہ باہر سے اور یہودی اندر سے حملہ آور ہو جائیں گے۔

مسلمان، یہودیوں کے ساتھ برابر نیک سلوک کرتے رہے ایک دن ایک مسلمان لڑکی یہودیوں کے محلے سے گزر رہی تھی کہ چند یہودی لڑکوں نے اسے گھیر لیا اور بدکلامی کرنے لگے۔انہوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ وہ اس نوجوان لڑکی کے کپڑے بھی اتارنے پر تیار ہو گئے۔ یہ لڑکے مسلمان لڑکی کو گھیرے ہوئے تھے کہ یہودی سنار اپنی دکان سے برآمد ہوا اور اس کے دامن کو میخ سے گاڑ دیا لڑکی نے جو بھاگنا چاہا تو اس کے کپڑے پھٹ گئے اور وہ عریاں ہو

گئی۔ ایک مسلمان ادھر سے گزر رہا تھا۔ وہ یہودی سنار کی طرف بڑھا، ڈنڈا اٹھایا اور اس کے سر پر دے مارا، یہودی لڑکے سنار کا بدلہ لینے کے لئے اس مسلمان پہ حملہ آور ہو گئے اور اسے قتل کر ڈالا۔ لہٰذا مسلمانوں نے یہودی زرگروں سے اس کے خون بہا کا مطالبہ کیا، یہودی دیت دینے پر راضی نہ ہوئے۔

عربوں میں یہ دستور تھا کہ اگر کوئی قبیلہ دیت دینے پر راضی نہ ہوتا تو اس سے جنگ کرتے۔ اس لیے مسلمان ان سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ یہودی ساروں کے مردوں کی تعداد سات سو کے قریب تھی وہ اپنے گھر میں قلعہ بند ہو گئے۔ انہیں مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کا کوئی خدشہ نہ تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ چند دنوں میں مکی لشکر ابوسفیان کی زیر قیادت آ پہنچے گا، البتہ انہیں صرف اس بات کا ملال تھا کہ یہ چند روز پہلے کیوں چھڑ گئی۔ مسلمانوں نے زرگروں کے محلے کا محاصرہ کر لیا، پندرہ دن تک وہ قلعہ بند رہے۔ ان دو ہفتوں میں فریقین میں سے کوئی بھی نہ زخمی ہوا اور نہ کوئی ہلاک ہوا۔ دو ہفتوں کے بعد یہودیوں کو پتہ لگا کہ ابھی تک عسکر مکہ روانہ بھی نہیں ہوا چہ جائیکہ وہ مدینہ پہنچے۔ چونکہ یہودی زرگر سخت تکلیف میں تھے لہٰذا انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس پر بھی حضرت محمدؐ نے ان کے ساتھ نہایت نرم سلوک کیا، سوائے ہتھیاروں کے ان سے کچھ نہ لیا اور فرمایا۔ ”تمہیں اختیار ہے یا مسلمان ہو جاؤ یا یہاں سے نکل جاؤ“ آپ نے ان سے یہ بھی فرمایا۔ ”مدینہ سے جاتے وقت تم جو چاہو اپنے ساتھ لے جاؤ، سوائے زمینوں کے کیونکہ زمین خدا کا مال ہے“ زرگران یہود اپنا سارا مال حتیٰ کہ دروازے اور چھتیں بھی اکھاڑ کر مدینہ سے باہر لے گئے، شہر سے باہر ہو جانے کے بعد ان کے دو فریق ہو گئے۔ ایک گروہ نے راہ جنوب یعنی راہ مکہ اختیار کی تاکہ قریشی لشکر کے ساتھ مل کر مسلمانانِ مدینہ پر حملہ آور ہو اور ان سے اپنا انتقام لیں۔ دوسرا گروہ کسی ایسے شہر کی طرف چلا گیا جہاں یہودی آباد تھے۔ اگرچہ یہودی ساروں کے چلے جانے کے بعد مسلمانوں کے دشمنوں کی تعداد گھٹ گئی تھی مگر پھر بھی مدینہ میں ان کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اہل قریش کو یہودی ساروں کے نکل جانے سے بڑا سخت نقصان پہنچا کیونکہ سات سو جنگجو جو حملہ کے وقت ان کی مدد کرتے، مدینہ سے جا چکے تھے۔

غزوۂ احد

ابوسفیان نے مکہ میں ایک بڑا لشکر تیار کیا اور مارچ 625ء بہ مطابق ماہ شوال 3ھ پھر مدینہ کی طرف آیا، اس دفعہ اس کے ساتھ تین ہزار سپاہی تھے جن میں سے سات سو "آہن پوش" تھے صفوان بن امیہ اس لشکر کا دوسرا کمانڈر تھا۔ ہم نے جن سات سو آہن پوشوں کا ذکر کیا ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ سرد ممالک کے سپاہیوں کی طرح آہنی لباس پہنے ہوئے تھے کیونکہ صحرائے عرب میں آہنی لباس پہنا ہی نہیں جا سکتا اگر کوئی شخص آہنی لباس پہن بھی لیتا تو وہ میدان جنگ میں پہنچنے سے پہلے ہی شدت حرارت سے مر جاتا۔ البتہ یہ سات سو جانباز زرہ پوش تھے۔ ان کی زرہ تلوار، نیزے اور تیر کے وار کو روک سکتی تھی، صرف اسی لئے وہ "آہن پوش" کہلاتے تھے۔ قریشیوں کے دو سو لڑاکا گھوڑ سوار تھے یہ نہایت تیزی سے حرکت کر سکتے تھے۔ ان دو سو افراد کے سپہ سالار خالد بن ولید تھے جو نہ صرف جزیرہ عرب بلکہ دنیا کے مشہور سالار تھے۔

خالد بن ولید کی شجاعت، پامردی اور میدان میں مقابل کے کم زور مقامات پر ادھر سے ادھر تیزی کے ساتھ پہنچ جانے کی صلاحیت کی تمام اسلامی مؤرخین نے تصدیق کی ہے۔ میدانِ جنگ میں جب تیروں اور پتھروں کی بارش ہوتی تو یہ مرد دلیر اس طرح ثابت قدمی کے ساتھ کھڑا رہتا جیسے کوئی اپنے گھر میں کھانے کی میز پر آرام کے ساتھ کھانے میں مشغول ہو۔ حملہ کرنے میں اس قدر چابک دست تھے کہ ایک لحظہ میں ادھر سے ادھر پہنچ جاتے تھے۔ بعد ازاں خالد مسلمان ہو گئے وہ میدانِ جنگ میں ایسی شجاعت اور ہوشمندی سے کام کرتے کہ مسلمان انہیں سیف اللہ یعنی شمشیرِ خدا کہنے لگے۔

مگر وہ ماہ شوال 3ھ میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے آئے تھے عکرمہ فرزند ابوجہل بھی سرداران قریش سے تھے اور یہ بھی ابوسفیان کے ساتھ مدینہ جنگ کرنے کے لئے آئے تھے اپنے باپ کی طرح نبی اکرم سے سخت کینہ رکھتے تھے۔ ہندہ زوجہ ابوسفیان بھی اپنے شوہر کے ساتھ مدینہ آئی تھی تاکہ میدان جنگ میں اپنی نذر کو پورا کرے اور اپنے ہاتھوں سے مسلمانوں کے ناک کان کاٹ کر ایک طوق بنائے اور اسے گلے میں پہنے۔

لشکرِ قریش میں ایک اور عورت بھی تھی جس کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے اس کا نام عمرہ علقمہ

تھا جو حسب روایات پینتیس یا چالیس سال کی تھی یہ بڑی قد آور سخت ہڈیوں والی چہار شانہ اور صاحب حسن و جمال تھی جیسا کہ ہم بیان کریں گے اس عورت نے جنگ احد میں قابل بیان اہلیت کا اظہار کیا تھا۔

بروز چہار شنبہ 2 مارچ مطابق 625 مطابق 12 شوال 3 ھ قریشی فوج تین ہزار افراد پر مشتمل مدینہ پہنچی اور جانب شمال کا رخ کیا۔ مکہ جنوب مدینہ میں واقع ہے۔ اسی لئے مسلمان مکی قافلوں کو جو بطرف شمال (شام) جایا کرتے تھے روک لیتے تھے، لہٰذا جو فوج مکہ سے مدینہ آئے اسے جنوب مدینہ سے داخل ہونا چاہئے یا جنوب مدینہ میں پڑاؤ کرنا چاہئے نہ یہ کہ شمال شہر کی طرف جائے۔ مگر قریشی لشکر مدینہ کے نزدیک پہنچ کر اس لیے شمال کی طرف گیا (یعنی شہر کو دور چھوڑ دیا) کہ جنوبی جانب سے مدینہ کا قرب ایک شتر سوار لشکر کے لئے تنگ مقام تھا اور مدینہ کی جنوبی گھاٹیوں میں ایک جرار فوج کو احکامات دینا دشوار تھا۔

جنوبی مدینہ کے صحرا میں آتش فشاں پتھر تھے لہٰذا اونٹ آسانی سے ان کے اوپر سے نہیں گزر سکتے تھے بلکہ ہر قدم پر یہ خطرہ تھا کہ وہ تیز نوکیلے پتھروں سے پھسل نہ جائیں اور زمین پر نہ آ پڑیں۔ ابوسفیان کی فوج اس علاقے میں لڑ نہیں سکتی تھی کیونکہ جنگ میں لشکر کو ادھر ادھر گھومنا پھرنا پڑتا ہے اور ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ کی طرف جانا پڑتا ہے لہٰذا ابوسفیان شہر سے دور ہو گیا اور کوہ احد کے دامن میں پہنچ گیا کیونکہ وہاں کی زمین نرم تھی راہ پیمائی آسان تھی اور جنگ کے احکامات آسانی کے ساتھ فوج کو پہنچائے جا سکتے تھے۔ جب لشکر قریش مدینہ پہنچا رسولِ اکرم مسجد قبا میں تھے۔ جہاں آپ ہفتہ میں ایک بار تشریف لے جاتے تھے اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس کے صحن میں بیٹھ کر مسلمانوں کے ساتھ بات چیت کیا کرتے تھے۔ اس دن چہار شنبہ یا ایک روایت کے مطابق پنجشنبہ تھا جب آنحضرت نے سنا کہ دشمن آ پہنچا ہے تو انہیں کوئی تعجب نہ ہوا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ مکہ کی طرف سے ایک لشکر آنے والا ہے۔

مکی فوج نے دامنِ احد میں پڑاؤ کرنے کے بعد اپنے اونٹوں اور گھوڑوں کو مدینہ کے شمالی کھیتوں میں چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ ان کی یہ حرکت گویا جنگ کے لئے ایک چھیڑ چھاڑ تھی۔ مدینہ کے باشندے اس کا مطلب سمجھ گئے۔ اس دن اور اس رات حضرت محمد (ﷺ) نے سردارانِ قبیلہ سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے؟ آپ یہ جاننا چاہتے تھے کہ جنگ شروع ہو جانے

کے بعد آیا شہر میں امن رہے گا یا نہیں۔ کیونکہ آپ کو خطرہ تھا کہ جنگ شروع ہوتے ہی منافقین یعنی (غیر جانبدار) اور دوسرے گروہ اندرون مدینہ سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائیں گے لہٰذا آپ یہ چاہتے تھے کہ اندرونی حملے کی طرف سے بے خوف ہو جائیں۔

عبداللہ بن ابی منافقوں کا سردار تھا، اس نے کہا کہ آپ (ﷺ) کو ہماری طرف سے بالکل مطمئن رہنا چاہئے اور یہودیوں نے کہا ہم مسلمانوں پر حملہ آور نہیں ہوں گے پیغمبر اسلام کو ان کی باتوں سے اطمینان ہو گیا۔ تو وہ روسائے قبائل کے ساتھ طرز جنگ کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ عبداللہ بن ابی بولا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو مدینہ میں قلعہ بند ہو کر لڑنا چاہئے۔" شہر کے اندر ایسی عمارتیں ہیں کہ ہر ایک ان میں سے گویا ایک جنگی قلعہ ہے۔ اگر مسلمان ان میں سے قلعہ بند ہو جائیں گے تو افواج مکہ ان پر غلبہ حاصل نہ کر سکیں گی۔"

حضرت محمد کو یہ معلوم تھا کہ مدینہ کی عمارتیں قلعہ کی مانند ہیں اگر مسلمان ان میں محصور ہو جائیں تو اہل مکہ کبھی بھی ان پر غالب نہیں آ سکتے بشرطیکہ ان کے پاس آب و دانہ وافر موجود ہو مگر چونکہ یہ بات عبداللہ بن ابی نے پیش کی تھی کہ مسلمانوں کو قلعہ بند ہو جانا چاہئے اس پر آپ (ﷺ) شبہ میں پڑ گئے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ دھوکا کرنا چاہتا ہو اور اس طرح مسلمانوں کی نقل و حرکت کو پابند کر کے قلعوں کے دروازے کھول کر ان کو قریشیوں کے سپرد کر دینا چاہتا ہو۔

عبداللہ کی باتیں سننے کے بعد آپ نے جوانان اسلام سے مشورہ کیا، انہوں نے کہا۔ "یا رسول اللہ ہمارے خیال میں تو ہمیں مدینہ سے باہر جنگ کرنی چاہئے کیونکہ اگر ہم نے مدینہ میں رہتے ہوئے جنگ کی تو اپنی نقل و حرکت کو مفلوج کر دیں گے۔ البتہ صحرا میں آپ کے ہر حکم کی اطاعت کر سکیں گے"۔ چنانچہ آپ نے ان لوگوں کے مشورے پر غور کرنے کے بعد یہی طے کیا کہ جنگ مدینہ سے باہر ہی کرنی چاہئے۔ آپ (ﷺ) کی یہ عادت تھی کہ عزم سے پہلے ارباب مشورہ سے رائے لیتے اور ان کی رائے معلوم ہو جانے کے بعد اقدام کرتے تھے۔ ارادہ کرنے سے پیشتر وہ ہر مفید نظریہ پر غور فرماتے مگر فیصلہ کے بعد اپنے ارادے سے نہ پھرتے۔ جب آپ نے پختہ ارادہ کر لیا کہ شہر سے باہر نبرد آزما ہوں گے تو عبداللہ بن ابی پھر حاضر خدمت ہوا اور اس امر کی بڑی کوشش کی کہ آپ اپنے ارادے کو بدل ڈالیں اور مدینہ میں محصور رہ کر لڑائی کریں اور اس کی عمارتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ آپ نے فرمایا۔ "اے عبداللہ! جو پیغمبر اللہ کی طرف سے

مبعوث ہوا اسے یہ نہیں چاہئے کہ وہ محصور اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ جائے۔اسے تلوار کو نیام سے باہر نکال لینے کے بعد نیام میں واپس لانا زیب نہیں دیتا۔"

لشکر مکہ تین ہزار افراد پر مشتمل تھا اور پیغمبر اسلام کے ساتھ صرف ایک ہزار جانباز تھے۔ ان میں سے بھی تین سو واپس چلے گئے اور حضرت محمد کے ساتھ صرف سات سو افراد رہ گئے تھے۔اسلامی فوج کے پاس صرف دو گھوڑے تھے، زرہیں اور ہیلمٹ بھی بہت تھوڑے تھے۔ مدینہ سے باہر نکلنے کے بعد آپ نے اپنی فوج پر نگاہ ڈالی ان کا ساز و سامان کچھ بھی نہ تھا کیونکہ مسلمان غریب تھے وہ اپنے لئے آلات حرب مہیا نہ کر سکتے تھے۔اسی لمحے انہیں اطلاع ملی کہ جو یہودی ان کی فوج میں شامل ہیں، بعید نہیں ہے کہ جنگ چھڑتے ہی وہ مکہ والوں میں جا کر شامل ہو جائیں۔ یہودی حسب معاہدہ جنگ میں شریک تھے کیونکہ مدینہ کے قانون اساسی کی رو سے یہ طے پایا تھا کہ جب بھی مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تمام باشندگان مدینہ ہتھیار لے کر دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔آپ (ﷺ) کو یہودیوں کے دشمن سے جاملنے کے ارادے کا علم ہو گیا مگر آپ یہ بات زبان پر نہ لائے۔

اگلے دن اسلامی فوج مدینہ سے روانہ ہوئی اور دامن کوہ احد میں مشرق جانب پڑاؤ کیا، قریشی لشکر احد کی جانب غرب صف بندی کر رہے تھے۔15 ماہ شوال 3ھ شنبہ کی صبح عبداللہ بن ابی، رہبر جماعت غیر جانب داراں یعنی سردار منافقین اپنے تمام پیروکاروں کو لے کر، کوہ احد کی مشرقی جانب سے لوٹ آیا اور یہودیوں اور مسلمانوں کو چھوڑ کر چلا گیا۔

شنبہ کی صبح منافقوں کی یہ حرکت بتا رہی تھی کہ حضرت محمد جو ان کے ساتھ بدگمانی رکھتے تھے اس کی کوئی بنیاد تھی یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ منافقین یعنی ظاہری طور پر مسلمان، حضرت محمد کا ساتھ چھوڑ گئے مگر یہودی جن کے بارے میں مشہور ہو چکا تھا کہ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر مکی فوج کے ساتھ جا ملیں گے، اپنی جگہ قائم رہے۔حضرت محمد نے یہودیوں سے فرمایا۔"اگرچہ مدینہ کے قانون اساسی کے مطابق یہ طے پا چکا ہے کہ جب بھی مدینہ پر کوئی بیرونی حملہ ہوگا، سب ہتھیار اٹھا لیں گے اور مدافعت کریں گے، مگر یہ جنگ اہل مکہ نے مسلمانوں کے خلاف کی ہے۔ وہ باشندگان مدینہ کے خلاف نہیں ہیں۔لہٰذا یہ جنگ ایک مذہبی لڑائی ہے، مدینہ کے قانون اساسی کے تحت نہیں آتی۔اس کے تحت تم صرف دفاع مدینہ کے پابند ہو۔تم لوگ یہودی مذہب رکھتے

ہو یہ بات عقل وفہم سے دور ہے کہ ہم مسلمان یہ توقع رکھیں کہ تم ہمارے دین کی حمایت پر مشرکوں سے لڑو گے۔ پھر یہ کہ آج شنبہ ہے تم لوگ سنیچر کے دن تمام کاروبار چھوڑ کر آرام کرتے ہو۔ جنگ وغیرہ نہیں کرتے لہٰذا یہی مناسب ہے کہ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جاؤ، ہم مسلمان، تنہا ان سے لڑیں گے پھر جو کچھ اللہ کرے۔"

جب یہودیوں نے یہ بات سنی کہ خود حضرت محمد یہ فرمارہے ہیں اپنے اپنے گھر چلے جاؤ، تو وہ فوراً وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ اب حضرت محمد کے ساتھ صرف سات سو غازی رہ گئے تھے۔ اس دن مسلمانوں کی حالت جنگِ بدر کی نسبت سے زیادہ خراب تھی کیونکہ اہل قریش کی فوج مسلمان غازیوں سے چار گنا تھی۔

حضرت محمد نے صبح صبح "زرہ پہنی، خود سر" پر رکھا اور جنگ شروع ہونے سے پہلے مسلمانوں سے کہا۔ "ہمارا آج کا طرز جنگ وہی ہوگا جو جنگ بدر میں تھا یعنی ہمیں بشکل مربع یا دائرہ ہو جانا چاہئے تاکہ جس طرف سے بھی مقابل حملہ آور ہو، ہمارے غازی اس کے سامنے ہوں یہ بات خیال میں رکھنی چاہئے کہ دشمن کی فوج ایک قوی نظامِ اسپ سواراں رکھتی ہے کیونکہ خالد بن ولید کی سرکردگی میں دو سو سوار ہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ دو سو افراد ہماری صفوں کا نظام درہم برہم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ہم بصورت مربع یا دائرہ صف بستہ ہو گئے تو جدھر سے بھی دشمن حملہ کرے گا ہمارے غازی اس کے سامنے ہوں گے۔ اس طرح پیادہ فوج کے حملے سے ہمیں کوئی خطرہ نہ ہوگا البتہ سواروں کا حملہ اس طرز جنگ کے لئے بھی خطرناک ہوسکتا ہے کیونکہ اگر ہم نے ان کے سواروں کے حملے کو روک بھی دیا تو ان کی مدد کے لئے دوسرے سوار آجائیں گے جو تازہ دم ہوں گے اور ہمارے قدم اکھاڑ دیں گے۔ گھوڑوں کی سرعت رفتار کی وجہ سے ہم اپنے درہم و برہم نظام صف کو دوبارہ درست نہیں کر سکتے اور پھر پہلی سی شکل نہیں بنا سکتے۔"

اس کے بعد آپ نے انگلی سے جانب جنوب اشارہ فرما کر کہا، "میں پیش بینی کرتا ہوں کہ اگر خالد بن ولید ہمارے اوپر حملہ کرے گا تو اس طرف سے حملہ آور ہوگا کیونکہ ادھر کی زمین گھوڑ دوڑ کے لئے مناسب ہے" جس جانب آپ نے اشارہ کیا تھا وہ ایک تنگنائے تھا جو دامنِ احد اور شہر مدینہ کی زمین کی بہ نسبت وسیع تر تھا اس قطعہ اراضی میں مدینہ کے باغ واقع تھے اگر اس تنگنائے سے گزر کر جانب جنوب جاتے تو شہر میں پہنچ جاتے تھے۔ وہاں ایک ٹیلہ ذرا بلند تھا جسے

عینین کا ٹیلہ بولتے تھے۔ حضرت محمد نے پیادوں کے دو دستے ادھر مقرر کر دیئے تھے یہ سب کے سب تیر انداز تھے ان کے سردار عبداللہ بن جبیر تھے آپ نے ان سے فرمایا تھا کہ اس مقام کو نہ چھوڑنا۔ بعض مورخین نے ان دونوں دستوں کی تعداد پچاس افراد لکھی ہے اور بعض نے ایک سو، میرا یہ خیال ہے کہ وہ سو افراد تھے ان میں سے ہر گروہ پچاس آدمیوں پر مشتمل تھا۔

عینین کا ٹیلہ جنگی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ حضرت محمد نے اپنی جنگی مہارت سے اس ٹیلے کی اہمیت کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا کہ خالد بن ولید مسلمانوں کے پیچھے سے حملہ نہ کر سکیں اسی لئے تمام تیر اندازوں کو یہاں مقرر کیا تھا۔ وہ منطقہ جہاں غازیانِ اسلام صف بستہ تھے ایک نشیبی علاقہ تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دامن کوہ احد میں بصورت کاسہ تھا۔ چونکہ حریف، مسلمانوں کے مغربی جانب تھا لہٰذا وہ کسی طرح بھی مسلمانوں کے عقب سے حملہ آور نہ ہو سکتا تھا مگر یہ کہ جنوب کی طرف سے آئے یعنی عینین کے ٹیلے کے نیچے سے گزرے۔

حضرت محمد (ﷺ) نے ان مسلمانوں سے جو عبداللہ بن جبیر کی سرکردگی میں اس طرف جا رہے تھے فرمایا، "ہمارے اوپر جو کچھ بھی گزرے تم لوگ اس ٹیلے کے اوپر سے ہرگز نہ ہٹنا۔ دشمن کا جو بھی فرد ادھر کا رخ کرے اور ٹیلے کے نیچے سے گزرے اس پر اس طرح تیر برسانا کہ وہ ہم تک نہ پہنچ سکے۔ تم لوگ اپنی جگہ پر ہی کھڑے رہنا خواہ آخری آدمی تک مارا جائے، ہر وقت چوکنے رہنا کہ دشمن ادھر سے حملہ آور نہ ہو"۔

عبداللہ بن جبیر اپنے ساتھیوں کو لے کر ٹیلے پر پہنچ گئے اور وہاں پہنچ کر پوزیشن سنبھال لی۔ حضرت محمد نے چھ سو یا ساڑھے چھ سو جانبازوں کے ساتھ (حسب روایت اگر عبداللہ بن جبیر کے ساتھیوں کو پچاس قرار دیا جائے چند صفیں جنگ بدر کی صفوں کی طرح بنائی اور غزوہ بدر کی طرح پہلی صف کا علم بردار حضرت علی ؓ کو مقرر کیا۔

غازیانِ اسلام کے ایک گروہ کو (جن کی تعداد کا مجھے کسی بھی تاریخ سے پتہ نہیں چلا) حضرت زبیر بن عوام کی سرکردگی میں علیحدہ کھڑا کر دیا اور ان سے فرمایا گیا جب بھی ہماری کسی صف کو کمزور دیکھو تو اپنے ساتھیوں کو لے کر فوراً وہاں پہنچ جاؤ۔ آپ آخری وقت تک مسلمانوں کو یہی نصیحت کرتے رہے کہ انفرادی جنگ سے بچو، اپنی صف بندی کو نہ چھوڑو کیونکہ ہم دشمن سے کمزور ہیں لہٰذا انفرادی جنگ میں سب کے سب مارے جائیں گے۔

جنگ شروع ہونے سے پہلے ہندہ زوجۂ ابوسفیان، چند قریشی عورتوں کے ساتھ کھڑی طبل بجا رہی تھی اور ایک خاص طرز سے اشعار پڑھ رہی تھی جن میں جنگجو نوجوانوں کے جنسی جذبات کو خوب مشتعل کیا گیا تھا ''اگر تم دشمن پر حملہ کرو گے تو ہم تمہیں بستر پر جگہ دیں گی، شراب اور دوسری لذتوں سے سرشار کریں گی لیکن اگر تم نے دشمن کی طرف پشت کی تو کبھی بھی ہمارے ہاتھوں سے شراب نہ پی سکو گے''۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہندہ نے اپنے غلاموں سے کہا۔ ''تم میں سے جو کوئی بھی حضرت محمد، ابوبکر، عمر کو قتل کر دے گا وہ فوراً آزاد ہو جائے گا''۔

مسلمانوں کی صفوں نے قریشیوں کی طرف پیش قدمی کی۔ قدم اٹھانے سے پہلے رسول اکرم نے مسلمانوں کو پھر نصیحت کی۔ کہ ''اپنی صفوں کو جو ایک قلعہ ذی حیات کی مانند ہیں ہرگز نہ توڑیں اور انفرادی جنگ نہیں کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے اور نظم و ضبط کو قائم رکھیں گے تو فتح پائیں گے'' اگرچہ مکہ کے لوگوں کی طاقت مسلمانوں کی قوت سے چار گنا سے بھی زیادہ تھی، مگر شروع ہی سے معلوم ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کو فتح ہو گی۔

جس طرف سے بھی قریشی حملہ آور ہوتے مسلمانوں کی برہنہ شمشیریں اور نیزے ان کے سامنے ہوتے وہ کسی طرح بھی صفوں کو نہ توڑ سکے اور کسی طور بھی مسلمانوں کے پیچھے یا برابر حملہ نہ کر سکے۔ مسلمانوں کی صفیں ایک نظام کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں یہ دیکھ کر قریش کے جوان پریشان ہو گئے اور اک دم بھاگ کھڑے ہوئے ان کا فرار دکھاوے یا دھوکے کے لئے نہ تھا بلکہ وہ دراصل خائف ہو چکے تھے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اگر ثابت قدم رہے تو مارے جائیں گے۔

مسلمان لحہ بہ لحہ قریشیوں کے قریب پہنچ رہے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ کفار مکہ بھاگ کھڑے ہوئے ہیں تو انہوں نے سمجھا کہ مال غنیمت لوٹنے کا یہ اچھا موقعہ ہے اس سے اونٹ، گھوڑے، اسلحہ اور زر و سیم کے علاوہ ان کے ہاتھ قیدی بھی لگیں گے جن کا وہ بھاری فدیہ رہائی حاصل کر سکیں گے۔

حضرت علی نے جو پرچم بردار صف اول تھے پکارا کہاں جا رہے ہو؟ ہو سکتا ہے کہ دشمن دھوکا دے رہا ہو، کیا پیغمبر نے نہیں فرمایا کہ نظام کو ہاتھ سے نہ دینا؟ مسلمانوں نے جواب دیا۔ نبی (ﷺ) نے فرمایا تھا کہ جب تک جنگ رہے نظم و ضبط باقی رکھنا، اب جب کہ جنگ ختم ہو چکی

ہے اور ہم فتح پا چکے ہیں نظم وضبط کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھتے چلے گئے اور مال غنیمت اکٹھا کرنے لگے۔ حضرت عبداللہ بن جبیر کی زیر قیادت ٹیلے پر متعین مجاہدین نے دشمن کو بھاگتے دیکھنے کے بعد اپنی صفیں توڑ دیں اور وہ بھی مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے بھاگے۔ حضرت عبداللہ بن جبیر نے کہا۔ رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ جو کچھ بھی ہم پر گزرے تم اس مقام کو نہ چھوڑنا" تیرانداز بولے۔"اب جب کہ قریشی شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے مسلمانوں نے اپنی صفیں توڑ دی ہیں جنگ ختم ہو چکی ہے تو ہم یہاں کیوں کھڑے رہیں دوسروں کی طرح کیوں مال غنیمت نہ اکٹھا کریں؟" یہ کہہ کر وہ لوگ سوائے بارہ افراد کے جن میں ایک عبداللہ بن جبیر بھی تھے ٹیلے سے چل کھڑے ہوئے۔ تا کہ مال غنیمت حاصل کرسکیں۔

جب فوج قریش بھاگ کر اپنی قیام گاہ کی طرف پہنچی تو ان کی عورتوں نے جو مدینہ کی طرف ان کے ساتھ آئی تھیں ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔ جزیرۃ عرب میں ہمیشہ سے یہ دستور تھا کہ جنگ میں عورتیں مردوں کے ساتھ جاتی تھیں تا کہ انہیں بھڑکائیں اور ثابت قدمی پر مجبور کریں۔ کلثوم، شاعر عرب کہتا ہے۔"جب ہم جنگ کرتے ہیں تو ہماری عورتیں دیکھتی رہتی ہیں وہ مشعل کا کام دیتی ہیں تا کہ ہمارے خون میں جوش پیدا ہو"۔

زنانہ ہتھیار

سخت لڑائیوں میں جب کبھی کفار کی شکست یقینی ہوتی تو جو عورتیں ان کے ساتھ میدان جنگ آتی تھیں وہ اپنے بال بکھیر دیتیں، کپڑے پھاڑ ڈالتیں اور نیم عریاں حالت میں دشمن کی طرف دوڑتیں تا کہ مردوں کو مجبور کریں کہ وہ دشمن کی طرف بڑھیں۔ اس دن بھی وہ عورتیں جو لشکر قریش کے ساتھ آئی تھیں جب انہوں نے اپنے مردوں کو بھاگتے دیکھا تو ایک بلند قامت حسین وجمیل عورت عمرہ علقمہ کی قیادت میں بال بکھیر کر، اور کپڑے پھاڑ کر نیم عریاں حالت میں آگے بڑھیں۔ عمرہ علقمہ نے چیخ کر کہا۔" تمہاری غیرت وحمیت کہاں گئی اگر تم ایک مٹھی مسلمانوں سے نہیں نمٹ سکتے تو ثابت قدم کیوں نہیں رہتے کہ مارے جاؤ۔ اگر کوئی مرد میدان جنگ میں مارا جاتا ہے تو کیا ہرج ہے کیونکہ اس نے اپنا فرض انجام دیا، اسے کوئی بھی ملامت نہیں کرتا کہ اس نے فتح حاصل نہیں کی مگر جو مرد میدان جنگ سے اپنے جیسوں کے ڈر سے

بھاگتے ہیں اور مرنے سے ڈرتے ہیں، انہیں چاہیے کہ خیموں میں جائیں اور ہماری جگہ بیٹھیں بچوں کی نگرانی کریں اور کھانا پکائیں، تم لوگ خیموں میں چلے جاؤ، وہاں خیمہ داری کرو، میدان جنگ میں ہم لڑیں گی"۔

مسلمان تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے "کہ اس دن مسلمانوں نے نو بار دشمنوں کے نو علم برداروں کو قتل کیا جو سب کے سب قبیلۂ عبدالدار سے تھے۔ عمرہ علقمہ جھجی اور اس نے آخری مقتول علم دار سے پرچم اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کی تلوار لے کر مسلمان غازیوں کی طرف لپکی، دوسری عورتیں بھی اس کے ساتھ ساتھ بڑھیں" عورتوں کے طعنوں سے شرما کر قریش نے ایک بار پھر مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کے لئے یہ حملہ بالکل غیر متوقع تھا کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ قریش کلی طور پر شکست کھا چکے ہیں جس وقت اہل قریش نے حملہ کیا تو وہ مسلمان صف میں نہ تھے منتشر ہو چکے تھے،، مال غنیمت کے پیچھے وہ اپنی صفوں کو توڑ چکے تھے۔ مسلمانوں نے صف بستہ ہونا چاہا مگر وہ ایسا نہ کر سکے، اس لیے کہ قریشی بڑی تیزی سے آگے بڑھے تھے لہٰذا انہیں مہلت نہ مل سکی۔

خالد بن ولید سپہ سالار شہسواران قریش نے اب تک جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ انہوں نے میدانِ جنگ پر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ قریشیوں کے تعاقب میں مسلمانوں نے اپنی صفیں توڑ دی ہیں اور قریشی اپنی عورتوں کے بھڑکانے کی وجہ سے واپس آ گئے ہیں، مسلمان ان کے حملے کی وجہ سے صف بستہ نہیں ہو سکے اور انفرادی طور پر لڑ رہے ہیں تو اس فرصت کو غنیمت جانا، انہوں نے اپنے سواروں کے ساتھ مسلمانوں کے پیچھے سے حملہ کرنا مناسب سمجھا۔ حضرت عبداللہ بن جبیر اپنے گیارہ ساتھیوں کے ساتھ عینین کے ٹیلے پر بدستور کھڑے تھے۔ انہوں نے خالد بن ولید کے سواروں کے حملے کو روکنا چاہا مگر وہ روک نہ سکے اور گیارہ آدمی عبداللہ بن جبیر سمیت شہید ہو گئے۔ وحشی نام کا ایک سیاہ فام میدانِ جنگ میں حضرت محمد کو تلاش کر رہا تھا تا کہ ہندہ کے وعدے کے مطابق انہیں شہید کر کے آزادی حاصل کر لے مگر ان تک نہ پہنچ سکا، نہ حضرت ابوبکر، و عمر و علی کو پا سکا مگر حضرت حمزہ کو اس نے پالیا جو مسلمانوں کے ایک مشہور پہلوان اور رسول اکرم کے چچا تھے۔

وحشی ان کی شمشیر زنی کو دیکھ کر قریب جانے کی جرأت نہ کر سکا حتیٰ کہ خالد بن ولید کے

شہسوار عینین کے ٹیلے سے گزر گئے اور پیچھے سے پیغمبر اسلام پر حملہ آور ہو گئے حضرت علی، حمزہ اور عمر بن الخطاب جو کہ سربازان قریش کے ساتھ شمشیر زنی کر رہے تھے لوٹے تا کہ خالد بن ولید کے شہسواروں کو روک دیں۔ جب وحشی نے دیکھا کہ حضرت حمزہ اس کی طرف سے پشت پھیر کر گزر رہے ہیں تو وہ قریب گیا اور نیزہ ان کی پشت میں مار کر سینہ کے پار کر دیا۔ جب ہندہ نے سنا کے حضرت حمزہ وحشی کے ہاتھوں شہید ہو چکے ہیں تو اس نے اسی وقت وحشی غلام کو نہ صرف آزاد کر دیا بلکہ وہیں اپنے دست بند اور جھانور اتار کر اسے دے دیے اور کہنے لگی ''میں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر کسی مسلمان کو قتل کر دے گا تو تجھے آزاد کر دوں گی مگر اب میں آزادی کے علاوہ زیورات بھی بخشتی ہوں''۔

خالد بن ولید کے حملے نے مسلمانوں کا شیرازہ بکھیر دیا۔ سارے مسلمان منتشر ہو گئے۔ صرف حضرت ابوبکر، عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، ابو دجانہ اور دوسرے حضرات پیغمبر کے اردگرد جمع رہے اور ایک صف بنالی تا کہ دشمن کے سوار جدھر سے بھی حملہ کریں تلواروں سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔

حضرت محمد (ﷺ) نے اپنے اردگرد جمع شدہ حضرات سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''خالد بن ولید کے سواروں کے حملے کے لئے یہ مقام مناسب ہے لیکن اگر ہم کوہ احد پر چڑھ جائیں تو ان کے گھوڑے وہاں نہ پہنچ سکیں گے اس طرح ہم وہاں محفوظ رہیں گے'' اس کے بعد آپ (ﷺ) نے مسلمانوں کی بدنظمی پر افسوس کیا اور فرمایا۔ ''میں نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ اپنی صفوں کو نہ توڑنا اور عینین کے تیراندازوں سے کہا تھا کہ ہمارا جو بھی حال ہو تم اپنی جگہ سے نہ ہلنا مگر افسوس کہ مسلمانوں نے میری نصیحت پر عمل نہ کیا لہٰذا میں خیال کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آج غزوہ بدر کی طرح فتح نصیب نہیں کرے گا''۔

اللہ تعالیٰ قرآن کی تیسری سورۃ آل عمران میں فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِن قَبْلِ أَن تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ.

''تم موت کی تمنا کرتے تھے اس سے قبل کہ اس سے ملو (یعنی شہادت کی) مگر جب اسے دیکھ لیا تو تم دور سے کھڑے دیکھتے رہے۔''

اللہ تعالیٰ اس آیت اور سورۃ آل عمران کی دوسری آیتوں میں مسلمانوں کو قابل ملامت

قرار دیتا ہے، جنگ احد میں ان کے فرار کر جانے کو لائق سرزنش سمجھتا ہے چونکہ جنگ احد میں جیسا کہ ہم عنقریب بیان کریں گے یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ حضرت محمد شہید کر دیئے گئے ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں مسلمانوں سے فرمایا:

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ (الی آخر الآیۃ)

"محمد (ﷺ) کیا ہیں ایک رسول، ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں (اور وفات پا چکے ہیں) اگر وہ فوت ہو جائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاؤ گے۔ (آخر آیت تک)"

مطلب یہ کہ کیا تم جنگ کو چھوڑ دو گے اور دین کو ترک کر دو گے۔ تم میں سے جو کوئی بھی دین سے پھر جائے گا اور مرتد ہو جائے گا وہ خدا کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا بلکہ ضرر اسی کو پہنچے گا۔

جب حضرت محمد (ﷺ) اور آپ کے ساتھی خالد بن ولید کے سواروں کا مقابلہ کر رہے تھے تو وہ ایک ایسے مقام پہ پہنچ گئے جہاں خالد بن ولید کے سوار نہ جا سکتے تھے کیونکہ گھوڑے پہاڑ پر نہ چڑھ سکتے تھے۔ قریشی فوج کے دو افراد جن میں سے ایک کا نام عبداللہ بن قمیئہ تھا اس مقام کے قریب ایک چٹان کے پیچھے گھات لگائے بیٹھے تھے، عبداللہ بن قمیئہ نے گوپھن سے پتھر پھینکا تو وہ رسول اللہ کے چہرہ انور پر لگا، دندان مبارک ٹوٹ گئے۔ رسول اکرم اور آپ کے ساتھی پہاڑ پر چڑھ رہے تھے کہ اس ضرب سے آپ ایک غار میں جا گرے اور زخمی ہو گئے۔ خالد بن ولید اور ان کے ساتھی گھوڑوں سے اترے تا کہ پہاڑ پر چڑھ کر رسول اکرم اور ان کے ساتھیوں کا کام تمام کر دیں، ادھر دامن کوہ سے خالد بن ولید اور ان کے ساتھیوں نے تیر برسانے شروع کیے تو ادھر عبداللہ بن قمیئہ نے اسی وقت خبر اڑا دی کہ رسول اللہ شہید کر دیئے گئے۔ کیونکہ اس نے اپنی منجنیق سے آپ کے رخ انور کا نشانہ لگایا تھا اور آپ کو گڑھے میں گرتے دیکھا تھا لہٰذا وہ پہاڑ سے اترا اور چلا کر کہنے لگا۔ "محمد شہید کر دیئے گئے" وہ مسلمان جو تنہا تنہا لڑ رہے تھے یہ خبر سن کر بڑے مایوس ہو گئے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

حضرت علی اور عمر بن الخطاب، رسول اللہ کو گڑھے سے باہر لائے۔ حضرت علی دوڑ کر قریب کے چشمے سے اپنی ڈھال میں پانی بھر کر لائے۔ آپ کے سر اور رخ انور پر ڈالا، اپنی

ٹوپی سر سے اتاری اور زخموں کو صاف کیا۔ اسی عالم میں خالد بن ولید اور ان کے پیادہ پا ساتھی آن پہنچے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ خالد بن ولید اس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ نہ تھے۔

خالد بن ولید کے وہ ساتھی جو گھوڑوں سے اتر کر پیادہ پا ہوئے تھے تاکہ رسول خدا اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر دیں، ایک سو افراد تھے۔ ان ایک سو اشخاص نے حسب روایت بارہ یا چودہ افراد پر حملہ بول دیا جو پیغمبر کے گرد جمع تھے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ابتداءً اس جنگ کا طرز، صف بندی کی مربع شکل میں تھا تاکہ دشمن کسی طرح بھی مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ نہ کر سکے مگر بالائے کوہ پہنچنے کے بعد وہ اس طرح صف بندی نہ کر سکے کیونکہ پہاڑ کی وضع طبعی اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ان بارہ چودہ افراد میں سے چار شخص حضرت محمد کی حفاظت کے لیے تعینات ہوئے اور دوسرے آٹھ یا دس دشمن سے مقابلہ کے لئے مقرر ہوئے۔ وہ چار اشخاص بھی لڑ رہے تھے مگر جنگ کرتے ہوئے رسول اللہ سے دور نہ جاتے اس لیے کہ آپ زخمی ہو چکے تھے اور ایسی حالت میں ان کا تنہا رہ جانا باعث خطرہ تھا وہ چار افراد یہ تھے:

حضرت علی، انس، عمر بن الخطاب اور ابو دجانہ، بلاتوقف شمشیر زنی کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر فرد کے مقابلے میں دس دس تلواریں چل رہی تھیں تاکہ انہیں قتل کر کے کسی طرح حضرت محمد تک پہنچ جائیں مگر بغیر اس امر کی پرواہ کئے کہ وہ کس قدر زخمی ہو چکے ہیں، شمشیر زنی میں مصروف تھے۔

جن لوگوں نے غزوہ احد کے واقعات لکھے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ان چاروں اشخاص کے سروں پر صرف خود تھے، زرہ بدن پر نہ تھی۔ ان چاروں حضرات کے جسم پر جس قدر کثیر زخم لگے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تن پر زرہ نہ تھی کیونکہ اگر ان کے پاس زرہیں ہوتیں تو اتنے گھاؤ ہرگز نہ لگتے۔

جنگ احد مارچ کے نصف میں ہوئی یعنی ابھی موسم بہار شروع نہ ہوا تھا کیونکہ موسم بہار 21 مارچ کو شروع ہوتا ہے اس کے باوجود مدینہ کا موسم انتہائی گرم تھا گو موسم سرما کا آخری زمانہ تھا۔ لہٰذا میدان جنگ میں زرہ پہننا بہت تکلیف دہ اور گرمی کا باعث تھا۔ نبی اکرم کو اپنے گھیرے

میں رکھنے کی کوشش میں ابودجانہ زخموں سے چور ہو گئے۔ مسلسل تیر لگتے لگتے ان کا جسم خار پشت کی طرح ہو گیا مگر وہ اس پر بھی بہت خوش تھے کہ تیر انہیں لگ رہے ہیں اور رسول اکرم کو کسی قسم کا گزند نہیں پہنچ رہا ہے۔ ابودجانہ زمین پر گر پڑے اور تھوڑی دیر کے بعد جان دے دی، ان کے بعد انس بھی گر پڑے۔ ان کے چہرے پر اس قدر تلواریں پڑی تھیں کہ جب مسلمانوں نے انہیں دفن کرنا چاہا تو کوئی بھی انہیں نہ پہچان سکا حتیٰ کہ ان کی ہمشیرہ، کانوں سے اپنے بھائی کی شناخت کر سکیں۔ انس کے زمین پر گر جانے کے بعد رسول اللہ کے محافظ صرف دو شخص رہ گئے تھے۔ ایک علی اور دوسرے عمر بن الخطاب۔ حضرت علی کا سارا بدن خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس پر بھی انہوں نے رسول خدا کا ساتھ نہ چھوڑا۔ عمر بن الخطاب جو بڑے بلند قامت اور چوڑے شانوں والے تھے بوقت کارزار کبھی کبھی نعرے لگا رہے تھے اور لڑنے والے مسلمانوں کی ہمت بندھانے کے لئے رجز پڑھ رہے تھے۔

اب پیغمبر اسلام (ﷺ) کی تھکن ذرا کم ہو چکی تھی، ان میں اتنی طاقت آ گئی تھی کہ ایک مسلمان سعد بن ابی وقاص کو اپنی طرف بلا سکیں اور ان سے تیر و کمان لے کر کفار مکہ پر تیر اندازی کر سکیں۔ وہ مٹھی بھر مسلمان جو ایک سو کفار مکہ کا مقابلہ کر رہے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ کی حالت درست ہو گئی ہے وہ اٹھ کر تیر اندازی کر رہے ہیں تو انہیں اس قدر مسرت ہوئی کہ اپنے زخموں کو بالکل بھول گئے۔ انہوں نے اپنے ٹیلے سے ذرا جدا ہو کر حضرت محمد کو اپنے وسط میں لے لیا اور صف بندی کر دی۔ ان کی یہ صف بندی ایک متحرک قلعہ کی مانند تھی لہٰذا انہوں نے کفار مکہ کے خلاف پامردی سے حملہ شروع کر دیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ ایک سو افراد پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔

میرے خیال میں غزوہ احد کا یہ پہلو اس کے تمام پہلوؤں سے سب سے زیادہ قابل توجہ ہے کہ کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ علی ابن ابی طالب، عمر بن الخطاب، سعد بن ابی وقاص اور دوسرے غازیوں کی شجاعت کس درجہ کی تھی کہ لشکر مکہ کے ایک سو افراد کو پیچھے ہٹا دیا۔ اگر ہم رسول اکرم کے اس موقع کے ساتھیوں کی تعداد چودہ قرار دیں تو ابودجانہ اور انس کی شہادت کے بعد وہ صرف بارہ اشخاص رہ جاتے ہیں اور اگر بارہ قرار دیں تو دس رہ جاتے ہیں جنہوں نے صف بندی کر کے حضرت محمد کو بیچ میں لے لیا تھا، از سر نو حملہ کا آغاز کر دیا تھا اور آخرکار کفار کو پیچھے ہٹنے

پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ ایک صدسر باز ایسے وقت مجبوراً پیچھے ہٹے جب کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ فتح ہماری ہو رہی ہے اور ذرا سی استقامت سے ہم دشمن کو قتل یا قید کر سکتے ہیں۔ ایسے وقت میں کون جنگ سے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ یہ امر بھی خیال میں رکھنا چاہئے کہ ان ایک سو لشکریوں کے سپہ سالار خالد بن ولید تھے، جو یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس وم مخالف کے سپہ سالار کو قتل کر دینا یا گرفتار کر لینا اتنی قیمت رکھتا ہے کہ اگر یہ ایک سو بھی تہہ تیغ ہو جائیں تو کوئی بات نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ احد کے خاتمہ پر ابوسفیان، سپہ سالار قریش نے کہا تھا۔ "جنگ احد کی آخری گھڑیوں میں جو لوگ حضرت محمد کے ساتھ اس قدر وفادار و فدا کار رہوں" ان دس یا بارہ افراد نے جب کہ پیغمبر اسلام شدید زخمی ہو چکے تھے غزوہ احد کی آخری ساعتوں میں ایسی طاقت و شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ آپ سپاہ قریش کے خطرے سے باہر ہو گئے۔

مارچ کے آدھے مہینے میں (تاریخ جنگ احد) جب کہ ابھی فصل بہار شروع نہ ہوئی تھی، لمبے دن نہ تھے جس وقت دلیرانِ اسلام نے ایک چھوٹی سی صف بندی کر کے سر بازانِ مکہ کو کوہ احد سے پیچھے دھکیل دیا تھا، سورج کوہ احد کی غربی چوٹی کے قریب آ گیا تھا اور دن ختم ہوا چاہتا تھا جنگ ہو چکی تھی لہٰذا قریشیوں نے نئے حملہ کا ارادہ نہ کیا اور جنگ جاری رکھنے پر زور نہ دے سکے۔

اس موقع پر حضرت فاطمہؓ اور ام کلثومؓ اپنے باپ کے پاس پہنچ گئیں۔ مورخین اسلام واقعات کے لکھنے میں گاہے بگاہے سہل انگاری سے کام لیتے ہیں اور تاریخ و مقام کا ذکر چھوڑ جاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ غزوۂ احد کی صبح کچھ مسلمان عورتیں، غازیان مدینہ کے ساتھ تھیں، فاطمہؓ وام کلثومؓ دختران پیغمبر بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ فاطمہؓ اپنے پدر بزرگوار کے قریب گئیں تاکہ مرہم پٹی کریں مگر آپ (ﷺ) نے حضرت علی ؓ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جو سراپا پارچہ خون بنے ہوئے تھے ان سے فرمایا۔ "فاطمہؓ ادھر جاؤ، علی کے زخموں کو دیکھو کیونکہ میری بہ نسبت انہیں مرہم پٹی کی زیادہ ضرورت ہے"۔

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، اسلامی لشکر کے جراح (SURGEON) جب حضرت علی ؓ کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ ان کو اسی (80) زخم لگے ہیں کہنے لگے۔ "یا علی ؓ! مجھے آپ کی مرہم پٹی کرنی چاہئے اور تخت رواں کے ذریعہ آپ کو مدینہ پہنچانا چاہئے کیونکہ اپنی ساری عمر میں

آج تک میں نے کسی شخص کو اتنا زخم خوردہ نہیں دیکھا، میں حیران ہوں کہ اتنے زخم کھا کر آپ کیسے ثابت قدم رہے اور کس طرح لڑتے رہے"۔

حضرت عمر بن الخطاب نے جنگ احد میں نیزے اور تلواروں کے اکیس زخم کھائے اور سعد بن ابی وقاص کو بارہ زخم آئے تھے۔ ابھی آفتاب غروب نہ ہوا تھا کہ ہند زوجہ ابوسفیان میدان کارزار میں آئی، حضرت حمزہ کی نعش مبارک تک پہنچی، ان کا شکم وسینہ چھری سے چیرا، جگر نکالا اور اسے چبایا، اسی لیے اسے ہند جگر خوار یا ہند جگر خور کہتے تھے۔

حضرت حمزہ کا جگر نکال کر چبانے کے بعد ہند نے ان کے ناک کان کاٹے، اسی طرح دیگر مسلمان شہیدوں کے بھی ناک کان کاٹے اور ایک ہار بنا کر اپنی گردن میں پہنا، پھر میدان جنگ میں رقص کیا۔ ایک اور قریشی عورت سلافہ بن سعد بھی میدان جنگ میں آئی اور شہدائے اسلام کے لاشوں کو ٹٹولنے لگی تاکہ اپنے اس بیٹے کے قاتل کی لاش کو تلاش کرے جس نے اسے غزوۂ بدر میں قتل کیا تھا۔ چنانچہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہوگئی اور غازی شہید کا سر کاٹ کر کہنے لگی۔ "میں اس کھوپڑی کے گوشت پوست کو اس لیے جدا کر رہی ہوں تاکہ یہ کاسہ سر خشک ہو جائے اور میں تا زندگی اس سے پانی پیتی رہوں جب بھی مجھے تشنگی محسوس ہو اس سے پیاس بجھاؤں۔"

لشکر مکہ کی روانگی کے بعد جب پیغمبر اسلام کی نظر حضرت حمزہ کی نعش مبارک پر پڑی تو دیکھا کہ شکم وسینہ چاک کر کے ان کا جگر قطع کیا گیا ہے اور ناک کان کاٹے گئے ہیں تو آپ بہت زیادہ غمزدہ ہوئے اور فرمایا۔ آئندہ "جب ہمارے اور مشرکوں کے درمیان جو جنگ ہوگی میں حمزہ کے بدلے تیس بت پرستوں کا مثلہ کروں گا" اسی وقت وحی نازل ہوئی، قرآن کی سولھویں سورۃ النحل کی یہ آیت اتری تھی۔

وَ إِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصّٰبِرِينَ.

"اگر تم سزا دو تو اتنی ہی جتنی کہ تم پر زیادتی کی گئی ہو اور اگر صبر کرو تو یہ یقیناً صبر کرنے والوں کے لئے ہی بہتر ہے۔"

مطلب یہ کہ اگر سزا دو، ظلم سے زیادہ سزا نہ دو، اگر سزا دینے کا خیال ہی ترک کر دو اور صبر کرو تو یہ بہتر ہے کہ خیر وصلاح کے ساتھ صبر کرو۔ اس آیت کے نزول کے بعد پیغمبر اسلام نے

فرمایا۔ ''اے خدا! میں نے انتقام لینے کا ارادہ ترک کر دیا میں صبر کروں گا''۔

جنگ احد میں لشکر اسلام کے ستر غازی شہید ہوئے جن میں سے چونسٹھ انصاری تھے اور چھ مہاجر تھے، قریشی عورتیں ان کے ناک کان اور لب کاٹ کر اپنے ساتھ لے گئیں تا کہ ہار بنائیں۔ غروب آفتاب سے قبل سپہ سالار ابوسفیان میدان جنگ میں آیا جہاں مسلمانوں کے لاشے پڑے تھے، وہاں کھڑے ہو کر کہنے لگا۔ ''کیا محمد زندہ ہیں یا نہیں؟'' اس نے یہ سوال اس لیے کیا کہ لشکر اسلام اور فوج مکہ میں یہ مشہور ہو چکا تھا کہ حضرت محمد شہید کر دیئے گئے ہیں۔ اسی لیے مسلمان منتشر ہو گئے تھے۔ یہ بات طے پا چکی تھی کہ کوئی بھی یہ نہ کہے، رسول اللہ زندہ ہیں مگر حضرت عمر سے صبر نہ ہو سکا۔ انہوں نے چیخ کر کہا، محمد زندہ ہیں۔

ابوسفیان پکارا، ''اے محمد! جنگ بدر میں تمہارے لشکریوں نے ہمارے ستّر آدمی مارے تھے اس جنگ میں ہم نے تمہارے ستّر جاں باز مار دیئے لہٰذا اب ہمارا تمہارا حساب کتاب برابر ہو گیا، اس کے باوجود بھی اگر تم ہم سے لڑنا چاہتے ہو تو ہم حاضر ہیں کہ آئندہ سال جب مقام بدر میں میلہ لگے تو ہم تمہارے ساتھ جنگ کریں''۔ ابوسفیان جو بڑا مغرور ہو رہا تھا یہ کہہ کر میدان جنگ سے لوٹ آیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلا گیا۔

جب دشمن میدان جنگ سے چلے گئے تو چند ایک مسلمان لوٹے، پیغمبر اسلام نے حکم دیا کہ شہیدوں کو دفن کر دیا جائے۔ تاریخی وقائع میں مورخین اسلام اس مقام پر پھر سہل انگاری سے کام لیتے ہیں، اس بات کی تصریح نہیں کرتے آیا اسی وقت جب کہ آفتاب غروب ہونے کو تھا مسلمانوں نے اپنے شہیدوں کو دفن کر دیا اور رات گئے تک وہ اس میں مشغول رہے یا دوسرے دن شہیدوں کو دفن کیا۔

دامن کوہ احد میں شہیدوں کو دفن کر دیا گیا، اہل عرب میں یہ طریقہ تھا کہ دفن کرنے سے پہلے مردے کو غسل دیتے تھے تا کہ وہ پاک صاف ہو جائے مگر پیغمبر اسلام نے فرمایا، ''یہ لوگ میدان جنگ میں شہید ہوئے ہیں، شہادت نے انہیں پاکیزہ کر دیا ہے یہ سیدھے بہشت کو گئے ہیں لہٰذا انہیں غسل کی ضرورت نہیں رہی''۔ رسول اکرم ہر میت کے دفن سے پہلے دعائے جنازہ پڑھتے، جب سب دفن ہو چکے تو آپ نے شہدا کی تعظیم و توصیف بیان کی۔

غزوہ احد پر ایک نظر

مورخین اسلام لکھتے ہیں "مسلمان غزوہ احد میں شکست کھا گئے" میرے خیال میں یہ نظریہ قابل غور ہے۔

ہم اگر کسی ماہر جنگ سے یہ دریافت کریں کہ شکست کھا جانے کی کیا پہچان ہوتی ہے؟ تو وہ جواب میں یہی کہے گا۔ "اگر دشمن ملک کے کسی حصے پر قبضہ کر لے اور مقابل کے لشکر کو فنا کر دے تو جس قوم کو ملک چھینا گیا اور اس کا لشکر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا وہ شکست خوردہ ہے۔"

اگر کوئی شخص کسی کے ملک پر قبضہ کر لے مگر اس کی فوج کو برباد نہ کر سکے تو وہ قوم، جس کا لشکر سالم ہے کبھی شکست خوردہ تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ دوسری عالمگیر جنگ میں جرمن نے والگا کے کنارے تک پورے ملک روس پر قبضہ کر لیا تھا مگر چونکہ وہ اس کے لشکر کو تباہ نہ کر سکا لہٰذا فاتح نہ بن سکا۔

کسی ملت کو شکست خوردہ اسی وقت تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ دو باتیں نہ پائی جائیں ایک یہ کہ اس کے ملک پر قبضہ کر لیا جائے، دوسرے یہ کہ اس کی فوج کو تیغ کر دیا جائے۔ غزوہ احد میں افواج مکہ مدینہ پر قبضہ نہیں کر سکیں، نہ مجاہدین اسلام کو فنا کر سکیں۔ اگرچہ جنگ میں لشکر اسلام منتشر ہو گیا تھا مگر اگلے دن وہ سارا منتشر لشکر حضرت محمد کے گرد جمع ہو گیا تھا جب حضرت محمد میدان جنگ سے مدینہ کی طرف لوٹے تو ان کے ساتھ ایک منظم فوج تھی۔ ایک ماہر جنگ کے نظریہ سے میرے خیال میں حضرت محمد نے غزوۂ احد میں شکست نہیں کھائی البتہ آپ اس دن ایک سخت آزمائش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس لیے کہ مشرکین قریش نہ تو مدینہ پر قابض ہو سکے نہ غازیان اسلام کو نیست و نابود کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی غزوۂ احد کے بارے میں مسلمانوں کو شکست خوردہ قرار نہیں دیا جو آیتیں جنگِ احد سے متعلق ہیں اور سورۃ آل عمران (قرآن کی تیسری سورت میں آئی ہیں ان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ.

"جنگ سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو غم نہ کرو تم ہی غلبہ پاؤ گے (مشرکین پر) اگر ایمان والے ہو گے"۔

اسی سورت آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

إِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ. (الی اخر الایۃ).

''اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہے (یعنی غزوہ احد میں مجروح ہوئے) تو قریشیوں کو بھی تو اسی قسم کے گھاؤ لگے (آخر آیت تک)''۔

اسی سورۃ میں مزید فرمایا گیا ہے:

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ.

''تا کہ خدا مومنوں کو گناہوں سے پاک کرے اور کافروں کو مٹا دے''۔

یعنی جو مصیبت جنگ احد میں مسلمانوں پر وارد ہوئی وہ اس لیے تھی کہ ان کے گناہ مٹا دیے جائیں مگر کافروں پر جو مصیبت پڑی وہ ان کو مٹانے کے لئے تھی۔

اسی سورت کی آیت 159 میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے بارے میں جو اس جنگ میں بھاگ کھڑے ہوئے تھے اظہار ترحم کرتا ہے اور پیغمبر سے کہتا ہے کہ انہیں معاف کر دیں، یہ آیت اس طرح ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ. (الی اخر الآیہ)

''اللہ تعالیٰ کی رحمت سے آپ ان کے لئے نرم ہیں اگر سنگدل تندخو ہوتے تو وہ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، انہیں معاف کر دیجئے، ان کے لئے استغفار کیجئے اور ان سے معاملات میں مشورہ لیجئے''۔ (آخر آیت تک)

مطلب یہ کہ رحمت خداوندی کی بنا پر جو آپ پر ہے آپ ان کے لیے خوش خلق ہیں یعنی غزوۂ احد سے فرار ہونے والوں کے لئے خوش روئی سے پیش آئے۔ اگر سنگ دل اور تندخو ہوتے تو وہ آپ کے پاس بھاگ کھڑے ہوتے اور کوئی بھی ارد گرد نہ رہتا، اے محمد انہیں یعنی جنگِ احد میں بھاگ جانے والوں کو معاف کر دیجئے اللہ سے ان کے لئے طلب مغفرت کیجئے اور ان سے مشورہ لیجئے۔

اللہ تعالیٰ ان آیتوں کے بموجب جو ذکر ہوئیں اور دوسری آیتوں کے مطابق جو سورۃ آل عمران میں ہیں، غزوۂ احد کو جنگی شکست قرار نہیں دیتا۔ فراریوں کے بارے میں اظہار رحم کرتا

ہے اور حضرت محمد (ﷺ) کو نصیحت کرتا ہے کہ انہیں معاف کر دیں۔ اگر غزوۂ احد آج کے ایک ماہر جنگ کے سامنے فیصلہ دینے کے لئے پیش کیا جائے تو وہ اسے مسلمانوں کی شکست نہیں، بلکہ فتح قرار دے گا کیونکہ انہوں نے میدان جنگ سے ابوسفیان کے لشکر کو مار بھگایا، یہ جنگی نتیجہ، دلیل فتح ہے۔ غزوہ احد میں لشکرِ مکہ کی شکست کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں۔

1- قریشی اس ارادے سے نہیں آئے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ میدانی جنگ کریں، وہ تو یہ چاہتے تھے کہ اچانک مسلمانانِ مدینہ پر چڑھائی کر دیں، یہودیوں اور منافقوں کی مدد سے حضرت محمد اور ان کے متبعین کو فنا کر دیں۔ انہوں نے شہر سے دور، دامن کوہ احد میں اس لیے پڑاؤ نہ کیا تھا کہ مسلمان وہاں ان سے آکر لڑیں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے لہٰذا وہ شہر سے باہر نکل کر جنگ کرنے کی جرأت نہ کریں گے بلکہ اس بات کو ترجیح دیں گے کہ شہر میں قلعہ بند ہو کر لڑیں۔ مسلمانوں کے شہر سے باہر آنے پر ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو حیرت ہوئی۔ اس کے باوجود انہیں یہی توقع تھی کہ وہ یہودیوں اور منافقوں کی مدد کے ذریعہ ان کا کام تمام کر دیں گے۔ منافق شہر کو واپس ہو گئے تھے اور حضرت محمد نے یہودیوں سے درخواست کی تھی کہ وہ واپس چلے جائیں لہٰذا مسلمانوں کے علاوہ کوئی بھی باقی نہ رہا تھا۔ اگرچہ مجاہدین اسلام کی تعداد اہل مکہ کے مقابلہ میں کم تر تھی مگر وہ وحدت پر بھروسہ کیے ہوئے تھے، جب تک کہ انہیں مال غنیمت کے حاصل کرنے کا خیال نہ ہوا۔ وہ خوب خوب لڑے اور لشکر قریش کو شکست دیدی اگر مکہ کی عورتیں قریشیوں کو لعن طعن نہ کرتیں اور انہیں واپسی پر مجبور نہ کرتیں تو ابو سفیان کا لشکر شکست کھا چکا تھا۔

2- اہل مکہ کی شکست کا دوسرا سبب یہ تھا کہ رات ہو گئی اور اہل عرب غروب آفتاب کے بعد جنگ نہیں کرتے۔

3- تیسری وجہ ابوسفیان کے کامیاب نہ ہونے کی یہ تھی کہ لشکر مکہ کے پاس آج کل کی اصطلاح کے مطابق وسائل جاسوسی نہ تھے جن سے وہ صحیح طور پر لشکر اسلام کی نقل و حرکت کا پتہ چلا سکتا، حالانکہ حضرت محمد (ﷺ) کے پاس اطلاعات کے ذرائع تھے اور وہ حریف کے ارادوں سے واقف تھے۔

4- چوتھی وجہ ابوسفیان کی ناکامی کی یہ تھی کہ اس نے ایک بڑی بھاری غلطی کا ارتکاب کیا اور وہ بھی ایک ایسی غلطی جسے ایک ماہر جنگ معاف نہیں کرسکتا۔ اگر ابوسفیان یہ غلطی نہ کرتا اور اپنے لشکر کو دامن کوہ احد سے واپس نہ لاتا تو وہ جنگ احد کی رات کے اگلے یا دوسرے دن مسلمانوں کو نیست و نابود کرسکتا تھا۔ ابوسفیان کی لغزش کی دلیل یہ ہے کہ جب اس نے دامن کوہ احد سے اپنے لشکر کے ساتھ مراجعت کی تو وہ مقام روحاء میں جا کر سخت پشیمان ہوا، اس نے پختہ ارادہ کرلیا کہ واپس لوٹ کر مسلمانوں کا خاتمہ کردے۔

5- حضرت محمد کی جنگی اطلاعات کے منظم ہونے کی ایک یہ بھی دلیل ہے کہ پیغمبر اسلام کو پتہ چل گیا ابوسفیان پشیمان ہوگیا ہے اور لوٹنے اور جنگ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے یہ بات یاد رکھی جانی چاہئے کہ جنگ احد کے ختم ہو جانے کے اگلے دن لشکرِ مجاہدین مجتمع ہو چکا تھا جس دن وہ مدینہ میں داخل ہوئے سب اسی طرح صف بستہ تھے جس طرح کہ مدینہ سے خارج ہوتے وقت تھے۔

ایک رات دن گزر جانے کے بعد جب مسلمان مدینہ پہنچے تو حضرت محمد کو اطلاع ملی کہ لشکرِ قریش ایک بار پھر حملہ آور ہونا چاہتا ہے آپ کی قوت روحانی وایمانی اس قدر مضبوط تھی کہ وہ اس خبر کے آنے سے بالکل سراسیمہ نہ ہوئے، آپ نے مسلمانوں سے فرمایا جنگ کے لئے مدینہ سے باہر چلو۔ یہ سن کر سارے مسلمان، زخمیوں سمیت جنگ کے لئے آمادہ ہو گئے۔ عمر بن الخطاب اور سعد بن ابی وقاص باوجود سخت زخمیوں کے چل کھڑے ہوئے، ابوعبیدہ الجراح نے حضرت علی کو جانے کی اجازت نہ دی، انہوں نے کہا۔ "اگر علی جنگ کے لئے نکلے تو زخموں کی تاب نہ لاکر فوت ہو جائیں گے۔" حضرت محمد لشکر اسلام لے کر ابوسفیان کے لشکر کے مقابلے کے لئے صحرا الاسد تک پہنچے اور وہاں مشرکین مکہ کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔

مگر ابوسفیان مقام روحاء میں پہنچ کر جو واپسی کا ارادہ کر رہا تھا اس میں تذبذب پیدا ہو گیا۔ اور بالآخر اس نے مکہ کی طرف واپس لوٹنے کا فیصلہ کرلیا۔ جب مسلمانوں کو اطمینان ہوگیا کہ اب وہ واپس نہیں آئے گا تو وہ مدینہ کی طرف لوٹ گئے۔ اس سے قبل کہ مسلمانوں کی فوج صحرائے احد سے مراجعت کرے، وحشی غلام جس نے حضرت حمزہ کو شہید کیا تھا، افواج مکہ سے بھاگ کھڑا ہوا اور مسلمانوں کے لشکر کی طرف آگیا اور اس نے حضرت محمد کی خدمت میں حاضر ہو

کر اعتراف کیا کہ میں آپ کے چچا حمزہ کا قاتل ہوں۔ رسول اکرم نے اسے کوئی سزا نہیں دی چونکہ آپ بہت رحم دل اور بامروت تھے لہٰذا اس سے فرمایا، آئندہ کبھی میرے سامنے نہ آنا اور کبھی بھی مجھ سے نہ ملنا۔

اس کے بعد وحشی کبھی بھی آپ کے سامنے نہیں آیا مگر حضرت حمزہ کے قتل کا بدلہ چکانے کے لئے اس نے دشمنان نبی میں سے ایک کو قتل کیا۔ منجملہ ان کے ایک مسیلمہ تھا جو دعوائے پیغمبری کرتا تھا۔ جب مسلمان جنگ احد سے فارغ ہو کر مدینہ پہنچے تو انہیں یہ لڑائی ایک ناخوش گوار حادثہ معلوم ہوئی یعنی انہوں نے اسے شکست نہیں سمجھا، مگر یہود مدینہ نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ حضرت محمد جنگ میں شکست کھا گئے۔ اگر وہ خدا کے پیغمبر ہوتے تو ہرگز شکست نہ کھاتے۔

قرآن کی تیسری سورت کی یہ آیت اسی زمانے میں نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
''اس سے پہلے بھی پیغمبر آئے وہ بڑے بڑے لشکروں سے لڑے اور شکست کھائی مگر شکست سے مایوس نہیں ہوئے بلکہ اور زیادہ صاحب استقامت بن گئے حتیٰ کہ فتح یاب ہوئے اللہ تعالیٰ استقامت والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

یہ آیت اس لئے نازل ہوئی تھی کہ وہ پروپیگنڈا جو یہودی کر رہے ہیں اسے باطل کر دیا جائے کہ اگر حضرت محمد پیغمبر ہوتے تو شکست نہ کھاتے۔ اس آیت سے مسلمانوں میں ہمت اور جوش پیدا ہو گیا۔ مگر مدینہ کے یہودی اپنے خیال سے دست بردار نہ ہوئے بلکہ یہودی مزارعین جو مدینہ میں رہتے تھے انہوں نے یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ حضرت محمد کو شہید کر دیں۔ (ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ مدینہ میں یہودیوں کے تین فرقے تھے، سنار، کسان اور چمڑا رنگنے کا کاروبار کرنے والے لوگ۔)

جب حضرت محمد کو یہ معلوم ہوا کہ یہودی کسان آپ کو شہید کرنا اور مسلمانوں پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں تو مسلمانوں نے ان کے محلے کا محاصرہ کر لیا اور فرمایا، ''تم لوگ مدینہ کے قانون اساسی کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہو، بہتر یہ ہے کہ اس ارادے سے باز آ جاؤ تاکہ مسلم و یہود محبت کی زندگی گزار سکیں'' کسانوں نے کہا، ''ہم آپ کی بات نہیں مان سکتے'' پیغمبر اسلام نے ان سے کہا، ''یہودی سناروں کی طرح تم بھی اس شہر سے نکل جاؤ اور کسی دوسرے مقام پر سکونت

کرلو"۔ اس بات پر وہ ناراض ہو گئے حضرت محمد نے ان سے کہا۔ "تم قابل انتقال سرمایہ یہاں سے لے جا سکتے ہو"۔ چنانچہ جو کچھ بھی تھا وہ لے گئے حتیٰ کہ چھتیں بھی اکھاڑ کر ساتھ لے گئے۔ اب مدینہ میں سوائے چھڑار لگنے والوں کے اور کوئی نہ رہا تھا۔

عمر بن الخطاب مرد دلیر جو جنگ احد میں پیغمبر اسلام کے مخصوص محافظوں میں سے تھے اور انہوں نے بعد کے دس سال کے عرصہ میں تین شہنشاہیوں کو زیر نگین کیا تھا، ان کی ایک بیٹی حفصہ تھیں۔ انہوں نے حفصہ کو ایک نوجوان خنیس سے منسوب کیا تھا۔ خنیس ان نوجوانوں سے تھے جنہوں نے جنگ احد میں داد شجاعت دی تھی اور شہید ہو گئے تھے، پیغمبر اسلام نے ان کی دلیری کی داد اس طرح دی تھی کہ جب وہ دفن کیے جانے لگے تو خود اپنے دونوں دست مبارک سے انہیں قبر میں اتارا۔

حضرت حفصہؓ کی اس زمانے میں بیس سال عمر تھی اور بڑی حسین، صاحب ادب و شعر اور دانشمند تھیں، اپنے زمانے کے مطابق شوہر کی وفات پر صبر نہ کر سکیں اور بہت زیادہ غمگین رہنے لگیں۔ عمر ؓ بن الخطاب ایک صاف گو اور صریح اللہجہ انسان تھے حضرت عثمان ؓ کے پاس گئے اور کہنے لگے تم ایک حسین نوجوان ہو میری بیٹی تازہ بیوہ ہے وہ بھی حسین ہے، لہٰذا تم اس سے نکاح کر لو تاکہ میری بیٹی اپنے شوہر کے غم کو بھول جائے اس طرح تمہیں بھی ایک جمیل شاعرہ، رفیقۂ حیات مل جائے گی۔ حضرت عثمان نے ان کی یہ پیش کش نہ مانی، حضرت عمر کو بڑا صدمہ ہوا کیونکہ وہ شخصیت کے لحاظ سے ان سے برتر تھے لہٰذا اس امر کی توقع رکھتے تھے کہ عثمان بخوشی ان کی تجویز کو منظور کر لیں گے۔ حضرت عثمان کا انکار انہیں کفران نعمت اور باعث توہین معلوم ہوا انہوں نے رسول اکرم سے جا کر اس بات کی سخت شکایت کی اور بہت زیادہ اظہار ناراضی کیا، رسول اللہ کی عادت تھی کہ وہ معاملات کو بڑی باریک نگاہ سے دیکھا کرتے تھے جب ان کی شدید شکایت سن چکے تو فرمایا: "تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ عثمان نے جو تمہاری پیش کش کو ٹھکرایا ہے اس پر جتنا چاہے غم و غصہ کر لو کیونکہ انہوں نے تمہاری توہین کی ہے مگر میں اس توہین کو اس طرح زائل کر سکتا ہوں کہ آپ حفصہؓ کو میرے عقد میں دے دیں"۔ اس پیشکش پر حضرت عمر بے حد خوش ہوئے۔ مارے خوشی کے آپ کا دست مبارک اپنے سر پر رکھ لیا اور عرض کی کہ "یا محمد آج آپ نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ اور مجھے سعادتمند بنا دیا ہے"۔ اس طرح حضرت حفصہؓ سے

آپ کی شادی ہوگئی۔ اور عمر بن الخطاب، رسول اللہ کے خسر بن گئے۔

ازواج مطہرات

پیغمبر اسلام کی نو بیویاں تھیں جن سے آپ نے حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً شادیاں کیں ان کے نام یہ ہیں:

(1) ام سلمہؓ دختر ابی امیہؓ (2) سودہؓ دختر زمعہ (3) عائشہؓ بنت ابی بکر ﷺ (4) ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان ﷺ (5) حفصہؓ بنت عمر ﷺ بن الخطاب (6) صفیہؓ بن حیی بن اخطب خیبری (7) میمونہؓ بنت حارث ﷺ بلالی (8) زینبؓ بنت جحش الاسدی اور (9) جویریہؓ بنت حارث ﷺ بنی مصطلق۔

چار اصحاب آپ سے بہت زیادہ قریب تھے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت علی آپ کے داماد تھے۔ فاطمہؓ دختر پیغمبر ان کے حبالۂ عقد میں تھیں۔ ابوبکر آپ کے خسر تھے ان کی بیٹی عائشہؓ رسول اکرم کی زوجہ تھیں۔ عمر بن الخطاب بھی پیغمبر اسلام (ﷺ) کے خسر تھے۔ حضرت عثمان آپ کے داماد تھے۔ حفصہؓ بنت عمر جب آپ (ﷺ) کے نکاح میں آئیں تو وہ خانہ پیغمبر میں تین چیزیں لائیں۔

(1) شعر (2) پڑھنا پڑھانا اور (3) خوش خطی۔

حضرت حفصہؓ سے حضرت عائشہؓ بہت محبت کرتی تھیں۔ اکثر ان کے پاس بیٹھ کر کتاب سنا کرتیں یا یہ کوشش کرتیں کہ انہی جیسی خوش خط ہو جائیں۔ روایت ہے کہ ام المومنین حفصہؓ نے قرآن کا کچھ حصہ بڑی خوش خطی سے لکھا ہوا تھا۔ اسے قرآن حفصہؓ کہتے تھے۔

جمع آوریٔ قرآن

جو لوگ تاریخ اسلام سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن پاک حیات نبوی میں ایک کتاب کی صورت میں جمع نہیں کیا گیا۔ مگر حیات نبوی ہی میں چند اصحاب نے جن میں حضرت حفصہؓ اور حضرت علی بھی شامل ہیں۔ اپنے لئے قرآن کو مرتب کر لیا تھا اور وہ بصورت مجموعہ کامل ان کے پاس تھا۔ حضرت محمد (ﷺ) امی تھے، جب قرآنی آیات ان پر نازل ہوتیں تو وہ انہیں یاد کر لیتے مگر لکھ نہ سکتے تھے۔ نزول وحی کے وقت جو پڑھے لکھے اصحاب موجود ہوتے وہ لکھ لیتے

اور یاد کر لیتے کاغذ، کپڑے یا استخوان کتف شتر پر لکھ لیا کرتے۔ جو حضرات بے لکھے پڑھے تھے وہ نازل شدہ آیتوں کو حفظ کر لیتے۔ بدو عرب حفظ کی بہت زیادہ استعداد رکھتے تھے وہ جو کچھ سن لیتے یاد رکھ سکتے تھے۔

حضرت محمد کی وفات کے بعد، مختلف مہمات اور جنگوں میں بیشار حفاظ قرآن شہید ہو گئے۔ اس سے خطرہ پیدا ہو گیا کہ سب کے مارے جانے یا وفات پا جانے کے بعد قرآن مجید ضائع ہو جائے یا اس میں تحریف ہو جائے تو ایک قرآن کی بجائے کئی قرآن بن جائیں گے جس طرح کہ دین مسیح میں مختلف طرح کی انجیلیں ہیں۔ لہٰذا حضرت عثمان نے چند ایک اصحابؓ کو اس خدمت پر مامور کیا کہ قرآن کو جمع کر کے لکھیں، خواہ حفاظ و قراء سے سن کر لکھیں یا لکھے ہوئے کو دیکھ کر نقل کریں، جب مکمل قرآن لکھا جا چکا تو آپ نے حکم دیا کہ جو بھی کاغذ، پارچہ، چرٹہ یا ہڈی ایسی ہو جس پر قرآن لکھا ہوا سے ضائع کر دیا جائے۔

ہمارے جو مغربی مصنفین اسلام اور مسلمانوں پر خون ریزی کرنے کا الزام لگاتے ہیں وہ کفار کی شقاوت قلبی اور سنگدلی کے واقعات معلوم کرنے کی کوشش کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ مشرکین اور کفار نے مسلمانوں پر ظلم کے کیسے کیسے پہاڑ توڑے تھے۔ ہندہ زوجہ ابوسفیان نے جو کچھ حضرت حمزہ اور چند دیگر شہدا کے ساتھ کیا اس کی تفصیل دی جا چکی ہے۔ ایک عورت سلافہ نے ہی مسلمان شہید کی کھوپڑی کا کاسہ نہیں بنایا تھا بلکہ دوسری عورتیں بھی مسلمان شہدا کی کھوپڑیوں کی تلاش میں نکلیں تا کہ ان کھوپڑیوں کے پیالے بنا کر ان میں پانی پیا کریں۔ جنگ احد کے بعد قریشیوں نے منادی کرائی کہ جو شخص بھی کسی مسلمان کو ان کے حوالے کرے گا اسے معقول انعام دیا جائے گا۔ اہل قریش نے ایک مسلمان کا اتنا بڑا انعام مقرر کیا تھا کہ بدو قبائل نے پختہ ارادہ کر لیا کہ مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر قریش کے حوالے کر کے انعام حاصل کریں گے۔ مکہ میں کوئی مسلمان نہ تھا کہ قریشیوں کے ہاتھ لگتا، یہی وجہ تھی کہ دیہاتی قبائل نے مدینہ جانا شروع کر دیا تا کہ مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر لائیں۔ غزوہ احد کے بعد جنوب مدینہ کے ایک قبیلے نے حضرت محمد سے درخواست کی تھی کہ چند مسلمانوں کو ان کے پاس بھیجیں تا کہ وہ انہیں اسلام کے مسائل سکھائیں اور مسلمان بنائیں۔ آپ نے ایک عالم دین عمیر ﷺ بن ثابت کو تیں صحابہؓ کے ساتھ اس قبیلے کی طرف بھیج دیا تا کہ انہیں مسلمان کریں اور دین کی باتیں بتائیں۔ وہ بدو جو

مسلمانوں کی گھات میں بیٹھے تھے انہوں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ ان لوگوں کو گرفتار کر کے قریشیوں کے حوالے کر دیں مگر مسلمان گرفتاری پر راضی نہ ہوئے اور لڑتے لڑتے سب کے سب شہید ہو گئے۔ ان میں سے صرف تین افراد بچے جنہیں بدوؤں نے گرفتار کرلیا اور مکہ کی طرف لے گئے تا کہ سرداران قریش کے ہاتھوں فروخت کر کے مال حاصل کریں۔ ان تین اصحابؓ میں سے ایک فرار ہو گئے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ مکہ پہنچ کر ان کو سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بدو ان کے پیچھے بھاگے مگر وہ ان کے قبضے میں نہ آئے بالآخر مقابلہ کرتے مارے گئے تو بدوؤں نے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ یہ صحابی مقام، الراجی میں پارہ پارہ کر دیئے گئے۔ بدو دو صحابیوںؓ کو گرفتار کر کے مکہ لے گئے، مکہ پہنچ کر ان لوگوں نے مقرر کردہ انعام لینے سے انکار کر دیا کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ تمام اشراف مکہ ان کے خواہاں ہیں اور انہیں خرید کر سخت ترین عذاب میں مبتلا کر کے قتل کرنا چاہتے ہیں۔

بدوؤں نے ان مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ قیمت طلب کی، صفوان بن امیہ جو ابوسفیان کے بعد مکہ کا سب سے بڑا سردار تھا اس نے ان میں سے ایک صحابی کو بڑی بھاری قیمت پر خرید لیا۔ صفوان بن امیہ کے ہاتھ جو صحابی لگے یہ عمیر بن ثابت قافلہ سالار تھے۔ دوسرے صحابی کو کسی سردار مکہ نے خرید لیا۔ جب اہل مکہ نے یہ دیکھا کہ یہ دو سردار اپنی پیاس بجھانے کے لئے ان دونوں کو قتل کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے اعتراضات کرنا شروع کر دیئے، کہنے لگے ''ہمیں بھی تو مسلمانوں سے تکلیف پہنچی ہے ہمارے عزیز جنگِ بدر اور احد میں مارے گئے ہیں ہم بھی چاہتے ہیں کہ ان دونوں، مسلمانوں کے قتل سے لطف اٹھائیں لہٰذا تم دونوں جوان دونوں کو، قتل کرنا چاہتے ہو تو تمہیں چاہیے کہ انہیں ایک میدان میں اہل مکہ کے سامنے قتل کرو تا کہ سب لطف اندوز ہوں۔''

صفوان بن امیہ نے یہ بات منظور کر لی کہ حضرت عمیر کو مکہ کے ایک وسیع میدان میں قتل کیا جائے، اس نے ایک شخص نستاس کو ان کے شہید کرنے پر متعین کیا مگر اس نے یہ شرط لگائی کہ چونکہ میں نے عمیر کی خریداری پر بڑی بھاری رقم صرف کی ہے اس لیے ان کے قتل کیے جانے کے بعد کاسہ سر، میں لوں گا تا کہ جو کوئی ان کے کاسہ سر کو پانی پینے کے لئے خریدنا چاہے گا میں اس سے اچھے دام وصول کرسکوں۔ جب نستاس کے ہاتھوں عمیر ﷺ بن ثابت، ساکنان مکہ کے

سامنے (جو بطور تماشائی جمع تھے) شہید کر دیئے گئے، تو ان کے کاسہ سر کی بڑی قیمت لگی، دام بڑھتے چلے گئے۔ آخر ایک شخص نے بھاری رقم دے کر کھوپڑی خرید لی۔ دام ادا کر دینے کے بعد وہ حضرت عمیر ؓ کے لاشہ کے پاس گیا اور چاہا کہ شمشیر نیام سے نکال کر سر تن سے جدا کر لے پھر اس کا گوشت پوست علیحدہ کر کے کھوپڑی کو خشک ہونے دے اور بطور کاسہ پانی پینے کے لئے استعمال کرے۔ جب وہ ان کی نعش کے قریب گیا تو دیکھا کہ سرخ رنگ کے بڑے بڑے زنبور، ان کی لاش کو چمٹ رہے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں ادھر ادھر اڑ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ ڈر گیا، دل میں کہنے لگا جب تاریکی چھا جائے گی تو یہ آپ ہی اڑ جائیں گے، میں آ کر ان کا سر تن سے جدا کر لوں گا اور اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

تذکرہ نویسان اسلام لکھتے ہیں ''جب رات ہو گئی تو بڑا سخت طوفان آیا اور سیلاب ان کے لاشہ کو بہا کر لے گیا، اس طرح وہ خریدار سر، اپنی آرزو پوری نہ کر سکا کہ ان کے کاسہ سر سے پانی پی سکتا''۔

دوسرے صحابیؓ کو اہل مکہ شہر سے باہر لے گئے اور قریب مکہ مقام تنعیم میں سولی پر لٹکا دیا۔ ہمیں پھر مسلمان سیرت نگاروں کی سہل انگاری کی شکایت کرنی پڑتی ہے کہ انہوں نے مذکورہ بالا صحابیؓ کا نام نہیں بتایا، پتہ نہیں چلتا وہ کون تھے حالانکہ یہ سب سے پہلے مسلمان تھے جو راہِ اسلام میں سولی چڑھائے گئے، لہٰذا ان کا نام ذکر کرنا چاہئے تھا۔ اہل مکہ صلیب کو زمین پر رکھتے تھے، مصلوب کو اس پر پشت کے بل لٹا دیتے تھے اور دو بڑی میخیں لے کر اس کے دونوں ہاتھوں میں صلیب کے ادھر ادھر ٹھونک دیتے تھے۔ یہ مرد مومن مرتے دم تک بلند آواز سے، لا الہ الا اللہ کے نعرے مارتا رہا۔ جب ان کے دونوں ہاتھوں میں میخیں ٹھونک دی گئیں تو ان کے دونوں پاؤں ملا کر ایک موٹی میخ ان دونوں میں ٹھونک کر اسے صلیب کے قائمہ کے ساتھ گاڑ دیا گیا۔ پھر صلیب کو سیدھا کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد تمام عورتوں اور مردوں نے ان پر سنگ باری کی جن لوگوں کے پاس نیزے تھے انہوں نے نیزے ان کے جسم پر پیوست کیے۔ باشندگان مکہ کو انہیں صلیب پر چڑھانے میں بڑا لطف آیا۔ اس کے بعد جب کبھی بھی کوئی مسلمان ان کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ اس کے ساتھ ایسا ہی کرتے اور خوب سنگ باری کرتے۔

ماہ جولائی 625ء مطابق 3ھ میں چالیس صحابہؓ مدینہ سے ایک قبیلہ کی طرف جا رہے تھے

تا کہ انہیں اسلام کی تبلیغ کریں، یہ حضرات بھی بدوؤں کے حملے کی زد میں آ گئے اور بیر معونہ (یعنی کنواں) کے قریب شہید کر دیئے گئے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر گرفتار کر لئے گئے تو مکہ میں شکنجہ میں کھینچ کر سخت عذاب کے ساتھ قتل کر دیئے جائیں گے لہٰذا یہ سب کے سب لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

جنگ احد کے ختم ہو جانے کے بعد ابوسفیان نے مسلمانوں سے کہا، اگر تم ایک اور جنگ لڑنا چاہتے ہو تو آئندہ سال بدر کے میلے کے موقع پر آ جانا"۔

بدر کا میلہ ہر سال ایک ہفتہ رہتا تھا۔ اگلے سال ماہ اپریل 626ء میں حضرت محمد ڈیڑھ ہزار غازیوں اور پچاس گھوڑوں کو ساتھ لے کر مقام بدر میں تشریف لے آئے۔ حضرت محمد یہ چاہتے تھے کہ ابوسفیان کو یہ بات ذہین نشین کرا دیں کہ مسلمان اس کے لشکر سے خوف زدہ نہیں ہیں اور دوسری جنگ لڑنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ گو ابوسفیان کے ساتھ دو ہزار افراد تھے مگر اسے مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کی جرات نہ ہوئی چونکہ خشک سالی کی وجہ سے مقامِ بدر میں اس کے اونٹوں کے لئے چارہ نہ تھا لہٰذا وہ یہ بہانہ کر کے بدر سے واپس چلا آیا۔ ابوسفیان کے جنگ سے کترا جانے سے مسلمانوں کو بڑا فائدہ ہوا کیونکہ سب جان گئے کہ اگرچہ اس کے پاس مسلمانوں کی نسبت سے زیادہ قوی لشکر تھا مگر وہ جرأت نہ کر سکا کہ مسلمانوں کے ساتھ لڑائی ٹھان سکے۔

چونکہ بدر کے مقام پر مسلمانوں کو ابوسفیان کے اس عمل سے بڑی وقعت حاصل ہو گئی تھی لہٰذا انہوں نے بدر کے میلے کی تجارت سے بڑا فائدہ اٹھایا مگر جونہی وہ مدینہ پہنچے معلوم ہوا قریشی سیاسی طور پر مدینہ کا مکمل محاصرہ کرنا چاہتے ہیں۔ جماعت قریش، جو مدینہ کی جنوبی جانب چار سو کلومیٹر کی دوری پر مکہ میں سکونت پذیر تھی اس نے یہودیانِ خیبر کے ساتھ جنگی اتحاد قائم کر لیا۔ خیبر مدینہ کے شمال میں دو سو کلومیٹر پر واقع ہے جہاں یہودیوں کے سوا اور کوئی آباد نہ تھا قریشیوں نے نہ صرف خیبر کے یہودیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا بلکہ وہ دو بدو قبیلوں، بنوفزارہ اور بنوغطفان کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرنے لگے۔ بنوفزارہ و غطفان کے قبائل، مدینہ کی شمالی جانب صحرا میں زندگی بسر کرتے تھے، قریشیان مکہ نے تو ان کے ساتھ اتحاد کر ہی لیا تھا، شہر خیبر کے یہودی بھی ان کے ساتھ اتحاد کی بات چیت کرنے لگے، طے یہ پایا کہ خرما کی پوری فصل قبیلہ

غطفان و بنوفزارہ کو دے دی جائے، بشرطیکہ قبائل مذکورہ حضرت محمد (ﷺ) کے خلاف ان کی مدد کریں۔ ان دونوں قبیلوں نے اس قرارداد کو منظور کر لیا اس طرح قریشیوں، یہودیوں اور ان دونوں قبیلوں کے درمیان جنگی اتحاد قائم ہو گیا۔

مدینہ کی مشرقی جانب ایک قبیلہ بنوسلیم آباد تھا طائفہ قریش نے انہیں بھی اپنا ہم خیال بنا لیا۔ اس طرح مدینہ سیاسی طور پر محصور ہو گیا اور بہت جلد یہ سیاسی محاصرہ، اقتصادی محاصرے کی شکل اختیار کر گیا کیونکہ مدینہ کے کارواں نہ شمال کی جانب جا سکتے تھے، نہ مشرق کی طرف اور نہ سمتِ جنوب۔ اس لیے کہ شمال میں بدو قبیلوں غطفان و بنوفزارہ سے انہیں سابقہ پڑتا تھا، جنوب میں قبائلِ قریش سے اور دو اور قبیلوں سے بھی جو قریش کے ساتھ متحد ہو گئے تھے یعنی کنانہ و ناقف، جانبِ مشرق میں قبیلہ بنوسلیم کاروان مدینہ کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ ایک اور بات جس نے مدینہ کے محاصرہ کی تکمیل کر دی یہ تھی کہ سوریہ (عربستان کا ایک مقام) کے قریب ایک شہر دومتہ الجندل تھا، مدینہ سے جتنے کارواں بھی شام یا بین النہرین کی طرف جاتے مجبور تھے کہ وہ دومتہ الجندل سے گزریں۔ اس شہر کے حاکم نے اعلان کر دیا کہ مدینہ کے کسی بھی قافلے کو ادھر سے گزرنے نہ دے گا۔ اور کوئی ایسا راستہ نہ تھا جس سے سوریہ اور بین النہرین کو جا سکیں۔ شہر دومتہ الجندل سے مسلمانوں کے قافلوں کو عبور نہ کر سکنے سے حضرت محمد اور ان کے متبعین ﷺ کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اگرچہ مدینہ میں بارش ہوتی تھی کھیت اور باغ تھے مگر پھر بھی اہل مدینہ اپنی ضروریات کو پورا نہ کر سکتے تھے کہ سوریہ اور بین النہرین کے راستہ تجارت کریں اور ضروریات باہر سے پورا کریں۔ حضرت محمد کو مدینہ کے اقتصادی محاصرہ سے افسوس ہوا مگر چونکہ وہ متوکل تھے لہٰذا خیال کرتے تھے کہ حالات سدھر جائیں گے۔

ہم اہلِ یورپ یہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں توکل کا مفہوم یہ ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو اور اپنی جگہ سے جنبش نہ کرو، اور منہ کھول کر آسمان کی طرف کر دو تاکہ آسمان سے لقمہ آگرے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے جو مسلمان خدا پر توکل کرتے ہیں وہ ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھتے اور سعی و کوشش میں سستی نہیں کرتے، البتہ سعی و جہاد میں اللہ پر توکل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک صاحبِ ایمان مسلمان سخت موقع پر بھی ناامید نہیں ہوتا وہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ شاید کوئی اعجاز رونما ہو جائے جو اسے نجات دلا دے۔

جب مدینہ کا محاصرہ مکمل ہو گیا تو قبائل قریش نے، اپنے رفیقوں کے اتفاق کے ساتھ جن میں سے ایک عبداللہ بن ابی رئیس منافقین تھا ایک منصوبہ تیار کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ کسی بہانے سے حضرت محمد کو شہر سے باہر لے جایا جائے اس طرح جب مسلمان شہر کے اندر تنہا رہ جائیں تو سب مل کر ایک دم مسلمانوں پر حملہ کر دیں اور سارے اہل اسلام کو تہ تیغ کر دیں۔ بحر نیلگوں کے کنارے ایک قبیلہ آباد تھا جسے بنو مصطلق کہتے تھے، اس کا سردار حرث تھا جسے حارث بھی کہتے تھے۔ قریش نے انہیں مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا تو وہ اہل مدینہ کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ جب رسول اللہ (ﷺ) کو معلوم ہوا کہ قبیلہ بنو مصطلق مدینہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو آپ نے پیش بندی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یعنی ان کے حملے سے پہلے ہی ان پر حملہ کر دیا جائے۔

مدینہ سے روانگی کے وقت آپ نے عبداللہ بن ابی سے کہا کہ وہ مسلمانوں کے اس چھوٹے سے لشکر کی سرداری قبول کرے۔ عبداللہ بن ابی رئیس منافقین، جس کے ذریعہ سے قریش و یہود مسلمانوں پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ وہ اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار نہ کر سکا۔ چنانچہ رسول اکرم بحیثیت سپہ سالار اسلام، عبداللہ بن ابی کو اپنے ساتھ مدینہ سے باہر لے گئے اور اس طرح مدینہ کے منافق بغیر سردار کے رہ گئے لہذا قریش و یہود نے جو نقشہ تیار کیا تھا وہ اس پر عمل نہ کر سکے اور آپ کی عدم موجودگی میں مدینہ پر حملہ آور نہ ہو سکے۔ اس جنگی سفر میں غازیان اسلام بہت تھوڑی تعداد میں تھے یہ صرف تیس مجاہد تھے دس مہاجر اور بیس انصار تھے جب کہ بنو مصطلق کے دو سو اشخاص تھے، جانبازان اسلام مدینہ کی مغربی جانب آٹھویں منزل پر ان سے لڑے۔ گو مردانِ بنو مصطلق کی تعداد مسلمانوں سے سات گنا کے قریب زیادہ تھی مگر مسلمانوں نے ان کے دس آدمی مار ڈالے اور سارے قبیلے کو گرفتار کر لیا، مسلمانوں میں سے صرف ایک مجاہد شہید ہوا۔

بنو مصطلق کی مسلمانوں کے ساتھ جنگ، دراصل قریش کی اطاعت میں تھی بلکہ ان کے مزدور کی حیثیت (MERCENERY) تھی، مسلمانوں نے انہیں حربی کافر قرار دیا یعنی وہ کافر جو اسلام کے خلاف تلوار اٹھائے۔ لہذا ان کے مردوں کو غلام اور عورتوں کو کنیز بنا لیا۔ حارث، رئیس قبیلہ بنو مصطلق بھی گرفتار ہوا۔ حسب دستور عرب تمام قیدی، مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ حارثِ مصطلق کی بیٹی جویریہ حضرت محمد (ﷺ) کے حصے میں آئیں۔

جویریہؓ بیوہ تھیں مگر جوان و حسین تھیں، گرفتار ہونے کے بعد حضرت محمد (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے کہا۔ "میں نے سنا ہے آپ پیغمبر ہیں لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ عادل ہیں، آپ نے مجھے گرفتار کرایا ہے تو کچھ ایسا کر دیجئے کہ میں آزاد ہو سکوں"۔ حضرت محمد نے فرمایا، "میں نے ظلماً تمہیں گرفتار نہیں کیا، تم اپنے باپ کے کردار کی وجہ سے اسیر ہوئی ہو، اگر تمہارا باپ مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہ کرتا تو وہ گرفتار ہوتا نہ تم، نہ اس بات کی نوبت آتی کہ تم مجھ سے ایسی درخواست کریں"۔ جویریہؓ بولیں، "یا محمد! میں کبھی کنیز نہیں رہی، نہ کبھی میں نے لونڈی پن کیا ہے، نہ میں کسی کی کنیز بن سکتی ہوں" رسول اللہ نے دریافت کیا، کیا تم پیغمبر اسلام کی زوجہ بننا پسند کرتی ہو؟" ارد گرد جو مسلمان بیٹھے تھے انہیں حیرت ہوئی کہ آپ کیا فرما رہے ہیں، مگر انہیں معلوم نہ تھا کہ اس شادی سے آپ کا کیا مقصد ہے؟ جویریہؓ دخترِ سردارِ بنو مصطلق بولیں، "ہاں یا محمد میں حاضر ہوں، میں آپ کی زوجہ بننے کے لئے تیار ہوں"۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں نکاح ہو گیا اور وہ زوجہ پیغمبر اسلام بن گئیں۔

بعد ازاں مسلمانوں کو خیال آیا کہ جویریہؓ کے باپ، رسول اللہ کے خسر ہو گئے ہیں، مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ پیغمبر کے سسر غلام ہوں لہٰذا حارث کے آقا نے کہا۔ میں نے حارث کو آزاد کر دیا۔"

عرب کے چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں تمام افراد قبیلہ عزیز شمار ہوتے تھے اور سب ایک ہی خاندان کے فرد سمجھے جاتے تھے۔ اس وجہ سے جتنے بھی بنو مصطلق کے قیدی مسلمانوں کے غلام تھے سب آزاد کر دیئے گئے کیونکہ اس شادی کے بعد وہ رسول اللہ (ﷺ) کے قریبی عزیز ہو گئے تھے لہٰذا مسلمان انہیں کنیز و غلام نہ دیکھ سکتے تھے۔ بنو مصطلق نے مسلمانوں کی یہ شرافت دیکھی تو سب کے سب مسلمان ہو گئے سب سے پہلے حضرت جویریہؓ کے باپ حارثِ مصطلق مسلمان ہوئے۔ مسلمان ہو جانے کے بعد یہ قبیلہ ہمیشہ اسلام کا وفادار رہا اور انہوں نے میدانِ جنگ میں بڑی جاں نثاری کا ثبوت دیا۔ تب مسلمانوں کو پتہ چلا کہ پیغمبر (ﷺ) کا اس عقد سے کیا مقصد تھا۔ دراصل اس شادی سے مقصود یہی تھا کہ یہ قبیلہ مسلمان ہو جائے۔

عبداللہ بن ابی جو مجبوراً رسول اللہ کے ساتھ میدان جنگ میں مدینہ سے باہر گیا تھا جب اس نے دیکھا کہ مسلمان کامیاب ہو گئے اور حضرت محمد نے اپنی حکمت عملی سے کس طرح اس

قبیلے کو حلقہ بگوشِ اسلام کر لیا ہے تو اسے بڑا غصہ آیا لہٰذا اس نے ارادہ کر لیا کہ مدینہ پہنچنے سے پہلے پہلے آپ کو غائب کر دے۔ بنو مصطلق کے اسلام لانے کے بعد جب رسول اللہ نے مدینہ کو واپس جانا چاہا تو عبداللہ بن ابی نے ایک فتنہ برپا کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے حضرت محمد کے اس چھوٹے سے لشکر کے ان افراد کو جمع کیا جو مہاجر تھے اور ان سے کہا، "دیکھتے ہو پیغمبر نے تمہیں کس طرح حق سے محروم کر دیا"۔ انہوں نے پوچھا وہ کیسے؟ وہ بولا۔ "تم لوگ مدینہ سے چل کر یہاں آئے اور اس امید پر لڑے کہ مالِ غنیمت ہاتھ آئے گا، مگر جنگ ختم ہو جانے کے بعد حضرت محمد نے جویریہؓ دختر حارث مصطلق سے شادی کر لی، بالآخر تم مجبور ہو گئے کہ اپنے غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کر دو، اب تم لوگ مدینہ بالکل خالی ہاتھ لوٹ کر جاؤ گے" اس کے بعد اس نے ایک علیحدہ مقام پر انصاریوں کو جمع کیا اور ان سے کہا۔ "اس سفر میں تم نے فریب کھایا ہے" انہوں نے دریافت کیا وہ کیسے؟ وہ بولا، "اس لیے کہ تم مالِ غنیمت سے محروم ہو گئے ہو، مجھے حیرت ہے تم نے کیوں اپنے غلام و کنیز آزاد کر دیئے۔ اگر حضرت محمد نے جویریہؓ بنت حارث کے ساتھ شادی کر لی تھی تو تمہیں کیا پڑی تھی کہ اپنے غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کرتے؟" جان نثاران انصار نے کہا۔ "جویریہؓ کے ساتھ آپ کی شادی اسلام کی وسعت کا سبب بنی ہے، ایک پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا ہے لہٰذا ہمیں اس بات کی کوئی شکایت نہیں کہ ہمیں اس لڑائی میں مال غنیمت کیوں نہیں ملا" عبداللہ بن ابی نے دیکھا کہ انصاری اس کے فریب میں نہیں آ سکتے تو وہ مہاجروں اور انصاروں کو آپس میں لڑانے کا منصوبہ بنانے لگا، اس نے مہاجرین سے کہا، حضرت محمد تو بڑے ہوشیار آدمی ہیں انہوں نے انصاریوں کو فریب (نعوذ باللہ) دے کر خوش کر دیا وہ لوگ مالِ غنیمت سے محروم ہو جانے کے باوجود بھی خوش ہیں، کہتے ہیں ہم راضی ہیں۔ تم لوگوں کو چاہئے کہ اس فریب سے انہیں آگاہ کرو۔"

قریب تھا کہ حضرت محمد کے اس معمولی سے لشکر میں تلوار چل جاتی کہ عبداللہ بن ابی کا جوان بیٹا، جو اس سفر میں اس کے ساتھ تھا حضرت محمد کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا واقعہ سنایا اور کہا، "جلدی کوئی اقدام کیجئے ورنہ لڑائی شروع ہو جائے گی" حضرت محمد کے کلام کی تاثیر سے وہ لوگ آپس میں جنگ و جدل سے باز رہے۔ آپ نے سوچا کہ کہیں پھر بگاڑ پیدا نہ ہو جائے لہٰذا فوری طور پر مدینہ واپس جانے کا حکم دے دیا، سب چل کھڑے ہوئے، آپ نے حکم دیا کہ تیز تیز

چلیں کیونکہ آپ جانتے تھے کہیں عبداللہ بن ابی کی کسی حرکت سے فتنہ برپا نہ ہو جائے۔

عبداللہ بن ابی کا نوجوان بیٹا راہ میں پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا۔

"یا محمد جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا میرا باپ یہ چاہتا تھا کہ آپ کے فدائیوں کو آپ کے خلاف بھڑکا دے تا کہ آپ کو شہید کرا سکے، چونکہ اس نے آپ کے خلاف سازش کرنی چاہی تھی لہٰذا وہ واجب القتل ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے مار ڈالوں، یہ بات میں آپ کے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں کہ مدینہ بھر میں کوئی بھی میرے برابر، اپنے باپ کا وفادار نہیں ہے مگر جب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ میرا باپ، نبی کے ساتھ دغا کرنا چاہتا ہے تو میں اسے مستحق ہلاکت سمجھتا ہوں، آپ جب بھی مجھے اس کے قتل کرنے کا حکم دیں گے میں اس پر عمل کروں گا"۔

عبداللہ بن ابی کے نوجوان بیٹے کی ان باتوں سے نبی کریم پر بڑا اثر ہوا، کیونکہ وہ جوان فرزند سچے دل سے باتیں کر رہا تھا، آپ نے اس سے فرمایا، "میں تیرے باپ کو قتل کا حکم صادر نہیں کر سکتا، میں نہیں چاہتا کہ وہ مارا جائے بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ زندہ رہے اور ہمارے درمیان زندگی بسر کرے" حضور یہ جانتے تھے کہ عبداللہ بن ابی غدار ہے مگر اس کے قتل سے درگزر فرمایا کیونکہ آپ بہت زیادہ نرم دل تھے۔

واقعۂ اِفک

عبداللہ بن ابی احسان شناس نہ تھا، وہ شکر کرتا کہ آپ نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ مگر اس کے بجائے وہ اولین فرصت سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اس نے رسول خدا پر ایک اور ضرب لگائی، ایک ناگہانی واقعہ جس کا تعلق حضرت عائشہؓ سے تھا، ظہور پذیر ہوا، عبداللہ نے اس فرصت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام سفر میں ہمیشہ ایک زوجہ مطہرہ کو اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے، جن کا انتخاب قرعہ اندازی کے ذریعہ ہوا کرتا تھا تا کہ کسی کو ناراضی کا موقعہ نہ ملے۔ بنو مصطلق کی جنگ پر جب آپ روانہ ہوئے تو قرعہ حضرت عائشہؓ کے نام نکلا تھا، حضرت عائشہؓ کجاوہ پر سوار ہو کر میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ لوٹتے وقت جس راہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ وہاں حضرت عائشہؓ رفع حاجت کے لئے اتریں۔ اس وقت ان کی عمر پندرہ

سال تھیں۔ جب وہ لوٹیں تو حیرت زدہ رہ گئیں، دیکھا کہ قافلہ روانہ ہو کا تھا۔ جس وقت قافلہ روانہ ہونے لگا تو حسب عادت لوگوں نے کجاوہ اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیا وہ یہ سمجھتے رہے کہ عائشہؓ سو رہی ہیں لہٰذا ان کی عدم موجودگی کا انہیں علم نہ ہو سکا اور وہ روانہ ہو گئے۔

حضرت عائشہؓ نے جو یہ دیکھا کہ قافلہ روانہ ہو چکا ہے تو وہ روتی ہوئی قافلہ کے پیچھے دوڑیں مگر قافلہ کو نہ پا سکیں، زمین پر بیٹھ کر خدا سے التجا کرنے لگیں، اے خدا تو نے مجھے اسلام پر پیدا کیا زوجہ پیغمبر بنایا، مجھے اس مصیبت سے نجات دے"۔ ایک گھنٹے کے بعد ایک شتر سوار جوان، سریع السیر، کا ادھر سے گزر ہوا، یہ صفوان بن معتقل سہمی، رسول اللہ کے قافلہ کے نگہبان تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک عورت زمین پر بیٹھی ہیں وہ قریب گئے تو بولے۔ آپ یہاں کیسے اور کس لئے؟ حضرت عائشہؓ نے واقعہ بیان کر دیا تو صفوان نے انہیں اپنے اونٹ کی پشت پر سوار کر لیا اور مدینہ کی راہ لی۔ رسول اللہ کے قافلہ کے اگلے دن ہی وہ مدینہ میں داخل ہوئے۔

عبداللہ بن ابی نے جو یہ سنا کہ صفوان بن معتقل سہمی حضرت عائشہؓ کو لائے ہیں تو اس نے موقع کو غنیمت جانا کہ افتراء پردازی سے حضرت محمد کو دکھ پہنچائے۔ کچھ لوگ بھی عبداللہ کے ہم نوا ہو گئے۔ ان میں زید بن رفاعہ، حسان بن ثابت شاعر مشہور اور مسطح بن اثاثہ بھی تھے۔ مسطح بن اثاثہ حضرت عائشہؓ کے دور کے رشتے دار تھے کیونکہ وہ حضرت ابوبکر ؓ کی خالہ کے نواسے تھے۔ عبداللہ بن ابی اور دوسرے لوگ مدینہ کے کوچہ کوچہ کا صبح سے شام تک چکر لگاتے رہے اور لوگوں سے یہ کہتے رہے کہ صفوان، بھی جوان اور عائشہ بھی جوان، یہ دونوں ایک رات دن صحرا میں رہے ہیں۔ یہودی، حضرت محمد کے دشمن تھے ہی، انہوں نے اور زیادہ پروپیگنڈا کیا۔ حضرت حسان بن ثابت جو شاعر تھے اور وہم و تخیلات پر چلتے تھے وہ بھی اس رو میں بہہ گئے۔

حضرت محمد نے اسامہ بن زید سے مشورہ لیا کہ کیا کرنا چاہئے؟ انہوں نے کہا، "یا رسول اللہ! آپ کی زوجہ عائشہؓ میں کسی قسم کا عیب نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ نوعمر ہیں چنانچہ جب وہ آٹا لے کر روٹیاں پکانے بیٹھتی ہیں تو بکریاں آ کر آٹا کھا جاتی ہیں"۔ پھر آپ نے اپنے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علی کے ساتھ مشورہ کیا، فرمایا، اے علی! میں عائشہ کے بارے میں کیا کروں؟" حضرت علی نے فرمایا۔ "اگر آپ انہیں گنہگار نہیں سمجھتے تو اس پروپیگنڈے کی پرواہ نہ کیجئے اور اگر گنہگار سمجھتے ہیں تو طلاق دے دیجئے آپ کے لئے عورتوں کی کیا کمی ہے" کہتے ہیں

حضرت علی و عائشہ میں اسی دن سے مخالفت کا آغاز ہو گیا۔ حضرت محمد، عائشہؓ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: ''تمہیں پتہ ہے کہ لوگ تمہارے بارے میں کیا کچھ کہہ رہے ہیں؟'' یہ بات سن کر حضرت عائشہؓ رونے لگیں اور عرض کی، ''یا رسول اللہ یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں جھوٹ ہے میں کسی گناہ کی مرتکب نہیں ہوئی''۔

بعد ازاں وحی نازل ہوئی، حضرت عائشہؓ کے بارے میں یہ سب سے پہلی آیت ہے جو قرآن کی چوبیسویں سورۃ النور کی گیارہویں آیت ہے۔ یہ آیت اس طرح ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ.

''جن لوگوں نے بہتان طرازی کی ہے وہ تم ہی میں سے ہیں اسے اپنے لئے برا نہ سمجھو بلکہ یہ بھلا ہی ہے ہر شخص کو اس کے گناہ کی سزا ملے گی جس نے سب سے بڑا جھوٹ گھڑا ہے اس کے لئے سخت عذاب ہے۔'' (مراد عبداللہ ہے)

سورہ نور کی بارھویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''تم مسلمان مرد و زن با ایمان ہو، جب تم نے افتراء پردازی کی خبر سنی تو اپنے جیسے ایمان والوں کے بارے میں (یعنی عائشہؓ و صفوان کے بارے میں) کیوں اچھا گمان نہیں کیا اور یہ کیوں نہ کہا کہ یہ بات (یعنی افتراء) بے بنیاد تہمت ہے''۔

اسی سورت کی تیرھویں آیت میں اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔

لَّوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ.

(''وہ کیوں نہیں چار گواہ لائے اور جب گواہ نہیں لائے تو یہ اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں۔'')

مطلب یہ کہ اگر یہ لوگ اپنی تہمت لگانے میں سچے ہیں تو چار گواہ لائیں تاکہ ثابت ہو کہ عائشہ گناہ کی مرتکب ہوئی ہیں، اگر ایسا نہیں ہے تو ویسا بھی نہیں ہے۔ جو لوگ اسلام سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی مرد یا عورت پر تہمت لگائے کہ وہ زانی یا زانیہ ہے، تو اسے حکم قرآن کے مطابق چار گواہ پیش کرنے چاہئیں۔ وہ چار شخص یہ گواہی دیں کہ ہم نے بچشم خود انہیں گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ چاروں گواہوں کی گواہی صریح و

صاف ہونی چاہئے۔

اگر گواہ یہ شہادت دیں کہ ہم نے مرد و زن کو، جو آپس میں میاں بیوی نہ تھے ایک مکان میں تنہا بند دیکھا اور وہ دیر تک بند رہے۔ تب بھی یہ گواہی ثبوت گناہ کے لئے کافی نہیں ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے وہ گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں۔ جو کوئی کسی پر تہمت زنا رکھتا ہے اسے چار شاہد لانے چاہئیں، اگر وہ چار گواہ نہیں لا سکتا تو وہ مفتری ہے، گنہگار ہے اور لائق سزا ہے۔ حضرت عائشہؓ کی بے گناہی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ چوبیسویں سورۃ النور کی بارھویں آیت سے ستائیسویں آیت تک اللہ تعالیٰ نے ان کی بے گناہی کا اظہار کیا ہے اور اپنے پیغمبر اور مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ دختر ابوبکرؓ و زوجہ پیغمبر مرتکب گناہ نہیں ہوئیں۔ ان آیتوں کے اترنے سے مسلمان بہت خوش ہوئے کیونکہ مسلمان جو سب کے سب عرب تھے اور عورت کے بارے میں بڑے تعصب وحمیت سے کام لیتے تھے وہ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کی تہمت سے بڑے ملول تھے اور ان کے اشعار ہجویہ سے بڑی سخت تکلیف محسوس کرتے تھے۔

جب مذکورہ بالا آیتیں نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کی بے گناہی کی تصدیق و تائید کر دی تو سب خوش ہو گئے اور عبداللہ بن ابی نے دیکھ لیا کہ وہ اس تہمت کے ذریعہ جو ضرب کاری حضرت محمد اور ان کے ساتھیوں پر لگانا چاہتا تھا کامیاب نہ رہی۔ ان آیتوں کے اترنے کے بعد حضرت محمد اور مسلمان اطمینان خاطر سے نئی صورت حال کے مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔

عربستان میں پہلی خندق

حضرت محمد کے پاس معقول ذرائع اطلاعات تھے۔ وہ جانتے تھے اہل قریش، مکہ میں، دس ہزار کا ایک لشکر جمع کرنا چاہتے ہیں تاکہ مدینہ حملہ کر کے مسلمانوں اور اسلام کو برباد کر دیں۔ اگرچہ قریشی اتنا بڑا لشکر جمع کر رہے تھے مگر وہ حضرت محمد کی جنگی مہارت سے بہت خائف تھے لہٰذا یہ جرات نہ کر سکتے تھے کہ ان کے مدینہ میں موجود ہوتے ہوئے حملہ کر سکیں۔ وہ منتظر رہتے تھے کہ آپ مدینہ سے باہر کہیں تشریف لے جائیں تو ہم حملہ کر دیں۔ ادھر آپ

مدینہ سے باہر جائیں اور ادھر ہم یہودیوں اور منافقوں کی مدد سے شہر کا محاصرہ کر لیں اور اسلام کا قلع قمع کر دیں۔

قریشیوں کو یہ اطلاع ملی کہ آپ ایک سرحدی بستی دومتہ الجندل کی طرف جانے پر مجبور ہیں اور وہاں کے سردار سے جنگ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ دومتہ الجندل کے حکمران نے یہودیان خیبر اور قریشیوں سے مل کر یہ ساز باز کی تھی کہ مدینہ کے قافلے کو سوریہ اور بین النہرین کی طرف جانے نہ دیا جائے۔ حضرت محمد کو یہ معلوم تھا کہ جماعتِ قریش ایک بڑا لشکر تیار کر رہی ہے اور مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہتی ہے مگر آپ مجبور تھے کہ دومتہ الجندل کی طرف جا کر مذاکرات یا مجادلہ کے ذریعہ سے مدینہ کے قافلوں کو شام و بین النہرین کی طرف جانے سے روکنے نہ دیں۔ دومتہ الجندل کے حاکم نے اس قدغن سے گویا اہل مدینہ کا گلا گھونٹ رکھا تھا اور انہیں سانس تک نہ لینے دیتا تھا لہٰذا پیغمبر اسلام چاہتے تھے کہ اس سے گلو خلاصی کرائیں۔

حضرت محمد نے دومتہ الجندل کی جنگ کو اس لیے ترجیح دی کہ ایک تو یہ بستی مدینہ سے بہت قریب تھی اور دوسرے آپ کے جاسوس اطلاع دے رہے تھے کہ ابھی تک مکہ کا لشکر تیار نہیں ہو سکا۔ لہٰذا حضرت محمد ایک ہزار غازیوں کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور دومتہ الجندل کا رخ کیا، راہ میں قبیلۂ غطفان پڑا تو یہ مناسب جانا کہ اس کے سردار سے مل کر گفتگو کریں شاید وہ غیر جانب دار بن جائے۔ ہم یہ بات پہلے بیان کر چکے ہیں کہ بدو عرب جو کچھ سوچتا ہے وہی کہتا ہے۔ اس کی فکر اور بیان میں کوئی تضاد یا تفاوت نہیں ہوتا۔

رسول اللہ سے گفتگو کرتے ہوئے سردار قبیلہ غطفان نے وہی کچھ کہا جو اس کے دل میں تھا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں طائفہ قریش اور یہودیان خیبر کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف معاہدہ کر چکا ہوں، اور اس کے عوض ان سے خرما لے چکا ہوں۔ اگر آپ ان سے زیادہ خرما دے سکتے ہیں تو میں ان سے اپنا معاہدہ فسخ کر لوں گا اور دونوں سے کنارہ کش ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا، "یا (ﷺ) محمد! اس سے زیادہ مجھے بات چیت کرنے کی فرصت نہیں ہے کیونکہ مجھے اپنے قبیلہ کے ساتھ رفاقت کرنی ہے، قریشیوں کا لشکر جو مدینہ کی راہ پر جا رہا ہے میرا قبیلہ بھی ادھر روانہ ہو چکا ہے تاکہ ہم مل کر مدینہ کا محاصرہ کریں" غطفان کے سردار قبیلہ سے جو

آپ نے یہ خبر سنی تو اسے بالکل صحیح سمجھا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ رئیس قبیلہ غلط نہیں کہہ سکتا مگر یہ سوچنے لگے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے اسے جماعت قریش نے غلط خبر دی ہو۔ پھر یہ سچ ہے کہ قریشیوں کا لشکر مدینہ کی طرف روانہ ہو چکا ہے، آپ نے مراجعت کا ارادہ کر لیا اور بڑی تیزی کے ساتھ مدینہ پہنچ گئے۔ عبداللہ بن ابی اور یہودی آپ (ﷺ) کی اچانک واپسی کی خبر سن کر حیران رہ گئے کیونکہ وہ آپ کی اس عادت سے اچھی طرح واقف تھے کہ جب بھی کسی سفر پر جنگ کی غرض سے تشریف لے جاتے ہیں تو بغیر غزوہ کے واپس نہیں آتے۔

راہ سے واپس چلے آنے کے بعد قبیلہ خوزہ کے چند افراد مدینہ آئے اور اطلاع دی کہ لشکر قریش مکہ سے روانہ ہو چکا ہے ان لوگوں نے کہا کہ افواجِ قریش کو مکہ سے مدینہ پہنچنے میں گیارہ دن لگیں گے مگر قریشی لشکر چوتھے دن مدینہ پہنچ گیا کیونکہ انہوں نے رات دن سفر کیا تاکہ آپ کو خبر پہنچنے سے پہلے مدینہ جا پہنچیں۔ جو لوگ قریش کی روانگی کی اطلاع لائے تھے انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ دس ہزار سپاہی لے کر چلے ہیں، سب کے سب مکمل طور پر ہتھیار بند ہیں اور اس بات کا پختہ ارادہ کر چکے ہیں کہ اس وقت تک مکہ واپس نہیں جائیں گے جب تک کہ مدینہ سے اسلام کا قلعہ قمع نہ کر دیں گے۔ یہ اطلاع پاتے ہی آپ نے فوراً مسلمانوں کو حکم دے دیا کہ جنگ کے لئے آمادہ ہو جائیں اور فرمایا، "اس دفعہ مشرکین کا لشکر پہلے سے بھی زیادہ ہے لہٰذا تم لوگوں کو مدافعت کے وسائل زیادہ سے زیادہ فراہم کرنے چاہئیں"۔ لشکر قریش کی مدافعت کے لئے آپ نے جو وسیلہ دفاع تجویز فرمایا، وہ مدینہ کے گرد ایک خندق کا کھودنا تھا اسی لیے اس جنگ کو غزوہ خندق کہتے ہیں، یہ جنگ 627ء مطابق ماہ شوال 5ھ میں مسلمانوں اور قریش و یہود کے درمیان ہوئی اور چونکہ اس جنگ میں قریش کی حمایت میں مختلف قبائل نے شرکت کی تھی لہٰذا اسے غزوہ احزاب بھی کہتے ہیں۔ (حزب کی جمع احزاب ہے بمعنی گروہ ہے)۔

حضرت محمد کا یہ طرز جنگ نہ صرف ایک عام آدمی کے لئے باعثِ حیرت ہے بلکہ ایک ماہر جنگ کے لئے بھی باعث تعجب ہے کہ پیغمبر اسلام نے یہ طرز جنگ کس طرح سوچا اور اس پر کیسے عمل کیا۔ کسی طرز جنگ کا ایجاد کر دینا دلیل مہارت جنگی نہیں ہے کیونکہ ایسے کتنے ہی افراد ہیں جو گھر بیٹھے صفحۂ قرطاس پر بہترین نقشہ جنگ بنا سکتے ہیں مگر میدانِ جنگ میں اپنے بنائے ہوئے

کسی ایک نقشہ کو بھی عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔

عربستان میں جنگ کے لیے خندق کھودنے کا رواج نہ تھا جس طرح کہ اس طرز کی صف آرائی کا بھی رواج نہ تھا جو حضرت محمد (ﷺ) نے ایجاد کی تھی۔ اس کی ابتداء بھی عرب میں حضرت محمد نے کی۔ مسلمانوں میں ایک شخص "روزبہ مہیار" تھا جسے مسلمان، سلیمان فارسی کہتے تھے، انہوں نے حضرت محمد سے کہا تھا کہ ایران میں شہر یا قلعہ کی حفاظت کے لئے خندق کھودی جاتی ہے جو اس قدر لمبی چوڑی ہوتی ہے کہ مقابل کے سوار اور پیادہ اسے عبور نہیں کر سکتے۔

سلمان فارسی ﷜ بلند قامت، کشادہ سینہ والے اور مضبوط مرد تھے۔ رسول اللہ کے ساتھ بہت اخلاص رکھتے تھے چونکہ، یہ تجویز انہوں نے پیش کی تھی لہٰذا آپ نے قبول فرمائی۔ سلمان فارسی کی تجویز کو قبول کرنا آسان تھا مگر اس پر عمل کرنا بڑا ہی مشکل تھا کیونکہ خندق ایسی ہونی چاہیے تھی جو دشمن کے خطرے کا مقابلہ کر سکے اور مدینہ شہر کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہو۔ مسلمانوں کی تعداد تھوڑی تھی اور وقت بھی تھوڑا تھا۔ اس کے باوجود لوگوں نے آپ کے اشارے پر خندق کھودنا شروع کر دی۔

خندق کھودنے کے حکم کے ساتھ ساتھ آپ نے یہ حکم بھی دیا کہ مدینہ کے باہر جو کچھ بھی از قسم زراعت و ثمر ہے سب کو توڑ کر شہر میں لایا جائے تا کہ دشمن ان سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور مدینہ کے کھیتوں اور باغوں کو برباد نہ کر سکے۔

یہ طریقہ دوسری جنگ عظیم میں روس نے جرمنی کے خلاف اختیار کیا تھا تا کہ جرمن ان کے کھیتوں اور باغوں سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ چودہ صدی پیشتر حضرت محمد (ﷺ) نے یہ طریقہ کار اختیار کیا تھا لوگوں نے سارے پھل اور غلہ مدینہ میں لا کر اکٹھا کر دیا، نتیجہ یہ کہ جب اہل مکہ کا لشکر مدینہ پہنچا تو انہیں سامان رسد کی بڑی تکلیف ہوئی۔ مدینہ کے تمام مرد و زن، اسی طرح مسلمان لڑکے اور لڑکیاں غرض جو بھی پھاوڑا چلا سکتا تھا خندق کھودنے میں لگ گیا۔

خندق کا نقشہ اس طور پر تھا کہ خندق، شمال و مغرب، جنوب مغرب اور کچھ حصہ جنوب مدینہ کو احاطہ کئے ہوئے تھی، شمالِ مدینہ کے قلعہ شیخین سے شروع ہو کر قبا کے جانب جنوب پر ختم ہوتی تھی۔ خندق کا نقشہ کچھ اس طرح بنایا تھا کہ جس مقام پر بھی زمین کے موانع طبیعی، دشمن کے

روکنے میں مدد دیتے تھے، ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا تھا تاکہ وہ مسلمان جو مدینہ کے اندر ہیں دشمن کے مقابلے کے لئے ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ مدینہ میں لمبائی کے ناپنے کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا یعنی کہنی سے لے کر بیچ کی انگلی تک ایک ذراع شمار کیا جاتا تھا جسے آج کل کے حساب سے نصف میٹر کہنا چاہئے۔ حضرت محمد نے ہر دس آدمیوں کی جماعت کو چالیس ذراع خندق کھودنے کا کام سپرد کیا تھا۔ مجھے پھر افسوس کے ساتھ تذکرہ نگارانِ اسلام کی سستی کا شکوہ کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس خندق کی چوڑائی کا ذکر نہیں کیا جو مدینہ کی تین طرف کھودی گئی تھی، خندق کا طول بارہ ہزار ذراع تھا یعنی آج کل کے پیمانے کے مطابق چھ کلومیٹر تھا۔ اس کی گہرائی پانچ ذراع یعنی ڈھائی میٹر سے زیادہ تھی گویا تین میٹر سمجھنی چاہئے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ لمبی خندق بڑی چوڑی اور عمودی دیواروں والی تھی۔ اگر خندق کی دیواریں عمودی نہ ہوتیں تو سوار و پیادہ اسے پار کر کے شہر میں داخل ہو جاتے۔ قدیم زمانے کی لڑائیوں میں ایک بے آب خندق پر آب خندق سے بہتر سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ اس کے ذریعے شہر یا قلعہ کی بخوبی حفاظت ہو سکتی تھی۔ خندق میں اگر پانی ہوتو سوار، گھوڑوں کے ذریعہ تیر کر آ جاتے یا کشتی وغیرہ پر سوار ہو کر خندق پار کر لیتے اور شہر یا قلعہ میں گھس جاتے۔ اس چھ کلومیٹر کی خندق کھودنے پر مسلمان رات دن لگے رہے۔ یہ لمبائی اس دور کے اعتبار سے بھی اچھی خاصی ہے۔ دس دس آدمیوں کا دستہ جو خندق کھودنے پر مامور تھا، باری باری سوتا در نہ جاگتے رہتے اور خندق کھودتے رہتے۔ حضرت محمد بھی ان کی مدد کرتے، پھاوڑا چلاتے اور مٹی اپنے سر مبارک پر رکھ کر ڈھوتے۔

ایک دن حضرت ابوبکر اور عمر بن الخطاب نے مٹی اٹھانے کی ٹوکری، دوسروں کو دے دی تھی، لہٰذا ان کے پاس کوئی ٹوکری نہ تھی تو یہ دونوں حضرات اپنی چادر میں مٹی ڈال کر پھینکنے جاتے۔ حالانکہ یہ دونوں ہجرت سے پہلے مکہ میں بڑے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ خندق، شمالِ مدینہ کے مقام شیخین سے شروع ہو کر قبا کی طرف ختم ہوتی تھی۔ لہٰذا مدینہ کی ایک جانب یعنی شمالِ مشرقی، مشرق اور جنوبِ مشرقی میں کوئی خندق نہ تھی مگر ان تینوں حصوں میں مدینہ کے گھنے باغ اور ان کی چھوٹی چھوٹی گلیاں دشمن کے لیے روک کا کام دے رہی تھیں۔ ان اطراف میں

مسلمان تیر انداز اور گوپھن چلانے والے درختوں پر تعینات تھے جو مکہ کے پیادوں اور سواروں کو آگے بڑھنے نہ دیتے تھے۔ لہٰذا مکہ کے پیادے اور سوار آسانی کے ساتھ اس راہ کو قطع نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے حضرت محمد نے اس جانب خندق کی کھدائی کو ضروری نہ سمجھا اور جنگ نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کا خیال درست تھا۔

جو مسلمان خندق کھودنے پر تعینات تھے آپ نے انہیں اجازت دے دی تھی کہ وہ بلند آواز سے خندق کھودتے وقت گا سکتے ہیں بلکہ جو لوگ خوش الحان تھے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ گائیں تاکہ کام کرنے والوں کی تھکاوٹ دور ہو، جو لوگ شعر کہہ سکتے تھے ان سے فرمایا کہ وہ جوشیلے شعر گائیں تاکہ کام کرنے والوں کی ہمت بندھے اور انہیں تقویت حاصل ہو۔

عمارہ حزم، بارہ سالہ لڑکے تھے وہ بہت خوش الحان تھے۔ ایک دن حضرت محمد اس طرف جا نکلے جہاں عمارہ کام کر رہے تھے، ان کی خوش الحانی سنی تو انہیں اپنے ساتھ لیا اور ہر طرف ان کے ساتھ چکر لگایا تاکہ سب کام کرنے والوں کی طبیعت خوش ہو جائے۔ جب بھی کوئی دس نفری جماعت اپنے کام سے فارغ ہو جاتی تو وہ بجائے چلے جانے یا آرام کرنے کے دوسری پارٹی کی مدد کرتی۔ اس طرح ہمت اور وارفتگی کی مثال دنیائے قدیم میں بہت کم ملتی ہے۔

دور جدید میں ہمارے پاس سوائے باشندگان لینن گراڈ کی فداکاری کے اور کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ مرد و زن شہر سے باہر نکلے، پھاوڑا سنبھالا، خندق کھودنے لگے اور اس کے استحکام میں لگ گئے تاکہ دشمن کے لشکر کا مقابلہ کریں۔

جب اہل مکہ کا لشکر مدینہ آیا تو مسلمان خندق کی تکمیل کر چکے تھے اور ہتھیار سنبھال چکے تھے۔ غزوہ احد کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ لشکر مکہ، مدینہ کی جنوبی سمت سے حملہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ سنگلاخ زمین اونٹوں کے عبور کرنے کے لئے سازگار نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دوسری بار بھی لشکر مکہ، مدینہ شہر سے دور رہا حتیٰ کہ راہ شمال و مغرب سے یعنی دامنِ کوہ احد سے مدینہ کی طرف جا پہنچا۔

اس دفعہ بھی سپہ سالار مکہ ابوسفیان تھا، اسے یہ توقع تھی کہ دامن کوہ احد میں پہنچ کر وہ مسلمانوں کے لشکر سے دوچار ہوگا اور انہیں نیست و نابود کر دے گا۔ مکی لشکر میں دس ہزار سپاہی

تھے جن میں سے بیشتر اہل مکہ تھے اور کچھ لوگ دوسرے قبائل کے افراد تھے جیسے بنو فزارہ، بنو غطفان، قبیلہ احابش، تہامہ اور کنانہ وغیرہ۔

ابوسفیان کو کامل یقین تھا کہ وہ دامن کوہ احد میں مسلمان لشکر پر ضرب کاری لگا سکے گا جب اس نے افواج اسلام کو وہاں نہ پایا تو حکم دے دیا کہ مدینہ پر حملہ کر دیا جائے مگر لشکر قریش نے مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہا تو سامنے خندق دیکھی۔ بصورت حصار استحکامات سے اہل عرب نا آشنا نہ تھے مگر آج تک انہوں نے خندق نہ دیکھی تھی لہٰذا وہ خندق دیکھ کر حیران رہ گئے اور ٹھہر گئے۔ ابوسفیان بھی جب خندق پر پہنچا تو اپنے جانبازوں کی طرح وہ بھی حیران رہ گیا۔ اگر کوئی ایرانی یا رومی سپہ سالار لشکر ہوتا تو وہ خندق کے عبور کرنے سے عاجز نہ رہتا کیونکہ وہ اس سے واقف ہوتا مگر ابوسفیان جو ایک تاجر تھا اس قسم کی مشکلات سے آشنا نہ تھا۔

اہل عرب کی سادگی و ناواقفیت کا یہ عالم تھا کہ دس ہزار کا لشکر ایک خندق دیکھ کر رک گیا، انہیں خندق پار کرنا اس قدر ناممکن معلوم ہوا کہ ابوسفیان کے حکم کے بغیر انہوں نے خندق کے گرد اپنے خیمے گاڑ دیئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہم خندق پار نہیں کر سکتے اور مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتے۔ صرف یہی صورت ہو سکتی ہے کہ شہر کا محاصرہ کر لیا جائے۔

لشکر مکہ خندق کے ایک طرف تھا اور اہل مدینہ دوسری جانب تھے، یہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے اور ان کی آوازیں سن سکتے تھے۔ اہل مکہ مسلمانوں کو طعن کرنے لگے کہ تم لوگ نہ تو عرب ہو، نہ جنگجو، اگر عرب یا جنگجو ہوتے تو خندق کی پناہ نہ لیتے۔ خندق کا کھودنا اس امر کی دلیل ہے کہ تم لوگ بزدل ہو، بزدل نہ ہوتے تو خندق ہرگز نہ کھودتے، دیکھو ہم جنگ سے نہیں ڈرتے اور کسی خندق کی پناہ نہیں لیتے کیا ہمارے باپ دادوں نے کبھی تمہاری طرح خندق کھودی تھی؟ خندق کی پناہ لی تھی اور کبھی قتل و قتال سے ڈرے تھے؟ اگر تم لوگ عرب ہو تو خندق سے باہر اس طرف آؤ تلوار نیام سے باہر کرو تا کہ معلوم ہو کہ تمہارے بازوؤں میں کتنا دم ہے۔ مسلمان یہ باتیں سن رہے تھے مگر خاموش رہے، وہ دیکھ رہے تھے یہ لوگ خندق کو نہیں پھاند سکتے۔

ادھر ہوا بھی سرد ہو گئی۔ مکی فوج کو اپنے خیموں میں سردی پریشان کر رہی تھی جو مسلمان کمین گاہوں میں بیٹھے تھے وہ بھی سردی محسوس کر رہے تھے گو ان کے لئے کوئی مکان یا خیمہ نہیں تھا مگر

وہ سردی لگنے پر اپنے گھر جا سکتے تھے۔ حضرت محمد ساری رات پاسبانی میں گزارتے اور اپنے گھر تشریف نہ لے جاتے۔ چونکہ دونوں طرف کی فوجیں دست بدست جنگ نہ کر سکتی تھیں لہٰذا وہ ایک دوسرے پر تیر برسا رہی تھیں اس سے کچھ افراد دونوں طرف کے زخمی ہو گئے۔ جب رات ہو گئی تو تیر اندازی بند ہو گئی کیونکہ وہ اندھیرے کی وجہ سے ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ البتہ ایک دوسرے کو طعن و تشنیع کرنے لگے اور ہجویہ اشعار بلند آواز سے پڑھنے لگے۔ دن میں تیر اندازی کرتے اور رات میں طعنہ زنی، اس کے باوجود وہ آپس میں مذاکرات بھی کرتے تھے، چنانچہ مسلمانوں نے قبیلہ غطفان کو یہ پیش کش کی کہ وہ اہل مکہ کا ساتھ چھوڑ کر مسلمانوں سے آ ملیں اور مدینہ کی ساری پیداوار خرما لے لیں۔ دوران جنگ میں اس قسم کا معاملہ کچھ عجیب سا تھا کہ سارے سپاہی یہ آوازیں سن رہے تھے، کیونکہ اس قسم کے معاملات پوشیدہ طور پر ہوتے ہیں نہ کہ علانیہ، اس طرح کہ طرفین پوری گفتگو کو سن رہے ہوں، اس قسم کے معاملات سے مقصود دشمن کی فوج میں نفاق واختلاف پیدا کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسی باتیں خفیہ طور پر ہوتی ہیں مگر چونکہ اہل عرب سادہ دل ہوتے تھے اور ان کے فکر و عمل میں کوئی تفاوت نہ ہوتا تھا۔ اس وجہ سے وہ جیسا سوچتے ویسا ہی کہہ دیتے تھے۔ مسلمانوں اور بنو غطفان میں یہ معاملہ طے نہ پا سکا اس لیے کہ ابو سفیان نے مداخلت کر کے بات آگے نہ بڑھنے دی۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے کہ لشکر مکہ مدینہ میں داخل نہ ہو سکا اور خندق کے پار نہ جا سکا لہٰذا ابو سفیان نے مدینہ کے یہودیوں کو اکسایا کہ وہ پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ کر دیں۔ مدینہ میں یہودیوں کے تین بڑے گروہ تھے جن میں سے دو طائفے مدینہ سے کوچ کر چکے تھے جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں، البتہ بنو قریظہ مدینہ میں رہتے تھے ان کے اکثر افراد باغی کا کام کیا کرتے تھے۔ ابو سفیان اپنے لشکر کو خندق کے پار نہ لے جا سکا مگر اتنا ضرور کر سکا کہ اس نے بنو قریظہ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائیں۔

حضرت محمد کے پاس جنگی اطلاعات کا اچھا ذریعہ تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ ابو سفیان اس کوشش میں ہے کہ بنو قریظہ کو مسلمانوں کے خلاف آمادہ جنگ کر دے لہٰذا آپ نے دو مسلمانوں کو ان کے پاس بھیجا۔ حضرت سعد بن عبادہ ان کے پاس گئے، مدینہ کا قانون اساسی یاد دلایا اور

کہا۔ ''ہمارے تمہارے درمیان معاہدہ ہے کہ تم مسلمانوں کے خلاف تلوار نہیں اٹھاؤ گے، ہمارے ساتھ تم نے جو پیمان کیا ہے اس کی رعایت کرنی چاہئے'' مدینہ کے یہودیوں نے لغو جواب دیا اور جتا دیا کہ ہم لشکر مکہ کی طرف داری کا خیال رکھتے ہیں۔ حضرت محمد سمجھ گئے کہ بہت جلد ابوسفیان سپہ سالار افواج مکہ اور طائفہ، بنو قریظہ کے درمیان معاہدہ ہونے والا ہے اور بنو قریظہ پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ حضرت محمد (ﷺ) کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ان دونوں میں اتحاد ہو گیا تو مسلمان دو تلواروں کے درمیان گھر جائیں گے اور اس طرح وہ خندق جو مسلمانوں نے بڑی محنت سے کھودی ہے مسلمانوں کو شکست سے نہ بچا سکے گی۔

اس دوران مسلمانوں کی ایک تعداد حضرت محمد کے پاس پہنچی اور آپ کو اس ساز باز کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ اگر بنو قریظہ نے پیچھے سے حملہ کر دیا تو ہم فنا ہو جائیں گے۔ آپ نے انہیں جواب دیا۔ ''ابوسفیان کا بھروسہ بنو قریظہ پر ہے اور ہمارا توکل اللہ پر ہے، وہ ہمیں ہرگز تنہا نہیں چھوڑے گا۔ اگر جنگ احد کی شکست کا خیال کرتے ہو تو ایسا اس لیے ہوا تھا کہ تم لوگوں نے میرے احکامات کی خلاف ورزی کی تھی اور جو کچھ میں نے کہا تھا اس پر عمل نہیں کیا تھا''

حضرت محمد نے جو کچھ فرمایا تھا، وہ پورا ہوا، اللہ نے اپنے پیغمبر اور مسلمانوں کی مدد کی جب کہ مسلمانوں کو یہ یقین تھا کہ اہل مکہ اور بنو قریظہ کے درمیان معاہدہ مکمل ہونے والا ہے ایک شخص نعیم بن مسعود رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ لشکر مکہ اور بنو قریظہ کے درمیان معاہدہ کرانے پر مامور ہوئے تھے۔ کہنے لگے۔ ''یارسول اللہ! اگرچہ میں اس کام کے لئے متعین ہوا ہوں کہ لشکر مکہ اور یہود بنو قریظہ کے درمیان معاہدہ کراؤں تاکہ وہ عقب سے مسلمانوں پر حملہ کریں مگر ایک مدت دراز سے میں آپ کا پوشیدہ طور پر بہی خواہ رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ پیغمبر اسلام کو شکست ہو بلکہ یہ آرزو رکھتا ہوں کہ فتح ہو'' اس کی بات سے رسول اللہ مطمئن ہو گئے کہ یہ جو کچھ ہوا ہے فضل رب ہے کیونکہ وہ شخص جو مسلمانوں کی بربادی کے لیے تعینات ہوا تھا، ان کی طرف داری کر رہا ہے، پھر نعیم بن مسعود نے دریافت کیا۔ ''میں کس طرح آپ کی کوئی اچھی خدمت انجام دے سکتا ہوں۔''

جاسوسی کا دوہرا استعمال

حضرت محمد نے فرمایا۔ ''چونکہ ہم دشمن کے خلاف لڑ رہے ہیں لہٰذا ہمارے لیے یہ جائز ہے

کہ ہم دشمن کے حالات سے آگاہ رہیں اور اس کی طرف سے ہمیں جو خبر پہنچے ہم اس میں ردوبدل کر کے دشمنوں کے کانوں تک پہنچا دیں، تو ایسا کرنا دھوکا دہی نہیں ہوگا بلکہ یہ تو ایک طریقہ جنگ ہے، لہٰذا تم کو جو کچھ بھی اطلاع لشکر مکہ یا طائفہ بنو قریظہ کے بارے میں موصول ہو، مجھے اس سے باخبر کر دو تاکہ میں تمہیں بتا دوں کہ اسے کس طرح ابوسفیان یا بنو قریظہ کے گوش گزار کرنا چاہئے'' نعیم نے سر تسلیم خم کر دیا اور اسی دن بنو قریظہ (یہودیوں) کے پاس پہنچے اور کہا۔

''تم لوگ جانتے ہو کہ میں ہمیشہ سے تمہارا دوست رہا ہوں، تمہیں چاہئے کہ مجھے اپنا خیر خواہ سمجھو۔ دیکھو ایسا نہ ہو کہ تم لشکر مکہ کو دیکھ کر مغرور ہو جاؤ جو خندق کے اس پار بیٹھے ہیں کیونکہ سربازان مکہ، اہل مدینہ کی طرح جاں باز نہیں ہیں اور نہ وہ قبیلے جو ان کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے آئے ہیں۔ یہ لوگ بڑی جلدی یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ پھر تم ہو گے اور اہل مدینہ۔ فرض کرو اہل مکہ ثابت قدمی سے یہاں لڑتے رہے لیکن اگر حضرت محمد کو قتل نہ کر سکے تو کیا ہوگا؟ جنگِ احد میں ابوسفیان کے سامنے کوئی خندق نہ تھی جسے پار کرنا ہوتا، اس کی طاقت بھی مسلمانوں سے چار گنا زیادہ تھی مگر وہ حضرت محمد کو قتل نہ کر سکا تو اب وہ کیسے شہر مدینہ میں داخل ہو سکے گا اور حضرت محمد کو قتل کر سکے گا لہٰذا اس سے پیشتر کہ تم اہل مکہ کے ساتھ رابطہ قائم کرو، یہ سوچ لو کہ مسلمانوں سے جنگ کرنے میں تمہیں فائدہ ہے یا نقصان؟ میں چونکہ تمہارا دوست ہوں صاف صاف بتائے دیتا ہوں کہ ابوسفیان یا سرداران قریش کی وفاداری پر ہرگز بھروسہ نہ کرنا، انہیں اگر ذرا بھی شکست کا احساس ہو گیا تو تمہیں چھوڑ کر مکہ کی راہ لیں گے۔ اہل مکہ کے ساتھ معاہدہ کرنے سے پہلے، کم از کم اتنا ضرور کر لینا کہ ان سے چار آدمی بطور یرغمال طلب کرو اور انہیں اپنے پاس رکھو تاکہ لشکرِ مکہ اس بات پر مجبور ہو جائے کہ تادم آخر تمہاری حمایت میں مسلمانوں سے لڑے، اگر تم نے ان سے بطور ضمانت چار شخص نہ لئے تو احساسِ شکست ہوتے ہی وہ تمہیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائیں گے۔''

یہودیوں نے جو حضرت نعیم ﷺ کی یہ بات سنی تو سوچنے لگے کہ بات تو دانائی کی ہے کہنے لگے، ہمیں مسلمانوں سے قطع تعلق کرنے سے پیشتر سوچ سمجھ کر کام کرنا چاہئے، بعد ازاں نعیم ﷺ، ابوسفیان کے پاس گئے اور اس سے کہا۔'' آپ جانتے ہیں کہ میں اہل قریش کا مخلص اور مکہ کا باشندہ ہوں، میں یہ نہیں چاہتا کہ اس جنگ میں تمہاری شکست ہو مجھے معلوم ہوا ہے کہ بنو قریظہ

حضرت محمد سے دوستی پکی کرر ہے ہیں، اس کے ثبوت کے لئے انہوں نے یہ ساز باز کی ہے کہ تمہارے چند سرداروں کو تم سے بطور یرغمال طلب کریں اور انہیں حضرت محمد کے سپرد کر دیں، دوسرے یہ کہ بنو قریظہ سے کہو کہ ہفتہ کے دن مسلمانوں پر حملہ کریں، اگر وہ ایسا نہ کریں تو سمجھ لینا کہ دفع الوقتی کرر ہے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا نہیں چاہتے۔"

یہ باتیں سن کر ابوسفیان بحر فکر میں ڈوب گیا ادھر مسلمانوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ یہودی اہل مکہ کے چار سردار لے کر انہیں حضرت محمد کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں تا کہ وہ انہیں قتل کر دیں۔ حضرت محمد سے جب اس پروپیگنڈے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا۔

لعلنا امرنا هم بذالك -

"شاید ہم نے ایسا حکم صادر کیا ہو۔"

پیغمبر اسلام کی طرف سے مبہم سا جواب ایسا تھا کہ ہر شخص اسے اپنے خیال کے مطابق معنی پہنا سکتا تھا، ابوسفیان اور سرداران مکہ نے سمجھا کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو اتحاد کی خبر ہے وہ صحیح ہے۔ پیغمبر اسلام نے یہودیوں کو یہ حکم دیا ہے کہ ان سے چار سردار بطور یرغمال لے کر ہمارے سپرد کر دیں کہ ہم انہیں قتل کر دیں۔ آخر کار یہودیوں نے ابوسفیان کو یہ پیغام بھیج ہی دیا کہ ہمیں چار سردار بطور یرغمال دو تو ہم عقب سے مسلمانوں پر حملہ کر دیں گے کیونکہ ہو سکتا ہے ہم حملہ کر دیں تم بھاگ جاؤ اور ہمیں تنہا چھوڑ دو۔

چار سرداروں کے اس مطالبہ سے نعیم ﷺ کی بات کی تائید ہو گئی، ابوسفیان اور سرداران قریش کو یقین ہو گیا کہ بنو قریظہ حضرت محمد کے سچے دوست بن گئے ہیں اور وہ یہ مطالبہ اس لیے کرر ہے ہیں تا کہ ہمارے سرداروں کو حضرت محمد کے سپرد کر دیں اور وہ انہیں قتل کر دیں۔

ابوسفیان سرداروں کو بطور یرغمال دینے پر راضی نہ ہوا اور اس نے یہودیوں سے کہا کہ شنبہ کے دن مسلمانوں پر حملہ کر دو کیونکہ جنگ طول کھینچ چکی ہے اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم تو شنبہ کے دن پیچھے سے اور ہم سامنے سے مسلمانوں پر حملہ کر دیں گے۔ ہم سنگین موانع کے باوجود یہی کوشش کریں گے کہ شہر میں پہنچ جائیں۔ یہودی شنبہ کے دن حملہ کرنے پر راضی نہ ہوئے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ یہودیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی یہودی سنیچر کے دن جنگ کرتا

ہے تو اسے دنیا اور آخرت میں بڑی بھاری بدبختی اور عذاب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح یہودیانِ بنی قریظہ اور اہل مکہ کے درمیان بدظنی پیدا ہو گئی، وہ مسلمانوں کے خلاف ایک دوسرے کی مدد نہ کر سکے۔

دو ہفتہ محاصرہ جاری رکھنے کے بعد ابوسفیان کے دس ہزاری لشکر میں کھانے کی قلت ہو گئی اور گھوڑوں کے لئے چارہ نہ رہا تو وہ بہت زیادہ بددل ہو گیا۔ مدینہ کے مسلمان سامانِ رسد کی طرف سے تنگ نہ تھے مگر ابوسفیان کے لشکری بھوک سے دوچار ہو رہے تھے۔ ابوسفیان نے جب مدینہ کی طرف قدم اٹھایا تو وہ سمجھتا تھا کہ مدینہ کے باغوں اور کھیتوں سے خوراک حاصل کر لوں گا اور گھوڑوں کے لئے چارہ مہیا کر لوں گا، اسے یہ معلوم نہ تھا کہ مسلمانوں نے حسب فرمان نبوی مدینہ کے باغوں کے سارے پھل اور کھیتوں کا سارا غلہ جمع کر کے شہر میں بھر لیا اور خندق کے پرے نہ خوراک چھوڑی نہ چارہ۔

اس کے علاوہ رات کے وقت مکہ کے فوجیوں کو سردی سے دوچار ہونا پڑتا جب کہ وہ مکہ کی گرمی کے عادی تھے وہ خیموں میں مدینہ کی سرد ہوا کیسے برداشت کرتے۔ ادھر ماہ شوال ختم ہونے لگا تھا اور ماہ ذیقعدہ شروع ہونے والا تھا جس میں قتل و قتال حرام تھا۔ سربازان ابی سفیان جانتے تھے کہ شوال کے مہینے کے ختم ہو جانے کے بعد وہ تین ماہ تک مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ ماہ ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم میں جنگ کرنا حرام تھا۔ قریش کے سردار اور سپاہی جان گئے کہ مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے صرف چند دن باقی ہیں۔ اگر ان چند دنوں میں وہ مسلمانوں پر حملہ کر کے انہیں برباد نہ کر سکے تو تین ماہ تک مدینہ کے باہر رہ کر سردی اور بھوک کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور اس طرح وہ ہلاک ہو جائیں گے کیونکہ خالی صحرا میں دس ہزار انسانوں کے لئے غلہ فراہم کرنا ممکن نہ تھا مگر یہ کہ دور دراز سے غلہ لایا جائے۔

اس پندرہ دن کے عرصہ میں جب کہ مسلمانوں اور مشرکوں کی فوجیں آمنے سامنے پڑی تھیں۔ کئی بار دست بدست لڑائی ہوئی اور سربازان لشکر مکہ کے دو فرد ایک عمرو بن عبدود اور دوسرا نوفل مخزومی، حضرت علی ابن ابی طالب، پیغمبر اسلام کے چچازاد بھائی اور داماد کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ نوفل مخزومی کا گھوڑا کود کر خندق میں آ گیا، تو حضرت علی بن ابی طالب نے خندق میں اتر کر اس کا کام تمام کر دیا۔ خندق میں آ جانے کے بعد نوفل گھوڑے سمیت لڑھک گیا۔ حضرت علی

اس فرصت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے مگر آپ نے صبر کیا حتیٰ کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور تلوار نیام سے نکال لی۔ نوفل مخزومی جس وقت خندق میں آیا، آفتاب غروب ہونے والا تھا اور مغربی سمت سے آفتاب حضرت علی کی آنکھوں پر پڑ رہا تھا۔ یہ بات حضرت علی کے حق میں سازگار نہ تھی لیکن اس کے باوجود آپ نے غروب آفتاب سے پہلے ہی اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

چونکہ جنگ اِحد میں مشرکین کی عورتوں نے مسلمان شہدا کو مثلہ کیا تھا لہٰذا سپہ سالار فوج مکہ ابوسفیان ڈرا کہیں مسلمان نوفل مخزومی کو مثلہ نہ کر دیں جو لشکر مکہ کے ثروت مند سرداروں سے ہے، یہ خیال کرتے ہی اس نے حضرت علی ؓ کو پیغام بھیجا کہ میں تمہارے لئے ایک سو اونٹ بھیج دوں گا، بشرطیکہ نوفل کو مثلہ نہ کرو، اس کا سر نہ کاٹو اور اس کی لاش کو بغیر خراب کئے ہمارے پاس بھیج دو۔ حضرت علی نے یہ انعام قبول نہ کیا اور بغیر کسی قسم کا ہدیہ قبول کئے اس کی لاش قریشیوں کی فوج میں بھیج دی۔ دوسرا سردار قریش جو حضرت علی سے دست بدست جنگ کرتے مارا گیا عمرو بن عبدود تھا یہ شخص علاوہ دلیری اور جسمانی طاقت رکھنے کے، سردار بھی تھا، اتنا اچھا شمیر زن تھا کہ دو مرتبہ اس نے حضرت علی کو زخمی کیا مگر علی بن ابی طالب دو زخموں کی پرواہ کرنے والے کب تھے کہ جنگ چھوڑ بیٹھتے، وہ برابر لڑتے رہے حتیٰ کہ حضرت علی کے ایک وار سے ان کا ہاتھ کٹ گیا اور تلوار زمین پر گر پڑی، حضرت علی اس کے قریب گئے، پائے مبارک اس کی شمشیر پر رکھ دیا تا کہ اٹھا نہ سکے پھر کہا۔ ’’اگر تو اسلام لے آئے تو میں تیری جان بخشی کر دوں۔‘‘

صرف رضائے الٰہی

عمرو بن عبدود نے آپ کے روئے مبارک پر تھوک دیا اور کہا، ’’میں اسلام نہیں لا سکتا‘‘ حضرت علی ؓ نے رخ مبارک سے اس کے تھوک کو صاف کیا اور سر جھکا لیا، چند دقیقہ ساکت و صامت کھڑے رہے۔ عمرو بن عبدود کہنے لگا، ’’اے علی ؓ میں نے تو کہا تھا اسلام نہیں لاؤں گا آپ مجھے قتل کیوں نہیں کرتے؟‘‘ حضرت علی نے فرمایا، ’’اس لیے کہ جب تو نے میرے منہ پر تھوکا تو مجھ پر غصے کا غلبہ ہو گیا، اگر میں تجھے ایسی حالت میں قتل کرتا تو غصہ اور انتقام کی خاطر ایسا کرتا، میں نہیں چاہتا کہ تجھے غصہ میں انتقام کے لئے قتل کروں کیونکہ ہم مسلمان خدا کی راہ میں لڑتے ہیں جس کسی کو قتل کرتے ہیں رضائے الٰہی کے لئے قتل کرتے ہیں۔ اپنے غیظ و غضب کے

فرو کرنے کے لئے نہیں، اے عمرو! اگر چہ تو نے میرے منہ پر تھوکا لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ تو مسلمان ہو جا، میں تیرے قتل سے در گزر کر لوں گا"۔ عمرو بن عبدود نے کہا، میں مسلمان نہیں ہوں گا۔ حضرت علی ؓ اس کے قریب گئے اور ایک وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ عمرو بن عبدود بڑی قیمتی زرہ پہنے ہوئے تھا جس کے حلقے سونے کے تھے، حضرت علی نے وہ زرہ اس کی بہن کو بھجوادی تا کہ کوئی یہ خیال نہ کرے آپ ؓ نے اسے سونے کے لالچ میں قتل کیا ہے۔

بھوک اور سردی کے علاوہ لشکر مکہ پر ایک اور مصیبت پڑی جس سے وہ بالکل متزلزل ہو گئے۔ ایک رات سخت تیز ہوا چلی جس سے خیموں کی چادریں پھٹ گئیں، آگ بجھ گئی اور پھر بارش شروع ہوگئی یہ بارش اس قدر سخت ہوئی کہ ذرا سی دیر میں جل تھل ہو گیا، ابوسفیان کو یہ خدشہ ہوا کہ اب مسلمان حملہ کر دیں گے تو اس نے روانگی کا حکم دے دیا۔ بعض تذکروں میں لکھا گیا ہے کہ ابوسفیان کو روانگی کی اس قدر جلدی تھی کہ جب وہ اونٹ پر سوار ہوا تو اسے پتہ نہ چلا کہ اونٹ رسی سے بندھا ہوا ہے، وہ اونٹ پر کوڑے برسا رہا تھا کہ اپنی جگہ سے حرکت کرے، مگر وہ اٹھ ہی نہ سکتا تھا تاہم لشکر چلا آیا اور جنگ خندق یا احزاب اسی شب ختم ہوگئی اس "جنگ" میں لشکر مکہ کے آٹھ اور لشکر اسلام کے چھ افراد مارے گئے۔ یہ چودہ اشخاص مشہور جنگجو تھے اور دست بدست جنگ میں مارے گئے۔ اس سے قبل کے عرصہ میں ایسا موقعہ پیدا نہ ہو سکا تھا کہ دونوں لشکر دست بدست جنگ کریں۔ جنگ خندق کے ختم ہو جانے اور مدینہ سے لشکر مشرکین کے چلے جانے کے باوجود مدینہ اسی طرح اقتصادی محاصرہ میں مبتلا رہا۔

شہر مدینہ گویا ہرن کی دو شاخوں کے درمیان واقع ہے۔ ایک شاخ خیبر ہے یہ شمال مدینہ سے دو سو کلومیٹر دور ہے اور دوسری شاخ شہر مکہ ہے جو چار سو کلومیٹر دور جنوب میں واقع ہے۔ یہ دونوں شہر، مسلمانوں کے قافلوں کو آزادانہ طور پر آنے جانے نہ دیتے تھے اور دونوں شہر بڑے قوی تھے۔ خیبر کے یہودی بڑے دولت مند تھے اور بہت سے لشکریوں کو اکٹھا کر سکتے تھے، مکہ کے باشندے، اشراف قریش کے ماتحت تھے جن میں ابوسفیان عکرمہ، ابوجہل، صفوان بن امیہ اور ہندزوجہ ابوسفیان جیسے لوگ حضرت محمد کے دشمن تھے۔

مدینہ کے اقتصادی محاصرے کے توڑنے کے لئے حضرت محمد مجبور تھے کہ خیبر یا مکہ پر حملہ

کر کے انہیں مشغول کر دیں۔ باشندگان مکہ و خیبر کے درمیان ایک پیمان اتحاد تھا کہ اگر پیغمبر اسلام (ﷺ) اور مسلمان خیبر پر حملہ کریں تو بلاتاخیر اہل مکہ، مدینہ پہ حملہ کریں دیں اور اگر حضرت محمد مکہ پر حملہ کریں تو اہل خیبر، مدینہ کا محاصرہ کر لیں۔

مؤرخ اسلام طبری لکھتا ہے۔"جب سے منافق شکمِ مادر سے تولد ہوئے کبھی بھی ایک قطعی راہ اختیار نہ کر سکے مگر جنگ خندق میں انہوں نے ایک قطعی راہ اختیار کی اور لشکر مکہ کی طرف داری کی" طبری کا یہ کہنا کہ جب سے وہ شکم مادر سے پیدا ہوئے قطعی راہ اختیار نہ کر سکے، ایک ادبی مبالغہ ہے، ہاں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں جب کبھی بھی مسلمانوں اور مشرکوں یا مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان اختلاف رونما ہوتا اور جنگ کھڑی ہو جاتی تو وہ ایک کنارے کھڑے ہو جاتے اس دوران بظاہر وہ مسلمان شمار ہوتے تھے، جنگ خندق میں انہوں نے پہلی بار یہ پختہ ارادہ کیا کہ ایک راہ اختیار کریں لہٰذا انہوں نے لشکرِ مکہ کی طرف داری کی، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ دس ہزار کا لشکر مکہ مسلمانوں کو شکست دے دے گا اور وہ حضرت محمد کو گرفتار کر کے انہیں شہید کر دیں گے۔ جب دو ہفتہ کے قیام کے بعد لشکرِ مکہ، مدینہ کی خندق سے کوچ کر گیا تو منافق پھر اپنی قدیمی مشتبہ حالت کی طرف لوٹ آئے یعنی انہوں نے مسلمانوں کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا۔ عساکر مکہ کی طرف داری صرف معنوی طرف داری رہی۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکی۔

چونکہ غزوہ خندق کے موقعہ پر منافقوں کی طرف سے کسی قسم کا اقدام نہیں ہوا تھا جس سے ان کی طرف داری کا کوئی ثبوت ملتا لہٰذا خاتمۂ جنگ پر حضرت محمد نے انہیں کوئی سزا نہیں دی۔ اس کے باوجود مسلمان ان کی اس روش کو فراموش نہ کر سکے، جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے، جنگِ خندق کے بعد مسلمانوں کی روش منافقوں کے بارے میں بدل گئی۔ بنو قریظہ کے یہودیوں کی روش جنگ خندق میں، مدینہ کے قانونِ اساسی کے خلاف تھی کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ حملہ آوروں کے ساتھ متحد ہو جائیں حالانکہ مدینہ کے قانون اساسی کے اعتبار سے شہر کو خطرہ لاحق ہونے کی صورت میں باشندگان مدینہ کا یہ فرض تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ متحد ہو کر شہر کا دفاع کرتے اور ان کی مدد کرتے۔ یہودیان بنی قریظہ کا بھی یہی فرض تھا۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں جنگ میں حضرت محمد نے یہودیوں سے کہہ دیا تھا کہ اہل مکہ کے ساتھ ہماری یہ جنگ مذہبی ہے

لہٰذا تم لوگ مجبور نہیں ہو کہ اس میں شرکت کرو۔

جنگ احد مدینہ سے باہر ہوئی تھی مگر جنگ خندق خود مدینہ شہر میں ہوئی تھی۔ یہ بھی واضح ہے کہ پیغمبر اسلام نے یہودیوں کو غزوہ احد سے اس لیے واپس کر دیا تھا کہ آپ کو ان پر بھروسہ نہ تھا اور جنگ خندق میں صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ یہودیان بنو قریظہ مدینہ کے قانون اساسی کے خلاف چل رہے ہیں اور جو معاہدہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا اس پر عمل نہیں کر رہے ہیں۔ یہودیان بنی قریظہ جانتے تھے کہ ہم نے مدینہ کے قانون اساسی کے خلاف کیا ہے اور معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے لہٰذا وہ خاتمہ جنگ پر اپنے گھروں میں محصور ہو کر بیٹھ رہے۔

حضرت محمد نے اپنے داماد علی بن ابی طالب کو، جنہوں نے جنگ احد و خندق میں بہت زیادہ دلیری و جواں مردی کا ثبوت دیا تھا اور اس سے پیشتر بھی کئی بار پیغمبر اسلام کی خاطر فدا کاری کی تھی (منجملہ ان کے ہجرت مکہ کے وقت) یہودیان بنی قریظہ کی سرکوبی کے لئے بھیجا، چنانچہ وہ چند ایک غازیوں کو لے کر بنو قریظہ کی طرف روانہ ہوئے۔ عربی زبان میں قریظہ اقاقیا ببول کے پتوں کو کہتے ہیں چونکہ اقاقیا سے دباغی (کھال رنگنے) میں کام لیا جاتا تھا اور اکثر یہودیان بنی قریظہ یہی کام کرتے تھے لہٰذا وہ بنو قریظہ کہلاتے۔ مدینہ کے یہودی زرگری، زراعت اور دباغی کی وجہ سے بڑے دولت مند ہو گئے تھے۔ یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان کے دو گروہ، زرگر اور کسان مدینہ سے چلے گئے تھے۔ لہٰذا انہوں نے بڑے مضبوط محلات بنا لیے تھے۔ ان کے بعض گھر مسکن بھی تھے اور جنگی قلعے بھی۔

جب یہودیوں نے یہ دیکھا کہ اہل مکہ واپس ہو گئے ہیں تو وہ ان قلعوں میں محصور ہو کر مسلمانوں کے مقابلہ کی فکر کرنے لگے۔ حضرت علی نے ان کا محاصرہ کر کے کہا کہ تم لوگ اسلام لے آؤ تو بنو قریظہ بولے۔ ہم انہیں پیغمبر نہیں سمجھتے کہ ان کے دین کو قبول کر لیں کیونکہ حضرت محمد عرب ہیں اور عرب کبھی پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر تو صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو اولاد اسرائیل سے ہو، اللہ تعالیٰ صرف بنو اسرائیل سے ہم کلام ہوتا ہے اور انہی کو پیغمبری کے لئے منتخب کرتا ہے۔ پچھلے سارے انبیاء قوم اسرائیل سے ہوئے ہیں اگر آئندہ کوئی نبی آئے گا تو وہ بنو اسرائیل ہی سے ہوگا۔

چار یا چھ ہفتے کے بعد محصور شدہ بنو قریظہ کے پاس کھانے کی قلت ہو گئی تو کعب بن اسد سردار بنی قریظہ نے ایک قلعہ پر چڑھ کر آواز دی۔ ''اے علی ابن ابی طالب ہمارے شیر خوار بچوں کے لئے دودھ نہیں ہے کیونکہ عورتوں کے پستان خشک ہو گئے ہیں عورتوں کو غذا ہی نہیں مل رہی ہے کہ بچوں کو دودھ پلائیں'' حضرت علی نے جواب دیا۔ ''اے کعب ابن اسد ہم اور تمام محاصرہ کرنے والے مسلمان خورد سال بچوں والے ہیں۔ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب بچہ بھوکا ہوتا ہے تو اس پر کیا گزرتی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمہارے بچوں کو کوئی تکلیف پہنچے مگر تم نے مدینہ کے قانون اساسی کے خلاف چل کر مسلمانوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ تم پر بھروسہ نہ کریں لہٰذا تم اپنے اور مسلمانوں کے درمیان کسی کو فیصل بنالو'' کعب بولا، ''میں اس وقت اس بات کا جواب نہیں دے سکتا مجھے چند گھنٹوں کی مہلت دو تا کہ اپنے قبیلے کے لوگوں کے ساتھ مشورہ کر سکوں۔''

مدینہ کے قانونِ اساسی کے مطابق قانون کے اجراء کرنے والے صرف حضرت محمد تھے وہ اس بات کے پابند نہ تھے کہ مسلمانوں اور بنو قریظہ کے درمیان کسی سے فیصلہ کرائیں مگر حضرت علی نے آپ کا خیال معلوم کر کے یہودیوں سے کہہ دیا کہ آپ فیصل بنانے کے لئے تیار ہیں۔ قلعہ پر چڑھ کر گھنٹے بعد کعب بن اسد پکارا۔ ''اے علی ہم فیصلہ کرانے پر رضا مند ہیں۔''

حضرت علی نے فرمایا۔ ''ہم تمہیں اختیار دیتے ہیں کہ جسے چاہیں فیصل بنالو جس پر تمہیں اطمینان ہو اسے منتخب کر لو کیونکہ ہم تم پر ظلم کرنا نہیں چاہتے، اس کے انتخاب کے بعد دو نمائندے ہمارے اور دو تمہارے، اس کے پاس جا کر فیصلہ کرا لیں گے۔ ہمارے نمائندے تمہارے نقضِ عہد کے بارے میں گفتگو کریں گے اور تمہارے نمائندے جو کچھ تم پیش کرنا چاہو گے پیش کر دیں گے۔ بحث و مباحثہ کے ختم ہو جانے کے بعد ثالث جو کچھ فیصلہ دے گا وہ قابل اطاعت ہو گا، کیا تم لوگ حکم کے فیصلہ پر رضا مند ہو جاؤ گے؟'' یہودیوں نے کہا۔ ''ہاں، حضرت علی ؓ نے فرمایا، ''ہم بھی ثالثی فیصلہ پر راضی ہیں'' گو یہودی زیر محاصرہ تھے اور جنگ ابھی ختم نہ ہوئی تھی مگر حضرت علی ؓ نے حکم دے دیا کہ یہودیوں کو ایک ہفتہ کا سامان رسد دیا جائے، وہ جس قسم کا بھی غلہ چاہیں دے دیا جائے تا کہ ان کی عورتیں بے شیر اور بچے بھوکے نہ رہیں۔ بنو قریظہ کے یہودیوں نے پھر مشورہ کیا اور کہا، ''ہم سعد بن معاذ کو فیصل بنانا چاہتے ہیں'' سعد بن معاذ قبیلہ

اوس کے سردار تھے وہ یہودیوں اور مسلمانوں دونوں سے دوستی رکھتے تھے۔ حکم کے انتخاب کے بعد مسلمانوں نے اپنی طرف سے دو نمائندے چنے اور یہودیوں نے بھی دو نمائندے منتخب کیے۔

مسلمانوں نے سعد بن معاذ سے یہودیوں کے بارے میں شکایت کی کہ ان کے اور ہمارے درمیان ایک پیمان دوستی تھا جس کی رو سے یہ طے پایا تھا کہ جب کبھی بھی مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو یہ اور تمام باشندگان مدینہ مسلمانوں کے ساتھ متحد ہو کر مدافعت کریں گے مگر بجائے اس کے کہ مدد کرتے اور دشمن کو دھکیلتے الٹا، ان کے ساتھ معاہدہ دوستی کرنے لگے، یہ چاہتے تھے کہ ابوسفیانؓ سپہ سالار لشکر مکہ کے ساتھ معاہدہ کریں تاکہ عقب سے مسلمانوں پر حملہ کردیں اور مسلمانوں کو دو تلواروں کے درمیان گھیر دیں۔ بنو قریظہ کے دونوں نمائندوں نے مدافعت کی اور جنگ احد کے معاملہ کا حوالہ دیا۔ کہنے لگے جنگ احد میں ہم نے مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہا تھا مگر انہوں نے ہماری امداد کو قبول نہ کیا تھا۔ اسی لئے ہم نے جنگ خندق کے بارے میں یہ خیال قائم کیا کہ حضرت محمد ہماری معاونت کو قبول نہ کریں گے۔ مسلمانوں کے نمائندوں نے کہا، کہ بنو قریظہ قانون اساسی کے خلاف دشمن کے ساتھ گفت وشنید کرنے لگے تاکہ ان کے ساتھ متحد ہو جائیں۔ اگر حضرت محمد اس بارے میں رکاوٹ نہ ڈالتے تو بلاشک وشبہ ان کے اور لشکر مکہ کے درمیان ایک جنگی معاہدہ ہو جاتا اور بنو قریظہ پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو جاتے۔

بنو قریظہ کے نمائندوں نے اس بات کا انکار کیا اور کہا۔ "ہماری ان کے ساتھ کسی قسم کی گفتگو نہیں ہوئی" مسلمان نمائندوں نے بے دریغ حضرت نعیم بن مسعود کو پیش کر دیا، جنہوں نے تفصیلی طور پر اپنے تمام اقدامات کا ذکر کر دیا اور سارے یہودیوں کے نام گنانے شروع کر دیئے جن کے ساتھ مذاکرہ کیا تھا۔ گفتگو چند روز جاری رہی، سعد بن معاذ طرفین کے بیانات سنتے رہے، بعد ازاں انہوں نے فیصلہ سنا دیا کہ چونکہ یہودیان بنی قریظہ نے مدینہ کے قانون اساسی کے خلاف کیا ہے اور ایک ایسے دشمن کے ساتھ سازباز کی ہے جو شہر مدینہ کو تسخیر کرنا چاہتا تھا اور مسلمانوں پر عقب سے حملہ کرنا چاہتا تھا لہٰذا وہ جلاوطنی کے مستحق ہیں۔ یہ فیصلہ مسلمانوں نے صادر نہیں کیا تھا بلکہ ایک ایسی شخصیت نے دیا تھا جو یہودیوں کی محبوب ہستی تھی اور جسے انہوں نے خود اپنا فیصل بنانا پسند کیا تھا۔

فیصلہ سننے کے بعد حضرت علی ؓ نے کہا، ”عورتیں، بچے اور وہ لڑکے لڑکیاں جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچے بوڑھی عورتیں اور مرد سزا سے بری ہیں اگر دوسرے لوگ اسلام لے آئیں گے تو انہیں معاف کر دیا جائے گا“۔ یہ اعلان سن کر بہت سے یہودی مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت علی ؓ نے ان سے جنگ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ رسول اللہ نے انہیں ایک اور بڑا کام سپرد کر دیا تھا یعنی مکہ پر چڑھائی کا حکم دے دیا تھا۔ حضرت علی ؓ نے مسلمانوں کو تاکید کی کہ عورت، بچے، نابالغ لڑکے لڑکیوں اور بوڑھوں کو قلعہ سے باہر نکلنے دیا جائے تاکہ بھوک کی تکلیف نہ اٹھائیں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ صرف وہ مرد قلعوں میں رہ گئے جو جنگ کرنا چاہتے تھے، یہ لوگ لڑتے لڑتے مارے گئے۔

پیغمبر اسلام کا ارادۂ عمرہ

مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ محاصرۂ اقتصادی کو توڑنے کے لئے پیغمبر اسلام کو، یا مکہ پر حملہ کرنا چاہئے جو مدینہ سے چار سو کلومیٹر دور ہے یا خیبر پر، جو مدینہ سے دو سو کلومیٹر دور جانب شمال واقع ہے۔ مگر حضرت محمد نے اس کا ایک دوسرا حل سوچ رکھا تھا جدھر مسلمانوں کا خیال تک نہ گیا تھا۔ وہ یہ کہ آپ (ﷺ) نے پختہ ارادہ کر لیا کہ تمام مسلمانوں کو لے کر حج عمرہ کے لئے مکہ تشریف لے جائیں۔

وہ مکہ جہاں کے لوگوں نے آپ کو شہید کرنا چاہا تھا آپ کے ساتھ انتہائی بدسلوکی برتی تھی اور کئی بار مسلمانوں کو نابود کرنے کے لئے وہاں سے لشکر روانہ کئے تھے اس کے باوجود آپ نے مسلمانوں کے ساتھ مکہ تشریف لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مسلمانوں نے یہ خیال کیا کہ آپ جنگ کی غرض سے جا رہے ہیں لہٰذا دریافت کیا کہ کیا آپ مکہ کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، نہیں میں تو صرف حج عمرہ کی غرض سے جا رہا ہوں۔ حضرت محمد نے موسم سرما کے دوسرے ماہ کی 28 مطابق 6 ھ میں دو ہزار مسلمانوں اور چند سو اونٹوں کو لے کر مکہ کا رخ کر دیا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ تھی۔ مگر بعض بدوؤں نے آپ کی دعوت پر لبیک نہ کہی کیونکہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ باشندگانِ مکہ اہل قریش اور مسلمانوں کے درمیان جنگ ہے لہٰذا حضرت محمد ان کے ساتھ لڑنے کے لئے جا رہے ہیں بدو عرب اس بات کو گوارا نہ

کرتے تھے کہ ایسے شہر میں لڑیں جسے حرم کہتے ہیں یعنی جہاں جنگ کرنا حرام ہے۔ ان کے خیال میں حضرت محمد ایک ایسے موقعہ پر جنگ کرنے جا رہے تھے جو حرام مہینے تھے۔ یہ بدو عرب جنہوں نے آپ کے ساتھ جانا نہ چاہا نو مسلم تھے ان کے مذہبی عقائد ابھی تک انصار و مہاجرین کی طرح پختہ نہ ہوئے تھے کہ حضرت محمد کے حکم کے سامنے فوراً سر تسلیم خم کر دیتے۔ مسلمانوں کا ایک گروہ اس حکم کو سن کر بہت ہی خوش ہوا یہ مہاجرین تھے جو چھ سال پیشتر حضرت محمد کے ساتھ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔

واضح رہے کہ شہر مکہ جزیرۃ العرب کے تمام عربی باشندوں کے نزدیک محترم و مقدس تھا کیونکہ وہاں حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ کی عبادت کے لئے سب سے پہلا گھر بنایا تھا، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں خانہ کعبہ کی تعمیر کی تاکہ لوگ خدا کی عبادت کریں۔ اس کے علاوہ شہر مکہ مہاجرین کا وطن تھا، مہاجروں نے اسی شہر میں سب سے پہلے آنکھ کھولی تھی، ان کی تمنا تھی کہ وطن واپس جائیں اور وہیں مریں، اپنوں اور اپنے قبیلوں کے درمیان زندگی کو الوداع کہیں۔ اہلِ عرب، وطن سے باہر عزیزوں سے دور اور قبیلے سے علیحدہ مرنے کو اپنے لئے سب سے بڑا سانحہ سمجھتے تھے چنانچہ وہ اپنے دشمن کو یہ بددعا دیا کرتے تھے کہ تو غربت و مسافرت میں، قبیلے سے دور مرے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب مہاجرین مدینہ سے مکہ کی راہ پر چلے تو وہ گویا رقص کناں جا رہے ہیں۔

ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ مکہ ایک بین الاقوامی شہر تھا۔ خانہ کعبہ میں ہر مذہب کے لوگوں کے کمرے اور حجرے تھے جہاں وہ اپنے بت رکھتے تھے۔ ہر مذہب کے پیروکار کو یہ اجازت تھی کہ وہ خانہ کعبہ میں آئے اور طواف کرے۔ باشندگانِ مکہ کی نظروں میں اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح ایک مذہب تھا لہٰذا وہ مسلمانوں کو خانہ کعبہ کی زیارت سے روک نہیں سکتے تھے۔ باشندگان مکہ کی مصلحت کا یہ تقاضا تھا کہ زائرین، جزیرۃ العرب کے ہر مقام سے مکہ میں آئیں، خواہ ان کا کوئی بھی دین ہو تاکہ اپنی دولت وہاں خرچ کریں، بازارِ مکہ سے سودا خریدیں ایامِ حج میں اونٹ اور بھیڑ بکری کی قربانی کریں اور ان کا گوشت اہل مکہ کھائیں۔ دو ہزار مسلمانوں کو مکہ میں آنے سے روکنا اہل مکہ کے خسارے کا باعث تھا پھر یہ کہ ماہ حرام میں مسلمانوں کے داخلے کو روکنا دستور قدیم کے خلاف تھا۔ لیکن وہ مسلمانوں کو مکہ میں کیسے آزادانہ

داخل ہونے دیتے جب کہ ان کے اور باشندگان مکہ کے درمیان لڑائیاں ہو چکی تھیں۔

اگر یہ کہہ دیں کہ مسلمان دستور قدیم سے مستثنیٰ ہیں لہٰذا انہیں مکہ میں گھسنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تو خانہ کعبہ جو ایک بین الاقوامی مقام تھا اپنی حیثیت کھو بیٹھتا ہے کیونکہ قانونِ کلی کو توڑنے کے لئے ایک نظیر کافی ہے اس طرح مکہ کے میلے پر برا اثر پڑتا ہے اور پھر ہر شخص آزادانہ خرید و فروخت کے لئے نہیں آ سکتا۔ اگر دو ہزار مسلمانوں کو چند سو اونٹوں کے ساتھ مکہ میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی ہے تو یہ خطرہ ہے کہ کہیں وہ مکہ پر قبضہ نہ جما بیٹھیں۔

مشورہ کرنے کے بعد جماعت قریش نے یہ طے کیا کہ مسلمانوں کو داخلے سے روکا جائے لہٰذا انہوں نے چالیس سوار اس غرض سے روانہ کر دیئے کہ وہ مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روک دیں۔ ان سواروں نے مسلمانوں کے قریب پہنچتے ہی تلواریں سونت لیں۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ لوگ گرفتار ہو گئے اور ان سے ہتھیار چھین لئے گئے۔ حضرت محمدؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان کے ہتھیار واپس کر دیں اور انہیں بغیر فدیہ لئے آزاد کر دیں۔ یہ بات تمام لوگوں اور خود اسیران مکہ کو بڑی عجیب معلوم ہوئی کیونکہ عربستان میں جب بھی کوئی شخص جنگ میں گرفتار ہوتا، بغیر فدیہ لئے رہا نہ کیا جاتا یا یہ کہ اسیروں کے تبادلہ میں چھوڑ دیا جاتا۔ بعض مسلمانوں نے آپ سے سوال کیا کہ ان لوگوں کے ہتھیار کیوں واپس دلا دیئے اور انہیں بغیر فدیہ لئے کیوں چھڑا دیا؟ تو آپ نے فرمایا: ''اس لیے کہ ہم زائر ہیں جنگ کرنے نہیں جا رہے ہیں سوائے خانہ کعبہ کی زیارت کے، ہمارا اور کوئی مقصد نہیں ہے، زائر کو کسی شخص کو قید نہ کرنا چاہئے۔''

اس واقعہ کے تھوڑی دیر بعد مکہ سے دو سو سوار مسلمانوں کے پاس آن پہنچے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان آگے قدم نہ بڑھانے پائیں۔ ان سواروں کا سردار عکرمہ بن ابی جہل تھا۔ جب وہ مسلمانوں کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہ مکہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے میں مصروف ہیں۔ مسلمانوں کے نماز پڑھنے کا انداز کچھ ایسا پرشکوہ تھا کہ عکرمہ جرأت نہ کر سکا کہ ان پر حملہ کرے۔ اس نے گھوڑے کی لگام پھیر دی مگر وہاں سے دور نہ گیا بلکہ اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ مسلمان نماز سے فارغ ہو جائیں تو ان پر حملہ کر دے۔

حضرت محمدؐ نے اہل مکہ کو یہ امر ذہن نشین کرانے کے لئے کہ ہم لڑائی نہیں چاہتے ایک

ایلچی روانہ کیا۔ اس سے کہا۔ ''مکہ جا کر اہل مکہ کو مطمئن کر دو کہ ہم لڑنے کی غرض سے نہیں آئے ہیں۔ زیارت کعبہ کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ اس لیے اپنے ساتھ اسلحہ نہیں لائے۔ اگر ہمارا ارادہ جنگ کرنے کا ہوتا تو اسلحہ ساتھ لاتے''۔

عکرمہ نے ایلچی کو جانے نہ دیا، راہ روک لی اور اس کے اونٹوں کو قتل کر دیا۔ ایلچی اور اس کے ساتھی صحرا میں پریشان ہو گئے، پینے کے لئے پانی تک نہ رہا، قریب تھا کہ وہ پیاسے مر جاتے، جوں توں کر کے بڑی مشکل سے مسلمانوں کی طرف واپس آ سکے۔ تاہم مسلمان خاص اس جگہ پر پہنچ گئے۔ جہاں سے حدود حرم شروع ہو جاتی تھیں۔ حضرت محمد نے انہیں ٹھہرنے کا حکم دیدیا اور فرمایا ''قربانی کے جو اونٹ ساتھ لائے ہو۔ ان پر مخصوص نشان لگا دو'' زیارت کعبہ کے دور جاہلیت میں قربانی کے اونٹوں پر خاص نشان بنانا اہل عرب کی پرانی رسم تھی، آپ نے اس رسم کو تازہ کیا تا کہ اہل مکہ کو یہ یقین ہو جائے کہ واقعی مسلمان زیارت کعبہ کے لئے آئے ہیں۔ لڑنے یا مکہ پر قبضہ کرنے کی غرض سے نہیں آئے۔ جب اونٹوں پر قربانی کے لئے نشان لگانے لگے تو حضرت محمد نے چند ایک مسلمانوں کو مختلف اطراف میں بھیجا تا کہ بدو قبائل کو دعوت دیں کہ آ کر مشاہدہ کریں، مسلمان کس طرح قربانی کے جانوروں پر نشان لگا رہے ہیں۔ جس جانور پر قربانی کا مخصوص نشان لگاتے تھے اسے سلیقہ کہتے تھے۔

اونٹوں پر نشان لگانے اور انہیں سلیقہ بنانے کے بعد مسلمانوں نے پھر مکہ کی طرف قدم بڑھائے مگر اس دفعہ عکرمہ بن ابی جہل دو سو سوار لے کر مسلمانوں کی راہ روکنے کے لئے آ چکا تھا۔ ابن ہشام عکرمہ کا قول نقل کرتا ہے:

و آتینا هم عندالسلته

''ہم ان کے پاس اس وقت پہنچے جب کہ وہ شمشیر برہنہ کر چکے تھے''۔

سلہ بروزن غلہ، تلوار سونتنے کو کہتے ہیں۔ اس قول اور اسی طرح دوسرے مستند اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس تلواریں تھیں مگر اس زمانے میں تلوار جنگی ہتھیار شمار نہیں کیا جاتا تھا بلکہ یہ ایک ایسا ہتھیار تھا کہ مرد ہر وقت اسے اپنے پاس رکھتے تھے جیسا کہ اب بھی جزیرۃ العرب کے بدو اور سواحلِ جنوب فارس کے شیوخ ہمیشہ ایک خنجر اپنی شال پر لٹکائے رہتے ہیں

چونکہ یہ خنجر لباس کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے لہٰذا اسے کوئی بھی ہتھیاروں میں شمار نہیں کرتا۔ اگر مسلمانوں نے تلوار سونتی ہوگی تو عکرمہ کو دیکھ کر شمشیریں میانوں سے باہر نکالی ہوں گی کیونکہ اس کے سوا تلوار نکالنے کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ وہ تلوار سونتنے کا موقعہ نہ تھا، اتنی بات تو ضرور ماننی ہی پڑے گی کہ مسلمان تلواروں سے کام لینا نہیں چاہتے تھے اس لیے کہ اس سفر میں حضرت محمد یہ نہ چاہتے تھے کہ زمین پر کسی کا خون گرے، علاوہ ازیں عکرمہ کا قول ضعیف ہے اور اسلامی تذکرہ نویسوں نے اس کی تائید نہیں کی۔ جس مقام پر مسلمانوں نے اونٹوں پر سلیقہ کا نشان بنایا وہ ذوالحلیفہ تھا یہیں سے انہوں نے عمرہ کا احرام باندھا اور مکہ کی راہ لی۔

مذکورہ بالا بیان سے جو مسلمانوں کا تلوار سونتنا ثابت ہوتا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان سپاہیانِ مکہ کے ساتھ لڑنا چاہتے تھے مگر یہ بات مسلم ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) خونریزی کے خواہاں نہ تھے اسی لئے آپ نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ کوہستانی علاقہ سے مکہ میں داخل ہوں۔ وہ منطقہ جس سے مسلمان ذوالحلیفہ سے نکل کر آگے بڑھے ایک پہاڑی پگڈنڈی تھی جہاں سے سواروں کو عبور کرنے میں بڑی زحمت اٹھانی پڑی۔ اس کوہستانی راہ میں مسلمانوں کو پانی کی قلت اور دھوپ کی حدت نے بہت تکلیف پہنچائی، تاہم وہ کوہستانی علاقے کے پار ہو گئے۔ اور حدیبیہ کے مقام پر جا پہنچے۔ آج کل کی پیمائش کے اعتبار سے حدیبیہ مکہ سے گیارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، مسلمان مکہ کو دیکھ رہے تھے اور اہل مکہ کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ دو گھنٹے کے بعد مکہ پہنچ جائیں گے اور وطن مالوف کو اچھی طرح دیکھ سکیں گے مگر ثعلب، شتر پیغمبر یہاں کھڑا ہو گیا اور اس نے گھٹنے ٹیک دیئے حضرت محمد نے اسے کھڑا کیا تو وہ کھڑا ہو گیا لیکن آگے بڑھنے کی بجائے چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر بیٹھ گیا۔

حضرت محمد اونٹ سے اترے اور مسلمانوں سے فرمایا، "خدا چاہتا ہے کہ ہم یہیں توقف کریں" یہ سن کر مسلمان اپنے اپنے اونٹوں سے اتر پڑے اور افسوس کرنے لگے کیونکہ یہ بات ان کے لئے بالکل غیر متوقع تھی کہ مکہ کے دروازے پر پہنچ کر پیغمبر خدا کا حکم امتناعی صادر ہو جائے گا۔ جہاں آپ نے قیام فرمایا، وہ جگہ حدیبیہ میں غدیر الاشطاط کے نام سے مشہور تھی۔ فصل بہار میں یہاں پانی جمع رہتا تھا مگر جس زمانے میں یہاں مسلمان قیام پذیر ہوئے، پانی نہ تھا۔ مسلمان

حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے: "یا رسول اللہ ہماری دو ہزار کی جمعیت ہے کئی سو اونٹ ہیں ہم کیسے اس بے آب مقام پر ٹھہر سکتے ہیں؟ بہتر یہ ہے کہ آگے بڑھیں تا کہ ایسے مقام پر پہنچ جائیں جہاں پانی کی افراط ہو"۔

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ رسول اللہ کے ساتھ پندرہ سو باون اشخاص تھے اور بعض نے ان کی تعداد سولہ سو لکھی ہے۔ رسول اکرم یہ جانتے تھے کہ اگر آگے بڑھے اور دونوں فریقوں میں جنگ چھڑ گئی تو حرم میں خون ریزی ہوگی۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مکہ بھی خانہ کعبہ کی طرح حرم ہے یہاں بھی قتل و قتال حرام ہے، پھر یہ کہ ماہ حرام میں ویسے بھی خون ریزی ممنوع تھی۔ آپ نے اسی لئے مسلمانوں سے فرمایا کہ ہم آگے نہیں بڑھ سکتے، حکم خدا بھی ہے کہ یہاں توقف کریں۔ مسلمانوں نے کہا، "تو پانی کے لئے کیسے صبر کیا جائے؟" روایت ہے کہ حضرت محمد نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے بارش کے لیے دعا کی اور کہا، اے خدا اگر مسلمانوں کو پانی نہ ملا تو وہ حرم میں گھس جائیں گے" ابھی آپ مناجات سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ ایک مسلمان حاضر خدمت ہو کر عرض کرنے لگا یا رسول اللہ آپ کے قدموں کے نیچے پانی ہے، زمین کو کھودا جائے" ایسا معلوم ہوتا ہے یہ شخص طبقات الارض سے واقف تھا۔ مسلمان نے فوراً کھودنا شروع کر دیا، تو پانی نکل آیا، جب تک مسلمان یہاں ٹھہرے رہے پانی کی افراط رہی۔

جب مسلمان پانی کی طرف سے مطمئن ہو گئے تو آپ نے حضرت عمر سے فرمایا، "بحیثیت ایلچی کے مکہ چلے جاؤ، قریشیوں سے کہو کہ مسلمان مکہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں ان کا ارادہ جنگ کرنے کا نہیں ہے لہٰذا ہمیں مکہ میں داخل ہو کر خانہ کعبہ کی زیارت کرنے دو" حضرت عمر ؓ نے عرض کی۔ "آپ کو قریش سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟" عمر بن الخطاب ایک قوی، سادہ اور صاف گو انسان تھے وہ بعض سیاسی امور انجام نہ دے سکتے تھے، عمر بن الخطاب ذکی شمار ہوتے تھے، اہل عرب، ذکی اس شخص کو کہتے تھے جو راست گو اور درست کردار ہو۔ اہل عرب میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو اعتدال پسند تھے۔ مگر حضرت عمر نہایت سادہ اور صاف گو انسان تھے وہ درمیانی راہ اختیار نہ کر سکتے تھے۔ ان کی نگاہ برائی یا بھلائی، عدل و ظلم اور راست و

دروغ میں انتہاء پر پڑتی تھی کیونکہ وہ انتہا پسند واقع ہوئے تھے۔ ان کی نظر میں دین اسلام ایک دین برحق تھا اور مسلمانوں کا پشت پناہ اللہ تھا، لہٰذا ان کے نزدیک اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ مسلمان ورودِ مکہ کے لئے قریش سے اجازت طلب کریں اس بنا پر آپ ایلچی بننے اور قریشیوں کے پاس جانے پر تیار نہ ہوئے تب پیغمبر اسلام نے حضرت عثمان کو سفارت کے لئے منتخب فرمایا۔

حضرت عثمان ایک مجلسی انسان تھے اور مجلسی لوگوں کی طرح اس طور سے گفتگو کرتے تھے کہ کسی کو رنجش نہ ہو۔ انہوں نے رسول کریم کی ہدایت کو سنا تو اونٹ پر سوار ہو کر مکہ کی راہ لی مگر دیر تک واپس نہ آئے۔ اس دوران یہ بات گردش کرنے لگی کہ حضرت عثمان کو مشرکوں نے روک لیا ہے اور بعد ازاں یہ مشہور ہو گیا کہ وہ شہید کر دیئے گئے ہیں۔

حضرت محمد نے مسلمانوں کو ایک درخت کے نیچے جمع کیا۔ یہ درخت مقام حدیبیہ میں غدیر الاشطاط میں تھا۔ آپ نے خطاب کرتے ہوئے کہا، ''میں نے تم لوگوں کو یہاں اس لیے جمع کیا ہے کہ یہ عہد کرو کہ بغیر چوں و چرا کے، رسول خدا کے حکم پر عمل کرو گے خواہ وہ حکم تمہاری عقل کے خلاف ہو''۔ جب آپ یہ فرمان دے چکے تو حضرت سنان آگے بڑھے اور عرض کی۔ ''یا محمد میں قسم کھاتا ہوں کہ آپ جو کچھ حکم دیں گے میں اس کی تعمیل کروں گا خواہ وہ حکم میری نظروں میں برا ہو یا اچھا، اور وہ عقل کے خلاف ہو یا موافق عقل'' اس کے بعد وہ آپ کے قریب گئے اور دست مبارک پر بیعت کی یعنی اپنا ہاتھ آپ کے دست مبارک پر رکھ دیا۔ بعد ازاں تمام مسلمان آپ کے قریب آئے اور بیعت کی یعنی عہد کیا کہ آپ جو کچھ بھی حکم دیں گے ہم اسے بسر و چشم منظور کریں گے خواہ وہ ہماری نظروں میں برا ہو یا اچھا، عقل کے خلاف ہو یا عقل کے مطابق۔

اس بیعت کو بیعت الرضوان کہتے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس بیعت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ قرآن کی اڑتالیسویں سورۃ الفتح کی اٹھارویں آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے اس طرح اظہار رضامندی کرتا ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا.

(''اللہ راضی ہوا مسلمانوں سے جب وہ بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے، وہ جان گیا

ان کے دلوں کا حال تو تسکین اتاری ان پر اور دی انہیں قریبی فتح"۔)

مطلب یہ کہ "اے محمد! جب مسلمانوں نے درخت کے نیچے آپ سے بیعت کی تو اللہ ان سے خوش ہوا، اللہ کو معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کے دلوں میں کیا ہے کس قدر صدق و اخلاص ان کے قلوب میں بھرا ہے۔ لہٰذا ایسی چیزیں نازل کیں کہ ان کی تسکین خاطر کا سبب بنیں تاکہ ان کا اضطراب دور ہو اور انہیں سکون قلبی ہو۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد انہیں اس کے صلہ میں فتح عطا کرے گا" غرضیکہ جب مسلمانوں نے حدیبیہ میں پیغمبر کے ساتھ اخلاص و وفاداری کا اظہار کیا۔ اللہ کو ان کا حال معلوم ہو گیا کہ وہ رسول کے سچے وفادار ہیں تو انہیں انعام دیا۔ یہ عظیم الشان انعام، خیبر تھا جس کا ہم آئندہ ذکر کریں گے۔

باشندگانِ مکہ بالخصوص قریشی اس بیعت سے ڈر گئے کیونکہ انہوں نے رسول کریم کے دست مبارک پر یہ عہد کیا تھا کہ وہ ان کے حکم کی فوراً تعمیل کریں گے اگرچہ خلاف عقل ہی کیوں نہ ہو۔ قریشیوں نے کہا کہ بیعت لینے سے حضرت محمد کا یہ مقصود ہے کہ مکہ پر حملہ کریں جو بھی وہاں مقابلہ کرے اسے قتل کر دیں اور جو بھی عورت یا مرد ہاتھ لگے اسے کنیز یا غلام بنا لیں۔ اہل قریش کو جنگِ بدر، احد و خندق میں رسول اللہ کی جنگی مہارت کا علم ہو چکا تھا اور مسلمانوں کی قابلیت کا بھی ان کو پورا پورا احساس تھا لہٰذا وہ یہ خیال کرنے لگے کہ اگر انہوں نے مکہ پر حملہ کیا تو وہ اسے تسخیر کر لیں گے۔ اسی لئے انہوں نے فوراً حضرت عثمان ؓ کو روانہ کر دیا اور داماد پیغمبر مکہ سے حدیبیہ چلے آئے وہ یہ پیغام لائے کہ قریشی آپ کے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے تیار ہیں اور خواہش رکھتے ہیں کہ آپ کی خدمت میں چند افراد کو مذاکرہ کے لئے بھیجیں۔ اشراف مکہ حاضر خدمت ہوئے اور عکرمہ بن ابی جہل کو، جو منطقہ کوہستانی سے حدیبیہ کے مقام کی طرف بڑھ آیا تھا، حکم دیا کہ مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی جنگ نہ کرے۔

اگر حضرت محمد، عمر بن الخطاب کے نظریہ کو تسلیم کر لیتے اور مکہ کی طرف بڑھ جاتے تو خونریزی یقینی تھی۔ اشراف مکہ کو یہ بات کہنے کے لئے مل جاتی کہ پیغمبر اسلام نے حرم میں ماہ حرام میں خون ریزی کی۔ آپ نے بغیر کسی قسم کی خون ریزی کے، قریش کو متنبہ کر دیا کہ انہیں اپنی روش بدلنی چاہئے اور میرے پاس اپنے نمائندے بھیجنے چاہئیں تاکہ گفت و شنید ہو سکے۔ جس

طرح غزوہ احد، ایک ماہر جنگ کے نزدیک شکست نہیں تھا کیونکہ قشون مکہ، لشکر اسلام کو برباد نہ کر سکا۔ نہ مدینہ پر قبضہ کر سکا اسی طرح صلح حدیبیہ بھی سیاسی شکست نہیں ہو سکتی، بعض تذکرہ نویسوں کی یہ غلطی ہے کہ وہ اسے شکست قرار دیتے ہیں۔ یہ تو ایک سیاسی چال (Strategy) تھی۔ سیاست سے نابلد شخص بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ حضرت محمد نے اپنی سیاست سے حریف کو مقام حدیبیہ میں مجبور کر دیا کہ وہ ان کی سیاست کا مطیع بنے۔ صرف اہل قریش خود ہی آپ سے مذاکرہ کے لئے تیار نہ تھے بلکہ اپنی طرف سے اور نمائندوں کو بھیجنے کے لئے بھی تیار تھے تاکہ وہ یہ دیکھیں کہ مسلمانوں کی کیا وضع قطع ہے۔ آیا وہ مسلح ہیں یا نہیں۔ اگر مسلح ہیں تو وہ نبی کریم کے کس حد تک وفادار ہیں۔

کفار کی طرف سے سب سے پہلا ایلچی جو مقام حدیبیہ میں پہنچا وہ عروۃ بن مسعود ثقفی تھا وہ بنو ثقیف سے تھا۔ طائف میں رہتا تھا اور وہاں کا سردار تھا، اپنے خانوادے سے کوچ کر کے مکہ میں رہنے لگا تھا۔ عروہ اسی درخت کے نیچے جہاں آپ نے بیعت الرضوان لی تھی حاضر خدمت ہوا اور آپ سے دریافت کیا، ''مکہ کس مقصد سے آئے ہیں؟'' آپ نے فرمایا، ''ہم صرف مکہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں، کسی کے ساتھ جنگ کرنے نہیں آئے'' پھر آپ نے مسلمانوں سے فرمایا، ''قربانی کے جن اونٹوں پر نشان لگایا ہے عروہ کو دکھاؤ'' عروہ چند مسلمانوں کے ساتھ قربانی کے اونٹ دیکھنے گیا مگر اسے یقین نہ آیا کہ مسلمان زیارت کی غرض سے آئے ہیں، اپنا ہاتھ رسول اللہ کے رخ انور پر رکھ کر بولا۔ ''اے محمد کیا آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ یہ لوگ جو ارد گرد کھڑے ہیں جنگ برپا ہو جانے کی صورت میں آپ کے ساتھ وفادار رہیں گے اور آپ کو چھوڑ کر بھاگ نہ جائیں گے؟''

ایک صحابی حضرت مغیرہ بن شعبہ نے اپنی نوک شمشیر سے عروہ کے ہاتھ پر معمولی سا خراش لگا کر کہا، ''اے عروہ ادب کر، باتیں کرتے وقت رسول اللہ کے منہ پر ہاتھ مت مل'' عروہ نے ہاتھ کھینچ لیا، حضرت ابوبکر نے فرمایا، ''اے عروہ اگر تو بحیثیت ایک ایلچی کے، رسول اللہ کی خدمت میں نہ آیا ہوتا مامون و مصون نہ ہوتا تو میں تجھے مسلمانوں کے ساتھ توہین آمیز رویہ اختیار کرنے پر قتل کر دیتا، تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ مسلمان اپنے نبی کو میدان جنگ میں تنہا

چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے، اگر تو جنگ بدر و احد میں شریک ہوتا تو دیکھ لیتا کہ مسلمان پیغمبر خدا کے ساتھ کتنے وفادار ہیں"۔

عروہ مکہ واپس گیا اور قریشی سرداروں سے بولا، میں نے روم کا دربار دیکھا اور نجاشی شاہ حبشہ کا دربار بھی دیکھا مسلمانوں کی وفا پیغمبر کے ساتھ جس قدر ہے اس جیسی وفاداری میں نے قیصر روم اور نجاشی حبشہ کے ساتھ بھی نہیں دیکھی" عروہ کے بعد بنو کنانہ کا ایک اور فرد مکہ سے باہر گیا، حدیبیہ پہنچا تا کہ حضرت محمد اور مسلمانوں کو دیکھے کہ کس غرض سے آئے ہیں لوگوں نے حضرت محمد کو اطلاع دی کہ آنے والا بنو کنانہ سے ہے۔ آپ نے فرمایا: "یہ شخص اس قبیلے سے ہے جو جانوروں کی قربانی کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ قربانی کے اونٹوں کو آگے ہنکاؤ اور اس کی طرف بڑھو تا کہ وہ انہیں دیکھے" مسلمانوں نے اونٹوں کو آگے بڑھایا درآنحالیکہ وہ معروف ورد حج "لبیک اللھم لبیک" پڑھتے جاتے تھے اور اس کی طرف بڑھتے جاتے تھے۔ اس شخص نے جو قربانی کے جانوروں کو دیکھا اور مسلمانوں کو مخصوص ورد حج پڑھتے سنا تو وہ مکہ کی طرف واپس چلا گیا۔ قریشیوں سے کہنے لگا۔ "میں نے خود اپنی آنکھوں سے قربانی کے نشان زدہ جانور دیکھے، پیروان محمد کو احرام باندھے دیکھا، وہ اللھم لبیک کے نعرے لگا رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ زیارت کے لئے آئے ہیں لہٰذا انہیں روکنا نہ چاہیے"۔

قریش کوئی فیصلہ نہ کر سکے، انہوں نے ایک اور شخص، حضرت محمد کی خدمت میں بھیجا اس بار انہوں نے بدوی قبیلے کے سردار احابش کو جو ایک صحرانشین قبیلہ تھا، آپ کی خدمت میں بھیجا، قبیلہ احابش صحرائے مکہ کے قریب رہتا تھا، قریشی اس کے سردار حلیس بن علقمہ کو اچھا آدمی سمجھتے تھے۔ حلیس مکہ سے روانہ ہو کر مسلمانوں کے پاس پہنچا۔ رسول اللہ نے حکم دیا کہ اسے آزادانہ ادھر ادھر چلنے پھرنے دیا جائے، وہ جس سے چاہے بات کرے اور جو کچھ چاہے مشاہدہ کرے۔

حلیس بن علقمہ نے دیکھا کہ سارے مسلمان احرام باندھے ہوئے ہیں اور انہوں نے قربانیوں کے اونٹوں پر نشان لگائے ہیں اس نے مسلمانوں کے ساتھ کوئی جنگی ہتھیار نہ دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ اونٹوں نے بھوک کی شدت سے ایک دوسرے کی اون کھا لی ہے۔ حلیس بن علقمہ فوراً لوٹ گیا اور قریشیوں سے کہا۔ "مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمان

صرف زیارت کعبہ کی وجہ سے سفر کر کے آئے ہیں، تمہیں چاہیے کہ انہیں آزاد چھوڑ دو کہ مکہ آئیں اور زیارت کریں" قریشی بولے۔ "ہمیں یہ ڈر ہے کہ یہ شخص مکہ پہنچ کر کہیں مکہ کی تسخیر کی فکر نہ کرنے لگے۔" حلیس نے کہا، "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ حضرت محمد اور ان کے ساتھی سوائے زیارت کے اور کسی بھی چیز کے خواہاں نہیں ہیں، اگر وہ تسخیر کے ارادے سے آتے تو جنگی ساز و سامان کے ساتھ آتے۔ میں نے ان کے پیروکاروں کے پاس ایک بھی زرہ، خفتان، نیزہ یا خود نہیں دیکھا"۔

اس پر بھی قریش مسلمانوں کو راہ دینے پر راضی نہ ہوئے تو حلیس بگڑ گیا، اس نے کہا، "تم ایک نا قابل بخشش گناہ کے مرتکب ہو گے تم کیسے ان لوگوں کو روک سکتے ہو جو زیارت کے ارادے سے آئے ہیں، اگر تم لوگوں نے حضرت محمد اور ان کے متبعین کو داخلے کی اجازت نہ دی تو میں تم سے جدا ہو جاؤں گا، اس کے بعد تم مجھے اپنا نہ سمجھنا" بزرگان قریش میں سے کچھ لوگوں نے ابن علقمہ کو خاموش کیا اور کہا، "اے ابن علقمہ تو صحرا نشین راست گو، درست کردار اور سیدھا سادہ آدمی ہے تو دوسروں کے باطن کا حال کیا جان سکتا ہے ذرا تھوڑا صبر کر کہ ہم مشورہ و تحقیق کر سکیں اور ساکنان مکہ کے لیئے کوئی فلاح کی راہ نکال سکیں"۔ دو روز تک مشائخ قریش نے مشورہ کیا ان دو روز میں وہ لوگ جو مسلمانوں کے تجسس کے لیئے جاتے تھے آتے جاتے رہے اور دارالندوہ (مجلس شورائے قریش) میں شریک مشورہ ہوتے رہتے۔

مجلس شوریٰ سے باہر آ جانے کے بعد وہ سرداران قریش سے مسلمانوں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے، وہ کہتے کہ مسلمانوں کا حضرت محمد کے بارے میں احترام بے مثال ہے، اگر حضرت محمد ایک پیالہ پانی پینا پڑتے ہیں تو دس مسلمان دوڑتے ہیں تا کہ آپ کے لیے پانی لائیں۔ جو لوگ پانی پلانے سے محروم رہتے ہیں وہ اپنے آپ کو بدنصیب شمار کرتے ہیں۔ ایک عجیب بات مسلمانوں میں یہ ہے کہ وہ رات دن میں کئی مرتبہ صف بندی کر کے خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ نماز ادا کرتے وقت ان کا نظم و ضبط قابل دید ہوتا ہے۔

حدیبیہ کے حالات دیکھ کر آنے والوں نے یہ بھی بیان کیا کہ مسلمان حضرت محمد سے اس قدر وفاداری رکھتے ہیں کہ اگر وہ ذرا بھی اشارہ کر دیں تو تمام مسلمان جانیں قربان کرنے پر تیار

ہو جاتے ہیں۔ جماعت قریش یہ حالات سن کر بڑی خوف زدہ ہو گئی، آخر دو رات اور دو دن کے مشورے کے بعد ایک قریش نے سردار سہیل بن عمرو کو اپنے نمائندوں کا سردار بنا کر حدیبیہ کی طرف روانہ کیا تا کہ حضرت محمد کے ساتھ گفتگو کر کے مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ کرا دیں۔

روایت ہے کہ جب حضرت محمد نے سہیل بن عمرو کو دیکھا تو فرمایا، ''اب ہمارا کام سہل ہو گیا'' عربی دان لوگ جانتے ہیں کہ سہیل، سہل سے مشتق ہے، نمائندگان قریش کی بات چیت کے بعد آخر ایک دن طے پا گیا کہ دونوں فریقوں کے درمیان ایک پیمان جنگ بندی ہو جانا چاہئے۔

چنانچہ سب آمنے سامنے بیٹھے۔ رسول اللہ نے حضرت علی کو حکم دیا کہ وہ معاہدے کی عبارت لکھیں۔ اور عبارت کے شروع میں ''بسم اللہ'' لکھیں۔ چنانچہ انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ دیا۔ اس پر سہیل نے اعتراض کیا، میں رحمٰن و رحیم کو نہیں مانتا علی کو چاہئے کہ وہ باسمك اللھم لکھیں کیونکہ عرب کے سارے عہد نامے اس طرح شروع ہوتے ہیں۔''

حضرت علی نے دریافت کیا، ''یا رسول اللہ کیا کروں؟''

فرمایا: ''باسمك اللھم لکھ دو'' چنانچہ حضرت علی نے فرمان نبوی کے مطابق لکھ دیا۔ اس کے بعد جو کچھ آپ نے املا کرایا انہوں نے تحریر کر دیا لکھا تھا:

''یہ عہد نامہ محمد رسول اللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان منعقد ہوا'' سہیل بن عمرو نے اعتراض کیا اور کہا، ''ایسے مت لکھو، کیونکہ ہم تمہیں پیغمبر خدا نہیں مانتے، اگر ہم پیغمبر خدا مانتے تو مکہ میں داخل ہونے سے نہ روکتے اس طرح لکھو، ''یہ معاہدہ محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان طے پایا'' رسول اللہ نے حضرت علی سے فرمایا، ''ایسے ہی لکھ دو تا کہ سہیل بن عمرو خوش ہو جائے'' یہاں دو نکتے غور طلب ہیں، سہیل بن عمرو نے اور کوئی اعتراض عہد نامہ پر نہیں کیا کیونکہ معاہدہ کے اصول طے پا چکے تھے۔ علی بن ابی طالب نے جو ایک دانش مند، خوش نویس اور بزرگان اسلام میں سے تھے، معاہدہ کو اس طرح لکھا:

''باسمك اللھم یہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان ہوا، اس

عہد نامہ کے بموجب دونوں فریق عہد کرتے ہیں کہ دس سال کی مدت مسلمانوں اور باشندگان مکہ کے درمیان جنگ نہیں ہوگی اور اس عرصہ میں کوئی شخص کسی فریق کے جان و مال سے تعرض نہیں کرے گا۔ اس دس سالہ مدت میں اگر کوئی شخص قبائل قریش میں سے اپنے سرداروں کے اذن کے بغیر مسلمانوں سے آ کر مل جائے گا تو مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ اسے قریش کو واپس کر دیں لیکن اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص بغیر اجازت حاصل کئے قریشیوں سے جا ملے گا تو قریش اسے واپس کرنے پر مجبور نہ ہوں گے۔ اس دس سالہ مدت میں جب تک متارکۂ جنگ قائم رہے گا۔ طرفین میں سے کوئی کسی کے جان و مال کا قصد نہ کرے گا، نہ کوئی کسی پہ حملہ آور ہوگا نہ کسی کے جان و مال کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے گا۔ اس دس سالہ عرصہ میں جماعت قریش کو اجازت ہوگی کہ جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ کریں اور اتحاد کریں، اسی طرح مسلمان بھی آزاد ہوں گے کہ جس کے ساتھ چاہیں پیماں بندی کریں اور متحد ہو جائیں۔ اس سال مسلمانوں کو اجازت نہیں ہے کہ وہ کعبہ کی زیارت کے لئے مکہ جائیں، البتہ اگلے سال زیارت کعبہ کے لئے آ سکتے ہیں بشرطیکہ تین دن سے زیادہ اقامت نہ کریں اور تلوار کے سوا کوئی ہتھیار ساتھ نہ لائیں۔

یہ معاہدہ جو ساتویں سال ہجری میں حضرت محمد (ﷺ) اور جماعتِ قریش کے درمیان منعقد ہوا، آج تک تذکرہ نگارانِ اسلام اس پر بحث کرتے چلے آئے ہیں اور جو مصنفین اسلام اس معاہدہ کے فوائد سے اطلاع نہ پا سکے۔ انہوں نے یہ لکھ دیا ہے کہ اس معاہدہ سے مسلمانوں میں سخت نفرت و غصہ پھیل گیا تھا۔ اس موقعہ پر مسلمانوں نے احرام باندھ کر قربانی کے اونٹوں پر مخصوص نشان لگا دیا تھا تا کہ مکہ میں داخل ہوں اور طواف کعبہ کریں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں بہت سے مسلمان اہلِ مکہ تھے انہیں تمنا تھی کہ وطن واپس جائیں اس بار انہیں پوری طرح اطمینان تھا کہ وہ وطن میں داخل ہو سکیں گے۔ دوسری طرف مہاجرین وطن کے داخلے سے بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ اور مہاجر و انصار سارے مسلمان، مکہ کے داخلے پر قدغن کو اپنی توہین سمجھتے تھے۔ مسلمان چونکہ حضرت محمد کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے لہٰذا کسی نے بھی دم نہ مارا صرف عمر بن الخطاب نے اظہار ناراضی کیا۔ وہ حضرت محمد کی خدمت میں جا کر عرض کرنے لگے۔ ''یا رسول! آپ نے فرمایا تھا ہم مکہ جائیں گے اور خانہ کعبہ کا طواف کریں گے''۔

حضور نے جواب دیا، ''ہاں اے عمر میں نے یہ بات کہی تھی مگر یہ تو نہیں کہا تھا اسی سال ایسا ہوگا''۔

عمر ﷺ بن الخطاب ''تو پھر ہم کب مکہ جائیں گے اور طواف کعبہ کریں گے؟'' آپ نے فرمایا، ''اگلے سال تم مکہ جاؤ گے اور زیارت کعبہ کرو گے'' مسلمانوں کی ناراضی کے علاوہ ایک اور سخت واقعہ بھی پیش آیا جو یہ ہے۔

سہیل بن عمرو، سردار سفرائے قریش، جس نے دس سالہ عدم جنگ کا معاہدہ کیا تھا اس کا بیٹا ابوجندل، باپ کی اطلاع کے بغیر مسلمان ہو گیا تھا، متارکہ جنگ کے عہد نامہ پر دستخط ہو جانے کے دو روز بعد حضرت ابوجندل مکہ سے بھاگے اور مسلمانوں کے پاس حدیبیہ گئے، کہنے لگے، ''میں مسلمان ہوں تم لوگ میرے دینی بھائی ہو مجھے پناہ دے دو''۔ کچھ دیر کے بعد سہیل بن عمرو بھی مکہ سے حدیبیہ پہنچا اور حضرت محمد سے کہا، ''ہمارے تمہارے درمیان جو معاہدہ ہو چکا ہے اس کی رو سے آپ میرے بیٹے ابوجندل کو واپس کر دیں'' حضرت محمد ابوجندل کی واپسی سے انکار نہ کر سکتے تھے کیونکہ اگر ایسا کرتے تو دس سالہ معاہدہ ترک جنگ منسوخ ہو جاتا، مجبوراً آپ نے اسے واپس کر دیا۔ واپس کیے جانے سے قبل حضرت ابوجندل نے کہا، ''یارسول اللہ میرا باپ مجھے مار ڈالے گا''۔ رسول اللہ نے فرمایا، ''پرواہ نہ کرو اللہ تمہیں نجات دے گا''۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ابوجندل قتل نہیں کیے گئے بلکہ زندہ سلامت رہے۔

مکہ میں داخل نہ ہو سکنے کی پابندی پر مسلمان ناراض تو تھے ہی اس واقعہ سے وہ اور زیادہ برہم ہو گئے۔ اگر اس سے پیشتر مسلمان پیغمبر اسلام کے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے کہ وہ جو بھی حکم دیں گے خواہ خلاف عقل محسوس ہو اسے تسلیم کریں گے اور اسے عملی جامہ پہنائیں گے تو شر اور شورش بپا ہو جاتی مگر بیعت مانع رہی۔ لوگ حضرت محمد کی سی سیاسی سوجھ بوجھ نہ رکھتے تھے وہ دس سالہ متارکہ جنگ کے فوائد کو کیا سمجھتے۔ رسول اللہ نے معاہدہ کر کے مدینہ کو اقتصادی محاصرہ سے بچا لیا کیونکہ معاہدے کے بعد کاروان مدینہ بلاخوف وخطر مکہ کا رخ کر سکتے تھے معاہدے کی وجہ سے مسلمان دس سال تک آزادانہ زندگی گزار سکتے تھے اور جس کے ساتھ چاہے معاہدہ واتحاد قائم کر سکتے تھے۔

اس زمانے تک مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن اہل مکہ تھے۔ معاہدہ کی بنا پر مسلمان دس سال اہل مکہ کی طرف سے آسودہ رہ سکتے تھے۔ مسلمانوں میں اتنی استعداد کہاں تھی کہ وہ ایسے بڑے بڑے سیاسی فائدوں کو سمجھ سکتے جو حضرت محمد نے بغیر لڑے بھڑے اور بغیر ہاتھ سے کچھ دیئے حاصل کر لئے تھے۔ وہ تو امسال مکہ میں داخل نہ ہو سکنے اور ابو جندل ؓ کے واپس کر دینے کو اپنی دو بڑی ناکامیاں سمجھے ہوئے تھے۔

ابو جندل ؓ کی واپسی سے مسلمانوں کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ مکہ نہ جا سکنے کا اس قدر صدمہ نہ تھا۔ کیونکہ اہل عرب جس کو پناہ دے دیتے تھے اس کی حمایت کرتے تھے چہ جائیکہ مسلمان ایک مسلمان کو پناہ دیں۔ وہ اس بات کو نہ سمجھ سکتے کہ ابو جندل کی واپسی معاہدے کے تحت ہوئی ہے وہ نوجوان معاہدے پر دستخط ہو جانے کے بعد مکہ سے بھاگا تھا لہٰذا ابو جندل کی واپسی مسلمانوں کے لئے باعث دل شکنی نہ ہونی چاہئے تھی۔

جب حضرت محمد نے یہ دیکھا کہ مسلمان سخت ناراض ہیں تو سب کو حدیبیہ کے مقام پر جمع کر کے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''ہم نے جو معاہدہ کیا ہے یہ ہماری فتح مبین ہے'' یعنی ایک تاباں و درخشاں فتح ہے۔ یہ عظیم سیاسی فتح جو مسلمانوں کی حدیبیہ میں نصیب ہوئی اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں اپنے پیغمبر پر ایک آیت نازل فرمائی۔ یہ اڑتالیسویں سورۃ الفتح کی آیت ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا.

''ہم نے آپ کو فتح مبین دی ہے۔''

بعض علمائے اسلام کا خیال ہے کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے بعد فتح مکہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی اور بعض کا خیال ہے کہ فتح خیبر سے متعلق ہے۔

کچھ علمائے اسلام کہتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق تمام فتوحات اسلامی سے ہے جن میں حدیبیہ کی سیاسی فتح بھی شامل ہے۔ ابھی حضرت محمد نے توضیح و تفصیل نہ کی تھی کہ ایک مسلمان بولا، ''ہم زیارتِ کعبہ سے محروم رہ گئے ہیں ہم طواف بھی نہ کر سکے'' پیغمبر اسلام (ﷺ) نے فرمایا، ''تم اگر یہیں سے کعبہ کی زیارت کر لو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری زیارت کو قبول کر لے گا

اور یہ زیارت، طواف کعبہ کے قائم مقام ہو جائے گی، میں بھی یہیں سے زیارت کروں گا، اور یہیں قربانی کے جانور ذبح کروں گا، یہیں حجامت بنوا کر احرام کھول دوں گا، تم بھی میری طرح کرنا، سر منڈا کر احرام کھول دینا" ایک مسلمان نے کہا، "یا رسول اللہ ابو جندل کی واپسی کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے مشرکوں کے ساتھ ایسا پیمان کیوں باندھا کہ وہ اگر چاہیں تو اپنے مفروروں کو ہم سے واپس لے جائیں اور ہم چاہیں تو اپنے مفروروں کو ان سے واپس نہ لے سکیں؟"

آپ نے فرمایا، "ابو جندل کی واپسی عہد نامہ کے تحت ہوئی ہے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں کو اس پر رنجیدہ نہ ہونا چاہئے میں جانتا ہوں کہ ابو جندل مارا نہیں جائے گا، زندہ سلامت رہے گا اور اگر بالفرض وہ مارا بھی جائے تو سعادت ابدی پائے گا اس لیے کہ وہ شہید ہو گا اور شہید، مرنے کے بعد بہشت میں جاتا ہے۔ رہی یہ بات ہم نے عہد نامہ میں یہ طے کیوں نہیں کیا کہ اگر ہم میں سے بھاگ کر کوئی شخص ساکنان مکہ سے جا ملے تو ہم اسے واپس نہیں لے سکتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص دین اسلام سے برگشتہ ہو کر کافروں سے جا ملے گا وہ ہمارے کس کام کا؟ وہ تو خائن و مرتد ہے، ہم اسے قبول نہیں کر سکتے اور اپنوں میں سے نہیں سمجھتے۔ اسی لیے ہم نے پیمان میں حق استرداد چھوڑ دیا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہم ایسے مسلمان کو قبول نہیں کریں گے جو باشندگان مکہ سے جا ملے۔ ہم نے جو اس معاہدے کو فتح مبین سے تعبیر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آج سے اہل مکہ کی طرف سے دس سال کے لیے ہم مطمئن ہو گئے۔ ان دس سالوں میں ہم اردگرد کے تمام قبائل کو مسلمان کر سکتے ہیں بغیر اس امر کے کہ اہل مکہ اعتراض کریں یا کوئی بہانہ تراش سکیں۔ ان دس سالوں میں ہم اپنے آپ کو طاقتور بنانے کے لئے جس سے چاہیں گے پیمان اتحاد کر سکیں گے اور اس طرح اپنی قوت میں اضافہ کر سکیں گے، فوری فائدہ اس معاہدے کا یہ ہے کہ مدینہ جو اقتصادی محاصرہ میں ہے اب محاصرے میں نہیں رہے گا" ایک مسلمان نے دریافت کیا۔ "یا رسول اللہ! آپ سے اس معاہدہ میں یہ کیوں لکھایا گیا ہے کہ یہ معاہدہ محمد بن عبداللہ کی طرف سے ہے، یہ کیوں نہیں لکھایا کہ رسول اللہ کی طرف سے ہے؟"

حضرت محمد نے جواباً فرمایا، "ٹھیک ہے میں نے معاہدہ میں محمد بن عبداللہ لکھایا ہے مگر یہ تو

کہیں بھی نہیں لکھایا کہ میں فرستادۂ خدا نہیں ہوں اس سے مسلمانوں کا کوئی نقصان نہیں ہوتا میں نے معاہدہ میں اس لیے پیغمبر خدا نہیں لکھایا کہ مشرکین یہ چاہتے تھے کہ ایسا نہ لکھا جائے۔ مشرکوں کی یہ درخواست طفلانہ تھی لہٰذا میں نے اسے قبول کر لیا۔ ان کی اس خواہش کی تکمیل سے مسلمانوں کا کیا نقصان ہوا بلکہ ہمارا جو مقصود تھا وہ پورا ہو گیا کہ قریش کے ساتھ معاہدہ ترک جنگ ہو جائے" اس کے بعد کسی شخص نے کوئی اعتراض نہیں کیا مگر عام مسلمان خصوصاً حضرت عمر اب بھی مطمئن نہ ہوئے تھے وہ کہنے لگے۔ "یا رسول اللہ کیا ہمارا دین برحق نہیں ہے؟ کیا مشرکوں کا مذہب باطل نہیں ہے؟ کس اصول کی بنا پر ایک حق ایک باطل کے مقابلے میں خفیف ہو گیا؟"

لیکن اس کے باوجود حدیبیہ سے مراجعت کرنے اور مدینہ میں چند ماہ توقف کے بعد مسلمانوں حتیٰ کہ حضرت عمر نے بھی اس امر کی تصدیق کر دی کہ معاہدہ ترک جنگ اور صلح حدیبیہ سے مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچا اور یہی معاہدہ اس امر کا سبب بنا کہ اطراف مدینہ کے بہت سے بدو قبائل مسلمانوں کی طاقت سے مرعوب ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ البتہ جب مسلمانوں نے احرام کھولنے کے لئے سر منڈائے یا بال اتروائے اور راہ شمال یعنی راہ مدینہ اختیار کی تو وہ بڑے ہی ملول تھے۔ سب سے زیادہ صدمہ انہیں اس بات کا تھا کہ حضرت محمد نے ابو جندل کو کیوں قریش کے حوالہ کر دیا۔ کسی خوف زدہ کو پناہ دینا بدو عربوں کا مقدس قانون تھا، وہ سوچتے تھے کہ حضرت محمد نے ایک مقدس قانون کو ٹھکرا دیا ہے۔ دور جاہلیت کا ایک شاعر طرفہ کہتا ہے۔

"مرتے دم میں اس دنیا سے مسکراتا ہوا جاؤں گا کیونکہ دوران زندگی میں مجھے تین نعمتیں ملی ہیں جو اس دنیا میں بہترین وسیلۂ سعادت ہیں پہلی نعمت یہ ہے کہ جب کوئی جان کے خطرے سے بھاگتا اور مجھ سے پناہ طلب کرتا تو میں اسے پناہ دے دیتا، دوسری یہ کہ میں نے خوب خوب شراب پی، تیسری یہ کہ بارش کے دنوں میں جب کہ انسان غمگین ہوتا ہے میں نے اپنے غموں کو حسین عورتوں کی محبت سے بھلا دیا" اس شاعر عرب نے کسی خوف زدہ کو پناہ دینا سب سے بڑی نعمت قرار دیا ہے اور دوسری دو لذتوں پر اسے فوقیت دی ہے۔

مسلمان جانب شمال یعنی مدینہ کی طرف جا رہے تھے کہ ایک اور مسلمان ابو بصیر، مکہ سے بھاگ کر مسلمانوں کے پاس آ گیا اور پناہ کا طالب ہوا۔ حضرت محمد نے اسے کچھ جواب نہ دیا

کیونکہ آپ کو خیال ہوا شاید دھوکا ہوا اور قریش نے اسے اس غرض سے بھیجا ہوتا کہ دیکھیں کیا رد عمل ہوتا ہے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ابو بصیر کی جانب کسی قسم کا کوئی دھوکا نہیں ہے وہ بالکل سچا مسلمان ہے۔ چونکہ مکہ میں اسے سخت ایذائیں دی جاتی تھیں اور وہ جان کا خطرہ محسوس کرتا تھا لہٰذا مسلمانوں کے پاس چلا آیا۔ ابو بصیر کے پہنچنے کے بعد دو قریشی حاضر خدمت ہو کر عرض کرنے لگے۔ "نئے معاہدے کے تحت آپ کو یہ شخص ہماری تحویل میں دے دینا چاہیے" حضرت عمر ﷛ بن الخطاب بولے، "یا رسول اللہ اس بار تو آپ ابو بصیر کو کفار کے حوالے نہ کریں وہ ہماری پناہ میں آ گیا ہے۔ ہم اگر سب کے سب بھی مارے جائیں تب بھی حوالے نہ کریں گے"۔ حضرت محمد نے فرمایا، "ابھی ابھی جو معاہدہ مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان ہوا ہے میں اسے توڑ نہیں سکتا"۔

مکہ سے جو دو شخص آئے تھے انھوں نے ابو بصیر کو مسلمانوں کے سامنے اونٹ پر باندھا اور مکہ کی راہ لی۔ ابو بصیر بہت طاقتور تھے اور انہوں نے راہ میں ہی رسی کاٹ دی، اونٹ سے اترے ان دو میں سے ایک کو قتل کیا تو دوسرا بھاگ گیا۔ وہ پھر مسلمانوں کے پاس جا کر پناہ کے طالب ہوئے اور تقاضا کرنے لگے۔ اس بار ابو بصیر کی حیثیت صرف ایک مفرور کی سی نہ تھی بلکہ وہ قاتل بھی تھے اور قریشی اس سے اپنے مقتول کا خوں بہا بھی طلب کر سکتے تھے۔ حضرت محمد نے ارشاد فرمایا۔ "ابو بصیر کو نگرانی میں رکھا جائے جب تک کہ مکہ سے ان کا کوئی طالب نہ آئے"۔ ایک دن کے بعد ابو بصیر کا وہ محافظ جو جان بچا کر بھاگ گیا تھا، لشکرِ اسلام میں پہنچا اور ان کا طالب ہوا۔ لوگوں نے حضرت محمد کے حکم کے مطابق انہیں اس شخص کے حوالہ کر دیا مگر اس سے پیشتر کہ وہ لشکر اسلام سے انہیں دور لے جائے ابو بصیر بھاگ کر پیغمبر اسلام کی خدمت میں پہنچے تھے تو آپ نے ان سے فرمایا، "اے ابو بصیر ہم قریش سے کیے گئے معاہدے کے تحت تمہیں قبول نہیں کر سکتے تم مکہ چلے جاؤ، خدا تمہیں نجات دے گا" ابو بصیر نے سوچا کہ اب اگر میں مکہ گیا تو چونکہ ایک قریشی کا قاتل ہوں لہٰذا قتل کر دیا جاؤں گا، پیغمبر اسلام نے انہیں اس زمانے میں مکہ کی طرف لوٹ جانے کو کہا تھا جب کہ وہ ایک قریشی کے قاتل نہ تھے اور فرمایا تھا کہ اللہ نجات دے گا مگر اب تو وہ ایک قاتل بھی تھے۔ اگر مکہ جاتے تو یقیناً قتل کر دیے جاتے۔ لہٰذا ابو بصیر نے بیابان کی راہ لی۔

ایک عرب شاعر شنفری، ابوبصیر کی زبانی اس طرح کہتا ہے۔ "بھائیو میرا پیچھا نہ کرو کیونکہ میں نے بیابان کی راہ لے لی ہے، میں چاہتا ہوں کہ وہاں نئے دوست احباب بنالوں، دوستو میرے پیچھے نہ پڑو کیونکہ میں تنہا زندگی بسر کرسکتا ہوں، رات کی تاریکی میں راہ پیائی کرسکتا ہوں، میرے دوست قوی چیتے، چالاک بھیڑیے اور عیال دار بجو ہوں گے"۔

حضرت ابوبصیر اہل مکہ سے بھاگ کر منطقہ ذوالمروہ میں جا پہنچے۔ ان کے بعد ابوجندل بھی مکہ سے فرار ہوکر ان کے پاس آگئے۔ اسی دوران میں ایک اور مسلمان عتبہ بن اسید مکہ سے بھاگ کر ذوالمروہ چلے گئے۔ بعد ازاں جو مسلمان بھی مکہ سے فرار ہوتا ذوالمروہ پہنچ جاتا، ہوتے ہوتے وہاں ایک وحدت اسلامیہ یا موجودہ اصطلاح کے مطابق ایک امت جدیدہ تشکیل پاگئی۔ یہ لوگ پیمان متارکہ جنگ یا صلح حدیبیہ کے پابند نہ تھے کیونکہ ذوالمروہ مدینہ کا رقبہ نہ تھا اور حضرت محمد وہاں کوئی اقدام ان کی گرفتاری کے لئے نہ کرسکتے تھے۔

ابھی ایک سال صلح حدیبیہ پر نہ گزرا تھا کہ ذوالمروہ کے مسلمان اس قدر کثیر ہوگئے کہ وہ ایک چھوٹی سی جمعیت بنانے پر قادر ہوگئے یہ لوگ مکہ کے قافلوں پر حملہ کرتے اگر کوئی شخص مقابلہ کرتا تو اسے قتل کردیتے اور سارا مال لوٹ لیتے۔ قریشیوں کو اس سے بڑی سخت تکلیف پہنچی۔ انہوں نے حضرت محمد سے درخواست کی کہ جو مسلمان مکہ سے بھاگ کر ذوالمروہ میں اقامت گزیں ہیں انہیں مدینہ بلا کر جائے سکونت دیں، ہم لوگ ان کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ پیغمبر اسلام نے ان سے تحریری درخواست طلب کی تاکہ دستاویز کے طور پر اپنے قبضہ میں رہے۔ اس طرح متارکۂ جنگ کی ایک شرط جسے مسلمان اپنے لئے باعث توہین سمجھتے تھے ختم ہوگئی۔ اس کے بعد اور شرائط بھی جو مسلمانوں کے لئے فائدہ مند نہ تھیں رفتہ رفتہ ختم ہو گئیں۔ صرف وہ باتیں باقی رہ گئیں جن سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اہل قریش نے ایک درخواست لکھ کر رسول اللہ کو پیش کردی کہ جس میں لکھا تھا کہ اگر کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ کر مدینہ آئے گا تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ تب مسلمانوں کو پتہ چلا کہ صلح نامہ حدیبیہ پر وہ جو شک وشبہ اس وقت اور اس کے بعد کرتے تھے وہ خود مسلمانوں کے لیے بہت سود مند تھا۔

مکہ میں قحط اور مسلمان

حدیبیہ سے لوٹنے کے بعد حضرت محمد یہ کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح مسلمانوں اور اہل مکہ کے تعلقات درست رہیں۔ خدا کا کرنا کہ اس سال باشندگان مکہ خشک سالی کی وجہ سے قحط کے شکار ہو گئے۔ عرب میں ایک قبیلہ یمامہ میں تھا۔ جس کی سرزمین اہل مکہ کے لئے غذائی اجناس مہیا کرتی تھی۔ قبیلے کا سردار اور یہ پورا قبیلہ مسلمان ہو چکا تھا لہٰذا قبیلے کے سردار نے اہل مکہ کو غلہ فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ بھوک سے تنگ آ کر مکہ کے باشندوں نے حضرت محمد سے درخواست کی کہ سردار یمامہ کو حکم دیں ہمیں غلہ سے محروم نہ رکھے پیغمبر اسلام نے یہ درخواست قبول کر لی اور رئیس یمامہ کو حکم دیا کہ ان کے ہاتھ غلہ کی فروخت بند نہ کرے۔ اس کے علاوہ آپ نے پانچ سو طلائی سکے اہل مکہ کو بھیجے تا کہ انہیں فقرائے مکہ میں تقسیم کر دیں۔ ابوسفیان کو جو اس بات کا پتہ لگا تو بولا، ”محمد یہ چاہتے ہیں کہ اہل مکہ بالخصوص نوجوانوں کو دولت دے کر فریفتہ کر لیں“ پانچ سو دینار بھیجنے کے بعد آپ نے ابوسفیان کو بہت سی کھجوریں بھجیں اور کہلایا کہ ان کے بدلے رنگی ہوئی کھالیں بھیج دیں اس زمانے میں ابوسفیان کے پاس اس قدر کھالیں تھیں کہ ان کا کوئی بھی خریدار نہ تھا کیونکہ زمانہ قحط میں مکہ جیسے شہر کے لوگ سامان رسد بالخصوص خرما کے طالب تھے کھالیں کون خریدتا۔ ابوسفیان نے چاہا کہ کھجوروں کا ہدیہ قبول نہ کرے مگر وہ ایسا نہ کر سکا، اس لیے کہ اہل مکہ کو کھجوروں کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ چونکہ وہ بھوک سے تنگ آ گئے تھے لہٰذا آئی ہوئی کھجوروں کی واپسی پر رضامند نہ ہو سکتے تھے۔ ابوسفیان مجبور ہو گیا کہ کھجوروں کو قبول کرلے اور تبادلے میں چرم بھیج دے۔

جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ کھجوریں پیغمبر اسلام نے بھیجی تھیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس کے باوجود اشراف مکہ یعنی قریشی آپ سے عناد ہی رکھتے رہے۔ حضرت محمد یہ جانتے تھے کہ قریش آپ سے دشمنی رکھتے ہیں پھر بھی انہیں دوست بنانے کی کوشش کرتے رہے کیونکہ مسلمانوں اور قریش کی بہبود کو وہ اسلام کی ترقی کے لئے ضروری سمجھتے تھے، انہیں اس بات کی پرواہ نہ تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ایک پیغمبر کو دین خدا کی ترقی کے مقابلہ میں کسی کی یاوہ گوئی کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی ہر محبوب چیز کو قربان کر سکتا ہے۔

یہودیوں کی کتاب تلمود میں لکھا ہے۔ ''خدا اپنے پیغمبر سے چاہتا ہے کہ وہ دل و جان سے اس سے محبت کرے۔ اپنے جسم و جان اور آبرو کو اس کی راہ میں قربان کر دے'' حضرت محمد اللہ تعالیٰ کو جان و دل سے دوست رکھتے تھے۔ اور دین کی ترقی کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہ کرتے خواہ لوگ مذاق اڑائیں۔ خدا پر ایمان رکھنے والا، راہ خدا میں سب کچھ دے دیتا ہے۔ حضرت محمد قربانی سے کیسے پیچھے رہ سکتے تھے وہ چاہتے تھے کہ دین اسلام کی ترقی کے لئے ایک سے ایک بڑی قربانی دیں جس کا لازمی نتیجہ مکہ پر غلبہ ہوگا۔

اُم حبیبہ سے شادی

آپ (ﷺ) کو پتہ چلا ام حبیبہ دختر ابوسفیان وزوجہ عبداللہ بن جحش بیوہ ہوگئی ہیں۔ عبداللہ بن جحش نے چند سال پہلے اپنی بیوی سمیت حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی مگر وہاں پہنچ کر وہ اسلام سے برگشتہ ہو کر مر گیا تھا اس کی بیوی ام حبیبہ بیوہ ہوگئی تھیں، حضرت محمد نے ام حبیبہؓ سے شادی کی درخواست کا ارادہ کر لیا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ام حبیبہؓ نے ان کی پیش کش کو قبول کر لیا تو وہ ابوسفیان کے داماد بن جائیں گے اس تعلق سے مکہ کا سب سے بڑا دشمن نرم پڑ جائے گا۔ ابوسفیان مکہ کے لشکر کا سپہ سالار تھا۔ اگر اس کی دشمنی حضرت محمد سے دوستی کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ اس شادی سے تمام بنوامیہ سے رشتہ داری ہو جاتی ہے اور ہندہ جگر خور اور بنوامیہ کی دشمنی کم ہو جاتی ہے۔ اس زمانے میں ام حبیبہؓ حبشہ میں تھیں، حضرت محمد کا خیال تھا کہ جب بھی ام حبیبہؓ عربستان آئیں گی تو ان کے باپ ابوسفیان اور سارے بنوامیہ آپ سے شادی نہ کرنے دیں گے لہٰذا آپ نے ایک صحابیؓ کو اپنا وکیل بنا کر حبشہ بھیج دیا، تاکہ وہ ام حبیبہؓ سے گفتگو کریں اور انہیں اپنے ساتھ مدینہ لے آئیں۔ مگر اس بات کا بڑا خطرہ تھا کہ ام حبیبہؓ کے حبشہ سے روانہ ہونے اور عربستان کی طرف چلے آنے پر طائفہ قریش اس امر سے مانع ہو کہ وہ پیغمبر اسلام کی زوجہ بنیں۔ اس لیے آپ نے اپنے فرستادے کو ایک چٹھی بھی لکھ کر دی کہ شاہ حبشہ نجاشی کو دیں۔ آپ نے اپنے قاصد کو حکم بھی دیا تھا کہ پہلے ام حبیبہؓ سے جا کر ملیں اور ان سے گفتگو کریں کہ آیا وہ پیغمبر اسلام کی بیوی بننا پسند کرتی ہیں یا نہیں؟ اگر وہ رضامندی کا اظہار کریں تو بادشاہ حبشہ کو مذکورہ چٹھی دے دیں۔ اس چٹھی میں آپ نے شاہ حبشہ سے یہ کہا تھا کہ ام

حبیبہؓ جو اس کی سلطنت میں رہتی ہیں کا ان سے عقد کرا دے۔ نجاشی نے فوراً عقد کرا دیا، اس کے بعد ام حبیبہؓ دختر ابی سفیان حبشہ سے روانہ ہو کر عازم عربستان ہو گئیں۔

قریشیوں کو اس بات کی اطلاع ہو گئی مگر وہ ام حبیبہؓ کو مدینہ آنے سے نہ روک سکے کیونکہ وہ زوجہ پیغمبر بن چکی تھیں اہل عرب کسی کی بیوی کو شوہر سے ملنے پر روک ٹوک نہ کرتے تھے۔ حضرت ام حبیبہؓ سے حضرت محمد کا عقد اسلام کی ترقی کے لئے مددگار بن گیا اور اہل مکہ کے اسلام لانے کا ایک بڑا سبب ہو گیا۔ کیونکہ ام حبیبہؓ دختر ابوسفیان کا تعلق تمام خانوادہ ہائے قریش سے تھا خواہ وہ دور کے عزیز ہوں یا قریب کے۔ اب جب بھی ابوسفیان حضرت محمد سے جنگ کرنا چاہتا تو یہ سوچتا کہ وہ میرے داماد ہیں۔ یعنی خاندان کی ایک شاخ کی تکمیل کرتے ہیں۔

پیمان ترک جنگ اور صلح حدیبیہ کا ایک یہ اثر ہوا کہ آپ جانب شمال یعنی مدینہ کے محاصرے کو ختم کرنے پر قادر ہو گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اہل مکہ مسلمانوں کے کسی کے ساتھ متحد ہونے یا جنگ کرنے میں دخل نہ دے سکتے تھے بلکہ غیر جانب دار رہنے پر مجبور تھے۔

فتح خیبر

شہر خیبر شمال مدینہ میں واقع تھا وہاں کے باشندوں نے مسلمانوں اور ساکنان مکہ کے درمیان صلح ہو جانے کے باوجود اپنی روش کو اسی طرح برقرار رکھا۔ وہ مدینہ کے کسی قافلے کو خیبر کی طرف سے جانے نہ دیتے تھے کہ شمالی کشور اور شام کے ساتھ تعلق پیدا کر سکیں۔ خیبر کے باشندے یہودی تھے اور بڑے طاقت ور تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اکیلے ہی مسلمانوں سے جنگ کر سکتے ہیں، انہیں اہل مکہ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت محمد نے یہ چاہا کہ جس طرح انہوں نے صلح حدیبیہ سے خطِ جنوبی (مکہ) کے محاصرے کو ختم کرا دیا ہے خطِ شمالی (خیبر) کے محاصرے کو بھی ختم کرا دیں مگر یہودی کسی طرح بھی راضی نہ ہوئے۔ جو یہودی مدینہ سے ہجرت کر کے خیبر گئے تھے وہ بھی نہ چاہتے تھے کہ اہل خیبر و حضرت محمد کے درمیان مصالحت ہو۔ خیبر دو سو کلومیٹر پر جانب شمال مدینہ واقع تھا یہاں پانی کی کثرت تھی اسی لئے خیبر کا علاقہ ایک زرخیز علاقہ شمار ہوتا تھا۔ اس سرزمین سے جہاں خیبر واقع ہے ہٹ کر اگر دوسری راہ اختیار کرتے ہیں تو

وہ منطقہ آتش فشاں ہے جس سے گزرنا بڑا ہی دشوار ہے جہاں گھاس کا نام نہیں۔

عربی زبان میں خیبر، قلعہ کو کہتے ہیں۔ اس شہر میں آٹھ جنگی قلعے تھے، جنگ کے وقت یہاں کے باشندے بیس ہزار سپاہی مہیا کر سکتے تھے شہر خیبر، عربستان کے قدیم شہروں سے ہے، 530ء تک وہ ایک عربی شہر رہا اس سال میں وہاں کے باشندوں نے ابونواس کے ساتھ ایک پیمان کیا تھا جس کے بعد یہودی یہاں صاحب اثر و رسوخ بن گئے۔ یہود ایک جفاکش قوم ہے، وہ اپنی استقامت طبع کی وجہ سے شہر خیبر پر چھا گئے اور ان کی اکثریت ہو گئی حتیٰ کہ جب حضرت محمد نے خیبر پر لشکر کشی کرنی چاہی تو وہاں ایک بھی عرب نہ تھا۔ باشندگان شہر غنی تھے، شمال عربستان میں اس شہر کا شمار ایک بڑی تجارتی منڈی کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ یہاں کے جواہرات فروش، عرب میں مشہور تھے۔ یہ اشراف جزیرہ عرب کے ہاتھ جواہرات بیچا کرتے یا کرایہ پر دیتے مگر بغیر کسی ضامن کے یا وثیقہ لکھائے نہ دیتے تھے۔ عربستان میں گوہر فروشی یہودیوں کے ساتھ خاص تھی اور شمال اور جنوب جزیرۃ العرب میں ان کے گوہر فروشی کے کئی مرکز تھے مگر خیبر کی برابری کوئی بھی مرکز نہیں کرتا تھا۔ خیبر کا علاقہ مرطوب تھا اور یہاں کے باشندے اکثر ملیریا میں مبتلا رہتے تھے۔ اس زمانے میں لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ٹھہرے ہوئے پانی سے جو بدبودار بخارات اٹھتے ہیں۔ وہ انسان کو بیمار کر دیتے ہیں اسی لئے وہ اس بخار کو بیماریٔ آب سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ پہلے زمانے کے لوگ ملیریا کے مچھر سے آشنا نہیں تھے کیونکہ یہ نئے انکشافات ہی سے تھا۔ خیبر میں ٹھہرے ہوئے پانی کی بہتات تھی لوگ بیمار رہتے تھے۔

یہودی جانتے تھے کہ بدو عرب سادہ لوح ہوتے ہیں لہٰذا انہوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ جو کوئی خیبر میں داخل ہو اسے چاہئے کہ صحت کی حفاظت کے لئے سرزمین خیبر میں داخل ہونے سے پیشتر دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر گھوڑے کی طرح کھڑا ہو جائے اور گدھے کی طرح ہنہنائے۔ اگر ایسا کرے گا تو بیمار نہ ہوگا ورنہ اسے بیماریٔ آب کے لئے تیار رہنا چاہئے اور عرصہ تک بیمار رہ کر مر جانے کی امید رکھنی چاہئے۔ چنانچہ عرب اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے شہر میں داخل ہونے سے پہلے چاروں ہاتھوں پاؤں سے زمین پر کھڑے ہو کر گدھے کی طرح ہنہناتے اور مطمئن ہو جاتے کہ اب بیمار نہیں ہوں گے۔ جب باشندگان خیبر کو یہ معلوم ہوا کہ ساکنانِ مکہ اور مسلمانوں

کے درمیان دس سالہ ایک پیمانِ صلح ہوا ہے تو انہوں نے پیش گوئی کی کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ضرور جنگ ہوگی۔ اس معاہدے سے پہلے یہودیوں کو یقین تھا کہ مسلمان ان پر حملہ آور نہیں ہو سکتے اس لیے کہ اگر وہ خیبر پر حملہ کرتے تو اہل مکہ بے دریغ مدینہ پر حملہ کر دیتے کیونکہ اہلِ خیبر اور اہلِ مکہ کے درمیان معاہدہ تھا کہ اگر اہل مدینہ ان پر حملہ کریں گے تو وہ فوراً مدینہ پر حملہ کر دیں گے اور اگر مسلمان اہلِ مکہ پر حملہ کریں گے تو یہودیان خیبر بے دریغ مدینہ پر حملہ کر دیں گے مگر اب جب کہ اہل مدینہ و اہل مکہ کے درمیان یہ جدید معاہدہ ہو گیا تھا باشندگان مکہ و خیبر کا باہمی معاہدہ خود بخود لغو ہو گیا تھا۔

حضرت محمد باشندگانِ مکہ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے ڈیڑھ ہزار مجاہد لے کر روانہ ہوئے جب کہ خیبر کے یہودی آپ کے مقابلہ میں بیس ہزار ہتھیار بند لا سکتے تھے۔ یہودیان خیبر کو جس دن پتہ لگا کہ حضرت محمد اور اہل مکہ کے درمیان پیمان ترک جنگ ہو چکا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو گئے کہ ممکن ہے حضرت محمد خیبر پر حملہ کر دیں لہٰذا اسی دن سے انہوں نے مدافعت کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

جب مجاہدین اسلام کا لشکرِ خیبر پہنچا تو یہودی مدافعت کے لئے پوری طرح مستعد تھے۔ خیبر کے آٹھوں قلعوں میں کافی سامانِ رسد تھا اور ان کے بیس ہزار فوجی پوری طرح لیس تھے۔ لشکرِ اسلام کے خیبر پہنچنے سے پہلے بنو غطفان اور بنو فزارہ کا علاقہ آتا تھا یہ دونوں قبیلے اہلِ خیبر کے حلیف تھے لشکرِ اسلام کے یہاں پہنچنے پر ان دونوں قبیلوں کو اپنے جانبازوں کو اہل خیبر کی مدد کے لئے بھیجنا چاہئے تھا مگر یہ دونوں قبیلے مسلمانوں سے ڈر گئے۔ انہوں نے اگرچہ معاہدہ اہلِ خیبر کو نہیں توڑا لیکن انہوں نے حضرت محمد کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کر دیا، ہم اس جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیں گے۔ بنو غطفان اور بنو فزارہ کے اس خوف کے دو سبب تھے ایک تو واقعات جنگِ بدر، احد اور خندق اور دوسرے متارکۂ جنگ کا پیمان مسلمانوں اور اہلِ مکہ کے درمیان۔ انہوں نے کہا کہ جب اہلِ مکہ ہی مسلمانوں کے ساتھ صلح کرنے پر راضی ہو گئے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ ان کے ساتھ لڑنے سے کنارہ کشی کریں۔ حضرت محمد کو جب یہ یقین ہو گیا کہ دونوں قبیلے جنگ میں شرکت نہیں کریں گے تو آپ نے خیبر کی طرف پیش قدمی کر دی۔

مورخین کے بیان کے مطابق خیبر شمال عرب میں ایک مضبوط ترین جنگی قلعہ تھا اور اس طرح شہر کے استحکام کے لئے ''روش'' اختیار کی گئی تھی جیسا کہ وہاں فرانسیسی انجینئر نے 1700ء میں اختیار کی تھی۔ وہاں یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ طرز مدافعت اس نے ایجاد کیا ہے حالانکہ اس سے پہلے یہودیانِ خیبر ایسا کر چکے تھے۔

مسلمانوں کے خیبر میں پہنچ جانے کے بعد خود پیغمبر اسلام نے لشکر کی کمان کی اور فرمایا، ''ہمارے پاس ایسے وسائل نہیں ہیں کہ ان مضبوط جنگی قلعوں کو مسمار کر سکیں، ہمارے پاس صرف تیر، شمشیر اور کمان ہے اس اسلحہ سے مستحکم سنگین قلعوں کو کیسے فتح کیا جا سکتا ہے۔ ہم صرف ایک تدبیر سے ان قلعوں کے باشندوں کو زیر کر سکتے ہیں، وہ یہ کہ ان کا محاصرہ کر لیں اور جتنی نہریں قلعوں میں جا رہی ہیں سب کو بند کر دیں تا کہ انہیں پانی نہ پہنچ سکے۔ اگر قلعوں میں بہت سا پانی جمع نہ ہوگا اور وہ کنوئیں بھی نہ کھودیں گے تو بہت جلد مجبور ہو کر مسخر ہو جائیں گے''۔ خیبر میں آٹھ قلعے تھے مسلمانوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ ایک ایک قلعہ کو باری باری فتح کریں جب ایک فتح ہو جائے تو پھر دوسرے قلعہ کی تسخیر کی جائے جونہی مسلمانوں نے قلعہ کا محاصرہ کیا ان پر منجنیق کے گولے برسنے لگے یہودیوں نے پتھر کے گولوں کی صورت میں گول تراش لیا تھا۔ وہ ان گولوں کو منجنیق کے ذریعہ مسلمانوں پر برسا رہے تھے جن کے سامنے ٹھہرنا دشوار تھا۔ پہلی بار مسلمانوں کو گولہ باری سے واسطہ پڑا تھا۔ وہ اس قسم کی جنگ یا اس طرز کی مدافعت سے بالکل نا آشنا تھے۔ حضرت محمد نے حکم دیا کہ لڑھکنے والے برج بنائے جائیں، ان برجوں میں چھپ کر مسلمان قلعہ کی دیوار کے قریب چلے جائیں۔ دیوار قلعہ کے قریب جانے سے وہ منجنیق کے گولوں سے محفوظ ہو جائیں گے کیونکہ گوپھن کے غلے دور کی مار کرتے ہیں، قریب والے کو نہیں مار سکتے۔

آپ نے فرمایا، حصار قلعہ کے نزدیک تم لوگوں کے لئے صرف ایک خطرہ ہے وہ یہ کہ حصار قلعہ کے برجوں میں جو سوراخ ہیں ان سے یہودی تم لوگوں پر تیر برسانا شروع نہ کر دیں مگر یہ سوراخ صرف برجوں میں ہیں دیواروں میں نہیں ہیں لہٰذا دیواروں کے پاس تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ جب مسلمان واردِ خیبر ہوئے تو جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں فوج کی کمان خود نبی (ﷺ) کے دستِ مبارک میں تھی مگر بہت جلد آب و ہوا کی ناسازگاری سے آپ بیمار پڑ

گئے اور آپ نے لشکر اسلام کی کمان حضرت ابوبکر کو سونپ دی۔ ابوبکر دو دن سے زیادہ کمان نہ سنبھال سکے کیونکہ انہیں بخار نے نڈھال کر دیا تھا لہٰذا انہوں نے لشکرِ اسلام کی کمان حضرت عمر بن الخطاب کو دے دی۔ مگر وہ بھی بیمار پڑ گئے انہوں نے بستر علالت پر لیٹے لیٹے تمام سردارانِ لشکر کو جمع کر کے فرمایا، ''میں قیادت سپاہ اسلام کے لئے علی سے بہتر کسی کو نہیں پاتا کیونکہ وہ ایک مستقیم المزاج، صابر اور بہادر ہیں۔ اگر وہ تنہا ہوں اور ایک سو جنگجو بھی ان کے مقابل آ جائیں تو وہ کبھی بھی پشت نہ پھیریں۔ اگر کوئی شخص ان جنگی قلعوں سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے تو وہ علی ہی ہیں لہٰذا میں لشکر کی کمان علی کو سونپتا ہوں سب کو چاہئے کہ ان کی فرماں برداری کریں۔''

جب حضرت علی کو سپہ سالار بنایا گیا وہ بخار میں مبتلا تھے پھر بھی انہوں نے یہ خدمت قبول کر لی اور اسی دن، پہلے قلعہ، نطات کا محاصرہ کر لیا۔ تذکرہ نویسانِ اسلام میں سے دو اشخاص ایک بغوی اور دوسرے ابن ابی الحدید اس انتخاب کا یوں ذکر کرتے ہیں۔ ''جب پیغمبر اسلام علیل ہو گئے تو انہوں نے حضرت ابوبکر کو اس سپاہ کی کمان سونپی۔ انہوں نے حملہ کیا مگر معمولی نقصانات کی وجہ سے، جنہیں اسلام کا چھوٹا سا لشکر برداشت نہ کر سکتا تھا، فرمایا ''میں ان قلعوں پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا'' حضرت محمد نے بستر علالت پر ہی حضرت عمر بن الخطاب کا انتخاب فرمایا، عمر بن الخطاب نے بھی حملہ کیا مگر یہودیوں کی سخت مقاومت کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹ گئے اور کہنے لگے۔ ''میں خیبر کو تسخیر نہیں کر سکتا'' مسلمانوں نے حضرت محمد سے عرض کی کہ ''عمر قیادت سپاہ سے عذر پیش کرتے ہیں''۔ آپ نے فرمایا، ''میں اپنے چچازاد علی کو یہ خدمت سپرد کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس خدمت کے قبول کرنے سے انکار نہیں کریں گے'' بقول بغوی و ابن ابی الحدید جب پیغمبر اسلام نے حضرت علی کو طلب کیا تاکہ انہیں سپہ سالاری سپرد فرمائیں تو حضرت علی آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ وہ آشوب زدہ آنکھوں کے ساتھ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فوج کی قیادت سنبھالنے کے لئے تیار ہو گئے۔

بغوی اور ابن ابی الحدید بیان کرتے ہیں کہ اس دن ایک شخص جس کے سر پر آہنی خود تھا۔ بالائے حصارِ نطات سے پکارا، ''تمہارا سپہ سالار کون ہے؟'' نیچے سے حضرت علی نے جواب دیا، ''میں سپہ سالارِ فوج اسلام ہوں، میرا نام علی بن ابی طالب ہے''۔ وہ شخص پکارا، ''اے علی

میں مرحب ہوں ان آٹھ قلعوں میں سے ایک قلعہ کا نام، میرے نام پر رکھا گیا ہے کیا تم میں اتنی طاقت ہے کہ میرے ساتھ زور آزمائی کر سکو؟'' حضرت علی نے فرمایا میں نے آج تک کسی کی دعوت مبارزت کو رد نہیں کیا، میں تیرے چیلنج کو رد نہیں کر سکتا'' مرحب بولا، ''میں قلعہ سے باہر آتا ہوں اور تمہارے ساتھ مبارزۃ کرتا ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ قلعہ کے دروازے سے باہر نکلا اور قلعہ کا دروازہ بند کر دیا۔

حضرت علی کے بدن پر زرہ نہ تھی جب کہ مرحب خود اور زرہ پہنے ہوئے تھا پھر بھی آپ اس کے ساتھ لڑے اور اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ قلعہ فطات کا حصار توڑنے کے لئے درختوں کے تنوں سے مدد لی جائے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ درخت کے ایک تنے کو پچاس مجاہد ہاتھوں میں لے کر دوڑتے اور زور سے قلعہ کی دیوار سے مارتے، دو چار ضربوں میں قلعہ کی دیوار ٹوٹ جاتی۔ مسلمانوں نے درختوں کے تین تنے لئے، ہر تنے کو کوئی پچاس فوجی لے کر دوڑتے تھے۔ کچھ مجاہد اس کام پر لگ گئے اور کچھ حسب فرمانِ حضرت علی میڑھیوں کے ذریعہ قلعہ کی دیواروں پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے تا کہ قلعہ کے اندر داخل ہو سکیں۔ یہ لوگ لکڑی کے برجوں کے ذریعہ حصار کے نیچے پہنچ کر میڑھیاں لگا لیتے تھے۔ دو روز کی مقاومت کے بعد قلعہ فطات تسخیر ہو گیا۔ مسلمان دیواریں توڑ کر قلعہ میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے یہودیوں کو قید کیا اور ان کے مال لوٹ لئے۔ خیبر کے قلعوں میں سے سب سے پہلے قلعہ فطات کے فتح ہوتے ہی حضرت علی نے دوسرے قلعہ موسوم بہ ناعم کو فتح کرنے کے لئے محاصرہ کیا۔ دس دن کی جنگ میں آپ نے چار قلعے فتح کئے اور چار قلعوں کی مدافعت کرنے والوں نے خود ہی قلعے سپرد کر دیئے۔ دس دن کی جنگ میں حضرت علی بن ابی طالب نے سولہ بار دست بدست جنگ کی اور ہر بار اپنے حریف کو قتل کرنے میں کامیاب ہوئے یا اسے اتنا بے بس کر دیا کہ وہ جنگ جاری نہ رکھ سکے۔ جنگ خیبر میں حضرت علی ؓ کی فتح اور آٹھ مضبوط جنگی قلعوں پر قبضہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو بلا شبہ صدر اسلام کے درخشندہ کارناموں سے ہے کیونکہ سپہ سالار اسلام کے پاس کوئی بھی سامان قلعہ گیری نہ تھا اس کے باوجود ایسے بیس ہزار ہتھیار بندوں پہ غالب آ گئے جو آٹھ مضبوط قلعے رکھتے تھے۔

جب مسلمانوں کے ہاتھ خیبر کا آخری قلعہ لگا تو حضرت محمد تازہ تازہ بیماری سے شفایاب ہوئے تھے۔ آپ نے تمام مسلمانوں کے سامنے حضرت علی کو گلے لگایا اور بوسہ دے کر فرمایا، ''اے علی تم اسد اللہ ہو یعنی شیر خدا ہو''۔ آپ کا یہ عطا کیا ہوا لقب ہمیشہ حضرت علی کے نام نامی کے ساتھ چسپاں رہا ہے۔ غزوہ خیبر کی فتح سے بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا بالخصوص کھانے پینے کا سامان بہت کچھ ملا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ ''غزوہ بدر کے بعد جب خیبر فتح ہوا تو پہلی بار میں نے کھجوریں پیٹ بھر کر کھائیں۔ غزوہ خیبر سے پیشتر جو کچھ سامان غذا ہمارے گھر آتا تھا وہ کافی نہ ہوتا تھا لہٰذا گن گن کر کھجوریں دی جاتی تھیں'' جب مسلمانوں نے خیبر فتح کر لیا تو حضرت محمد نے یہودیانِ خیبر کے ساتھ بہت نرم سلوک کیا۔ یہودیوں کو اجازت تھی کہ وہ خیبر سے جاتے وقت جو چاہے اپنے ساتھ لے جائیں۔ البتہ خرما، بھیڑیں اور غلہ نہ لے جائیں۔ جو یہودی خیبر سے نہ جانا چاہتے تھے انہیں وہاں رہنے کی اجازت تھی اور حسب سابق کاروبار کرنے کے مجاز تھے۔ حضرت محمد نے یہودیوں کے ساتھ ایک اور احسان کیا وہ یہ کہ مسلمانوں کو اجازت نہ دی کہ یہودی عورتوں کے ساتھ متعہ کر سکیں۔ مجاہدین اسلام جو وقتی نکاح کسی مغلوب قوم کی عورتوں کے ساتھ کرتے تھے اسے متعہ کہتے تھے۔ ہر مجاہد کو یہ اجازت تھی کہ وہ مفتوح قوم کی عورتوں کے ساتھ جس قدر چاہے نکاح کر سکے۔ اگر عورتوں کی تعداد تھوڑی ہوتی تو پھر فدائیان اسلام کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ فتح خیبر کے بعد حضرت محمد نے بطور استثناء مسلمانوں کو خیبر کی عورتوں سے روک دیا تھا۔ دوسرا احسان حضرت علی نے کیا تھا۔ وہ یہ کہ تمام مجاہدین اسلام کو حکم امتناعی دے دیا تھا کہ کسی یہودی کے باغ میں گھس کر نقصان نہ کریں، نہ نخلستان میں جائیں اور نہ ان کے درختوں کو ہاتھ لگائیں۔ حضرت محمد نے صرف مسلمانوں اور یہودیوں کو قریب لانے کی خاطر ایک یہودی خاتون حضرت صفیہؓ سے عقد نکاح فرمایا۔

ایک دن ایک مسلمان غازی خیبر کے قلعوں کے درمیان سے گزر رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے حملہ کر کے اسے شہید کر دیا۔ سپہ سالار اسلام حضرت علی نے سرداران یہود کو جمع کر کے دریافت فرمایا، ''یہ حرکت کس نے کی ہے؟'' ان لوگوں نے قسم کھائی کہ یہ کام کسی یہودی کا نہیں ہے۔ باشندگانِ خیبر اس گناہ سے بالکل بری ہیں۔ حضرت علی نے معاملہ پیغمبر اسلام کے سپرد کر

دیا اور عرض کی کہ سرداران یہود کہتے ہیں، یہ قتل کسی یہودی کے ہاتھوں انجام نہیں پایا۔ اس لیے اس کا خون بہا کس سے طلب کیا جائے؟ آپ نے فرمایا۔ "چونکہ یہ لوگ قسم کھاتے ہیں لہٰذا میں ان کی قسم کا اعتبار کرتا ہوں اور مرحوم کا خون بہا میں اپنے پاس سے ادا کئے دیتا ہوں"۔ چنانچہ آپ نے اپنے پاس سے شہید ہونے والے کا خون بہا ادا کر دیا۔ مسلمانوں کے خیبر کو فتح کر لینے کے بعد یہودیوں کے دو قبیلے جو وادی القریٰ میں رہتے تھے اور دو اور دوسرے قبیلے جو فدک و تیماء میں رہتے تھے، مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ صلح کر کے حاضر ہوئے اور جزیہ دینے کو قبول کیا۔

زہر دینے کی کوشش

جنگ خیبر کے زمانے میں دو مسلمان حبشہ سے خیبر آئے دونوں حبشہ میں سکونت پذیر تھے ایک جعفر بن ابی طالب، رسول اللہ (ﷺ) کے برادر رضاعی اور دوسرے عمرو بن امیہ۔ یہ دونوں ان مسلمانوں میں سے تھے جو حبشہ کو ہجرت کر گئے تھے۔ ان دونوں کے لوٹ آنے کے بعد اب کوئی بھی مسلمان حبشہ میں باقی نہ تھا۔ فتح خیبر کے بعد مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں سے یہودیوں کے کینسے کھولے اور یہودی حسب سابق اپنی عبادت ادا کرنے لگے۔ یہودیوں کی جتنی مقدس کتابیں اور اوراق مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھے سب واپس کر دیئے گئے۔ اس طرح دونوں قوموں کے تعلقات بہت اچھے ہو گئے۔

ایک یہودی عورت زینب دختر حارث، زوجہ سلام بن مشکم یہودی نے سوچا کہ رسول اللہ کے لئے بکری کی ران، ہدیہ بھیجوں کیونکہ اس نے سنا تھا آپ کو گوشت مرغوب ہے، لہٰذا اس نے بکری بھونی اور اس کی دستی کو ز ہر آلود کر کے خدمتِ اقدس میں ہدیہ کر دیا۔ جب یہ آپ کے سامنے پیش کی گئی تو ایک صحابی بشیر بن براء بن معرور بیٹھے تھے۔ آپ نے ایک بوٹی تناول کرنے کے لئے انہیں دے دی اور دوسری بوٹی لے کر دہن مبارک کے قریب لے آئے۔ بشیر بوٹی کھا گئے۔ رسول اللہ جو لقمہ دہن مبارک کی طرف لے گئے تھے اسے نکال کر پھینک دیا اور بشیر سے کہا۔ "اسے نہ کھاؤ یہ زہر آلود ہے" مگر وہ اسے نگل چکے تھے۔ لہٰذا زندگی کو الوداع کہہ گئے مگر رسول خدا زندہ سلامت رہے۔ مسلمانوں نے زینب بنت حارث کو گرفتار کر لیا اور اس سے پوچھا کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے یہ حرکت یہ سوچ کر کی تھی کہ اگر

حضرت محمد خدا کے بھیجے ہوئے ہوں گے تو اس گوشت کو نہ کھائیں گے لہٰذا زندگی کو الوداع بھی نہ کہیں گے اور اگر پیغمبر نہ ہوں گے تو گوشت کو کھا کر دنیا سے رخصت ہو جائیں گے لہٰذا مجھے ان کی وفات کا کوئی صدمہ نہیں ہوگا۔ چونکہ حضرت محمد نے اس بھنے گوشت کو نہیں کھایا منہ سے نکال کر پھینک دیا لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر ہیں۔"

جب بھی کسی مصنف نے یہ واقعہ بیان کیا ہے جیسے مسعودی، ابن ہشام، اسد بیگ، طبری، ابن ابی الحدید اور زمخشری، کسی نے بھی یہ نہیں لکھا کہ اس عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ آیا اسے سزا دی گئی یا معاف کر دیا گیا یا وہ آپ (ﷺ) کے پیغمبری کا ثبوت پا کر مسلمان ہو گئی۔ البتہ چند ایک علمائے اسلام نے لکھا ہے کہ وفات سے پیشتر آپ (ﷺ) نے اپنے ہم مجلسوں سے فرمایا میری وفات کا سبب وہ زہر ہے جو مجھے خیبر میں دیا گیا تھا حالانکہ آپ نے یہ گوشت حلق سے نیچے نہ اتارا تھا۔ نکال کر باہر پھینک دیا تھا مگر اس کا کچھ اثر حلقوم سے نیچے اتر گیا تھا۔ جس کی وجہ سے آپ بیمار رہے اور یہ بیماری باعث وصال بنی۔ اگر بعض علمائے اسلام کی یہ روایت درست ہے تو پیغمبر اسلام نے درجہ شہادت پایا اس لیے کہ اس زہر کے اثر سے زندگی کو الوداع کہا جو دشمن نے انہیں دیا تھا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ 628ء مطابق 6ھ حضرت محمد (ﷺ) اور بہت سے مسلمانوں نے حج عمرہ کے لئے مکہ جانا چاہا تھا مگر بت پرستوں نے انہیں حدیبیہ سے آگے بڑھنے نہ دیا تھا کہ وہ مکہ کی زیارت کر سکتے۔ یہاں حضرت محمد نے جماعت قریش کے ساتھ ایک دس سالہ معاہدہ عدم جنگ کیا تھا اس صلح نامہ کی ایک دفعہ یہ تھی کہ مسلمان اگلے سال خانہ کعبہ کی زیارت کو آسکیں گے مگر تین دن سے زیادہ قیام نہ کر سکیں گے۔ ایک سال کے بعد 629ء مطابق 7ھ میں، حضرت محمد (ﷺ) دو ہزار مسلمانوں کو زیارت کعبہ کے لئے ہمراہ لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ چونکہ سب کے سب زیارت کے ارادے سے گئے تھے لہٰذا ان کے پاس سوائے تلوار کے، کوئی ہتھیار نہ تھا۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ شمشیر کا شمار اسلحہ جنگ میں نہ تھا بلکہ وہ عربی لباس کا ایک جزو تھی۔ اس کے باوجود جب مسلمانوں نے مکہ جانا چاہا تو قریشی ڈرے، وہ مکہ سے باہر چلے گئے اور اطراف مکہ کے پہاڑوں خصوصاً ان پہاڑوں میں، جو خانہ کعبہ کے قریب تھے، جا چھپے۔ وہاں سے وہ خانہ کعبہ کے طواف کا منظر دیکھ رہے تھے کہ مسلمان کس طرح طواف کرتے ہیں۔ اہل

قریش مکہ سے اس لیے باہر چلے گئے تھے کہ انہیں یہ خطرہ تھا کہیں مسلمان مکہ میں داخل ہونے کے بعد ان پر ناگہانی حملہ نہ کر دیں۔

مکہ میں داخل ہونے سے پہلے حضرت محمد نے احتیاط کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، آپ (ﷺ) نے ایک سو مسلمان سواروں کو محمد بن مسلمہ کی زیر قیادت، ایک نشیبی علاقہ میں مکہ کے قریب مقام مرالظہر ان میں تعینات کر دیا۔ اس مقام کے قریب ایک پہاڑ تھا جہاں سے محمد بن مسلمہ اور ان کے سوار مکہ کو دیکھ سکتے تھے، آپ (ﷺ) نے محمد بن مسلمہ سے فرمایا، ''اگر تم یہ دیکھو کہ بت پرستوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا ہے تو سواروں کو لے کر ہماری مدد کے لئے آ جانا ورنہ اسی جگہ رہنا حتیٰ کہ ہم واپس آ جائیں۔'' بت پرست پہاڑوں کے اوپر سے (درحقیقت ٹیلوں کے اوپر سے) جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں مسلمانوں کے نظم و ضبط اور خلوص نیت کو دیکھ کر اظہار حیرت کر رہے تھے۔

بلال حبشی، موذن رسول کے ابتدائی سالوں میں ابوجہل کے حکم سے آفتاب سوزاں میں عربستان کی تپتی ہوئی زمین پر باندھ کر ڈال دیے جاتے تھے۔ اس روز جب کہ مکہ اپنے اصلی باشندوں سے خالی تھا کعبہ کی بالائی چھت پر چڑھے اور اذان دی۔ جب حضرت بلال ؓ نے اللہ اکبر...... اللہ اکبر...... لا الہ الا اللہ...... کی صدا بلند کی تو ساکنان مکہ جو پہاڑوں میں چھپے ہوئے تھے خوف سے لرزنے لگے۔ وہ انتظار کر رہے تھے کہ خانہ کعبہ کے بڑے بڑے بت، تھوڑی دیر میں مسلمانوں پر آسمان کو گرا دیں گے۔ مگر مسلمانوں کے ساتھ کوئی بھی ناگوار واقعہ پیش نہ آیا اور ایک بھی سنگریزہ آسمان سے نہ گرا۔ مکہ کی فضا میں پہلی بار اللہ اکبر کی آواز گونجی۔ جس دم حضرت محمد اور مسلمان بحالت احرام خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے تو فرط شوق و خلوص نیت سے ان کے آنسو رواں تھے حتیٰ کہ عمر بن الخطاب بھی زار و قطار رو رہے تھے کیونکہ ایک عرصہ دراز تک مسلمان خانہ کعبہ سے دور رہے تھے اور کبھی اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ کعبہ کی زیارت کر سکیں گے اور اس کے ارد گرد طواف سے مشرف ہو سکیں گے۔

جب مناسک حج پورے ہو چکے تو حضرت محمد نے چاہا کہ قریشیوں سے قریبی تعلقات قائم کریں لہٰذا پختہ ارادہ کر لیا کہ کسی مشہور و معروف شریف عورت سے عقد نکاح کریں اس لیے میمونہؓ بنت حارث سے عقد کیا یہ حضرت عباس کی سالی تھیں۔ حضرت محمد کا میمونہؓ بنت حارث

کے ساتھ عقد کرنا ایک عمدہ سیاسی اقدام تھا کیونکہ میمونہؓ کے آٹھ بھائی تھے اور سب کے سب مکہ کے اشراف کے داماد تھے۔ حضرت میمونہؓ کے ساتھ نکاح کرنے سے آپ کا آٹھ معزز انسانوں سے رشتہ ہو گیا۔ ابن ہشام، زمخشری اور ابن حبیب، مستند تذکرہ نگاران اسلام لکھتے ہیں۔ ''میمونہؓ سے عقد نکاح کرنا گویا تمام اہل مکہ کے ساتھ رشتہ داری قائم کرنا تھا۔'' ابن حبیب لکھتا ہے۔ ہند اور میمونہؓ حشمت و شوکت کے اعتبار سے زنانِ مکہ میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھیں'' نکاح میمونہؓ سے آپؐ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ خالد بن ولید، سردار مکہ کے ساتھ آپ کا قریبی رشتہ ہو جائے۔ خالد بن ولید، حضرت میمونہؓ کے بھتیجے تھے، انہوں نے خالد بن ولید کو اپنے بیٹے کی طرح پالا تھا اور پال پوس کر سن رُشد کو پہنچایا تھا۔ میمونہؓ کے زوجہ نبی بن جانے کے بعد خالد بن ولید فرزندِ رسول اللہ (ﷺ) کی مانند ہو گئے۔ حضرت میمونہؓ کے ساتھ شادی کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تمام اہل قریش کو دعوتِ ولیمہ دیں تا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ دعوت ولیمہ قریشیوں کو بلانے کا بہترین ذریعہ تھی۔ مکہ کے ورود کے دوسرے دن آپ دعوت طعام کی تیاری میں مشغول رہے، باشندگانِ مکہ اسی طرح مکہ کے پہاڑوں میں چھپے بیٹھے تھے، انہیں اتنی جرأت نہ ہوتی تھی کہ پہاڑوں سے نیچے آئیں اور مکہ میں داخل ہوں مگر مسلمانوں کا مذہبی نظم و ضبط، بلال حبشی کی اذان اور مسلمانوں کی نماز کی صفوں نے ان پر بڑا گہرا اثر کیا۔

راست باز انسان

ان تدابیر کا اتنا بڑا اثر پڑا کہ سردار مکہ خالد بن ولید نے پہاڑ پر چڑھے ہوئے ساتھیوں سے کہا ''یہ شخص جو ایسا دین لایا ہے اور اتنے سارے پیروکار رکھتا ہے دھوکا باز اور جھوٹا نہیں ہو سکتا کیونکہ جو لوگ ان کے ارد گرد جمع ہیں ان میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ وہ سچا ایمان رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنے لوگ خلوص نیت سے ان پر ایمان نہ لاتے۔ تیسرے دن کی صبح حضرت محمد نے مسلمانانِ مکہ کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی کہ پہاڑ پر سے بلانے کے لئے دعوتِ ولیمہ دی جائے۔ مگر پیشتر اس کے کہ حضرت محمد کے قاصد طعام کی دعوت کے لئے جائیں، قریشیوں کی طرف سے ایک وفد حاضر خدمت ہوا اس وفد کا سردار عبدالعزیٰ تھا۔ انہوں نے مشاہدہ کیا کہ حضرت محمد اور مسلمان استقبال کی تیاری میں مصروف ہیں اور دعوتِ طعام کی

تیاریاں اس لئے ہیں کہ جماعت قریش کو نکاح میمونہؓ کے سلسلہ میں ولیمہ کی شرکت کے لئے بلایا جائے وفد نے کہا۔ "اے محمد آپ کو بلا تاخیر مکہ سے خارج ہو جانا چاہیے کیونکہ صلح حدیبیہ کے معاہدہ کے مطابق مسلمان صرف تین روز مکہ میں قیام کر سکتے ہیں یہ مدت ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب یہاں سے چلا جانا چاہئے" چنانچہ حضرت محمد قریش کی دعوت نہ کر سکے اور بلا توقف مسلمانوں کو لے کر وہاں سے کوچ کر گئے۔ جونہی مسلمان مکہ سے نکل کر مدینہ کی راہ پر چل پڑے ان کے پیچھے پیچھے خالد بن ولید بھی مکہ سے نکل کر ان سے جا ملے۔ اور مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ بعد ازاں وہ اسلام کے بڑے سرداروں میں سے ہوئے اور آنحضرتؐ نے انہیں سیف اللہ یعنی اللہ کی تلوار خطاب دیا۔ علی بن ابی طالب، رسول اللہ کے چچازاد کے علاوہ جنہیں رسول خدا نے اسد اللہ (شیر خدا) کا خطاب عطا کیا تھا، کوئی بھی اس مرتبہ تک نہ پہنچ سکا کہ خالد بن ولید کی طرف سیف اللہ کا خطاب پائے۔

جب خالد بن ولید اسلام لانے کے لئے مسلمانوں کی طرف جا رہے تھے انہیں راہ میں ایک شخص ملا جو حبشہ سے آ رہا تھا۔ یہ عمرو بن العاص تھے جو مسلمانوں کے پاس اسلام لانے کے لئے جا رہے تھے۔ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ معاہدہ حدیبیہ کے تحت اگر کوئی باشندہ مکہ قریش کی اجازت کے بغیر مسلمانوں کے ساتھ ملحق ہونا چاہتا تھا مسلمان اس بات کے پابند تھے کہ اسے واپس کر دیں۔ لیکن جب خالد بن ولید جیسا شخص مسلمانوں سے جا ملا اور اسلام لے آیا تو اہل مکہ کو جرات نہ ہوئی کہ مسلمانوں سے خالد بن ولید کی واپسی کا مطالبہ کریں کیونکہ وہ دیکھ چکے تھے کہ مسلمان بہت زیادہ طاقت پکڑ گئے ہیں۔ مسلمان مدینہ پہنچے تو ان کے لئے ایک خوش کن واقعہ رونما ہوا جو مذکورہ بالا دونوں حضرات کے اسلام لانے سے بھی زیادہ مفید تھا، وہ یہ کہ سپہ سالار افواج مکہ ابوسفیان رسول اللہ سے ملاقات کرنے آیا۔ وہ مدینہ آنے سے اس لیے خائف نہ ہوا کہ مسلمانوں اور باشندگان مکہ کے درمیان معاہدہ ترک جنگ تھا۔ ابوسفیان خوب سمجھتا تھا کہ جب تک یہ پیمان باقی ہے مسلمان خلاف اصول اس کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتے بالخصوص جب کہ وہ تنہا بغیر کسی لشکر کے مدینہ آئے۔ دوسرے یہ کہ ابوسفیان جانتا تھا کہ پیغمبر اسلام امین مشہور ہیں اور ان کی راست بازی مسلم ہے۔ تیسرے یہ کہ ابوسفیان کا

تنہا بغیر لشکر مکہ سے مدینہ آنا ایک قسم کی طلب پناہ تھی، قبائل عرب، پناہ چاہنے والے کی جان و مال کو محترم سمجھتے تھے اور حتی الوسع اس کی اس قدر پشت پناہی کرتے تھے کہ کوئی بھی خطرہ اسے لاحق نہ ہوسکتا تھا۔ اگر وہ کوئی خطرہ محسوس کرتا تو جس وقت چاہے جاسکتا تھا۔ ابوسفیان کے مکہ سے مدینہ جانے کا سبب یہ تھا کہ پیان حدیبیہ کے مطابق باشندگان مکہ و مدینہ اس بات کے مجاز تھے کہ جس کسی کے ساتھ متحد ہونا چاہیں، اتحاد کرلیں اور جس سے جنگ کرنا چاہیں لڑیں، اگر مسلمان یا باشندگانِ مکہ کسی قبیلے یا چند قبیلوں کے ساتھ لڑیں تو دوسرے فریق کو غیر جانبدار رہنا چاہیے اور جنگ میں شرکت نہ کرنی چاہیے۔

اس زمانے میں قبیلہ بنوخزاعہ مسلمانوں کے ساتھ متحد تھا، بنوبکر نے ان پر حملہ کردیا۔ یہ بات صرف مشہور ہی نہ تھی کہ اشراف مکہ نے بنوبکر کے لئے ہتھیار اور جانباز مہیا کئے بلکہ یہ ایک حقیقت بھی تھی اور ایسے شواہد موجود تھے کہ بنوبکر نے باشندگان مکہ کی بنوبکر کی مدد کرنا پیانِ متارکہ جنگ کے خلاف تھا۔ بعد ازاں اشراف مکہ اس بات کی اہمیت کے قائل بھی ہوگئے تھے مگر جب خیبر فتح ہوچکا تھا۔

جب خیبر مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور مسلمان شمالی عربستان کے وسیع علاقے پر قابض ہوگئے تو اشراف مکہ متارکہ جنگ کے معاہدے کی خلاف ورزی کرنے پر بہت پچھتائے اور گھبرائے۔ اسی لئے ابوسفیان مدینہ آیا تاکہ موجودہ اختلاف کا کوئی حل تلاش کرے۔

مدینہ آکر وہ اپنی بیٹی ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کے حجرے میں ٹھہرا۔ وہ، حضرت ام حبیبہؓ کے کمرے میں آیا تو انہوں نے اس بچھونے کو جوان کے حجرے میں بچھا تھا تہہ کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے فرمایا، ''اس بچھونے پر محمد رسول اللہ اٹھتے بیٹھتے ہیں اور سوتے ہیں آپ بُت پرست ہیں لہٰذا اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ آپ اس پر بیٹھیں۔''

ابوسفیان ان کی کوٹھڑی میں نہ بیٹھا اور بیٹی سے درخواست کی کہ تم میرے اور حضرت محمد کے درمیان وسیلہ بن جاؤ تاکہ بنوخزاعہ و بنوبکر کی جنگ سے جو اختلاف پیدا ہوگیا ہے وہ خوبی کے ساتھ حل ہوجائے۔

حضرت ام حبیبہؓ نے کہا، ''محمد رسول اللہ کے بارے میں واسطہ نہیں بن سکتی اس اختلاف کے حل کرنے کی ایک ہی راہ ہے کہ آپ خود مسجد نبوی میں جاکر آپؐ سے مذاکرہ کریں'' ابوسفیان

مسجد میں گیا۔ حضرت محمد نے فرمایا، ''بیٹھو'' جب وہ بیٹھ گیا تو دریافت فرمایا، ''کسی کام سے آئے ہو؟'' ابوسفیان بولا، ''ہاں، اے محمد میں چاہتا ہوں کہ قبیلہ بنوبکر و بنوخزاعہ کے اختلافات کے بارے میں آپ سے گفتگو کروں'' حضور نے فرمایا، ''آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہیے'' ابوسفیان بولا، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بنوبکر اور بنوخزاعہ کی جنگ میں اہل مکہ نے کوئی حصہ نہیں لیا لیکن اگر آپ یہی خیال کرتے ہیں کہ اہل مکہ نے ان کی مدد کی ہے اور انہی کی وجہ سے بنوخزاعہ کو نقصان اٹھانا پڑا ہے تو اہل مکہ اس کا تاوان دینے کے لئے تیار ہیں'' آپ نے جواب میں صرف اتنا فرمایا، ''اگر تم لوگوں نے ان کی مدد نہیں کی ہے تو ہم تم سے کوئی تاوان نہیں لے سکتے'' ابوسفیان آپ سے اور کوئی جواب اس کے سوا نہ لے سکا۔ لہٰذا بڑے اضطراب کے ساتھ مکہ چلا گیا۔

لشکر روم کے ساتھ جنگ

قبضہ خیبر کے بعد مسلمان بہت طاقت ور ہو گئے تھے۔ حضرت محمد اب اس قدر وسیع طاقت والے ہو گئے تھے کہ انہوں نے سلاطینِ اطراف کو خطوط ارسال کئے اور انہیں دین اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ پیغمبر اسلام نے ایک نامہ شاہ بیزانس (رومۃ الصغریٰ) کے نام ارسال کیا تھا اور ایک نامہ شاہِ ایران کو بھجوایا تھا۔ ایک خط نجاشی شاہ حبشہ کو اور ایک شاہ مصر کو بھیجا تھا۔ عربستان کے قریب ایک بادشاہ حارث بن ابی شمر تھا یہ بادشاہ بیزانس کی حکومت کا ماتحت تھا۔ حضرت محمد نے اس کے نام کا ایک خط ایک مرد مسلمان حارث بن عمیر کے سپرد کیا اور اس سے کہا، اس خط کو حارث بن ابی شمر کو دے کر اس سے جواب لے آؤ۔ حارث نمائندہ پیغمبر جب حارث بن ابی شمر کی سرزمین میں پہنچے تو وہاں کے ایک حاکم شرجیل بن عمرو نے پیغمبر اسلام کے اس ایلچی کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اس واقعہ سے مسلمانوں پر برا اثر پڑا کیونکہ تمام دنیا میں ایلچی کا خون محفوظ ہوتا ہے اسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ حضور نے حارث بن ابی شمر کو پیغام بھیجا کہ تمہارے حاکم شرجیل بن عمرو نے ایک بے گناہ انسان کو جو میری چٹھی لے کر تمہارے پاس گیا تھا قتل کر دیا ہے۔ وہ سفیر تنہا تمہاری سرزمین کی طرف گیا تھا۔ اس کی مسافرت سے ظاہر تھا کہ وہ لڑنے کے ارادے سے نہیں گیا تھا، اگر ایسا ہوتا تو وہ کسی لشکر کو ساتھ لے کر جاتا۔ کسی سفیر کو قتل کرنا کسی بھی طائفہ و مذہب میں روا نہیں ہے چونکہ تمہارے حاکم نے یہ کام کیا ہے لہٰذا ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ قتل تمہارے حکم سے ہوا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو اسے سزا ملنی چاہیے۔ اگر تمہارے حکم سے

ہوا ہے تو تم بھی ذمہ دار ہو اور تمہیں اپنے کیئے کی سزا ملنی چاہئے۔

حارث بن ابی ثمر نے جواب دیا۔ ''کہ میں اپنی سلطنت میں خود مختار بادشاہ ہوں جسے چاہے قتل کرادوں آپ کو مجھ سے باز پرس کرنے کا حق نہیں ہے آپ کا نمائندہ میرے حکم سے قتل کیا گیا ہے۔''

جب پیغمبر اسلام کو یہ سخت جواب پہنچا تو آپ نے پختہ ارادہ کرلیا کہ حارث بن ابی ثمر کی مملکت پر چڑھائی کریں لہٰذا آپ نے تین ہزار مسلمانوں کو جنگ کے لئے منتخب فرمایا۔ حارث بن ابی ثمر چونکہ شہنشاہ بیزانس (رومتہ الصغریٰ) کے ماتحت تھا لہٰذا اس نے اس سے کمک طلب کی۔ اتفاق دیکھیئے اس زمانے میں رومتہ الصغریٰ کا بادشاہ ایران کے بادشاہ کے ساتھ جنگ کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے ایک لاکھ لشکری تیار کیئے تھے۔ حارث بن ابی ثمر نے جو کمک کی درخواست کی تھی تو اس نے یہ ایک لاکھ سپاہی اس کی مدد کے لئے بھیج دیئے پتہ نہیں چلا کہ کے پاس کتنے فوجی تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے اس کے سپاہیوں کی تعداد دس ہزار اور بعض نے ایک لاکھ بتائی ہے، موخر الذکر تعداد مبالغہ سے خالی نہیں کیونکہ حارث جیسا چھوٹا بادشاہ ایک لاکھ فوج کہاں سے تیار کرسکتا تھا۔ اگر یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ حارث بن ابی ثمر کے پاس ایک بھی جنگجو نہ تھا تب بھی ایک لاکھ رومی سپاہی جو اس کی مدد کے لئے آئے تھے مسلمانوں کے تین ہزار فوجیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھے، مجاہدین اسلام کا یہ تین ہزاری لشکر مقام موتہ میں جا کر ٹھہرا۔ یہ حارث کی کشور غصان میں ایک مقام تھا۔ تذکرہ نگاروں کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ لشکر اسلام جب مدینہ سے روانہ ہوا تو سپہ سالار فوج اسلام کون تھا؟ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ رسول اللہ نے اپنے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارث کو لشکر کی کمان سپرد کی تھی۔ بعض نے لکھا ہے کہ لشکر اسلام کے مدینہ روانہ ہوتے وقت سپہ سالار لشکر جعفر بن ابی طالب (برادر علی بن ابی طالب) کو بنایا تھا۔ میدان جنگ کے جائے وقوع کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ بعض اسلامی مؤرخین لکھتے ہیں کہ موتہ میں مسلمانوں نے دوسری جنگ لڑی، پہلی جنگ میں مسلمان رومیوں کے مقابلہ میں شکست کھا گئے تھے لہٰذا دوسری جنگ انہوں نے موتہ (اردن کے اندر) کے مقام پر لڑی۔

ایک لاکھ سپاہی جورومتہ الصغریٰ کے بادشاہ نے حارث کی مدد کے لئے بھیجے تھے، پورے رومی ہتھیاروں سے لیس تھے۔ ہر چھ ہزار سپاہی رومی دستور کے مطابق ایک ڈویژن کی تشکیل کرتے تھے، ہر ڈویژن میں تیس بریگیڈ ہوتے تھے اور ہر بریگیڈ میں دو بٹالین اور ہر بٹالین میں ایک سو جوان ہوتے تھے ہر فوجی کے پاس خود، زرہ، ڈھال، نیزہ اور تلوار تھی۔ رومتہ الصغریٰ کی فوج اس طرز جنگ سے، جس کا ہم نے جنگ بدر کے سلسلہ میں ذکر کیا، واقف تھی جب مسلمانوں کا چھوٹا سا لشکر رومیوں کے لشکر عظیم کے سامنے پہنچا تو کچھ مسلمان کہنے لگے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم آپس میں مشورہ کرلیں کہ ہمیں جنگ کرنی چاہئے یا نہیں؟ اگرچہ پچھلی لڑائیوں میں دشمن کا لشکر ہم سے کئی گنا تھا مگر یہاں تو دشمن کی فوج چالیس پچاس گنا زیادہ ہے اور ان کا ساز وسامان بھی بہت اعلیٰ ہے جب کہ ہمارے بہت سے مجاہدوں کے پاس زرہ بکتر بند بھی نہیں ہے اس طرح وہ میدان جنگ میں بغیر کسی حفاظت کے جائیں گے۔

سپہ سالار اسلام زید بن حارثہ یا حسب روایت ثانی جعفر بن ابی طالب نے کہا۔ ''ہم راہ خدا میں لڑتے ہیں اگر ہم نے دشمن کو ماردیا اور مغلوب کرلیا تو جنت میں جائیں گے اور اگر ہم مر گئے اور مغلوب ہو گئے تب بھی بہشت میں جائیں گے، دشمن کے لشکر سے وہ لوگ ڈرا کرتے ہیں جو اپنے مستقبل کی طرف مطمئن نہیں ہوتے ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جنت میں جائیں گے تو دشمن کی فوج سے کیوں ڈریں۔'' جب مسلمانوں نے حضرت زید بن حارثہ کی باتیں سنیں تو وہ جنگ کے لئے آمادہ ہو گئے مگر دیکھا جائے تو وہ دراصل شہادت کی تیاریاں کررہے تھے۔

مسلمانوں نے اس غزوہ میں بھی وہی طرز جنگ اختیار کیا جو وہ پچھلی لڑائیوں میں اختیار کر چکے تھے، اس طرز جنگ سے مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچا تھا مگر اس بار یہ طریقہ جنگ کارگر نہ رہا کیونکہ رومی بھی اس طریقہ جنگ سے آشنا تھے اور گوپھن چلانے میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے اس کے علاوہ ان کا ساز وسامان، مسلمانوں کی بہ نسبت بہت اچھا تھا۔ ابتدائے جنگ میں زید بن حارثہ، سپہ سالار اسلام شہید ہو گئے اور جعفر بن ابی طالب نے ان کی جگہ، لشکر کی کمان سنبھالی۔

وہ پے در پے شمشیر زنی کرتے جاتے تھے انہوں نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ پیچھے ہٹتے چلے جائیں چنانچہ لشکر اسلام پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ بعض روایتوں کے مطابق حضرت جعفر کے دونوں

ہاتھ قطع ہو چکے تھے پھر بھی ٹانگوں کے ذریعے مدافعت کرتے رہے۔ ان کی شہادت کے بعد عبداللہ بن رواحہ انصاری سپہ سالارِ فوج اسلام بنے، یہ مسلمانانِ مدینہ سے تھے انہوں نے مسلمانوں کی تقویت قلب کے لئے صدائے دل نشین کے ساتھ قرآن پڑھنا شروع کیا۔ یہ آیتیں جہاد، راہ اسلام میں فدا کاری اور بہشت میں داخل ہونے سے متعلق تھیں۔ آپ تلوار چلاتے جاتے تھے اور با آواز بلند پکارتے جاتے تھے کہ اپنی صفوں کا خیال رکھو۔

اگر مسلمان جنگ موتہ میں اپنی صفیں اس طرح آراستہ نہ کرتے جیسی کہ جنگ بدر میں کی تھیں تو سب کے سب شہید ہو جاتے۔ اس روز عصر کے وقت تک جو وہ مقابلہ کرتے رہے اس کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے مضبوط صف بندی کی تھی ورنہ اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ نہ کر سکتے۔ عصر کے وقت حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی شہید ہو گئے ان کے بعد حضرت خالد بن ولید سپہ سالار بنے۔ بعض روایت میں ہے کہ جنگ موتہ ایک دن رہی اور بعض میں ہے کہ اگلے دن بھی جاری رہی میرا یہ خیال ہے کہ خالد بن ولید کی سپہ سالاری کے بعد اسی دن جنگ موتہ ختم ہو گئی تھی۔ اگر یہ لڑائی اس دن ختم نہ ہوتی اور مسلمانوں کو رومیوں کے ساتھ لڑنا پڑتا تو یہ امر مشکل تھا کہ ایک بھی مسلمان مدینہ کو زندہ سلامت جا سکتا۔ اس دن دو اسباب کی وجہ سے مسلمان سلامتی کے ساتھ پیچھے ہٹنے میں کامیاب ہوئے ایک تو خالد بن ولید کی جنگی مہارت اور دوسرے تاریکی شب کی وجہ سے۔

خالد بن ولید پورے لشکر اسلام کے سپہ سالار بننے سے پہلے صرف پانچ سو مجاہدین کے سالار تھے۔ آغاز جنگ سے لے کر اختتام جنگ تک ان کے ہاتھوں میں نو تلواریں ٹوٹ چکی تھیں۔ جب وہ پوری فوج کے سپہ سالار بن گئے تو انہوں نے از سر نو صف بندی کرائی اور حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت تک لشکر اسلام کی چھ صفوں میں سے تین صفیں کام آ چکی تھیں یعنی ڈیڑھ ہزار مسلمان شہید ہو چکے تھے۔ ان حالات کے باوجود حضرت خالد بن ولید نے اس زور سے حملہ کیا اور پیش قدمی کی کہ حارث بن ابی ثمر کی فوج کے سپہ سالار تک جا پہنچے اور اسے اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالا، اس کا نام ملک بن البلادی تھا۔

خالد بن ولید کے اس حملے کا یہ فوری اثر ہوا کہ حارث بن ابی ثمر اور رومتہ الصغریٰ کی

متحدہ طاقت نے یہ سمجھ لیا کہ مسلمانوں کو تازہ کمک مل گئی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے پیش قدمی کی جسارت کی ہے۔ اس کے بعد تاریکی چھا گئی اور حضرت خالد نے غازیان اسلام کو حکم دیا کہ وہ پیچھے ہٹتے چلے جائیں تا آنکہ رات کی تاریکی میں لشکر اسلام پیچھے ہٹ گیا۔ اس جنگ میں دو ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ منجملہ ان کے حضرت جعفر بن ابی طالب بھی شہید ہوئے، جو بچپن سے حضرت محمد کے ساتھ پلے بڑھے اور جوان ہوئے تھے اور آپ کے رضائی بھائی تھے۔ زید بن حارثہ جو رسول کریم کے آزاد کردہ غلام تھے اور اس کے بعد آپ (ﷺ) نے انہیں اپنا فرزند بنا لیا تھا یہ بھی جنگ موتہ میں شہید ہوئے یہ چار سابقین اسلام میں سے ایک تھے۔

روایت ہے کہ شب معراج میں پیغمبر اسلام نے آسمان پر ایک نہایت حسین ارغوانی لب عورت دیکھی تو دریافت فرمایا، "یہ کون عورت ہے؟" معلوم ہوا کہ یہ حور بہشت، زید بن حارثہ کے لئے ہے۔ چنانچہ جنگ موتہ کے بعد آپ اس سے جنت میں جا ملے۔ گو جنگ موتہ میں مسلمان شکست کھا گئے تھے اور خالد بن ولید اپنی جنگی مہارت کی بدولت ایک ہزار مسلمانوں کو بچا کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے اسی جنگ میں بہادری کے جوہر دکھانے پر وہ سیف اللہ کہلائے) مگر پورے حجاز میں مسلمانوں پر اس کا اثر بہت اچھا پڑا۔

اگلے زمانوں میں جس کسی کا حجاز پر قبضہ ہوتا وہ پورے جزیرۃ العرب کا فرماں روا ہوتا تھا۔ چونکہ حضرت محمد نے تمام قبائل حجاز کو مسلمان کر لیا تھا لہٰذا وہ بہ استثنائے مکہ پورے حجاز کے فرماں روا ہو گئے تھے۔ آپ نے مکہ کو تسخیر کرنا چاہا مگر اس کے لئے ضروری تھا کہ لشکر کشی کریں اور وہاں پہنچیں۔ باشندگان مکہ نے بنو بکر کی بنو خزاعہ کے خلاف مدد کی تھی حالانکہ بنو خزاعہ مسلمانوں کے ساتھ متحد ہو چکے تھے اور اہل مکہ اور مسلمانوں کے درمیان ترک جنگ کا معاہدہ ہو چکا تھا لیکن انہوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی تھی لہٰذا پیغمبر اسلام کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ مکہ پر حملہ کریں اس سلسلہ میں کوئی اعتراض بھی نہ کر سکتا تھا کہ آپ نے عہد کی خلاف ورزی کی ہے۔ قریش کی طرف سے بلاشک وشبہ نقض عہد ہوا تھا چنانچہ ابوسفیان مکہ سے مدینہ آپ سے مذاکرات کرنے کے لئے گیا اور آپ سے کہا کہ اگر اہلِ مکہ کی وجہ سے بنو خزاعہ کو نقصان پہنچا ہے تو وہ اس کی تلافی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس کی اس بات سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ قریش نے متارکہ جنگ کے عہد نامہ کی خلاف ورزی کی تھی۔

فتح مکہ

حضرت محمد کا فاتحانہ داخلہ

حضرت محمد نے جو کچھ ابوسفیان کو جواب دیا تھا وہ ہم بیان کر چکے ہیں، جب وہ مدینہ سے مکہ کی طرف لوٹا تو اس نے اہل مکہ سے کہا، "کچھ بعید نہیں ہے کہ محمد مکہ پر حملہ کر دیں وہ اب اس قدر طاقت ور ہیں کہ ہم ان کے حملے کی تاب نہیں لا سکتے" ابوسفیان کا خیال صحیح تھا۔ حضرت محمد نے مکہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا، مسلمانوں کو تیاری کرنے کا حکم دیدیا مگر یہ نہ بتایا کہ کدھر کا ارادہ ہے حتیٰ کہ حضرت ابوبکر و عمر کو بھی پتہ نہ لگا کہ آپ کہاں حملہ آور ہوں گے؟ حالانکہ دونوں حضرات آپ کے خسر تھے۔ جنگی سفر کی تیاری کا حکم دینے سے پہلے آپ نے یہ حکم صادر فرمایا کہ شہرِ مدینہ کا رابطہ باہر سے منقطع کر دیا جائے، باہر سے کوئی شخص اندر نہ داخل ہو سکے اور اندر سے کوئی شخص باہر نہ جائے یہ ایک قسم کا کرفیو تھا۔ یہ اس لئے لگایا گیا کہ اگر شہر سے باہر کوئی شخص گیا تو وہ آس پاس کے لوگوں سے مسلمانوں کی تیاری کا حال بیان کر دے گا اور اس طرح قریش تک یہ اطلاع پہنچ جائے گی یا لوگ خود مکہ جا کر انہیں خبریں پہنچا دیں گے کہ مدینہ کے مسلمان جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں اگر چہ یہ لوگ یہ بات تو نہ کہہ سکتے تھے کہ مسلمان، مکہ پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں مگر قریشی سمجھ جاتے کہ رخ ہماری طرف ہوگا۔

مدینہ میں اس "کرفیو" کے باعث نہ کوئی شخص باہر سے شہر کے اندر آیا نہ اندر سے کوئی باہر جا سکا اگر کوئی قافلہ باہر سے آتا تو شہر کے باہر ہی ٹھہرایا جاتا تجارت کا مال وہیں تحویل میں دے دیا جاتا پھر وہاں سے شہر کی طرف بھیج دیا جاتا۔ مدینہ کے ایک دانا باشندے حاطب بن ابی بلتعہ نے بھانپ لیا کہ نبی کریم کا ارادہ مکہ پر چڑھائی کرنے کا ہے۔ ان کے کچھ قریبی عزیز مکہ میں رہتے تھے لہٰذا انہوں نے ایک چٹھی لکھ کر ایک عورت سارہ کے ہاتھ روانہ کر دی تا کہ مکہ جا کر ان

کے عزیزوں کے سپرد کر دے۔ سارہ مدینہ کے ایک تاجر کی باندی تھی جس کا نام صیفی بن عمرو تھا چونکہ یہ خارج مدینہ سے داخل مدینہ میں اپنا مال لا رہے تھے لہٰذا سارہ شہر سے باہر جا سکتی تھی اسے کوئی نہ روک سکتا تھا سارہ شہر سے باہر نکلی تو اس نے مکہ کی راہ لی۔ حضرت علی بن ابی طالب، اطراف مدینہ کو کنٹرول کر رہے تھے، انہیں پتہ چل گیا کہ سارہ مکہ کی طرف روانہ ہوئی ہے تو فوراً کچھ آدمی اس کی تلاش میں بھیجے کہ اسے واپس لے آئیں اور جو کچھ بھی اس کے پاس ہو وہ اسے محفوظ کر لیں۔ جب اس عورت کو واپس لایا گیا اور وہ خط جو اس کے پاس تھا اس سے لے کر پڑھا گیا تو معلوم ہوا کہ حاطب بن ابی بلتعہ نے اپنے عزیزانِ مکہ کے نام لکھا ہے۔

آپ ﷺ نے سارہ کی تحقیقات کی، آیا وہ اس خط کے مضمون سے واقف ہے یا نہیں؟ سارہ کو کچھ پتہ نہ تھا۔ حضرت علی نے سارے معاملہ کی رپورٹ رسول اکرم کی خدمت میں پیش کر دی۔ رسول اللہ نے حاطب کو بلایا اور خط کے بارے میں پوچھ گچھ کی کہ آیا انہوں نے وہ نامہ صیفی بن عمرو کی کنیز کے ہاتھ مکہ بھیجا تھا؟ حاطب نے مجبوراً اعتراف کیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا، صیفی بن عمرو کو اس بات کا علم ہے کہ تم نے اس کی کنیز کو یہ خدمت سپرد کی ہے؟ حاطب نے عرض کی "یا رسول اللہ انہیں اس بات کا علم نہیں ہے۔" جب حضور (ﷺ) کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ حاطب کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اپنے گھر والوں کو اطلاع دے دیں کہ وہ لشکر اسلام کے پہنچنے سے پہلے مکہ سے باہر کہیں چلے جائیں اس پر انہیں معاف کر دیا گیا۔

مدینہ میں آپ کے قصد جنگ کے بارے میں دو افواہیں پھیل رہی تھیں، ایک یہ کہ آپ کا ارادہ جنگ روم (رومتہ الصغریٰ) کا ہے تاکہ جنگ موتہ میں جو شکست مسلمانوں کو ہوئی تھی اس کی تلافی کریں۔ دوسرے یہ کہ آپ بنو سلیم سے جنگ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ مسلمانوں کے لیے باعث زحمت بنے ہوئے تھے مگر اس بات کا خیال کسی کو بھی نہ آیا کہ آپ کا ارادہ اہل مکہ پر چڑھائی کرنے کا ہے۔

اِدھر مسلمانانِ مدینہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے، ادھر رسول خدا نے تمام آس پاس کے قبائل کو جو مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کر چکے تھے، حکم دے دیا کہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں بعد ازاں لشکرِ اسلام مدینہ سے روانہ ہوا تو مکہ کی راہ لی۔ راہ میں جتنے بھی حلیف قبائل پڑتے تھے سب مسلمانوں کے ساتھ ملتے جاتے تھے۔ اسلامی تذکرہ نویسوں نے 10 رمضان 8

ھ آپ کی تاریخ ورود مکہ لکھی ہے لیکن یہ کسی نے نہیں لکھا کہ آپ مدینہ سے کس دن روانہ ہوئے۔ بہرحال یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ مسلمان رمضان میں مکہ پہنچے، شاید پہلی رمضان کو مدینہ سے روانہ ہوئے ہوں۔

رمضان کے مہینے میں سارے مسلمان روزہ رکھتے ہیں، طلوع فجر سے غروب آفتاب تک کچھ بھی کھاتے پیتے نہیں تھے۔ جب لشکر اسلام مقام عذیر پر پہنچا تو حضرت محمد (ﷺ) نے مسلمانوں سے کہا کہ اگلے دن کوئی شخص روزہ نہ رکھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حالت سفر میں روزہ چھوڑ دینے کی اجازت دی ہے۔ اس دن کے بعد مسلمانوں نے روزہ نہ رکھا حتیٰ کہ مقام مرالظہران تک پہنچ گئے یہ مکہ سے ایک منزل دور ہے۔ رات کے وقت مسلمانوں نے یہاں قیام کیا۔ حضرت محمد نے حکم دیا کہ آگ روشن کریں تا کہ اہل مکہ کو پتہ چل جائے کہ مسلمان بڑا بھاری لشکر لے کر آئے ہیں۔ عباس جیسا کہ ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں ایک تاجر تھے وہ دوسرے لوگوں کی طرح سودی کاروبار کرتے تھے۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ اہل مکہ، لشکر اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا انہوں نے شہر چھوڑ دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ان کے پاس جو کچھ بھی تھا فروخت کر دیا کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ مسلمانوں کے مکہ میں داخل ہونے کے بعد ان کا مال محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ جب وہ اپنا مال فروخت کر چکے تو مکہ سے چل کر مرالظہران میں پہنچے اور اسلام لے آئے۔ ابوسفیان کا بھی حضرت عباس کی طرح یہی خیال ہوا کہ اہل مکہ تاب مقابلہ نہیں لا سکتے لہٰذا وہ بھی مرالظہران پہنچا۔ حضرت عباس فرماتے ہیں کہ میں اس شب میں جب کہ مسلمان مرالاظہران میں قیام پذیر تھے لشکر اسلام کے بیرونی حصے سے گزر رہا تھا میں نے دو آدمیوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا تو ان کی طرف کان لگا دیئے۔ ایک شخص دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ آگ جو جگہ جگہ دور تک روشن ہے قبیلہ خزاعہ کی ہے'' دوسرے نے کہا، ''ایسا نہیں ہے بنو خزاعہ اتنے کہاں سے آ گئے کہ اتنی ساری آگ جگہ جگہ روشن ہو۔''

میں دوسری آواز کو پہچان گیا کہ یہ گفتگو کرنے والا ابوسفیان ہے، میں نے کہا، ''اے ابو حنظلہ کیا تم ہو؟'' (ابو حنظلہ ابوسفیان کی دوسری کنیت تھی) ابوسفیان بھی میری آواز کو پہچان گیا کہنے لگا۔ ''ابوالفضل کیا تو ہے؟'' (ابوالفضل حضرت عباس عم پیغمبر کی کنیت تھی) میں نے کہا، ''ہاں میں ہی ہوں'' پھر میں اس کی طرف گیا تو وہ دریافت کرنے لگا۔ ''اے ابوالفضل کیا خبریں

ہیں؟'' میں نے کہا، ''حضرت محمد دس ہزار سپاہی لے کر آئے ہیں تا کہ قریشیوں کے ساتھ مقابلہ کریں اور مکہ پر قبضہ کرلیں کیونکہ قریشیوں نے پیمان متارکہ جنگ کو پاؤں تلے روندا ہے اور بنو خزاعہ پر حملہ کر کے ان کے بہت سے افراد کو قتل کر دیا اور ان کا مال لوٹ لیا ہے جب کہ قبیلہ خزاعہ، مسلمانوں کے ساتھ متحد ہو چکا تھا۔ جب مسلمان مکہ پر حملہ کریں گے اور اسے تسخیر کرلیں گے تو سب سے پہلے تجھے قتل کریں گے کیونکہ تو ہی لشکر مکہ کا سپہ سالار تھا اور ہے اور نقض معاہدہ ترک جنگ کی ذمہ داری بھی تجھی پر عائد ہوتی ہے۔''

ابوسفیان نے پوچھا، ''پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟'' میں نے کہا، ''اگر تو یہ چاہتا ہے کہ زندہ رہے اور تیرا مال مسلمانوں کے لیے مال غنیمت نہ بنے تو حضرت محمد کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لے آ۔ اگر تو نے اتنا کرلیا تو وہ تیرے خون سے درگزر کریں گے، تیرے مال کو مسلمانوں کے لئے غنیمت جنگ نہیں بنائیں گے۔ تو یہیں ٹھہر جا۔ میں ایک اونٹنی لاتا ہوں اس پر تجھے سوار کر کے مسلمانوں کی لشکر گاہ کے درمیان لے جاؤں گا'' (بعض تذکرہ نویسان اسلام نے مادہ شتر کی جگہ قاطر لکھا ہے)۔

ابوسفیان نے پوچھا۔ ''میں ناقہ پر سوار ہو کر حضرت محمد کے پاس کیوں جاؤں؟'' میں نے کہا، ''اس لئے کہ سارے مسلمان تجھے پہچانتے ہیں وہ تیرے جانی دشمن ہیں اگر کسی نے دیکھ لیا تو قتل ہی کر ڈالے گا، البتہ اونٹنی پر سوار ہو کر جانے سے تیری جان محفوظ ہو جائے گی، کوئی بھی در پے قتل نہیں ہوگا ہر شخص یہ سمجھے گا کہ رسول اللہ نے تجھے طلب کیا ہوگا۔''

اس طرح حضرت عباس عم پیغمبر کی پیش کش کے مطابق ابوسفیان مادہ شتر پر سوار ہوا۔ لشکر اسلام کے درمیان سے گزرا اور اپنے آپ کو حضور کی خدمت میں پہنچا دیا۔ حضرت عباس فرماتے ہیں ''جب میں رسول اللہ کے خیمے میں پہنچا تو عمر بن خطاب آپؐ کے خیمے میں آئے اور عرض کی یا رسول اللہ اجازت دیجئے کہ میں ابوسفیان کی گردن ماروں۔''

میں نے حضرت عمر سے کہا، ''یہ شخص عبد مناف کی اولاد سے ہے۔ اسی لیے آپ چاہتے ہیں کہ اس کی گردن ماردیں اگر یہ شخص بنوعدی سے ہوتا تو کیا آپ اس کی گردن مارنا پسند کرتے؟'' (حضرت عمر بنوعدی سے تھے) حضرت عمر نے فرمایا، اگر میرے قبیلے کے آدمی بھی رسول اللہ سے دشمنی کریں تو میں ان کی بھی گردن اڑا دوں کیونکہ میں صرف ان لوگوں کا دوست

ہوں جو رسول خدا کے دوست ہیں اور ان لوگوں کا دشمن ہوں جو ان کے دشمن ہیں۔"

حضرت عباس کہتے ہیں حضرت محمد نے مجھ سے فرمایا، "اے عباس آپ آج رات انہیں اپنے خیمے میں لے جائیں ان کی حفاظت کیجئے اور کل صبح میرے پاس حاضر کیجئے" حضرت عباس فرماتے ہیں میں نے اطاعت حکم نبوی کی، ابوسفیان کو اپنے خیمے میں لے گیا اور وہاں سو گیا اگلی صبح میں اسے رسول اللہ کی خدمت میں لے گیا۔

حضرت محمد نے ابوسفیان کو مخاطب کر کے فرمایا، "کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تو خدا پر ایمان لائے اور مجھے پیغمبر سمجھے؟" ابوسفیان بولا، "یا محمد میں تصدیق کرتا ہوں کہ آپ ایک امین انسان ہیں صلہ رحمی کرتے ہیں مگر ابھی تک آپ کی پیغمبری کا میں قائل نہیں ہوا کہ آپ کے دین کو قبول کروں" میں (عباس) نے کہا "اے ابوحنظلہ تو نے عہد شکنی کی ہے لہٰذا واجب القتل ہے اگر اسلام کو قبول نہیں کرے گا تو ابھی قتل کر دیا جائے گا۔"

ابوسفیان نے مجبوراً اسلام قبول کر لیا تب رسول اللہ نے سربرآوردہ مسلمانوں کو بلا کر مکہ کے بارے میں ابوسفیان سے گفتگو کی اور اس کے اظہار احترام کے لئے دو حکم جاری فرمائے۔

ایک یہ کہ لشکر اسلام، ابوسفیان کے سامنے سے گزرے، دوسرے یہ کہ مکہ میں جو بھی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا وہ محفوظ ہے۔

لشکر اسلام کے ابوسفیان کے سامنے سے گزرنے کے بعد رسول اللہ نے اسی روز ابوسفیان کو حکم دیا کہ مکہ جا کر یہ اعلان کرے۔ "چونکہ باشندگان مکہ نے عہد شکنی کی ہے لہٰذا قانون اور عام رواج کے موافق ان کا خون حلال ہے اور مسلمانوں کو ان کا مال لے لینا مباح ہے، البتہ جو کوئی بھی خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے گا اس کا خون محفوظ ہو جائے گا اور اس کے مال کو کوئی مسلمان ہاتھ نہیں لگائے گا، اسی طرح جو کوئی ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے گا اس کا جان و مال بھی دست برد سے محفوظ ہو جائے گا اور وہ اسلام کی پناہ میں آ جائے گا۔ جو لوگ گھر سے باہر نہیں نکلیں گے وہ بھی اسلام کی پناہ میں آ جائیں گے اور ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔"

ابوسفیان ان دنوں خوب موٹا تازہ تھا، سوار ہو کر مکہ گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد لشکر اسلام نے مکہ کی راہ لی اور بغیر کسی خون ریزی کے مکہ کا محاصرہ کر لیا۔

ابوسفیان مکہ پہنچا تو خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اعلان کیا:

''لشکر اسلام مکہ میں داخل ہوا چاہتا ہے ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، حضرت محمد (ﷺ) نے فرمایا ہے جو کوئی خانہ کعبہ یا ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا جو لوگ خانہ کعبہ یا ابوسفیان کے گھر تک نہیں پہنچ سکتے اپنے گھروں ہی میں رہیں ان کے جان و مال کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ ہندہ زوجہ ابوسفیان نے جو یہ اعلان سنا تو بہت غصہ ہوئی اور اہل مکہ سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا:

''اس چربی کے کپے کو قتل کر ڈالو۔ یہ شخص ہمارے ساتھ خیانت کر رہا ہے، یہ سپہ سالار مکہ ہو کر بجائے جنگ پر ابھارنے کے، کہتا ہے کہ اپنے گھروں سے باہر نہ نکلو تاکہ تمہاری جان و مال محفوظ رہے''۔ مگر لوگوں نے ابوسفیان کو قتل کرنا نہیں چاہا، اس لیے کہ وہ جانتے تھے مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

جب ہندہ نے یہ دیکھا کہ کوئی بھی اسے قتل کرنے پر تیار نہیں ہے تو خود اس کے قتل کرنے کے لئے بڑھی لیکن اہل مکہ نے اسے ایسا نہ کرنے دیا۔ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ اسلام کے منادی مکہ پہنچ گئے اور انہوں نے ابوسفیان والے اعلان کو دہرایا۔ جو لوگ گلیوں میں تھے جلدی سے خانہ کعبہ میں جا چھپے یا ابوسفیان کے گھر چلے گئے جن کا گھر قریب تھا وہ اپنے اپنے گھر چلے گئے اور دروازے بند کر لئے مکہ کی گلیاں خالی ہو گئیں۔

اسلامی فوج کا سب سے پہلا دستہ جو وارد مکہ ہوا حضرت علی کی زیر کمان تھا، وہ رسول اللہ کا پرچم دست مبارک میں لئے ہوئے تھے مکہ میں داخل ہوتے ہی سیدھے باب الفتح کی جانب سے خانہ کعبہ میں پہنچے۔ آپ خانہ کعبہ کے بڑے دروازے سے داخل ہوئے۔

مسلمانوں کے دوسرے دستے کے سپہ سالار زبیر بن عوام تھے وہ مغربی جانب سے مکہ میں آئے۔ سعد بن عبادہ انصاری کو حکم ملا کہ وہ ایک دستہ کے ساتھ مشرقی جانب سے داخل ہوں چوتھے دستے کے سردار خالد بن ولید تھے۔ انہیں مکہ کے جنوبی راستے سے شہر میں داخل ہونے کا حکم تھا۔

حضرت محمد نے چاروں سرداروں سے فرمایا، ''اب جب کہ تم مکہ میں داخل ہو چکے ہو، تلوار نیام سے باہر مت نکالنا اور کسی کے ساتھ جنگ نہ کرنا مگر یہ کہ تم پہ حملہ کیا جائے۔ یاد رکھو کہ باشندگان مکہ خانہ کعبہ، خانہ ابوسفیان اور اپنے گھروں میں مامون ہیں'' مگر حضرت سعد بن عبادہ

انصاری نے اعلان کیا:

الیوم یوم الحملۃ الیوم تسبی الحرمہ

''آج جنگ کا دن ہے آج حرمت واحترام کا دن نہیں ہے''

جس کا یہ مطلب تھا کہ آج خانہ کعبہ کی کوئی حرمت نہیں کی جائے گی لہٰذا مسلمان خانہ کعبہ میں مشرکوں کو قتل کر سکتے ہیں۔

رسول اللہ کو جو یہ بات معلوم ہوئی تو فوراً سعد بن عبادہ انصاری کو معزول کر دیا اور انہیں علی بن ابی طالب کی سرکردگی میں دے دیا تا کہ وہ خود مختارانہ طور پر جنگ کی طرف پیش قدمی نہ کر سکیں۔

لشکر اسلام کے کسی بھی دستے کو مکہ میں مقابلہ و مقاتلہ نہ کرنا پڑا مگر حضرت خالد بن ولید کے دستے کو دشمن کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ جنوب مکہ کی طرف سے داخل ہوئے تھے۔ جنوبی محلے کے چند ایک قریشیوں اور چند ایک احابیش نے مل کر ان کی ٹولی پر حملہ کیا تھا۔

حضرت خالد بن ولید سیف اللہ پکارے، ''خواہ مخواہ اپنا خون رائیگاں نہ کرو کیونکہ سقوط مکہ سے اب کوئی طاقت مسلمانوں کو نہیں روک سکتی۔ رسول اللہ ﷺ ارادہ کر چکے ہیں کہ آج مکہ کو تسخیر کر لیں اور ایسا ہو کر ہی رہے گا''۔ مگر وہ لوگ باز نہ آئے انہوں نے حضرت خالد کی نصیحت کو نہ مانا اور حملہ کر دیا، ذرا سی دیر میں پندرہ آدمی مارے گئے۔ جن میں سے دو مسلمان تھے اور باقی قریش تھے دیگر لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ وہ مقابلہ نہیں کر سکتے تو بھاگ کھڑے ہوئے۔

لشکرِ اسلام کی چاروں رجمنٹیں مکہ کی چاروں سمت سے آ کر خانہ کعبہ کے سامنے جمع ہو گئیں تو حضرت محمد اپنی سپید اونٹنی پر سوار بیت اللہ کے پاس آئے اور سات مرتبہ طواف کعبہ کیا پھر عثمان بن طلحہ کے پاس تشریف لے گئے۔ یہ کعبہ کے کنجی بردار تھے۔ ان سے فرمایا کہ درِ کعبہ کھولیں۔ عثمان بن طلحہ کی ماں نے کہا۔ ''ہم ہرگز تمہارے لئے بابِ کعبہ نہ کھولیں گے'' مگر عثمان نے اسے خاموش کیا اور دروازہ کھول دیا اس دن پانچ مسلمان خانہ کعبہ میں داخل ہوئے۔

سب سے پہلے حضرت محمد، ان کے پیچھے حضرت علی پھر عثمان بن زید، چوتھے بلال مؤذن صدر اسلام، پانچویں عثمان بن طلحہ، کلید دار کعبہ۔

جب آنحضرت ان چار افراد کے ساتھ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو جو اہل مکہ جان بچانے

کی غرض سے خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تھے۔ وہ ڈرنے لگے کہ حضرت محمد انہیں قتل کرنے آئے ہیں ان کے مال سلب کرلیں گے اور ان کے بیوی بچوں کو باندی غلام بنالیں گے۔

اہل مکہ کافر تو تھے ہی مگر جب انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ پیان باندھ کر توڑا تو وہ حربی کافر ہو گئے یعنی وہ کافر جو مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ آپ کو تسخیر مکہ کے لئے لشکر کشی کرنی پڑی تھی، خود مکہ میں قریشیوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی تھی۔ اور دو مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا۔ لہٰذا حسب قانون آپ کو ہر حق پہنچتا تھا کہ وہ تسخیر مکہ کے بعد سارے اہل مکہ کو تہ تیغ کر دیتے یا غلام و کنیز بنا لیتے مگر آپ نے سب کو بخش دیا۔

زیارت کعبہ سے فارغ ہو کر باہر تشریف لائے اور آستانہ کعبہ پر کھڑے ہو کر ان اہل مکہ سے جو کعبہ کے اندر تھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تم لوگ قانون جنگ سے آشنا ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ تم نے پیان شکنی کی اور مغلوب ہوئے لہٰذا مسلمان یہ حق رکھتے ہیں کہ تمہیں قتل کریں یا غلام بنائیں اور تمہاری عورتوں کو کنیز بنالیں مگر میں آج کے دن تم سے وہی بات کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے قدرت پالینے کے بعد اپنے بھائیوں سے کہی تھی یہ کہ خدا تمہاری مغفرت کرے تم لوگ آزاد ہو، کوئی شخص تمہاری جان و مال سے تعرض نہیں کرے گا اور تمہاری عورتوں کو کنیز نہیں بنائے گا''

اسی لئے اہل مکہ کو طلقا کہتے تھے یعنی آزاد کردہ غلام۔ اس کے بعد حضرت محمد نے ان باشندگان مکہ کو جو خانہ کعبہ میں تھے قرآن کی یہ آیت پڑھ کر سنائی۔

انا خلقنکم من ذکر و اُنثی (الیٰ آخر الآیۃ)

''ہم نے تمہیں ایک مذکر اور مونث سے پیدا کیا''

آپ نے فرمایا، ''اللہ تعالیٰ نے تمام افراد بشر کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، کوئی کسی سے افضل نہیں ہے مگر یہ کہ متقی ہو چونکہ اللہ کے نزدیک تمام افراد بشر برابر ہیں لہٰذا دور جاہلیت کی ہر وہ برتری جو حسب، نسب، طائفہ یا قبیلہ کی وجہ سے تھی باطل ہو گئی صرف ایک فضیلت باقی رہی ہے اور وہ منصب آب رسانی اہل مکہ ہے عباس میرے چچا اس منصب پر اسی طرح قائم رہیں گے کیونکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ بلا کسی امتیاز کے سب کو مساوی طور پر پانی تقسیم کیا کرتے تھے''۔

جب باشندگان مکہ داخل اسلام ہو گئے۔ تو عثمان بن طلحہ بھی منصب کلید داری پر اسی طرح فائز رہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزندوں کو یہ منصب ملا۔ آج بھی کعبہ کی کنجی بردار عثمان بن طلحہ کی اولاد سے ہیں۔

جب آپ (ﷺ) خطاب فرما چکے تو اپنے دستِ مبارک سے خانہ کعبہ کے ایک بت کو زمین پر پھینک کر توڑ دیا اور حضرت علی سے فرمایا کہ تمام بتوں کو توڑ ڈالیں اور یہاں سے اٹھا کر باہر پھینک دیں اور بتوں کی تمام تصویروں اور دوسری تصویروں کو جو خانہ کعبہ میں ہیں مٹا ڈالیں۔

روایت ہے کہ حضرت محمد نے فرمایا، ''جو تصویر میرے ہاتھوں کے نیچے ہے اسے نہ مٹانا، ایک روایت میں ہے کہ یہ تصویر مریم علیہا السلام کی تھی کہ حضرت عیسیٰ کو آغوش میں لیے ہوئے ہیں مگر دوسری روایتوں کے مطابق ہر بت اور ہر تصویر کو خانہ کعبہ سے نکال دیا اور مٹا دیا گیا۔ جس وقت مسلمان، پتھر کے بتوں کو توڑنے کے لئے اوندھا گرا رہے تھے اور لکڑی کے بتوں کو کلہاڑوں سے توڑ رہے تھے، خانہ کعبہ میں جو قریشی تھے انہوں نے فرطِ غم و تاثر سے چادروں میں منہ چھپا لیا تاکہ یہ منظر نہ دیکھ سکیں۔ بعض افراد قریش یہ خیال کر رہے تھے کہ اب دنیا ویران ہو جائے گی مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ یکے بعد دیگرے بتوں کو توڑتے رہے اور کوئی ناگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ بتوں کو نیست و نابود کر دینے اور فرمان معافی صادر کر دینے کے بعد حضرت محمد نے ان لوگوں سے جو خانہ کعبہ میں تھے فرمایا، ''جہاں چاہے چلے جاؤ، تم سے کوئی تعرض نہیں کرے گا، جو لوگ ابوسفیان کے یا اپنے گھر میں ہوں ان سے کہہ دو کہ جہاں چاہیں آئیں جائیں اور جو کام چاہیں کریں۔''

سب لوگ چلے گئے مگر حضرت محمد خانہ کعبہ سے باہر نہ نکلے کیونکہ ان کا کوئی مکان نہ تھا جہاں جاتے اور آرام کرتے۔ پچھلے زمانے میں آپ کا خانہ مبارک خدیجہؓ والا مکان بڑا خوب صورت اور دو منزلہ تھا اور مکہ کے خوبصورت مکانوں میں شمار ہوتا تھا۔ حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد یہ گھر عقیل، برادر علی کے قبضہ میں آیا اور انہوں نے اسے کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ چند ایک مسلمانوں نے رسول اللہ سے عرض کی کہ ''آپ مکہ کے جس مکان میں قیام فرمانا چاہیں اقامت کیجئے کیونکہ آپ اہل مکہ کو مغلوب کر کے شہر میں داخل ہوئے ہیں''۔

آپ نے فرمایا، ''اہل مکہ کی جان و مال مامون و محفوظ ہے لہٰذا میں اہل مکہ کے کسی گھر کو اپنے لئے منتخب نہیں کر سکتا''۔ چونکہ آپ خانہ کعبہ میں رات نہ گزار سکتے تھے لہٰذا وہاں سے روانہ

ہو کر الحائف پہنچے اور زیر خیمہ رات بسر کی۔

مسلمانوں کے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے یہاں کا حاکم بن اسید تھا۔ پندرہویں رمضان ظہر کے وقت اسلام کے مشہور موذن حضرت بلال اذان دینے کے لیے نکلے تو کسی بلند مقام کی تلاش کرنے لگے تا کہ ہر شخص اذان کی آواز سن سکے لہٰذا انہوں نے سوچا کہ خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دیں۔

جونہی حضرت بلال کی آواز بلند ہوئی تو عتاب بن اسید حاکم مکہ خانہ کعبہ میں پہنچا اور بدتمیزی کرتے ہوئے کہا کہ نیچے اترو۔ تاہم حضرت بلال اذان مکمل کرنے کے بعد اترے اور جا کر آنحضرت سے شکایت کی کہ عتاب نے مجھے گالیاں دی ہیں۔ اس کا فاتحین کے مذہب میں مداخلت کرنا سنگین جرم تھا مگر آنحضرت نے اسے کچھ نہ کہا۔ اس کا اس پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گیا۔ پیغمبر اسلام نے اسے اس کے عہدے پر برقرار رکھا اور عتاب مسلمانوں کی طرف سے حاکم مکہ قرار پایا۔

فتح مکہ کے بعد حضرت محمد (ﷺ) نے نہایت عالی حوصلگی سے کام لیتے ہوئے اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی معاف کر دیا۔ ان میں سے ایک عکرمہ بن ابی جہل بھی تھے جو مسلمانوں کے داخل مکہ ہونے سے پہلے جان کے خوف سے مکہ سے بھاگ نکلے تھے۔ ان کی بیوی رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنے شوہر کے لئے معافی کی درخواست کی آپ (ﷺ) نے انہیں امان دے دی، وہ مکہ کی طرف لوٹ آئے اور اپنے گھر میں رہنے لگے۔ اسلام کی ایک بڑی دشمن، ہندہ زوجۂ ابوسفیان بھی معاف کر دیا گیا۔ صفوان بن امیہ جو رسول خدا کو شہید کرانا چاہتا تھا اور جس نے آپ کے شہید کر دینے کے لئے ایک شخص کو انعام دینے کے وعدے پر مدینہ بھیجا تھا۔ اسے بھی آپ نے معاف کر دیا مگر اس نے کہا، میں مسلمان نہیں ہوں گا۔ معافی پانے کے پانچ دن بعد اس نے ایک سو زرہ اور پانچ سو درہم نقد لشکر اسلام کے لئے پیش کئے اور چند ماہ کے بعد وہ بھی مسلمان ہو گیا۔

فتح مکہ کے موقع پر انکشاف ہوا کہ خانہ کعبہ میں بیس ہزار چار سو مثقال سونا پڑا ہوا ہے۔ آنحضرت نے حکم دیا کہ اس خزانے کو کوئی ہاتھ نہ لگائے یہ اسی طرح کعبہ کے زیر تصرف رہے گا۔

فتح کے پہلے دن میں دو ہزار قریشی اسلام لائے۔ ان لوگوں کے داخل اسلام ہونے کا یہ

طریقہ تھا کہ یکے بعد دیگرے حضرت عمر بن الخطاب کے سامنے سے گزرتے، کلمہ شہادت پڑھتے اور حضرت عمر ان سے فرماتے، ''زنا اور عفیفہ عورتوں کی بے حرمتی کرنے سے باز رہنا اور ہمیشہ نیکی کرنے کی کوشش کرتے رہنا۔''

ہوسکتا ہے کوئی صاحب یہ سوال کریں کہ عمر بن الخطاب نومسلموں کو کس لیے زنا اور زنائے محصنات سے روکتے تھے اور مثلاً ان سے یہ کیوں نہیں کہتے تھے کہ سود خوری نہ کرو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مکہ میں مشرکین کے درمیان زنا اور زنائے محصنہ کا عام رواج تھا اس حد تک کہ کوئی بھی اسے معیوب نہیں سمجھتا تھا۔ بعض بیوہ عورتیں جو شریف خاندانوں سے بھی ہوتی تھیں اپنے گھر کی چھت پر ایک جھنڈا نصب کرا دیتی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ گھر والی ہر وقت ہر مرد کی پذیرائی کے لئے تیار ہے۔ جب مسلمانوں نے مکہ کو فتح کر لیا تو فسق و فجور کا مکہ سے خاتمہ ہو گیا۔ حضرت عمر بن الخطاب کے سامنے سے گزرنے اور مسلمان ہونے والیوں میں ہندہ زوجہ ابوسفیان بھی تھی۔ یہ بے رحم ترین دشمن اسلام بالآخر مسلمان ہوئی۔

طبری لکھتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ نے اہل مکہ کی خوشنودی کے خیال سے ملیقہ دختر داؤد لیث سے شادی کی اس کا باپ مکہ کی جانب جنوب میں حضرت خالد بن ولید کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔ طبری نے ایسے اشعار بھی نقل کیے ہیں جن سے اس لڑکی کا نام ملیقہ ثابت ہوتا ہے مگر یہ روایت نہایت ضعیف ہے کیونکہ مورخین اسلام میں سے کسی نے بھی اس کی تائید نہیں کی۔ ملیقہ بنت داؤد لیث کا نام ازواج مطہرات کی فہرست میں ہمیں نہیں ملتا، نہ ہم نے گزشتہ فصلوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ طبری کی یہ تحریر قابل اعتماد نہیں ہے کیونکہ مکہ کی کوئی ملیقہ آپ کے نکاح میں نہیں آئی۔

آپ نے مکہ میں پندرہ روز قیام کیا اس عرصے میں تقریباً تمام اہل مکہ مسلمان ہو گئے۔ اہل مدینہ (انصار) کو آپ کے مکہ میں زیادہ دنوں قیام کرنے سے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ کہیں آپ حب وطن کی وجہ سے یہیں نہ رہ پڑیں۔ آپ نے فرمایا۔ ''میں جب تک زندہ ہوں تمہارے ساتھ زندگی گزاروں گا اور جہاں میں دفن ہوں گا وہیں تم لوگ بھی دفن ہونگے'' پندرہ روز کے بعد آپ نے وہاں سے مراجعت فرمائی اور عازم مدینہ ہوئے تب اہل مدینہ کو جو فکر دامن گیر ہو گئی تھی وہ ختم ہو گئی۔

جنگِ حنین

تسخیر مکہ سے جزیرۃ العرب میں اسلام کی کامیابی پر مہر ثبت ہوگئی کیونکہ مکہ ایک سیاسی مذہبی اور تجارتی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا جب مسلمانوں نے اسے تسخیر کر لیا تو وہ عربستان کے سیاسی مذہبی اور تجارتی مرکز پر متصرف ہو گئے۔ جنوب مکہ میں (جو اسلام سے قبل طائفہ قریش کا شہر کہلاتا تھا) ایک گروہ زندگی گزارتا تھا جسے بنو ہوازن کہتے تھے۔ ان کے چند قبائل تھے یہ قبائل جنوب مکہ کے وسیع علاقے میں سرزمین یمن تک پھیلے ہوئے تھے یعنی جنوبِ مکہ سے لے کر جنوب عربستان کی سرحد یمن، تک آباد تھے۔

یہ بات بہت ہی عجیب تھی کہ دو قومیں یا دو ملتیں ایک جگہ رہیں اور ان میں جنگ نہ ہو اور تعلقات ہمیشہ استوار رہیں۔ بنو ہوازن اور ساکنانِ مکہ کے درمیان بھی کئی بار جنگ ہوئی۔ بنو ہوازن نے کئی بار حرام مہینوں میں اہلِ مکہ پر حملہ کیا۔ اہل عرب، حرام مہینوں کی جنگ کو حرب الفجار کے نام سے یاد کرتے تھے۔

بنو ہوازن اور باشندگان مکہ ایک دوسرے کے جدی دشمن تھے۔ حضرت خدیجہ کے والد اہل مکہ و ہوازن کی جنگ میں مارے گئے تھے اور خود حضرت محمد بھی عنفوان شباب میں اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ بنو ہوازن کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ معلوم ہونا چاہئے کہ ہوازن، ہوزان کی جمع ہے چونکہ بنو ہوازن کے بہت سے قبیلے تھے ان کا ایک قبیلہ بحر ازرق اور صحرائے عربستان کے ایک درمیانی صحرا میں آباد تھا (یعنی حجاز میں) ایک حصہ قبیلہ ثقیف کے نام سے طائف میں سکونت پذیر تھا یہ لوگ شہر نشین شمار ہوتے تھے۔ حضرت محمد کی ایک دایہ جنہوں نے آپ (ﷺ) کو دودھ پلایا تھا بنو ہوازن کی ایک شاخ بنو سعد سے تھیں۔ قبیلہ بنو سعد، بنو بکر، بنو سلیم اور سارے قبائل ہوازن، اسلام اور حضرت محمد (ﷺ) کے ساتھ دشمنی رکھتے تھے۔ ایک عظیم بت لات کا مجسمہ، شہر طائف میں تھا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ طائف وہی شہر ہے جب حضرت محمد کو ان کے قبیلے نے دیس نکالا دے دیا تھا تو وہ یہاں آ کر پناہ گزین ہوئے تھے مگر یہاں کے لوگوں نے آپ کو ٹھہرنے نہ دیا تھا۔

فتح مکہ کے تین دن بعد حضرت محمد نے چند ایک مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اطراف مکہ میں جا

کر بتوں کو توڑ ڈالیں چنانچہ حضرت خالد بن ولید کو حکم دیا کہ وہ نخلہ جا کر بتوں کو توڑ ڈالیں، مشہور عظیم بت عزا، یا عزیٰ کا مجسمہ نخلہ میں تھا۔

بنو ہوازن نے جو یہ دیکھا کہ مسلمان ان کے بتوں کو توڑنے کا عزم رکھتے ہیں تو وہ آمادۂ جنگ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے تمام قبائل کو اطلاع دے دی کہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں چنانچہ بیس ہزار جانباز اپنے فرزند و زن اور چوپاؤں کو لے کر میدان جنگ میں آ گئے۔ یہ لوگ فرزند و زن اور چوپاؤں کو اس لیے لائے تھے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ یا تو فاتح ہوں گے یا مر جائیں گے اور اپنے آپ کو اس بات کا قائل کر دیں کہ یا اپنے مال و دولت سے ہاتھ دھو بیٹھیں، خود مارے جائیں، عورتیں قید ہو جائیں اور مویشیوں کو دشمن لے جائے یا دشمن کو پیچھے ہٹا دیں اور مکہ پر قبضہ کر لیں تاکہ آئندہ مکہ کی طرف سے کوئی تکلیف پیش نہ آئے۔

ایسا کبھی بھی اتفاق نہ ہوا تھا کہ بنو ہوازن شرکت جنگ کے لئے بیس ہزار جانباز میدان جنگ میں لائے ہوں۔ صرف اسی موقعہ پر مکہ پر حملہ کرنے کے لئے وہ بیس ہزار سپاہی لائے تھے۔ جب اہل قریش کو معلوم ہوا کہ بنو ہوازن مکہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو ان کی آخری کدورت بھی مسلمانوں کے دلوں سے نکل گئی اور وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر بنو ہوازن سے جنگ کریں۔

صفوان بن امیہ نے پھر مسلمانوں کو ہتھیار اور نقد رقم دی تاکہ مسلمان بنو ہوازن کے مقابلہ کے لیے خوب تیاری کر سکیں۔ حضرت محمد بارہ ہزار مجاہد لے کر بنو ہوازن کے مقابلہ کے لئے نکلے، ان بارہ ہزار میں سے دو ہزار قریشی تھے جو اپنے جدی دشمن سے مقابلے کے لئے مسلمانوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔

لشکرِ اسلام 30 جون 631ء کو وادیٔ حنین میں رات گزارنے کے لئے ٹھہرا، یہ ایک کوہستانی علاقہ ہے۔ شہر مکہ اور طائف کے درمیان واقع ہے اس کا کچھ حصہ کوہستانی ہے اس کی تنگنائے سے اسلامی لشکر کو گزارنا تھا، طلوع آفتاب کے وقت لشکر اسلام اس تنگنائے سے گزرا اسلامی فوج کا اول دستہ اطمینان کے ساتھ اس درے سے گزر گیا۔ ہراول دستے کے سپہ سالار نے بڑی غفلت سے کام لیا اور اگر وہ کسی ایک آدمی کو بالائے کوہ سے دشمن کو دیکھنے کے لئے بھیج دیتا تو وہ دشمن کو ضرور دیکھ لیتا۔

کہتے ہیں یہ غفلت اس لیے ہوئی کہ مسلمان اپنی طاقت پر مغرور تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ بنو ہوازن کسی صورت بھی انہیں شکست نہیں دے سکیں گے۔ بہر حال ہراول دستہ درے کو عبور کر گیا اور اسے اس بات کا ذرا بھی خیال نہ آیا کہ دشمن کا کھوج لگائے۔ مالک بن عوف نصری، جنگ حنین میں سپاہ ہوازن کا سپہ سالار تھا اس نے ثابت کر دکھایا کہ وہ ایک قابل سپہ سالار ہے۔ اس نے اپنی فوج کو درے کے دونوں طرف پہاڑوں کی پس پشت اس طرح چھپا دیا تھا کہ اسلام کے ہراول دستہ کو پتہ تک نہ چلا کہ دشمن گھات میں ہے۔ جس وقت اسلام کا ہراول دستہ اس تنگنائے کو عبور کر رہا تھا بنو ہوازن کے سپہ سالار نے انہیں دیکھا مگر حملہ کرنے کا حکم نہ دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ دیکھ بھال کے لئے آئے ہیں اس نے اپنے آدمیوں سے کہا ذرا صبر کرو حتیٰ کہ لشکر اسلام درے کے درمیان آ جائے۔ حضرت محمد (ﷺ) اس دن لشکر اسلام کے آخری حصے میں تھے۔ آپ ایک سپید خچر پر سوار تھے جو شہنشاہ حبشہ نے آپ کے لیے ہدیتاً بھیجا تھا جسے شہباء کہتے تھے۔ سفیان بن حرب آپ کے خچر کی لگام تھامے ہوئے تھے اور آگے آگے چل رہے تھے۔

مالک بن عوف سپہ سالار فوج ہوازن اس قدر ٹھنڈے مزاج کا تھا کہ جب اصلی لشکرِ اسلام درے سے گزرنے لگا تب بھی اس نے حملہ کرنے کا حکم نہ دیا۔ جب پورا لشکر درے کے درمیان آ گیا تب اس نے حملہ کا حکم دیا۔ اس کے جاں باز گھات سے نکلے اور انہوں نے تیر و سنگ کی بارش شروع کر دی۔ اس وقت مسلمان راہ پیائی میں مصروف تھے، وہ جنگ کے لیے تیار نہ تھے لہٰذا اس اچانک حملے سے گھبرا گئے۔ لشکر اسلام کے شہسوار دستے نے چاہا کہ جس راہ سے آئے ہیں اسی طرف لوٹ جائیں۔ انہوں نے واپسی کے لئے اپنی باگیں پھیر دیں۔ یہ دیکھ کر لشکر اسلام کے دل ٹوٹ گئے اور سب کے سب بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس واقعہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سورۃ توبہ نمبر 9 آیت 25 میں اس طرح فرماتا ہے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ.

''اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت سے مقامات پر فتح دی یوم حنین میں تمہیں اپنی کثرت پر غرور ہو گیا تھا مگر یہ تمہیں بے نیاز نہ کر سکا (خدائے تعالیٰ سے) اور تم پر زمین باوجود وسعت کے تنگ ہو

گئی پھر تم پشت پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے"۔ (یہ نہ جانتے تھے کہ کدھر جائیں)۔

علمائے اسلام لکھتے ہیں کہ حضرت محمد (ﷺ) نے چھوٹی بڑی اسی (80) لڑائیاں لڑیں اور جیسا کہ اس آیت میں ہے کہ ہر جنگ میں کمک خداوندی مسلمانوں کی فتح کا سبب بنی۔ کثرت افواج باعثِ فتح نہ تھی لیکن جنگ حنین میں مسلمانوں نے دیکھا کہ ہم تعداد میں زیادہ ہیں لہٰذا ہمیں کون شکست دے سکتا ہے، ہماری فتح یقینی ہے وہ یہ بھول ہی گئے تھے کہ مسلمانوں کی فتح امدادِ خداوندی سے ہوتی ہے نہ کہ کثرتِ مجاہدین سے۔ یہی وجہ تھی کہ اگرچہ حنین میں مسلمان پچھلی تمام لڑائیوں کی نسبت سے کثیر تعداد میں تھے لیکن بھاگ کھڑے ہوئے۔

26 ویں آیت میں اللہ تعالیٰ اس طرح فرماتا ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ.

"پھر اللہ نے اپنے رسول اور مسلمانوں پر تسکین اتاری اور نامعلوم لشکر اتارے۔ اور کافروں کو عذاب دیا کافروں کی یہی سزا ہے۔"

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور مسلمانوں کے لئے سامان تسکین مہیا فرمایا، جس سے ان کی روح قوی ہوگئی وہ روحانی طاقت کیا تھی ایک نہ دکھائی دینے والا لشکر تھا کہ اللہ نے اپنے پیغمبر اور مسلمانوں کے لئے بھیجا جس کی وجہ سے وہ نیست و نابود ہونے سے بچ گئے۔ اللہ تعالیٰ کافروں کو عذاب سے دوچار کرتا ہے اور کافروں کی یہی سزا ہوتی ہے۔

حضرت محمد نے دیکھا کہ لشکر اسلام بھاگ رہا ہے تو اپنے خچر سے اتر پڑے اور اس کی بھاگ سفیان بن حرب کے ہاتھ میں دے کر ایک چٹان پر کھڑے ہو کر پکارنے لگے۔

"کہاں جا رہے ہو؟ کیا مجھے دیکھ نہیں رہے ہو؟ میں رسول خدا ہوں میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔ اے مہاجرو! اے انصاریو! اے وہ لوگو! جو حدیبیہ میں میرے اردگرد جمع تھے بھاگو نہیں میرے پاس آؤ"۔

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ حضرت عباس چچا بلند آواز والے تھے وہ رسول خدا کے فرمان کا تکرار کر رہے تھے۔ آپ کی استقامت اور پامردی نے بھاگنے والوں کے قدم جما

دیئے۔ وہ سب آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ آپ نے حکم دیا کہ سب کے سب اس درے سے نکل جائیں اور درے کے اس جانب صحرائے اوطاس میں جمع ہو جائیں۔

مسلمانوں نے ایسا ہی کیا چونکہ بنو ہوازن کے چوپائے عورتیں اور بچے سب کے سب مقام اوطاس میں جمع تھے، لہٰذا مسلمان انہیں اپنے زیر تصرف لے آئے۔ بنو ہوازن نے چاہا کہ درے میں مسلمانوں کو روک لیں لیکن چند مسلح مجاہدوں نے ان کے کئی آدمی مار گرائے تو باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب ان کی عورتیں، بکریاں اور اموالِ مسلمانوں کے ہاتھ آ گئے تو رسول اللہ نے حکم دیا کہ انہیں مقام جعرانہ میں لے جائیں اور قیدیوں کے لئے کپڑا اور کھانا مہیا کریں۔ یہ مکہ سے شمالی جانب پندرہ کلومیٹر سے کچھ زائد فاصلے پر تھا۔

طائف پر حملہ

جب جنگ حنین خیریت سے ختم ہو گئی تو حضرت محمد نے طائف پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ طائف کے دو حصار تھے۔ اہل طائف کو مسلمانوں کی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے شہر کے دروازے بند کر لئے۔ حصارِ شہر کے توڑنے کے لئے مسلمانوں نے منجنیق کا سہارا لیا اس کے علاوہ حضرت سلمان فارسیؓ کی حسب ہدایت مسلمانوں نے ایک جنگی گاڑی بنائی۔ سلمان فارسیؓ وہی ایرانی ہیں جن کی تجویز پر مدینہ کے ارد گرد خندق کھودی گئی تھی اور قریش کا لشکر شہر کے اندر داخل نہ ہو سکا تھا۔ وہ جنگی (بکتر بند) گاڑی ایک بڑے کچھوے کے مشابہ تھی جس کے ذریعہ مسلمان شہر کے دروازے کے قریب شہر والوں کے تیر و سنگ سے محفوظ رہ کر بے خوف و خطر پہنچ سکتے تھے۔

غزوہ حنین کی فتح کے بعد مسلمانوں کے حوصلے بہت بلند ہو گئے تھے وہ بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے وہ اتنا تو کر سکے کہ جنوب شہر میں مالک بن عوف کے گھر کو برباد کر دیں جو جنگ حنین میں سپہ سالار ہوازن تھا مگر طائف کو فتح نہ کر سکے۔ پیغمبر اسلام نے وعدہ کیا کہ اگر اہل طائف سر تسلیم خم کر دیں گے تو انہیں کوئی کچھ نہ کہے گا مگر اہل طائف میں سے صرف اسی (80) آدمی حاضر خدمت ہوئے جو بعد ازاں داخل اسلام ہوئے۔ طائف چالیس دن مسلمانوں کے زیر محاصرہ رہا۔ جب فتح ہوتے نہ دیکھی تو حضرت محمد نے سپہ سالاری ایک دوسرے شخص کے سپرد کر دی اور خود جعرانہ تشریف لے گئے تاکہ مال غنیمت کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیں۔ مال

کے علاوہ چھ ہزار جنگی قیدی بھی تھے مسلمانوں کے درمیان تقسیم ہوئے۔

حضور کا رضاعی قبیلہ

شمہ، نامی ایک قیدی عورت نے حضرت محمد کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ''میں آپ کی رضاعی بہن ہوں جس زمانے میں آپ حلیمہ سعدیہ کا دودھ پیتے تھے میں بھی پیتی تھی'' پھر اس نے اپنے ہاتھ کا پرانا زخم آپ کو دکھایا اور کہا، جب ہم دونوں چھوٹے تھے تو آپ نے میرا ہاتھ کھیل کھیل میں زخمی کر دیا تھا، اس کا نشان اب تک باقی ہے لہٰذا آپ کو مجھے مسلمانوں کی کنیز نہ بنانا چاہئے'' آپ نے فرمایا، ''اے شمہ! کیا تو یہ پسند کرتی ہے کہ اسلام لے آئے اور آزادانہ زندگی بسر کرے'' اس نے کہا، ''نہیں اے محمد میں تو آزادی اسے سمجھتی ہوں کہ صحرا میں زندگی گزاروں اور دیہات میں رہوں'' رسول اللہ نے فرمایا، ''میں تجھے آزاد نہیں کر سکتا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ تو مال غنیمت میں میرے حصہ میں آئے چونکہ میری کنیز بن جائے گی لہٰذا میں تجھے آزاد کر دوں گا'' اسی طرح کیا گیا، شمہ مال غنیمت میں شمار ہو کر آپ (ﷺ) کے حصے میں آ گئی اور آپ نے اسے آزاد کر دیا۔ پھر اس نے کہا، میرا شوہر بھی قیدی ہے، قانون جنگ کے مطابق وہ غلام بنے گا۔ میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ اسے بھی آزاد کر دیں'' رسول اللہ نے پھر مسلمانوں سے فرمائش کی کہ اس کے شوہر کو میرے مال غنیمت میں شامل کر دیں۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا تو آپ نے اس کے شوہر کو بھی آزاد کر دیا۔ جب بنو ہوازن کے لوگوں نے دیکھا کہ شمہ اور اس کا شوہر آزاد ہو گیا ہے تو انہوں نے چند افراد کو نمائندہ بنا کر حضور کی خدمت میں بھیجا اور کہا، ''کہ آپ کی دایہ حلیمہ ہوازن کے قبیلے سے تھی لہٰذا ہم سب آپ کے رضاعی بھائی بہن ہیں آپ کو چاہئے کہ فدیہ لئے بغیر ہمیں آزاد کر دیں تا کہ اپنے گھروں کو واپس جا سکیں۔''

آپ نے فرمایا، ''میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ تم لوگ مسلمانوں کے درمیان تقسیم ہو چکے ہو'' بنو ہوازن کے نمائندے کہنے لگے، ''کیا آپ اس بات کو گوارا کریں گے کہ آپ کے رضاعی بھائی بہن غلام اور کنیز بنیں'' آپ نے فرمایا، ''میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ جو غلام و کنیز میرے حصے میں آئے ہیں، میں انہیں آزاد کر دوں، اس کے سوا میں کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ باقی کنیز و غلام دوسروں کے حصے میں آئے ہیں، ان کا انہی کو اختیار ہے۔''

حضرت محمد نے اپنے وعدے پر عمل کیا، جتنے بھی غلام وکنیز آپ کے حصے میں آئے تھے آزاد کر دیئے۔ حضرت علی بن ابی طالب نے بھی فوراً اپنے حصے کے غلام وکنیز آزاد کر دیئے۔ ابوبکر وعمر حاضر مجلس تھے انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ جب باقی مسلمانوں نے یہ دیکھا کہ بزرگان اسلام نے اپنے اپنے غلام وکنیز آزاد کر دیئے ہیں تو انہوں نے بھی ایسا ہی کیا مگر بنو ہوازن کے اموال انہیں واپس نہ کیے۔

بنو ہوازن نے جو مسلمانوں کی یہ سخاوت وجواں مردی دیکھی تو وہ مسلمان ہو گئے اور کلمۂ شہادت بلند آواز سے پڑھتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ ان آزاد ہونے والوں میں مالک بن عوف سپہ سالار فوج ہوازن بھی تھا اسے اس کا تمام مال ومتاع بھی واپس مل گیا کیونکہ وہ حضرت محمد کے حصے میں آیا تھا۔ وہ بھی اسی وقت مسلمان ہو گیا۔ بعدازاں وہ اسلام کے بڑے خادموں میں سے شمار ہوئے۔ جب اس طرح قیدیوں اور اموال بنی ہوازن کی تقسیم انجام کو پہنچی تو حضرت محمد طائف کی طرف لوٹے کہ دیکھیں محاصرے کی کیا حالت ہے۔ محاصرہ میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ لشکر اسلام کا وہ حصہ جو طائف میں رہا اور جعرانہ نہ جا سکا، طائف کو فتح نہ کر سکا مگر چونکہ قبائل ہوازن اسلام لا چکے تھے لہٰذا شہر طائف مسلمانوں کے لئے خطرناک نہ رہا تھا کیونکہ وہ ایک جزیرے کی طرح تھا جو ہر طرف سے مسلمانوں کے گھیرے میں تھا حضرت محمد یہ جانتے تھے کہ اگر چھوٹا سا لشکر بھی طائف کا محاصرہ کیے رہا تو طائف بھوک کی وجہ سے سر تسلیم خم کر دے گا لہٰذا ابوسفیان کو ایک چھوٹا سا لشکر دے کر اس کے محاصرے کے لئے چھوڑ دیا اور خود تمام مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی طرف لوٹ گئے۔

مدینہ واپسی

جب رسول اللہ مکہ سے واپس تشریف لانے لگے تو ان مسلمانوں نے، جو مدینہ کے باشندے (انصار) تھے کہا کہ رسول اللہ نے بنو ہوازن کے مال غنیمت سے بہ نسبت ہمارے، قریش کو زیادہ حصہ دیا ہے۔ یہ بات صحیح تھی اس موقع پر حضرت محمد نے قریشیوں کو زیادہ حصہ دیا تھا مگر جانبازان انصار کا حصہ چھین کر قریشیوں کو نہیں دیا تھا۔ قانون جنگ کے مطابق مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ رسول اللہ اور ان کے عزیزوں کو ملنا چاہیے تھا۔ پیغمبر اسلام اپنا حصہ ہمیشہ

دوسروں کے درمیان تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ آپ نے اپنا حصہ قریشیوں کو دے دیا تھا تاکہ وہ خوش ہو جائیں۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ چونکہ قریش نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں لہٰذا ان کی تالیفِ قلوب کریں تاکہ وہ خوش رہیں۔ انصار کو ایسی شکایت کرنے کا حق نہیں پہنچتا تھا۔ اس کے باوجود رسول اللہ نے ان سے فرمایا، تمہیں جانبازانِ قریش کے حصے کی فراوانی پر ناراض نہیں ہونا چاہئے کیونکہ وہ تو مکہ ہی میں زندگی گزاریں گے اور میں تمہارے ساتھ مدینہ میں رہوں گا اور تم ہی میں زندگی گزاروں گا، کیا تمہارے لئے اونٹ یا بکری کا ہاتھ لگ جانا بہتر ہے یا اپنے پیغمبر کے ساتھ زندگی گزارنا۔ تم جانتے ہو کہ پیغمبر اسلام کے ساتھ زندگی گزارنا کتنی بڑی فضیلت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف تمہیں ہی نہیں بلکہ تمہاری اولاد کو بھی شاملِ رحم کرے گا۔ انصار آپ کی زبان مبارک سے یہ کلمات سن کر بہت شرمندہ ہوئے اور عرض کرنے لگے۔ ''یا رسول اللہ ہم نے جو کچھ کہا اس کا ہمیں سخت افسوس ہے'' اور بعض انصاری رونے لگے۔

اس کے چند روز بعد آپ حسب وعدہ انصاریوں کے ساتھ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ انصار اس قدر خوش ہوئے کہ روانگی کے وقت بلند آواز سے لا الہ الا اللہ کے نعرے بلند کرتے جاتے تھے اور شعر گاتے جاتے تھے۔ مکہ سے مدینہ کی طرف لوٹتے وقت آپ نے ایک نوجوان کو جو بنو امیہ (قبیلہ ابوسفیان) سے تھا اور ابھی تیس سال کا بھی نہ ہوا تھا، مکہ میں اپنا نائب بنایا اور مسلمانانِ مکہ کے تمام معاملات اس کے سپرد کر دیئے۔

وفود کی آمد

مدینہ واپس آئے ابھی چند دن گزرے تھے کہ اہل طائف کی طرف سے ایک وفد آپ (ﷺ) کی خدمت میں آیا۔ انہوں نے عرض کی، ''کہ باشندگانِ طائف اسلام لانے کے لئے تیار ہیں۔ اس طرح پر کہ آپ انہیں آزاد قرار دیں یعنی وہ حسب سابق زنا، شراب، سود اور تمام نشہ آور چیزیں استعمال کرتے رہیں'' آپ نے ان کی یہ درخواست نہ مانی، فرمایا: ''اسلام میں زنا، سود اور نشہ آور چیزیں حرام ہیں'' یہ وفد واپس چلا گیا اور اہل طائف سے گفت و شنید کر کے پھر واپس لوٹا اور عرض کرنے لگا۔ ''اہل شہر زنا، سود اور شراب خوری ترک کرنے کے لئے تیار ہیں مگر یہ چاہتے ہیں کہ آپ انہیں جہاد، روزہ اور زکوٰۃ سے مستثنیٰ فرما دیں'' معلوم ہونا چاہئے کہ

صدر اسلام میں ہر مسلمان مرد پر بوقت جنگ جہاد میں شرکت کرنا فرض تھا۔ اب بھی ہر مسلمان پر جہاد فرض ہے مگر بیمار اور ضعیف مستثنیٰ ہیں۔ حضرت محمد نے ان کی یہ دوسری درخواست وقتی طور پر قبول کر لی اور جہاد، زکوۃ اور روزے سے "معافی" دیدی۔ مسلمانوں نے آپ سے دریافت کیا یہ باتیں واجبات اسلام کا حصہ نہیں ہیں۔ آپ نے جواب دیا انہیں اسلام تو قبول کر لینے دو، وہ تمام واجبات خود بخود ادا کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اسلام قبول کر لینے کے بعد اور آپ کی وفات سے بہت پہلے وہ حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا ہم بخوشی جہاد کے لئے تیار ہیں۔ روزے بھی رکھیں گے اور زکوۃ بھی ادا کریں گے۔

(نوٹ از مولف: کونسٹن جورجیو کے بیان کردہ اس واقعے کا ماخذ نہیں مل سکا ہے۔ فاضل مصنف نے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے وہ انتہائی قدیمی ہیں اور ہماری دسترس سے باہر ہیں)

اندازہ کیجئے یہی اہل طائف تھے جنہوں نے 10 برس قبل حضور پر اتنا شدید پتھراؤ کیا تھا کہ آپ کے نعلین مبارک خون سے بھر گئے تھے۔ بالآخر سب حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ یہی مکہ تھا جہاں سے 9 سال پہلے قتل کر دیئے جانے کی سازش سے بچنے کی خاطر آپ حضرت ابوبکر کے ساتھ مدینہ روانہ ہوئے تھے اور ایک ایسے غار میں پناہ گزیں ہوئے جس میں سانپ ہی سانپ تھے اور قریش نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو شخص بھی حضرت محمد کو زندہ یا مردہ لائے گا اسے ایک سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے اور 9 برس بعد آپ اس قابل ہو گئے تھے کہ مکہ کو تسخیر کر سکیں، وہ تمام افراد جو آپ کے دشمن تھے اور آپ کو قتل کرنا چاہتے تھے سب کے سب اسلام کے فدائی بن چکے تھے حتیٰ کہ عکرمہ بن ابی جہل بھی جو آپ کے قتل کرنے کے درپے تھے مسلمان ہوئے اور میدان جنگ میں شہید ہو گئے۔ ابوسفیان، سپہ سالار لشکر مکہ جنگ احد و خندق میں آپ کے ساتھ برسرپیکار رہا، بالآخر مسلمان ہوا اور پیغمبر اسلام نے اسے نجران کا حاکم مقرر کیا۔ خالد بن ولید مشرکوں کے بڑے سرداروں میں سے تھے پھر اسلام کے بڑے سرداروں سے ہوئے اور سیف اللہ کا لقب پایا۔

نویں سال ہجری میں حضرت محمد نے نہ صرف مکہ کو فتح کیا بلکہ تمام جزیرۃ العرب کو تابع فرمان کر لیا یعنی سارا جزیرۃ العرب مسلمان ہو گیا یا مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ اگر ہم عربستان کی وسعت پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ پیغمبر اسلام اول سال ہجرت سے دسویں سال تک اوسطاً

822 کلومیٹر مربع زمین عرب کو اسلام کے زیر اقتدار لائے۔ ابتدائے اسلام میں مسلمان اس قدر غریب تھے کہ پہلی تین لڑائیوں میں دو غازیوں کے پاس ایک اونٹ تھا۔ جنگ بدر میں مجاہدین اسلام صرف تین سو تیرہ تھے اور گھوڑے صرف دو عدد تھے۔ لیکن اس کے بعد مسلمان اس قدر طاقتور ہو گئے تھے کہ جنگ حنین میں مسلمانوں کے پاس ہزار گھوڑے تھے اور جنگ تبوک میں دس ہزار تک پہنچ گئے۔

سب سے پہلی بار مسلمان مقام نخلہ میں چار آدمیوں کے ساتھ لڑے۔ دوسری جنگ میں (جنگ بدر میں) مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی، جنگِ احد میں سات سو مگر جنگ تبوک میں مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار تھی۔ ان لڑائیوں میں مسلمانوں کا بہت کم نقصان ہوا، البتہ بعض غزوات میں نقصان زیادہ ہوا لیکن اگر اس وسیع اراضی کو دیکھا جائے جو مسلمانوں کے قبضے میں آئی تو یہ نقصان زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

ہجرت کے نویں سال حضرت محمد کی طبیعت ناساز رہی اور وہ مدینہ میں قیام پذیر رہے۔ اس سال آپ ان شہروں کے سفیروں سے ملاقات کرنے میں مشغول رہے جو اسلام کی زیر سیادت آ گئے تھے عربی زبان میں وفد نمائندوں یا سفیروں کی جماعت کو کہتے ہیں اس کی جمع وفود ہے نواں سال ہجری چونکہ سفیروں کی آمد کا سال تھا لہٰذا عام الوفود کہلایا۔ گو حضرت محمد پورے جزیرۃ العرب کے رئیس نظامی، سیاسی اور مذہبی تھے مگر سفیر آپ کو اس حالت میں دیکھتے کہ کھجور کے پتوں کے بوریئے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور گھر کا اثاثہ بھی وہی تھا۔ جب کوئی سفیر آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تو پہلے بلال حبشی اس سے ملتے اور اسے اس کمرے میں لے جاتے جہاں آپ تشریف فرما ہوتے۔ یہ سفیر، رملہ بنت حارث کے گھر ٹھہرائے جاتے۔ یہ محلہ بخاریہ میں ایک مکان تھا جو سفیروں کے قیام کے لئے مخصوص تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ بہت سارے سفیر آ جاتے جو اس مکان میں نہ ٹھہر سکتے تو مسجد نبوی میں آپ کے حکم سے خیمہ لگا دیا جاتا جہاں یہ لوگ قیام پذیر رہتے۔

گو ہجرت کے نویں سال سارے جزیرۃ العرب میں اسلام پھیل گیا تھا۔ لیکن حضرت محمد نے یہودیوں اور عیسائیوں کو داخل اسلام ہونے پر مجبور نہ کیا کیونکہ دونوں اہل کتاب تھے۔ اس خط سے جو حضرت محمد نے نجران کے پادری ابوالحارث کو لکھا تھا، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عربستان

میں اسلام کے بعد عیسائیوں کی کیا حالت تھی، اس نامہ مبارک میں آپ لکھتے ہیں۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، پیغمبر اسلام کی طرف سے ابوالحارث نجران کے بڑے پادری اور وہاں کے تمام چھوٹے بڑے پادریوں کے نام: اما بعد، نجران کے بڑے پادری اور دوسرے چھوٹے بڑے پادریوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے کلیسا، عبادت خانے اور خانقاہیں جو ان کی زیر نگرانی ہیں سب کے سب ان ہی کی نگہداشت میں رہیں گے۔ خدا اور اس کا پیغمبر انہیں اپنی نگرانی میں لیتا ہے اس لیے پیغمبر خدا کہتا ہے کوئی چھوٹا، بڑا پادری اپنے منصب سے برطرف نہیں کیا جائے گا۔ ان کے حقوق و منزلت کا احترام کیا جائے گا کوئی تغیر نہیں کیا جائے گا، کسی مذہبی رسم کو نہیں بدلا جائے گا۔ جب تک کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیتے رہیں گے ان کے حقوق کا احترام کیا جائے گا۔ ان سے کوئی مزاحمت نہیں کی جائے گی۔ انہیں بھی چاہئے کہ کسی کے ساتھ مزاحمت نہ کریں''۔

اس نامہ مبارک سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائی اور اسی طرح یہودی جزیرۃ العرب میں اپنے مذہبی وظائف کی انجام دہی میں بالکل آزاد تھے، کوئی مسلمان ان سے تعرض نہ کرتا تھا۔

نویں سال ہجری میں ایک سفارت، نجران کے عیسائیوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں مدینہ آئی، اس وفد کے بڑے بڑے لوگ یہ تھے۔ (1) ابوالحارث، نجران کا سب سے بڑا پادری (2) عبدالمسیح، پادری اور (3) ایہم، رئیس قافلہ، مدینہ میں پہنچنے پر ان پادریوں نے اپنا رسمی مذہبی لباس پہنا ہوا تھا۔ مدینہ کے باشندے حیرت سے ان کی زرق برق لباسوں کو دیکھ رہے تھے۔

جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو انہوں نے حضرت محمد سے اجازت چاہی کہ ہمیں اپنی مذہبی عبادت کی اجازت دی جائے، پیغمبر اسلام نے فرمایا، مسجد نبوی میں جا کر عبادت کر دیہ لوگ مسجد میں گئے اور مشرق (بیت المقدس) کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد عیسائیوں کا احترام کرتے تھے کیونکہ قرآن عیسائیوں کو محترم گردانتا ہے۔ قرآن کی پانچویں سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 82 تا 85 تک عیسائیوں کو قابل احترام قرار دیا ہے۔

آیت نمبر 82 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا وَ لَتَجِدَنَّ

أَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ.

"تم مسلمانوں سے زیادہ عداوت رکھنے والے یہودی اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا ہم نصاریٰ میں یہ اس لیے کہ ان میں دانشمند اور زاہد لوگ ہیں اور وہ تکبر و نخوت نہیں رکھتے"۔

اسی سورۃ مائدہ کی آیت نمبر 83 میں اللہ تعالیٰ عیسائیوں کی اس طرح تعریف کرتا ہے:

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ.

"جب وہ سنتے ہیں جو کچھ رسول کی طرف اتارا گیا ہے تو تم ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھو گے کیونکہ وہ حق کو پہچانتے ہیں کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے ہیں ہمیں گواہی دینے والوں میں لکھ لے"۔

آیت نمبر 84 میں پھر اللہ تعالیٰ عیسائیوں کے بارے میں فرماتا ہے۔

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ.

"ہم کیوں اللہ پر اور حقانیت پر ایمان نہ لائیں اور کیوں نہ طمع کریں کہ اللہ ہمیں صالح قوم کے ساتھ شامل کر دے"۔

اسی سورۃ کی آیت 85 اس طرح ہے۔

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ.

"اللہ نے ان کی ان باتوں کی وجہ سے انہیں بہشتیں دیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بدلہ ہے نیکو کاروں کا"۔

میرے خیال میں قرآن میں جو یہ آیتیں عیسائیوں کی توصیف میں ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عیسائی بادشاہ حبشہ نے مسلمانوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمدؐ آخری لمحات حیات تک عیسائیوں سے خوش رہے۔ (یہ فاضل مصنف کی

ذاتی رائے ہے جو اس نے اپنے مطالعہ تاریخ کی بنا پر قائم کی ہے (مؤلف)

نویں سال ہجری مطابق 631ء میں بت پرست بھی مسلمانوں کے ساتھ خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے گئے مگر یہ آخری سال تھا کہ بت پرستوں نے مسلمانوں کے ساتھ خانہ کعبہ کی زیارت کی۔ نویں سال ہجری کے بعد اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو خانہ کعبہ کی زیارت سے روک دیا۔ قرآن کی نویں سورۃ کی اٹھائیسویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے بت پرستوں کے بارے میں صاف صاف کہہ دیا ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَـٰذَا. (الٰی آخر الآیۃ)

''اے ایمان والو! مشرک نجس ہیں وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ جائیں''۔ (آخر آیت تک)

دسویں سال ہجری میں جب کہ زیارت خانہ کعبہ مشرکوں کے لئے ممنوع ہوئی، حضرت محمد (ﷺ) چودہ ہزار مسلمانوں کو ہمراہ لے کر زیارت کعبہ کی غرض سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس سال پیغمبر اسلام (ﷺ) نے بطور کامل تمام مناسک حج پورے کیئے، اسی لیے اس سال جو کچھ آپ نے کیا سنت قرار پایا۔ آج تک مسلمان اسی طرح کرتے ہیں۔ میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس سال سے پیشتر پیغمبر اسلام، زیارت کعبہ کے لیے مکہ تشریف نہیں لے گئے تھے ہجرت کے آٹھویں سال بھی بحالت جنگ مکہ گئے اس سے پہلے ایک بار جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں آپ کچھ مسلمانوں کے ساتھ خانہ کعبہ کی زیارت کو گیے تھے مگر تمام مناسک حج کو ادا نہ کر سکے تھے۔

اس سے پہلے آپ سات سال مدینہ میں رہے اور مکہ نہ جا سکے، نہ زیارت کعبہ کر سکے۔ بہر حال اس سال آپؐ نے تمام مناسک حج کو پورا کیا۔ احرام باندھا اور سات بار طواف کعبہ کیا اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑے (سعی کی) یہ سعی حضرت ہاجرہ علیہا السلام والدہ ماجدہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی یادگار میں ہے کہ وہ پانی کی تلاش میں صفا و مروہ کے درمیان دوڑی تھیں۔ جو لوگ آپ کے ساتھ زیارت کعبہ کے لئے گیے تھے۔ آپ (ﷺ) نے انہیں جبل الرحمتہ پر جمع کیا تاکہ ان کے ساتھ باتیں کریں۔ یہ پہاڑ مقام عرفات میں واقع ہے۔ اس بار سوائے مسلمانوں کے کوئی غیر مذہب والا حاجی نہ تھا۔

خطبہ حجتہ الوداع......ایک تاریخی اعلان

حضرت محمد (ﷺ) یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ بات چیت کریں یا بقول مؤرخینِ عرب خطبہ دینا چاہتے تھے مگر اتنے بڑے مجمع میں آپ کی آواز سب کو نہ پہنچ سکتی تھی لہٰذا آپ نے کچھ کچھ فاصلے پر ایسے لوگ مقرر کیے جن کی آوازیں بلند تھیں تاکہ وہ آپ کی آواز کو دھرائیں اور تمام مسلمان آپ کا خطبہ سن سکیں۔ بعد ازاں مسلمان اس خطبے کو خطبہ الوداع سے تعبیر کرنے لگے، آواز اٹھانے والوں میں ایک تو مشہور مؤذن اسلام، بلال حبشی تھے اور دوسرے ربیع بن امیہ تھے ان کی آواز بھی خوب بلند تھی۔ اس سے پیشتر کہ آپ خطبہ ارشاد فرمائیں، آپ نے حاضرین سے دریافت کیا: ''جانتے ہو یہ کونسا مہینہ ہے؟'' لوگوں نے عرض کی ''یہ ماہ ذی الحجہ و ماہ حرام ہے'' اس کے بعد آپ نے پوچھا، ''یہ سرزمین کون سی ہے؟'' لوگوں نے کہا، یہ عرفان کی سرزمین ہے۔ تب آپ نے خطاب شروع کیا، پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی پھر ہر دو کلمہ شہادت پڑھے، اس کے بعد فرمایا:

''اے امت خدا! میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا سے ڈرو، اس کی اطاعت کرو، میں جو کچھ کہتا ہوں، اسے قبول کرو، شاید ایسا موقعہ پھر نہ آئے کہ میں یہاں مسلمانوں کے ساتھ اتنے بڑے مجمع میں شرکت کروں، مجھے معلوم نہیں کہ آئندہ کبھی ایسا ہو سکے گا کہ یہاں آؤں اور آپ سے ہمکلام ہو سکوں۔ اے لوگو! اگر تم خدا سے ڈرتے رہے اور اس کی فرماں برداری کرتے رہے تو تمہاری جان و مال اور تمہاری حیثیت ہر اعتبار سے محفوظ رہے گی حتیٰ کہ ایک دن تمہیں اپنے پاس بلا لے گا جس کے ہاتھوں میں تمہاری جان ہے'' اس کے بعد آپ نے موضوع خطبہ کو تبدیل کر دیا اور فرمایا، ''کیا میں نے پیغمبری کا حق ادا کر دیا ہے یا نہیں؟ اے خدا! تو ہی بتا کہ میرے ذمہ جو خدمت لگائی تھی میں نے اسے پورا کر دیا یا نہیں؟'' لوگ پکارے ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ

نے اپنا فرض ادا کیا ہے" اس کے بعد آپ نے فرمایا، "اے لوگو! میں جو کچھ کہتا ہوں اسے قبول کرو اور اس پر کاربند ہو جاؤ میری نصیحت یہ ہے:

☆ جس کسی نے کسی شخص سے امانت لی ہے اس امانت کو اسی طرح واپس کرے جیسے لی تھی، امانت میں خیانت نہ کرے۔

☆ اے لوگو! سود سے بچو۔ دور جاہلیت کی سود خوری اسلام میں ممنوع ہے البتہ تمہارا راس المال تمہارے لیے حلال ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سود خوری نہ کرو، میں سب سے پہلے جس شخص کو سود خوری سے روکتا ہوں وہ میرے چچا عباس بن عبدالمطلب ہیں۔ ان کے تمام سودی مطالبات آج سے کالعدم ہیں۔

☆ اے لوگو! اگر کوئی شخص قتل کرے گا تو اس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا، البتہ اگر قتل قصداً واقع نہیں ہوا اور کسی لکڑی یا پتھر سے مقتول مارا گیا، تو قاتل کو ایک سو اونٹ بطور دیت دینے چاہئیں، قاتل سے ایک سو اونٹوں سے زیادہ کا مطالبہ نہ کرو، اگر کوئی شخص اس سے زیادہ کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ رسم جاہلیت کی پیروی کرتا ہے۔

آپ نے فرمایا، "کیا میں اپنا فرض منصبی ادا کر چکا ہوں یا نہیں؟ اے خدا تو ہی بتا، آیا میں اپناوہ فرض ادا کر چکا ہوں جو تو نے میرے سپرد کیا یا نہیں؟" لوگوں نے پھر بلند آواز سے کہا، "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے" بعد ازاں فرمایا، "اے لوگو! شیطان کو بڑا غصہ ہے اس بات پر کہ تمہاری سرزمین میں یعنی سرزمین اسلام میں اس کی کوئی بھی پرستش نہیں کرتا مگر وہ یہ کوشش برابر کرتا رہے گا کہ دوسرے مقامات پر پوجا جائے"۔

"وہ جانتا ہے کہ اسے اتنی قدرت نہیں ہے کہ تمہارے مذہبی معاملات میں مداخلت کرے مگر وہ تمہارے غیر مذہبی اور فروعی مسائل میں دخل دینا چاہتا ہے اس سے پرہیز کرو، اپنے چھوٹے چھوٹے اور غیر اہم کاموں میں بھی دخل نہ دینے دو تا کہ کسی جگہ بھی اس کا نفوذ نہ ہو سکے اور تمہارے مذہب میں دخل اندازی نہ کر سکے۔"

"اے لوگو! حرام مہینوں میں کسی حلال مہینے کو داخل کر دینا، بے ایمان لوگوں کی ایک بدعت ہے۔ چونکہ یہ لوگ ایمان نہ رکھتے تھے لہٰذا اس بدعت سے گمراہ ہو گئے، وہ ایک سال میں ایک حرام مہینہ شمار کرتے اور اس کی جگہ حلال مہینہ لے آتے پھر اگلے سال اس حرام مہینے کو

شامل کر لیتے تھے۔ اسلام میں مہینوں کی وہی ترتیب ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہے اور کتاب الٰہی میں ذکر ہوئی ہے یعنی بارہ مہینے۔ جس دن سے اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے، سال بارہ ماہ کا رہا ہے۔ ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرام مہینوں کے ہیں، ان چاروں میں سے تین لگاتار ہیں یعنی ذی قعدہ، ذی الحجہ اور چوتھا مہینہ رجب کا ہے جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان ہے''۔

''اے لوگو! اب میں تمہاری عورتوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، تمہاری عورتیں تم پر حق رکھتی ہیں اور تم ان پر حقوق رکھتے ہو۔ ان کا یہ فرض ہے کہ وہ تمہارے علاوہ کسی کو حریم میں نہ آنے دیں اور جن لوگوں سے تمہیں محبت نہیں ہے انہیں گھروں میں نہ گھسنے دیں۔ اگر وہ ان باتوں پر عمل نہیں کرتیں تو اللہ کی طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ ان سے اپنے بستر علیحدہ کر لو۔ انہیں مارو۔ اگر وہ تمہاری اطاعت کرتی ہیں اور اپنا فرض ادا کرتی ہیں تو انہیں مناسب کھانا کپڑا دو، تمہیں چاہئے کہ اپنی عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو کیونکہ وہ تمہارے گھروں میں قید ہیں اور کوئی اختیار نہیں رکھتی ہیں۔ ایک ایسا قیدی جو کوئی اختیار نہ رکھتا ہو، محبت کے برتاؤ کا مستحق ہے۔ تمہاری عورتیں امانت ہیں جو خدا کی طرف سے تمہارے سپرد کی گئی ہیں تم کو اللہ کے نام پر ان کے پاس جانا چاہئے یعنی قانون اسلام کے مطابق ان سے شادی کرنی چاہئے۔ خدا سے ڈرو۔ اپنی عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو''۔

ایک بار پھر آپ نے فرمایا، ''کیا میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں یا نہیں؟ اے خدا! تو ہی بتا کہ جو فریضہ تو نے میرے سپرد کیا تھا وہ انجام کو پہنچ گیا یا نہیں؟'' لوگوں نے کہا، ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا''۔

بعد ازاں آپ نے فرمایا: ''اے لوگو! جو نئے داخل اسلام ہوئے ہیں، وہ تمہارے بھائی ہیں ایک بھائی دوسرے بھائی کے مال کی حفاظت کرتا ہے، کوئی مسلمان کسی مسلمان کے مال میں بغیر اس کی رضا مندی کے تصرف نہیں کر سکتا۔ اے لوگو! میری رحلت کے بعد کہیں ایک دوسرے کے دشمن نہ ہو جانا اور ایک دوسرے کی گردن نہ مارنے لگنا، اخوت اسلامی کی حفاظت کرنا، میں جا رہا ہوں اب تمہارے درمیان نہیں رہوں گا، میری وفات کے بعد کتاب اللہ اور سنتِ پیغمبر (ﷺ) تمہاری رہنما رہنی چاہئیں۔ وہ تمہیں گمراہی سے محفوظ رکھیں گی۔ کیا میں اپنے

فریضے کو انجام دے سکا ہوں یا نہیں؟ اے خدا! تو ہی بتا کہ آیا جو کام تو نے میرے سپرد کیا تھا انجام کو پہنچ گیا ہے یا نہیں؟'' لوگ پکارے، ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اپنے فریضہ کو انجام دے دیا ہے''۔

حضرت محمد نے پھر فرمایا، ''اے لوگو! تمہارا خدا ایک ہے، تمہارا دادا سب کا ایک ہی انسان تھا۔ آدم خاک سے پیدا ہوا تھا لہٰذا تم سب کا اصلی خمیر خاک ہے، کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں ہے، خدا کے نزدیک اس شخص کو دوسرے پر فضیلت ہے جو اس سے ڈرتا ہے، معلوم ہونا چاہئے کہ کوئی عرب یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ غیر عرب پر فضیلت رکھتا ہے، صرف وہ لوگ جو متقی ہیں دوسروں پر ترجیح رکھتے ہیں'' ایک بار پھر آپ نے فرمایا، ''کیا میں اپنا فریضہ انجام کو پہنچا سکا ہوں؟'' لوگوں نے کہا، ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اپنا فریضہ انجام کو پہنچا دیا ہے۔''

پھر فرمایا، ''اے لوگو جو یہاں موجود نہیں ہیں، انہیں میری یہ باتیں پہنچا دو تا کہ سب لوگ میرے بیانات سے مطلع ہو جائیں''۔ اللہ تعالیٰ نے، ہر وارث کے لئے ایک حصہ مقرر کر دیا ہے،

- ہر وارث کو اپنا حصہ میراث سے لے لینا چاہئے لہٰذا ایسی وصیت نہ کرنی چاہئے کہ کسی وارث کو اس کے حصے سے زیادہ پہنچے، اگر کسی بیگانے کے بارے میں وصیت کی جائے تو چاہیے کہ جو شخص بے گانہ ہے اسے تہائی مال سے زیادہ نہ پہنچے۔ اے لوگو! چھوٹا بچہ ماں کے تابع ہے۔ جو شخص کسی محصنہ سے زنا کرتا ہے سنگسار کیا جائے گا جو کوئی دوسرے کے باپ کو اپنا باپ بنائے گا یا دوسرے خاندان کو اپنا خاندان بنائے گا گرفتار لعنت خداوندی ہوگا، فرشتے اور انسان اس پر ملامت کریں گے۔ روز جزاء میں ان لوگوں سے دیت وفدیہ قبول نہیں کیا جائے گا''۔

اس کے بعد آپ (ﷺ) نے اپنے خطبہ کو السلام علیکم (یعنی تم پر سلامتی ہو) پر ختم کیا۔ اس خطبہ کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا، بعض مسلمان تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے اس دن ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان یہ خطبہ جبل الرحمۃ (واقع عرفات) پر سن رہے تھے۔ جب آپ خطبہ دے رہے تھے لوگ بلند آواز سے اس کا اعادہ کر رہے تھے، بالخصوص آپ کے ان جملوں کو جو آپ بار بار فرما رہے تھے۔ ''کیا میں نے اپنا فرض ادا کر دیا یا نہیں''۔ آپ کے اس سوال کے جواب میں لوگ بلند آواز سے جو کچھ کہہ رہے تھے اس کا دلوں پر بڑا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔

جب پیغمبر اسلام کے سوال کا جواب لوگ بلند آواز سے دیتے تو کوہ و بیاباں لرز اٹھتے۔ اس

خطبے کے سننے والے جب تک زندہ رہے اسے بھول نہ سکے، گویا مسلمانوں کے رؤئیں رؤئیں میں یہ خطبہ سرائیت کر گیا تھا۔ ہم اہل یورپ جب پیغمبر کے اس خطبہ کو سنتے ہیں حالانکہ ہم نے ان کی آواز نہیں سنی، نہ ہم اس مجمع میں موجود تھے، ہم بھی اس خطبہ سے بے حد متاثر ہوتے ہیں تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جنہوں نے جبل الرحمۃ پر حضرت محمد کی آواز سنی ہوگی اور انہیں دیکھ رہے ہوں گے جب کہ عربستان میں کلام کی بڑی وقعت تھی اور دیہاتی عرب کلام سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ آج کل ہم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

اس خطبہ کو خطبہ ''حج البلاغ'' بھی کہتے ہیں کیونکہ اس خطبے میں ان امور کے علاوہ جو آپ نے لوگوں تک پہنچائے کلمہ ''بلّغت'' بار بار استعمال فرمایا، یعنی کیا میں نے ابلاغ و تبلیغ کر دی ہے؟ مگر اکثر مسلمان اس خطبے کو ''خطبہ حج الوداع'' کے نام سے یاد کرتے تھے اور آج کل بھی اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس خطبہ کا اسلام پر بڑا اثر پڑا۔ اور اب تک بڑا عمیق اثر ہے۔ اہل ذوق مسلمان اس خطبہ کو زبانی یاد کرتے ہیں۔

علالت

مدینہ کو لوٹنے کے ایک ماہ تک رسول اللہ کی حالت بالکل ٹھیک رہی، اس کے بعد وہ بیمار ہو گئے، لیکن یہ بیماری ایسی تھی کہ بعض اوقات ہی آپ گھر سے برآمد ہو سکتے تھے، مسجد میں تشریف لا سکتے تھے اور نماز پڑھ سکتے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جس روز آپ اندرون خانہ سے باہر تشریف نہیں لا سکتے تھے تو آپ کے چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علی بن ابی طالب مسجد نبوی میں امامت کرتے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر نماز پڑھاتے تھے یعنی حضرت علی یا حضرت ابوبکر نماز پڑھاتے تھے اور تمام مسلمان ان کی اقتداء کرتے تھے۔ جب بھی علی یا ابوبکر نماز میں قرآن پڑھتے تو آپ بستر مبارک سے ان کی قرأت کو بغور سنتے، کبھی اٹھتے اور کبھی بیٹھتے اور جو کچھ مسجد میں پڑھا جاتا تھا اس کا اعادہ کرتے۔ جب تک کہ آپ مسجد میں جا سکے خواہ دوسروں کی امداد کے ساتھ، برابر نماز با جماعت کے لئے تشریف لے جاتے رہے۔ بعض وقت دو اشخاص ادھر ادھر سے آپ کی دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر سہارا دیتے اور اس طرح آپ مسجد کو تشریف لے جاتے تاکہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں اور مسلمانوں کو ہدایت

فرمائیں۔ ایک روز مسجد میں مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، ''تمہارا ایک محبت کرنے والا دوست بہت جلد تمہارے درمیان سے چلا جائے گا'' جو لوگ مسجد میں موجود تھے زار و قطار رونے لگے کیونکہ وہ سمجھ گئے کہ جو شخص ان سے محبت کرتا ہے اور درمیان سے اٹھ جائے گا، وہ آپ ہی کی ذات والا صفات ہے۔

دوران مرض میں اگر آپ کبھی اچھے ہو جاتے تو گھر سے باہر چلے جاتے اور قبرستان جنت البقیع کا رخ کرتے جہاں بہت سے مسلمان مدفون تھے خصوصاً شہدائے جنگ احد۔ قبرستان میں دیر تک توقف فرماتے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ شہدائے جنگ احد کی قبروں پر جا کر آپ کیا سوچا کرتے تھے؟ ان دنوں میں جب بھی مسجد میں تشریف لے جاتے، فرماتے، ''اے بھائی بہنوں، جس کسی کو مجھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو میرے دنیا سے چلے جانے سے پہلے مجھ سے اس کا بدلہ لے لے اور اپنے نقصان کو پورا کر لے اگر میں نے کسی کو مارا ہے تو آئے اور مجھے مارے، میں اپنی پشت کیے دیتا ہوں تاکہ وہ بدلہ لے لے'' مدینہ میں جس گھر میں آپ نے دنیا کو الوداع کہا وہ مسجد کے قریب تھا۔ یہ گھر یک منزلہ بغیر تہہ خانہ کے تھا جو موسم گرما میں سخت گرم ہو جاتا تھا اور ایک چہار دیواری میں واقع تھا، جہاں ہمیشہ چار بکریاں چرتی رہتی تھیں۔

ایک دن صبح آپ کی حالت کچھ غیر ہو گئی تو آپ نے پاس بیٹھنے والوں سے فرمایا، جاؤ، مدینہ کے ساتھ کنوؤں سے ایک ایک کنوئیں سے بقدر یک ظرف پانی لے آؤ، ایک کنوئیں سے ظرف سے زائد پانی نہ لینا۔ حاضرین مجلس مدینہ کے ساتھ کنوؤں سے سات ظرف پانی لائے، آپ نے ہر ظرف میں سے ایک گھونٹ پیا اور فرمایا، ''اب میری حالت اچھی ہو گئی ہے''۔

ہمیں اس بات پر حیرت نہ کرنی چاہئے کہ پیغمبر اسلام نے پانی سے کیوں علاج کیا، اس لیے کہ عرب پانی سے ہی علاج کرتے ہیں۔ پانی کی قدر کو بدو عرب ہی جان سکتے ہیں جو ساری عمر پیاسی زندگی بسر کرتے ہیں، ہم لوگوں کے پاس پانی کی بے حد فراوانی ہے، ہم پانی کی قدر و قیمت کیا سمجھ سکتے ہیں۔ بدو عرب کے لئے پانی نہ صرف مقوئ جسم و روح ہے بلکہ تمام دردوں کی دوا ہے۔ صحرائے عرب میں جو کوئی بیمار ہوتا پانی سے علاج کرتا۔ اس دن جب کہ پیغمبر اسلام نے سات کنوؤں کا پانی پیا اور فرمایا کہ اب میری حالت بہتر ہے لوگوں کی مدد سے مسجد کو تشریف لے گئے۔ دوسری بار پھر لوگوں سے خطاب کیا اور پھر مسلمانوں سے کہا کہ جس کو

کوئی آزار مجھ سے پہنچا ہو انتقام لے لے۔ میں ہر قسم کی ضرب و توہین کے لئے تیار ہوں۔
آپ نے فرمایا، ''میں تمام مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے حافظے پر زور دیں اور یاد کریں کیا میرے ذمہ کسی کا مطالبہ ہے یا نہیں اگر ہے تو آئے اور اسے وصول کر لے۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا، ''یارسول اللہ! آپ کے ذمہ میرے تین درہم نکلتے ہیں''۔ آپ نے فوراً اسے تین درہم دے دیئے۔ اس کے بعد موضوع سخن کو بدل دیا اور حضرت اسامہ کے بارے میں گفتگو فرمانے لگے۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ اسامہ، زید بن حارثہ کے فرزند تھے، زید آپ کے غلام تھے اور انہیں آپ نے آزاد کر دیا تھا۔ یہ قبیلہ بنی کلب سے تھے۔ بچے تھے کہ ایک جنگ میں گرفتار ہوئے۔ حکیم بن حزام نے اس بچے کو اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت خدیجہؓ بنت خویلد کے لئے خریدا تھا جنہوں نے چالیس سال کی عمر میں رسول مقبول سے شادی کی تھی۔ جب حضرت محمد کا عقد حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ہو گیا تو انہوں نے اپنے غلام زید بن حارثہ کو آپ کی ہدیتاً بخش دیا۔ آپ نے انہیں نہ صرف یہ کہ آزاد کر دیا بلکہ اپنا فرزند بھی بنا لیا۔ اہل مکہ انہیں بجائے زید بن حارثہ کے زید بن محمد کہہ کر پکارا کرتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے زید بن حارثہ کے بارے میں ایک آیت نازل ہوئی۔ یہ قرآن کی 33 ویں سورۃ الاحزاب کی پانچویں آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے فرماتا ہے جس کا مطلب یہ ہے:

''زید بن حارثہ کو زید بن محمد کہہ کر نہ پکارو کیونکہ اگرچہ انہیں رسول اللہ نے فرزندی میں قبول کر لیا ہے مگر وہ حقیقتاً آپ کے فرزند نہیں ہیں''۔

مذکورہ بالا آیت میں زید بن حارثہ کا نام نہیں ہے مگر آیت کا ایک حصہ ان سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت زید بن حارثہ جنگ موتہ میں شہید ہو گئے تھے ان کے بیٹے اسامہ تھے۔ ایام علالت میں آپ نے اسامہ بن زید کی سرکردگی میں ایک لشکر شام کی طرف تیار کیا۔ اس وقت ان کی عمر اکیس سال تھی۔ بعض اکابرین اسلام کو ان کے تقرر پر اعتراض تھا کہ اکیس سالہ نوجوان، کیا لشکر اسلام کی سپہ سالاری کرے گا، مگر حضرت محمد کی وجہ سے کوئی شخص آپ کے سامنے کچھ نہ کہہ سکا۔ آپ کو اس بات کی اطلاع ملی تو مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، ''میں نے اسامہ کا اس لیے انتخاب کیا ہے کہ وہ زید کا فرزند ہونے کے علاوہ ایک بہادر اور عقلمند بھی ہے، میں سمجھتا

ہوں کہ وہ سیادت کے فرائض انجام دے گا"۔

رحلتِ پیغمبر کی وجہ سے اسامہ اپنے لشکر کو نہ لے جا سکے مگر جب حضرت ابوبکر خلیفہ بن گئے تو انہوں نے رسول کے فیصلے کی تائید کی اور حضرت اسامہ کو پھر سپہ سالاری پر متعین کر کے لشکر اسلام کو شام کی طرف روانہ کر دیا۔ حضرت اسامہ لشکر لے کر گئے، جنگ کی اور فتح یاب ہوئے۔ ثابت ہو گیا کہ حضرت محمد کا ان پر اعتماد بلاوجہ نہ تھا۔ اسامہ کی فتح شام نے اہلِ اسلام پر شام کی فتوحات کے دروازے کھول دیئے حتیٰ کہ عہد فاروقی میں سارے شام پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ جس روز حضرت محمد، مسلمانوں کے ساتھ اسامہ بن زید کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے انصار کے بارے میں فرمانے لگے۔ "اے مہاجرو! جنہوں نے مکہ سے ہجرت کی اور مدینہ آئے میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ انصار کے ساتھ جو مدینہ کے اصلی باشندے ہیں خوبی کے ساتھ سلوک رکھنا کیونکہ انصار پر میں نے ہمیشہ بھروسہ کیا ہے، ہجرت مکہ کے بعد میں نے ان کے ساتھ امن کی زندگی گزاری ہے۔ اگر یہ دیکھو کہ انصار نے تمہارے بارے میں کوئی غلطی کی ہے تو انہیں معاف کر دو، اس لیے کہ وہ میرے لئے بمنزلہ لباس بدن کے رہے ہیں، آج تک وہ اپنے فرائض انجام دیتے رہے ہیں، اس کے بعد ان پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا بلکہ ان کے تم پر حقوق ہیں۔ اے لوگو! جب میں زندگی کو الوداع کہہ دوں اور مجھے دفن کر چکو تو میری قبر کے سامنے رکوع وسجدہ نہ کرنا، کیونکہ رکوع وسجدہ صرف خدا ہی کے لئے ہے" یہ کہہ کر آپ مسجد سے باہر تشریف لے گئے۔

غزوہ تبوک

اس سے پیشتر کہ ہم آپ کی زندگی کے آخری ایام کے بارے میں کچھ لکھیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً جنگ تبوک کے بارے میں اظہار خیال کریں جو آپ کی آخری جنگ تھی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب حضرت محمد مکہ سے لوٹے تو بیمار پڑ گئے مگر کبھی اچھے بھی ہو جاتے تھے۔ شام کے بعض سلاطین وامراء میں جو سلطنت روم کے زیر نگرانی تھے، یہ بات مشہور ہو گئی کہ آپ وفات پا چکے ہیں لہٰذا رومتہ الصغریٰ والے اس امر کے در پے ہوئے کہ شام کی راہ سے عربستان پر حملہ کر کے مسلمانوں کی سرکوبی کریں۔ آپ کو اطلاع ملی تو پختہ ارادہ کر لیا کہ دشمن کے

مقابلہ کے لئے بڑھیں، گو آپ بیمار تھے مگر آپ نے عام لام بندی کا حکم دے دیا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی مالی حالت بہت کمزور تھی، مدینہ میں سامانِ رسد کی قلت تھی اس سال کی گرمی نے مسلمانوں کو اور زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کو حکم دے دیا کہ جس کسی کے پاس مال ہو لشکرِ اسلام کی مدد کرے، اور اپنے لئے خود آلات جنگ مہیا کرے۔ ایک مسلمان حضرت عبدالرحمان بن عوف لشکر اسلام کی امداد کے لئے چار ہزار درہم لائے اور عرض کی، یا رسول اللہ میرے پاس آٹھ ہزار درہم تھے، میں نے چار ہزار اپنی بیوی کے لئے چھوڑ دیے اور باقی آپ کی خدمت میں لے آیا" حضرت محمد نے فرمایا، "جو مال تم اسلام کی مدد کے لئے لائے ہوئے اور جو مال تم نے اپنی بیوی کے لئے چھوڑا ہے اللہ اس میں برکت دے"۔

اس دعا کی برکت سے عبدالرحمان بن عوف اس قدر مال دار ہو گئے تھے کہ جب ان کی وفات ہوئی تو ان کی ایک بیوی کے آٹھویں حصے میں اسی ہزار مثقال سونا آیا تھا۔ ان کی چار بیویاں تھی۔

حضرت ابوبکر کے پاس جو کچھ تھا لے آئے اور حضرت عمر بن الخطاب آدھا مال لے آئے ایک صحابی عاصم ﷺ بن عدی جن کے پاس کچھ بھی نہ تھا ایک سو گٹھے خرما کے لائے اور ابوعقیل انصاری ایک صاع خرما لائے اور عرض کی، "یا رسول اللہ (ﷺ) میرے پاس دو صاع خرما تھے، آدھے لے آیا مسلمانوں نے خلوص کے ساتھ فداکاری کی، فرزند و زن کی خوراک کے علاوہ جو کچھ تھا لشکر اسلام کے لئے پیش کر دیا۔ اس طرح تیس ہزار کا ایک باعزم و ایمان طاقتور لشکر مرتب ہو گیا جن میں سے دس ہزار شہسوار تھے۔ مدینہ سے اس منظم لشکر کی روانگی کا پرشکوہ منظر تاریخ اسلام میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔

جب یہ لشکرِ سرزمین شام میں پہنچا تو وہ امراء اور رؤساء جو رومتہ الصغریٰ کی مدد سے عربستان پر حملہ کرنا چاہتے تھے، بھاگ کھڑے ہوئے اور سرزمین شام سے دور نکل گئے حتیٰ کہ وہ رومی لشکر جو ان کی مدد کے لئے آیا تھا پیچھے ہٹ گیا۔ پیغمبر اسلام ایک عرصہ تک ملک شام میں ٹھہرے رہے، مقامی سرداران قبائل اور وہاں کے روحانی لوگوں کو جو مسیحی تھے مطیع اسلام کیا یعنی انہوں نے یہ وعدہ کیا کہ وہ جزیہ دیں گے۔

چونکہ سرزمین شام میں اسلامی لشکر ایک قلعہ میں فروکش ہوا تھا جس کا نام تبوک تھا لہٰذا اسے غزوہ تبوک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حضرت محمد نے تبوک میں جنگ کی طرف سبقت نہ کی مگر امرائے سرحد، لشکر اسلام سے ڈر گئے اور اس بات پر مجبور ہو گئے کہ مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ امن کریں اور غیر جانبدار رہیں کیونکہ وہ دیکھ چکے تھے کہ اسلامی فوج کے آنے کے بعد رومی لشکر بھی پیچھے ہٹ گیا۔

تبوک پر لشکر کشی کرتے وقت تین مسلمان آرام طلبی اور خوف مرگ کی وجہ سے لشکر اسلام میں شامل نہ ہوئے۔ یہ ابولبابہ، اوس بن ثعلبہ اور ودیعہ بن حرام تھے۔ یہ تینوں بعد ازاں پشیمان ہوئے جب حضرت محمد تبوک سے واپس آئے تو دیکھا کہ تینوں مسجد نبوی کے ستونوں سے بندھے کھڑے ہیں، انہوں نے کہا، ''جب تک کہ رسول اللہ معاف نہیں فرمائیں گے ہم اسی طرح بندھے کھڑے رہیں گے'' رسول خدا کی یہ عادت تھی کہ جب بھی کسی سفر سے مدینہ واپس آتے تو مسجد میں جا کر دو رکعت نماز ادا کرتے تھے۔

آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا، ''تم لوگ کس لیے ستونوں سے بندھے کھڑے ہو؟'' وہ عرض کرنے لگے۔ ''ہم گنہگار ہیں اس لیے کہ جہاد میں شریک نہیں ہوئے، آپ جب تک ہمیں معاف نہیں کریں گے ہم اسی طرح بندھے رہیں گے'' آپ نے فرمایا، ''بندوں کے گناہوں کو خدا بخشتا ہے میں کسی شخص کے گناہ بخشنے کا مجاز نہیں''۔

اس واقعہ کے بعد نویں سورۃ، التوبہ کی یہ آیت نمبر 102 نازل ہوئی۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

''اور دوسرے جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا، ملا دیا نیک اور بد اعمال کو خدا ان کی توبہ کو قبول کرلے گا بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے'' اس آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کے گناہ بخش دیئے اس کے شکریہ میں انہوں نے پیغمبر خدا سے کہا ہم اپنا سارا مال اسلام کے بیت المال میں دیتے ہیں۔ مگر اسی سورۃ توبہ میں ایک آیت اور نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ حضرت محمد کو حکم دیتے ہیں کہ ان کے مالوں سے صرف بقدر زکوۃ وصول کریں باقی انہی کو واپس کر دیں۔

وفات

گو غزوہ تبوک کے بعد آپ نے کسی جنگ میں شرکت نہیں کی مگر اسلام کی تقویت کا برابر خیال رکھتے تھے چنانچہ بیماری ہی کے زمانے میں آپ نے حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ کو ایک لشکر دے کر شام کی طرف روانہ کرنا چاہا مگر آپ کی وفات نے اس کی تکمیل نہ ہونے دی۔ جس دن آپ مسجد میں تشریف لے گئے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ گفتگو کی تھی اس سے اگلے روز حالت خراب ہوگئی۔

فرمایا، "میری بیماری کا سبب وہ زہر ہے جو یہودی عورت نے خیبر میں مجھے کھلایا تھا۔ (اس کی تفصیل گزر چکی ہے) اس زہر سے مجھے گاہ بگاہ تکلیف ہوتی تھی مگر ایسی نہیں کہ بے بس کر دے۔ اس بار تو اس نے بالکل بے بس کر دیا ہے"۔

جن دنوں آپ سخت بیمار تھے اور گھر سے باہر نہ جا سکتے تھے، علی بن ابی طالب مسجد میں نماز با جماعت پڑھایا کرتے تھے، جیسا کہ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا مگر بعض مورخین اسلام لکھتے ہیں حضرت ابوبکر امام بنتے تھے۔ ایک دن وقتی طور پر آپ کی حالت درست ہوگئی تو آپ کے چچا حضرت عباس کے دو بیٹے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر سہارے سے مسجد لے گئے۔ اس وقت حضرت ابوبکر مسلمانوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے تھے، آپ کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگے تاکہ آپ کو اپنی جگہ بٹھائیں، حضور نے اشارہ کیا کہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہیں۔ چونکہ طبیعت خراب تھی لہٰذا انہی دونوں لڑکوں کے سہارے واپس تشریف لے گئے۔

ربیع الاول 11 ھ میں آپ کی حالت زیادہ خراب ہوگئی اور اب رحلت کا وقت آن پہنچا، یاد آیا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس سات دینار امانت رکھے تھے، ان دیناروں کے علاوہ آپ کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ حضرت عائشہؓ کو طلب کیا اور کہا، "کیا میرے سات دینار تمہارے پاس ہیں؟" انہوں نے عرض کی۔ "ہاں یا رسول اللہ" فرمایا، "وہ سات دینار مسکینوں میں تقسیم کر دو کیونکہ مجھے شرم آتی ہے کہ سات دینار کا سرمایہ چھوڑ کر اپنے پروردگار کے دربار میں جاؤں"۔

دو شنبہ 13 ماہ ربیع الاول 11 ھ میں آپ کی حالت بہت زیادہ گر گئی تھی۔ معلوم ہونا چاہئے کہ اسلامی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے بیماری کی حالت میں کوئی دوا

نہیں استعمال کی بعض مؤرخین کے بیان کے مطابق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بروز دوشنبہ 13 ربیع الاول یا اس سے پیشتر آپ نے تھوڑی سی دوا نوش فرمائی تھی مگر آپ دوا کے استعمال سے کراہیت کرتے تھے۔

حاضرین مجلس سے آخری فرمائش آپ نے یہ کی کہ وہ داندان مبارک کو مسواک کر دیں تا کہ صاف ہو جائیں۔ آپ پاکیزگی اور صفائی کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے، کئی بار فرمایا، ''پاکیزگی نصف ایمان ہے''۔

پیر کے دن 13 ربیع الاول مطابق 8 جون 632ء علی بن ابی طالب داماد پیغمبر، ابو الفضل ان کے چچا عباس کے بیٹے، اسامہ بن زید بن حارثہ (ان کے باپ کو آپ نے آزاد کر دیا تھا) شکران، آپ کے آزاد کردہ غلام جن کا نام ابھی تک پوری کتاب میں کہیں نہیں آیا اوس بن خولی اور ساری ازواج مطہرات آپ کے سرہانے موجود تھے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، ''میں اس زمانے میں جوان تھی، مجھے کیا پتہ کہ رسول اللہ قریب المرگ ہو پہنچ چکے ہیں۔ میں نے اپنی دونوں باہیں گردن مبارک میں ڈال دیں، اسی حالت میں آپ انتقال فرما گئے۔ مجھے پتہ نہ چلا کہ وفات پا چکے ہیں۔ جب عورتیں اور مرد رونے لگے تب مجھے معلوم ہوا کہ حضورؐ وفات پا گئے'' دنیا سے رخصت ہوتے وقت آپ کے پاس سوائے ایک سفید خچر اور چند تلواروں کے کچھ بھی نہ تھا۔ یہ شاہ حبشہ نے ہدیہ دی تھیں۔

اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ سردار قبیلہ جس جگہ مرتا اسے اسی جگہ دفن کرتے لہٰذا مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ خانہ مبارک ہی میں آپ کو دفن کیا جائے۔ حضرت محمد مکی تھے مگر مدینہ میں فوت ہوئے لہٰذا لوگ یہ سوچنے لگے کہ قبر مبارک کو اہل مکہ کے طریقہ پر کھودا جائے یا اہلِ مدینہ کے۔ اس دن مدنی گورکن آسانی سے دستیاب ہو گیا، اسی لیے آپ کی قبر مبارک مدنی طرز پر کھودی گئی۔ جب قبر کھودی جا چکی تو آپ کی مخصوص چادر کفن پر لپیٹ دی گئی تا کہ ان کے بعد اس چادر کو کوئی استعمال نہ کر سکے۔ غسل دیتے وقت احترام کی بنا پر لباس کو اتارا نہیں گیا کپڑوں سمیت ہی نہلایا گیا۔ ان کے بعد ایک سرخ پارچہ میں اطراف جسد مبارک کو لپیٹ دیا گیا بعض روایتوں میں ہے کہ سرخ رنگ کی دری کے ٹکڑے میں لپٹا گیا، اس کے بعد جسم اطہر کو سپرد لحد کر دیا گیا۔ دفن کرتے وقت جسدِ انور کو ایک پہلو پر لٹایا گیا ضریح شریف اس قسم کی بنائی گئی تھی کہ رخ انور

کعبہ کی طرف رہے۔ جسدِ مبارک کو اس طرح رکھا گیا کہ زمین سے ملحق رہے۔ اس کے بعد قبر کے دروازے کو بند کر دیا گیا اور اوپر سے مٹی ڈال دی گئی۔ مرقد اقدس پر ایک درخت لگا دیا گیا اور اس کی آبیاری کی گئی تاکہ جلدی نشوونما پا سکے۔ اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ میت بغیر تابوت کے رکھا کرتے تھے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ انسان سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ سوائے اس کی روحانی طاقت کے، جو اس نے زندگی میں پیدا کی۔ باقی جو کچھ ہوتا ہے سب فنا ہو جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام نے زندگی میں کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا۔

بعض تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ وفات سے چند ساعت پیشتر آپ نے فرمائش کی کہ کسی کاتب کو بلایا جائے تاکہ آپ کی آخری وصیت کو لکھ دے۔ مقصد آپ کا یہ تھا کہ کسی کو جانشین مقرر کر دیں۔ رسول مقبول کے چند عزیزوں نے حضرت علی کو اطلاع دی کہ وہ حاضر ہوں، حضرت عائشہؓ نے حضرت ابوبکر اور حضرت حفصہؓ نے اپنے پدر بزرگوار حضرت عمر کو بلا بھیجا۔ یہ تینوں اصحاب ایک ساتھ داخل ہوئے جب آپ نے تینوں کو اپنے سامنے دیکھا تو اپنے نظریۂ جانشینی کو ظاہر نہ کر سکے مگر یہ روایت بہت ہی کمزور ہے اس لیے کہ حضرت محمد بڑے قوی عزم و ارادے کے مالک تھے، وہ اپنی جانشینی کے مسئلہ کے بارے میں ہرگز تردد نہ کرتے جو پوری دنیائے اسلام کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

صحابہ مسجد میں جمع تھے جب انہیں معلوم ہوا کہ آپ رحلت فرما گئے ہیں تو زار و قطار رونے لگے۔ حضرت عمر نے رونے کی آواز سنی تو مسجد کی طرف گئے اور فرمایا، کس لیے روتے ہو؟ پھر تلوار نیام سے باہر نکال کر کہا، ''جو کوئی یہ کہے گا کہ حضرت محمد کا انتقال ہو گیا ہے میں اس کی گردن، اس تلوار سے قلم کر دوں گا۔ ہمارے پیغمبر کا انتقال نہیں ہوا وہ تو اللہ کے پاس آسمان پر تشریف لے گئے ہیں اور جلد ہی لوٹ آئیں گے ہم انہیں دیکھیں گے اور ملاقات کریں گے۔''

بعد ازاں حضرت ابوبکر مسجد میں تشریف لائے اور فرمایا، ''اے عمر خاموش، تلوار نیام میں کر لو'' اس کے بعد آپ نے مسلمانوں سے خطاب فرمایا، ''اے لوگ حضرت محمد خود فرماتے تھے کہ میں ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، ہر انسان کو مرنا ہے خواہ وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، پچھلے پیغمبر بھی وفات پا گئے اور ہماری نبی بھی رحلت فرما گئے۔ جو کوئی بھی مسلمان ہے اور حضرت محمد بن عبداللہ کو پیغمبر مانتا ہے، اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ وفات پا چکے ہیں لیکن اگر وہ رحلت کر گئے تو اللہ تو زندہ

ابد ہے وہ ہرگز نہیں مر سکتا"۔

جب حضرت عمر بن الخطاب نے یہ الفاظ سنے تو زمین پر بیٹھ گئے، اپنا سر مبارک دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور زار و قطار رونے لگے، کچھ مسلمان ذرا خاموش ہو گئے وہ بھی پھر سے رونے لگے۔اس طرح پیغمبر اسلام کی وفات ہوئی جو دنیا کے بڑے لوگوں میں سب سے بڑے تھے۔

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔"

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کونسٹن ورجیل جارجیو

☆ حضرت محمد نے غار ثور میں حضرت ابوبکر کے سانپ کے کاٹے زخم کو چوس کر زہر تھوک دیا جس سے انہیں فوراً آرام آ گیا اور آرام سے سو گئے۔

بادشاہ نہیں، پیغمبر

☆ فتح مکہ کے موقع پر جب حضور (ﷺ) اسلامی لشکر سمیت خانہ کعبہ کے قریب پہنچے تو حضرت عباس ؓ اور ابوسفیان ایک ٹیلے پر کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ابوسفیان نے کہا۔آج تمہارا بھتیجا بادشاہ لگ رہا ہے۔حضرت عباس نے جواب دیا...... "نہیں، میرا بھتیجا پیغمبر لگ رہا ہے۔یہ پیغمبرانہ شان ہے، یہ بادشاہوں کو کب نصیب ہوتی ہے۔"

نبی برحق......انجیل برناباس کی شہادت

حضور (ﷺ) کے نبی برحق ہونے کے بارے میں انجیل برناباس میں واضح طور پر بشارتیں دی گئی ہیں اور آپ کو انبیاء کا سرتاج کہا گیا ہے۔ مگر مسیحی علماء نے اپنے روایتی تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس انجیل کو تسلیم کرنے سے انکار کرنے کے بعد رد کر دیا لیکن دنیا تک خدا حقیقی پیغام پہنچ کر رہا ہے۔

اناجیل کی کہانی یا تاریخ یہ ہے کہ عیسائی دنیا نے صرف چار انجیلوں کو تسلیم کر رکھا ہے۔ ان میں انجیل مرقس، انجیل متی، انجیل لوقا اور انجیل یوحنا شامل ہیں۔ انجیل مرقس قدیم ترین شمار کی جاتی ہے۔ اس کا مصنف ایک یونانی یہودی مرقس (MARK) تھا جو پال اور برناباس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ پھر فاضل مصنف نے پطرس (St.PETERS) کے ساتھ رہنا شروع کر دیا اور اس کے قتل کے بعد مرقس نے یہ انجیل لکھی۔ یہ اگرچہ قدیم ترین شمار کی جاتی ہے لیکن یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کبھی نہیں ملا۔ جب ملاقات ہی نہیں ہوئی تو ان کا حواری ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پطرس کے ساتھ رہنے کی وجہ سے جو کچھ اس سے سنتا اسے یونانی زبان میں لکھ لیتا تھا۔ اسی وجہ سے اسے ترجمان پطرس کہا جاتا ہے۔ انجیل مرقس کا زمانہ تحریر 63ء سے 70ء کے درمیان بتایا جاتا ہے۔

انجیل متی

محققین کا خیال ہے کہ اگرچہ اس کا مصنف متی (MATTHEW) تھا لیکن اس کا لکھا ہوا بڑا حصہ ضائع ہو گیا تھا۔ بعد ازاں کسی گمنام شخص نے اس کی طرف منسوب کر کے یہ نسخہ لکھ دیا۔ اس کا زمانہ تصنیف 65ء سے 70ء تک کا ہے۔ جب کہ پروفیسر ہارنک کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب 80ء سے 100ء کے درمیان لکھی گئی تھی۔ مواد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی

1068 آیات میں سے 470 آیات مرقس کی انجیل سے ماخوذ ہیں۔ اگر اس کا مصنف حواری ہوتا تو اس کو ایسے شخص کی کتاب سے استفادہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی جو حواری نہ تھا اور نہ کبھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملا تھا۔

انجیل لوقا

یہ انجیل 80ء سے 90ء تک تصنیف ہوئی۔ اس کا مصنف (LUKE) اٹالین تھا۔ اس نے بھی کبھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں دیکھا اور نہ ان سے استفادہ کر سکا۔ وہ سینٹ پال (St.PAUL) کا عقیدت مند تھا اور ہمیشہ ان کی صحبت میں رہا جب کہ سینٹ پال کو بھی حضرت مسیح علیہ السلام سے صحبت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ مسیحی روایات کے مطابق وہ واقعہ صلیب کے چھ برس بعد مسیحیت میں داخل ہوا تھا۔ اس لیے لوقا اور مسیح علیہ السلام کے درمیان سلسلہ روایت کی ایک کڑی بالکل مفقود ہے ہارنک میکسگرٹ اور پلومر کی تحقیق کے مطابق یہ انجیل 80ء سے پہلے نہیں لکھی گئی۔

انجیل یوحنا

یہ انجیل اگرچہ حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد یوحنا سے منسوب ہے لیکن جدید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ یہ مشہور حواری یوحنا کی لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ یہ ایک اور شخص یوحنا کی تصنیف ہے جو ایشیائے کوچک کا رہنے والا تھا۔ اس انجیل میں فلسفہ یونان کی آمیزش بھی صاف نظر آتی ہے۔ اس کا زمانہ تحریر 90ء ہے جب کہ ہارنک کے نزدیک یہ 110ء میں لکھی گئی ہے۔ زیادہ گہری تحقیقات سے ان کتابوں کی دستاویزی حیثیت مزید مشکوک ہو جاتی ہے۔

یہ چار اناجیل ہیں جنہیں مسیحی کلیسا نے معتبر اناجیل (CANONICAL GOSPELS) قرار دے رکھا ہے جب کہ ان کے مقابلے میں انجیل برناباس (EVANGLIUNI BERNABAS) زیادہ قابل اعتماد تھا۔ اس کے معتبر اور برحق ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کا مصنف برناباس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اولین بارہ حواریوں سے ایک ہے اور اسے اول سے لے کر آخر تک حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ اور اس نے اپنی آنکھوں اور کانوں سے حالات دیکھے اور سنے ہیں۔

کتاب اعمال میں برناباس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ قدیم عیسائی لٹریچر میں انجیل برناباس کا ذکر ایک گم شدہ کتاب کی حیثیت سے آتا ہے۔ کلیسا نے حضرت محمد کی بعثت سے 75 برس پہلے جن اناجیل کو مشکوک الصحت (APOCRYPHAL) قرار دے دیا تھا ان میں یہ انجیل بھی شامل تھی۔ چنانچہ اسے غائب کر دیا گیا۔ تاہم قدرت، صداقتوں کو زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہنے دیتی۔ 1709ء میں شاہ پرشیا کے ایک ایڈوائزر کردم کو اس کتاب کا ایک نسخہ ایمسٹرڈم کے ایک کتب خانے سے دستیاب ہو گیا۔ اطالوی زبان میں تھا۔ اس نے یہ کتاب شاہ پرشیا کو بطور تحفہ پیش کر دی اس طرح یہ کتاب آسٹریا کے دارالحکومت وی آنا کے شاہی کتب خانے میں منتقل ہو گئی۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں مڈلی کے مقام پر ڈاکٹر ہلمین کو انجیل برنابس کا ایک ہسپانوی نسخہ دستیاب ہو گیا۔ اور ان کی وساطت سے یہ ممتاز مستشرق جارج سیل (GEORGE SALE) کو ملا اس نے اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں اس انجیل کا ذکر کیا ہے۔ بعدازاں یہ نسخہ پھر لاپتہ ہو گیا۔ تاہم 1884ء میں کسی طرح ڈاکٹر ہیوٹ کو اس کا ایک نسخہ مل گیا۔ جس نے اپنے لیکچروں میں بتایا کہ 1907ء میں ڈاکٹر منکھوس نے اس نسخے کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا۔ مصر کے عیسائی دانشور ڈاکٹر خلیل سعادت نے اسے عربی زبان میں منتقل کیا جو 1918ء میں مصری عالم دین سید رشید رضا نے شائع کیا۔ عربی ترجمہ ہندوستان پہنچا تو مولوی محمد حلیم انصاری رودلوی نے پہلی بار لاہور سے شائع کیا۔

مسیحی لٹریچر میں انجیل برناباس کا جہاں کہیں بھی ذکر آتا ہے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے جسے شاید کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برناباس سے منسوب کر دیا ہے لیکن یہ بہت بڑی کذب بیانی ہے۔ یہ جھوٹ انہیں اس لیے بولنا پڑتا ہے کہ اس میں جگہ جگہ بصراحت حضور (ﷺ) کے متعلق پیش گوئیاں آتی ہیں۔ جب کہ اس انجیل کو پڑھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کسی مسلمان کی تصنیف کردہ نہیں ہو سکتی (متذکرہ انجیل کے اقتباسات بطور ثبوت آگے دیئے جا رہے ہیں) ثانیاً اگر یہ کسی مسلمان نے لکھی ہوتی تو مسلمانوں میں کثرت سے پھیلی ہوئی ہوتی۔ علمائے اسلام کی تصانیف میں اس کا بکثرت ذکر آتا مگر یہاں صورت حال یہ ہے کہ جارج سیل کے ترجمہ قرآن میں اس کا ذکر آنے سے پہلے مسلمانوں کو اس کے وجود کا سرے سے علم ہی نہ تھا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیف سیرت سرورِ عالم (ﷺ) کے مطابق طبری، یعقوبی، مسعودی، البیرونی، ابن حزم اور دیگر مصنفین جو مسلمانوں میں مسیح لٹریچر کی وسیع پیمانے پر اطلاع رکھنے والے تھے، ان میں سے کسی کے ہاں بھی مسیحی مذہب پر بحث کرتے ہوئے انجیل برناباس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔ دنیائے اسلام کے کتب خانوں میں کتابوں کی جو بہترین اور مکمل ترین فہرستیں (ابن ندیم کی الفہرست اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون) بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے کسی مسلمان عالم نے انجیل برناباس کا نام تک نہیں لیا۔ اس الزام کے جھوٹا ہونے کی تیسری اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) کی پیدائش سے بھی 75 سال پہلے پوپ گلاسیس اول (GELASIUS) کے زمانے میں بدعقیدہ اور گمراہ کن کتابوں کی جو فہرست مرتب کی گئی تھی اور پاپائی فتوے کے ذریعہ جن کتابوں کو پڑھنا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا ان میں انجیل برناباس بھی شامل تھی (ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا 1958ء بعنوان گلاسیس) یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور (ﷺ) کی بعثت سے پون صدی قبل وہ کون سا مسلمان تھا جس نے "ایسی جعلی" انجیل لکھنے کا کارنامہ انجام دے دیا تھا۔ جب کہ یہ بات خود عیسائی علماء نے تسلیم کی ہے کہ شام، سپین اور مصر وغیرہ میں ابتدائی مسیحی کلیسا میں ایک مدت تک انجیل برناباس رائج رہی ہے اور چھٹی صدی میں اسے ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔

مسیحی حضرات برہم کیوں ہوئے؟

بائبل میں جو چار انجیلیں قانونی اور مستند قرار دے کر شامل کی گئی ہیں ان میں سے کسی کا لکھنے والا بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صحابی نہ تھا۔ اور ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا کہ اس نے اپنی انجیل میں آپ علیہ السلام کے صحابیوں (حواریوں) سے حاصل کردہ معلومات درج کی ہیں۔ جن ذرائع سے انہوں نے یہ معلومات حاصل کی ہیں ان کا بھی کوئی حوالہ نہیں دیا گیا جس سے پتہ چل سکے کہ آیا راوی نے خود وہ واقعات دیکھے ہیں اور اقوال اپنے کانوں سے سنے ہیں۔ اس کے برعکس انجیل برناباس کا مصنف لکھتا ہے کہ "میں حضرت مسیح علیہ السلام کے اولین بارہ حواریوں میں سے ایک ہوں، شروع سے آخر تک آپ علیہ السلام کے ساتھ رہا ہوں اور اپنی آنکھوں دیکھے واقعات اور کانوں سنے اقوال، اس کتاب میں درج کر رہا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ

کتاب کے آخر میں وہ کہتا ہے کہ "دنیا سے رخصت ہوتے وقت حضرت مسیح علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میرے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پھیل گئی ہیں ان کو صاف کرنا اور صحیح حالات دنیا کے سامنے لانا تیری ذمہ داری ہے"۔

برناباس کون تھا؟

برناباس، کے تعارف کے سلسلے میں بائبل کی کتاب اعمال میں بڑی کثرت سے اس نام کے ایک شخص کا ذکر آتا ہے جو قبرص کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ مسیحیت کی تبلیغ اور پیروان مسیح کی مدد و اعانت کے سلسلے میں اس کی خدمات کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ مگر کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کب دین مسیح میں داخل ہوا اور ابتدائی بارہ حواریوں کی جو فہرست تین انجیلوں میں دی گئی ہے اس میں بھی کہیں اس کا نام درج نہیں ہے۔ اس نے حواریوں (APOSTLES) کی جو فہرست دی ہے برناباس کی دی ہوئی فہرست، اس سے صرف دو ناموں میں مختلف ہے۔ ایک لوقا، جس کے بجائے برناباس خود اپنا نام دے رہا ہے دوسرا شمعون قنانی، جس کی جگہ وہ یہوداہ بن یعقوب کا نام لیتا ہے۔ لوقا کی انجیل میں یہ دوسرا نام بھی موجود ہے اس لیے یہ قیاس کرنا صحیح ہوگا کہ بعد میں کسی وقت صرف برناباس کو حواریوں سے خارج کرنے کے لئے لوقا کا نام داخل کیا گیا ہے، تاکہ اس کی انجیل سے پیچھا چھڑایا جا سکے، اور اس طرح کے تغیرات اپنی مذہبی کتابوں میں کر لینا ان حضرات کے ہاں کوئی ناجائز کام نہیں رہا ہے۔ اس انجیل کو اگر کوئی شخص تعصب کے بغیر، کھلی آنکھوں سے پڑھے اور نئے عہد نامے کی چاروں انجیلوں سے اس کا مقابلہ کرے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ان چاروں سے بدرجہا برتر ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور اس طرح بیان ہوئے ہیں جیسے کوئی شخص فی الواقعہ وہاں سب کچھ دیکھ رہا تھا، اور ان واقعات میں خود شریک تھا۔ چاروں انجیلوں کی بے ربط داستانوں کے مقابلے میں، یہ تاریخی بیان زیادہ مربوط بھی ہے اور اس سے سلسلہ واقعات بھی زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اس میں چاروں انجیلوں کی بہ نسبت زیادہ واضح، مفصل اور

موثر طریقے سے بیان ہوئی ہیں۔ توحید کی تعلیم، شرک کی تردید، صفات باری تعالیٰ، عبادات کی روح اور اخلاق فاضلہ کے مضامین اس میں بڑے ہی پرزور اور مدلل اور مفصل ہیں۔ جن سبق آموز تمثیلات کے پیرائے میں مسیح علیہ السلام نے یہ مضامین بیان کئے ہیں ان کا عشر عشیر بھی چاروں انجیلوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب علیہ السلام اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کس حکیمانہ طریقے سے فرماتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان، طرز بیان اور طبیعت و مزاج سے کوئی شخص اگر کچھ بھی آشنا ہو تو وہ اس انجیل کو پڑھ کر یہ ماننے پر مجبور ہو گا کہ یہ کوئی جعلی داستان نہیں ہے جو بعد میں کسی نے گھڑ لی گئی ہو، بلکہ اس میں حضرت مسیح علیہ السلام اناجیل اربعہ کی بہ نسبت اپنی اصلی شان میں بہت زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اور اس میں ان تضادات کا نام و نشان بھی نہیں ہے جو اناجیل اربعہ میں ان کے مختلف اقوال کے درمیان پایا جاتا ہے۔

اس انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور آپ علیہ السلام کی تعلیمات ٹھیک ایک نبی کی زندگی اور تعلیمات کے مطابق نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، تمام پچھلے انبیاء علیہم السلام اور کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں، صاف کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے سوا معرفت حق کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے اور جو انبیاء کو چھوڑتا ہے وہ دراصل خدا کو چھوڑتا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کے ٹھیک وہی عقائد پیش کرتے ہیں جن کی تعلیم تمام انبیاء علیہم السلام نے دی ہے، نماز، روزے اور زکوۃ کی تلقین کرتے ہیں ان کی نمازوں کا جو ذکر بکثرت مقامات پر برناباس نے کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہی فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور تہجد کے اوقات تھے جن میں وہ نماز پڑھتے تھے، اور ہمیشہ نماز سے پہلے وضو فرماتے تھے، انبیاء علیہم السلام میں سے وہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبی قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہودیوں اور عیسائیوں نے انہیں انبیاء علیہم السلام کی فہرست سے خارج کر رکھا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو وہ ذبیح قرار دیتے ہیں اور ایک یہودی عالم سے اقرار کراتے ہیں کہ فی الواقع ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی تھے اور بنی اسرائیل نے زبردستی کھینچ تان کر حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح بنا رکھا ہے۔ آخرت اور قیامت اور جنت و دوزخ سے متعلق ان کی تعلیمات قریب قریب وہی

ہیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔

مخالفت کی اصل وجہ

عیسائی جس وجہ سے انجیل برناباس کے مخالف ہیں وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ اس میں رسول اللہ کے متعلق جگہ جگہ صاف اور واضح بشارتیں ہیں کیونکہ وہ تو حضور کی پیدائش سے بھی بہت پہلے اس انجیل کو رد کر چکے تھے۔ان کی ناراضی کی اصل وجہ کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سی تفصیلی بحث درکار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیرو آپ علیہ السلام کو صرف نبی مانتے تھے،موسوی شریعت کا اتباع کرتے تھے،عقائد اور احکام وعبادات کے معاملے میں اپنے آپ کو دوسرے بنی اسرائیل سے قطعاً الگ نہ سمجھتے تھے،اور یہودیوں سے ان کا اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح تسلیم کر کے ان پر ایمان لائے تھے اور وہ ان کو مسیح علیہ السلام ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بعد میں جب سینٹ پال اس جماعت میں داخل ہوا تو اس نے رومیوں، یونانیوں اور دوسرے غیر یہودی اور غیر اسرائیلی لوگوں میں بھی اس دین کی تبلیغ واشاعت شروع کر دی اور اس غرض کے لئے ایک نیا دین بنا ڈالا ،جس کے عقائد اور اصول اور احکام اس دین سے بالکل مختلف تھے جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔

اس شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کوئی صحبت نہیں پائی تھی، بلکہ ان کے زمانے میں وہ ان کا سخت مخالف تھا اور ان کے بعد بھی کئی سال تک ان کے پیروؤں کا دشمن بنا رہا۔ پھر جب اس جماعت میں داخل ہو کر اس نے ایک نیا دین بنانا شروع کیا اس وقت بھی اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کسی قول کی سند نہیں پیش کی، بلکہ اپنے کشف والہام کو بنیاد بنایا۔اس نئے دین کی تشکیل میں اس کے پیش نظر بس یہ مقصد تھا کہ دین ایسا ہو جسے عام غیر یہودی (GENTILES) دنیا قبول کر سکے،اس نے اعلان کر دیا کہ عیسائی شریعتِ یہود کی تمام پابندیوں سے آزاد ہیں۔اس نے کھانے پینے میں حرام وحلال ساری قیود ختم کر دیں۔اس نے ختنے کے حکم کو بھی منسوخ کر دیا، جو غیر یہودی دنیا کو خاص طور پر ناگوار تھا۔حتیٰ کہ اس نے مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور ان کے ابن خدا ہونے اور صلیب پر جان دے کر اولاد آدم علیہ السلام کے پیدائشی گناہ کا کفارہ بن جانے کا عقیدہ

بھی تصنیف کر ڈالا، کیونکہ عام مشرکین کے مزاج سے یہ بہت مناسبت رکھتا تھا۔ یسوع مسیح علیہ السلام کے ابتدائی پیروؤں نے ان بدعات کی مزاحمت کی، مگر سینٹ پال نے جو دروازہ کھولا تھا اس سے غیر یہودی عیسائیوں کا ایک ایسا زبردست سیلاب اس مذہب میں داخل ہو گیا جس کے مقابلے میں وہ مٹھی بھر لوگ کسی طرح نہ ٹھہر سکے۔ تاہم تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک بکثرت لوگ ایسے موجود تھے جو مسیح علیہ السلام کی الوہیت کے عقیدے سے انکار کرتے تھے۔ مگر چوتھی صدی کے آغاز 325ء میں بمقام نیقیہ (NICAEA) کی کونسل نے پولوی عقائد کو قطعی طور پر مسیحیت کا مسلمہ مذہب قرار دے دیا۔ پھر رومی سلطنت خود عیسائی ہو گئی اور قیصر تھیوڈر سیس کے زمانے میں یہی مذہب سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا۔ اس کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ تمام کتابیں جو اس عقیدے کے خلاف ہوں مردود قرار دے دی جائیں، اور صرف وہی کتابیں معتبر ٹھہرائی جائیں جو اس عقیدے سے مطابقت رکھتی ہوں۔ 367ء میں پہلی مرتبہ اتھاناسیوس (ATHANASIUS) کے ایک خط کے ذریعے معتبر و مسلم کتابوں کے ایک مجموعے کا اعلان کیا گیا، پھر اس کی توثیق 382ء میں پوپ ڈامے سیس (DAMASIUS) کی زیر صدارت ایک مجلس نے کی اور پانچویں صدی کے آخر میں پوپ گلاسیس نے اس مجموعے کو مسلم قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان کتابوں کی ایک فہرست مرتب کر دی جو غیر تسلیم شدہ تھیں، حالانکہ جن پولوی عقائد کو بنیاد بنا کر مذہبی کتابوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کا یہ فیصلہ کیا گیا تھا، ان کے متعلق کبھی کوئی عیسائی عالم یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ ان میں سے کسی عقیدے کی تعلیم خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ بلکہ معتبر کتابوں کے مجموعے میں جو انجیلیں شامل ہیں خود ان میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اپنے کسی قول سے ان عقائد کا ثبوت نہیں ملتا۔

انجیل برناباس ان غیر معتبر کتابوں میں اس لیے شامل کی گئی کہ وہ مسیحیت کے اس سرکاری عقیدے کے بالکل خلاف تھی۔ اس کا مصنف کتاب کے آغاز ہی میں اپنا مقصد تصنیف یہ بیان کرتا ہے کہ "ان لوگوں کے خیالات کی اصلاح کی جائے جو شیطان کے دھوکے میں آ کر یسوع علیہ السلام کو ابن اللہ قرار دیتے ہیں، ختنہ کو غیر ضروری ٹھہراتے ہیں اور حرام کھانوں کو حلال کر دیتے ہیں، جن میں سے ایک دھوکا کھانے والا پولوس بھی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں موجود تھے اس زمانے میں ان کے معجزات کو دیکھ کر سب سے پہلے مشرک رومی سپاہیوں

نے ان کو خدا اور بعض نے خدا کا بیٹا کہنا شروع کیا، پھر یہ چھوت، بنی اسرائیل کے عوام کو بھی لگ گئی۔ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سخت پریشان ہوئے۔ انہوں نے بار بار نہایت شدت کے ساتھ اپنے متعلق اس غلط عقیدے کی تردید کی، اور ان لوگوں پر لعنت بھیجی جو ان کے متعلق ایسی باتیں کہتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے شاگردوں کو پورے یہودی علاقے میں اس عقیدے کی تردید کے لئے بھیجا اور ان کی دعا سے شاگردوں کے ہاتھوں بھی وہی معجزے صادر کرائے گئے جو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے صادر ہوتے تھے تاکہ لوگ اس غلط خیال سے باز آجائیں کہ جس شخص سے یہ معجزے صادر ہو رہے ہیں وہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے۔

اس سلسلے میں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مفصل تقریریں نقل کرتا ہے جن میں انہوں نے بڑی سختی کے ساتھ اس غلط عقیدے کی تردید کی تھی، اور جگہ جگہ یہ بتاتا ہے کہ آنجناب علیہ السلام اس گمراہی کے پھیلنے پر کس قدر پریشان تھے۔ مزید برآں وہ اس پولوسی عقیدے کی بھی صاف صاف تردید کرتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے صلیب پر جان دی تھی۔ وہ اپنے چشم دید بیان میں کہتا ہے کہ جب یہوداہ اسکریوتی یہودیوں کے سردار کاہن سے رشوت لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرانے کے لئے سپاہیوں کو لے کر آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار فرشتے آنجناب علیہ السلام کو اٹھا لے گئے اور یہوداہ اسکریوتی کی شکل اور آواز بالکل وہی کر دی گئی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تھی۔ صلیب پر وہی چڑھایا گیا تھا نہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ اس طرح یہ انجیل پولوسی مسیحیت کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور قرآن کے بیان کی پوری توثیق کرتی ہے، حالانکہ نزول قرآن سے 115 سال پہلے اس کے ان بیانات ہی کی بنا پر مسیحی پادری اسے رد کر چکے تھے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انجیل برنا باس درحقیقت اناجیل اربعہ سے معتبر انجیل ہے، مسیح علیہ السلام کی تعلیمات اور سیرت اور اقوال کی صحیح ترجمانی کرتی ہے اور یہ عیسائیوں کی اپنی بدقسمتی ہے کہ اس انجیل کے ذریعے سے اپنے عقائد کی تصحیح اور حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیمات کو جاننے کا جو موقع ان کو ملا تھا اسے محض ضد کی بنا پر انہوں نے کھو دیا۔ اس کے بعد ہم پورے اطمینان کے ساتھ وہ بشارتیں نقل کر سکتے ہیں جو رسول اللہ (ﷺ) کے بارے میں برنا باس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے روایت کی ہیں...... (اس کے بعد مولانا نے برنا باس کے باب 17, 42, 44, 72, 83, 96, 97, 113 سے مذکورہ بشارتیں نقل کی ہیں)۔

تین شبہات

ان صاف اور مفصل پیش گوئیوں میں صرف تین چیزیں ایسی ہیں جو بادی النظر میں نگاہ کو کھٹکتی ہیں۔

☆ ایک یہ کہ ان میں اور انجیل برناباس کی متعدد دوسری عبارتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مسیح علیہ السلام ہونے کا انکار کیا ہے۔

☆ دوسری یہ کہ صرف الٰہی عبارتوں میں نہیں بلکہ اس انجیل کے بہت سے مقامات پر رسول اللہ (ﷺ) کا اصل عربی نام "محمد" لکھا گیا ہے، حالانکہ یہ انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کا عام طریقہ نہیں ہے کہ بعد کی آنے والی کسی ہستی کا اصل نام لیا جائے۔

☆ تیسری یہ کہ اس میں آنحضرت ﷺ کو مسیح علیہ السلام کہا گیا ہے۔

شبہات کا جواب

پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ صرف انجیل برناباس ہی میں نہیں بلکہ لوقا کی انجیل میں بھی ذکر موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کو اس بات سے منع کیا تھا کہ وہ آپ کو مسیح علیہ السلام کہیں۔ لوقا کے الفاظ یہ ہیں۔ "اس نے ان سے کہا، لیکن تم مجھے کیا کہتے ہو؟ پطرس نے جواب میں کہا خدا کا مسیح۔ اس نے ان کو تاکید کر کے حکم دیا کہ یہ کسی سے نہ کہنا" (ب 20 `21 `9)۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل جس مسیح کے منتظر تھے اس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ تلوار کے زور سے دشمنان حق کو مغلوب کریں گے۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ "مسیح" میں نہیں ہوں بلکہ وہ میرے بعد آنے والا ہے۔

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ برناباس کا جو اطالوی ترجمہ اس وقت دنیا میں موجود ہے اس کے اندر تو حضور (ﷺ) کا نام بے شک "محمد (ﷺ)" لکھا ہوا ہے، مگر یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ کتاب کن کن زبانوں میں ترجمہ ہوتی ہوئی اطالوی زبان میں پہنچی ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل انجیل برناباس سریانی زبان میں ہو گی، کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی زبان تھی۔ اگر وہ اصل کتاب دستیاب ہوتی تو دیکھا جا سکتا تھا کہ اس میں آنحضرت کا اسم گرامی کیا لکھا گیا تھا۔ اب جو کچھ قیاس کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اصل میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے

لفظ ''منحمنا'' استعمال کیا ہوگا (سریانی زبان میں لفظ ''محمد (ﷺ)'' کا ہم معنی جس کا یونانی ترجمہ ''فارقلیط'' (PERICLYTOS) ہے...... پھر مختلف مترجموں نے اپنی اپنی زبانوں میں اس کے ترجمے کر دیئے ہوں گے۔ اس کے بعد غالباً کسی مترجم نے یہ دیکھ کر کہ پیش گوئی میں آنے والے کا جو نام بتایا گیا ہے وہ بالکل لفظ ''محمد (ﷺ)'' کا ہم معنی ہے، آپ ﷺ کا یہی اسم گرامی لکھ دیا ہوگا۔ اس لیے صرف اس نام کی تصریح یہ شبہ پیدا کر دینے کے لئے ہرگز کافی نہیں ہے کہ پوری انجیل برناباس کسی مسلمان نے جعلی تصنیف کر دی ہے۔

تیسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ لفظ ''مسیح'' درحقیقت ایک اسرائیلی اصطلاح ہے، جسے قرآن مجید میں مخصوص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے صرف اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ یہودی ان کے مسیح ہونے کا انکار کرتے تھے، ورنہ یہ نہ قرآن کی اصطلاح ہے نہ قرآن میں کہیں اس کو اسرائیلی اصطلاح کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے رسول اللہ (ﷺ) کے حق میں اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لفظ ''مسیح'' استعمال کیا ہو اور قرآن میں آپ (ﷺ) کے لئے یہ لفظ استعمال نہ کیا گیا ہو تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ انجیل برناباس آپ کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب کرتی ہے جس سے قرآن انکار کرتا ہے۔ دراصل بنی اسرائیل کے ہاں قدیم طریقہ یہ تھا کہ کسی چیز یا کسی شخص کو جب کسی مقدس مقصد کے لئے مختص کیا جاتا تھا تو اس چیز پر یا اس شخص کے سر پر تیل مل کر اسے متبرک (CONSECRATE) کر دیا جاتا تھا۔ عبرانی زبان میں تیل ملنے کے اس فعل کو مسح کہتے ہیں اور جس پر یہ ملا جاتا تھا اسے مسیح کہا جاتا تھا۔ عبادت گاہ کے ظروف اسی طریقے سے مسح کر کے عبادت کے لئے وقف کیے جاتے تھے۔ کاہنوں کو کہانت (PRIESTHOOD) کے منصب پر مامور کرتے وقت بھی مسح کیا جاتا تھا، بادشاہ اور نبی بھی جب خدا کی طرف سے بادشاہت یا نبوت کے لئے نامزد کیے جاتے تو انہیں مسح کیا جاتا۔ چنانچہ بائبل کی رو سے بنی اسرائیل کی تاریخ میں بکثرت مسیح (انجیل: مترجم آسی ضیائی) پائے جاتے ہیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام کاہن کی حیثیت سے مسیح تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کاہن اور نبی کی حیثیت سے، طالوت بادشاہ کی حیثیت سے، حضرت داؤد بادشاہ اور نبی کی حیثیت سے، ملک صدق بادشاہ اور کاہن کی حیثیت سے، اور حضرت الیسع علیہ السلام نبی کی حیثیت سے مسیح تھے۔ بعد میں یہ بھی ضروری نہ رہا کہ تیل مل کر ہی کسی کو مامور کیا جائے، بلکہ محض کسی کا مامور من اللہ ہونا مسیح

ہونے کا ہم معنی بن گیا تھا۔مثال کے طور پر دیکھئے۔ 1- سلاطین باب 19 میں ذکر آیا ہے کہ خدا نے حضرت الیاسؑ (ایلیاہ) کو حکم دیا کہ حزائیل کو مسح کر کہ آرام (دمشق) کا بادشاہ ہو اور نمسی کے بیٹے یاہو کو مسح کر کہ اسرائیل کا بادشاہ ہو اور الیشع (الیشع) کو مسح کر کہ تیری جگہ نبی ہو۔ان میں سے کسی کے سر پر بھی تیل نہیں ملا گیا۔بس خدا کی طرف سے ان کی ماموریت کا فیصلہ سنا دینا ہی گویا انہیں مسح کر دینا تھا۔پس اسرائیلی تصور کے مطابق لفظ مسیح درحقیقت ''مامور من اللہ'' کا ہم معنی تھا اور اسی معنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رسول اللہ کے لئے اس لفظ کو استعمال کیا تھا۔(لفظ ''مسیح'' کے اسرائیلی مفہوم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا آف بائبلیکل لٹریچر: بیساہ)

(بشکریہ ''برناباس کی انجیل'' مترجمہ آسی ضیائی،شائع کردہ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ)

انجیل برناباس

میں سے اقتباسات

ان اقتباسات میں حضرت محمد رسول اللہ کی بعثت کا واشگاف الفاظ میں ثبوت ملتا ہے۔ عیسائی دنیا اگر اس انجیل کو سچی تسلیم کر لے تو ان کے لئے اسلام کو قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی:

چند اقتباسات کا انگریزی متن اور ترجمہ یہ ہے۔

12 FIRST SERMON OF JESUS

Blessed be the holy name of God, who created the splendour of all the saints and prophets before all things to send him for the salvation of the world, as he spake by his servant David, saying: "Before Lucifer in the brightness of the saints Icreated thee." Blessed be the holy name of God, who created te angles that they might serve him. And blessed be God, who punished and reprobated Satan and his followers, who would not

reverence him whom God willeth to be revereneed.

یسوع کا پہلا وعظ

اللہ نے تمام مخلوق سے پہلے نبیوں کے سردار ﷺ کو پیدا فرمایا

باب 12: ''مبارک ہو خدا کا پاک نام جس نے تمام قدوسوں اور نبیوں کے سرتاج (ﷺ) کو تمام مخلوق سے پہلے پیدا فرمایا تاکہ اسے دنیا کی نجات کے لیے بھیجے، جیسا کہ اس نے اپنے بندے داؤد علیہ السلام کی زبانی فرمایا کہ: ستارہ صبح سے پہلے قدوسوں کی تابانی میں میں نے تجھے پیدا کیا''۔

''مبارک ہو خدا کا پاک نام جس نے فرشتے پیدا کیے تاکہ وہ اس کی خدمت کریں''۔

''اور مبارک ہو خدا کا پاک نام جس نے ابلیس اور اس کے پیرووں کو، جنہوں نے اس کو سجدہ کرنے سے انکار کیا، جسے خدا چاہتا تھا کہ سجدہ کیا جائے، سزا دی اور مردود کیا''۔

17 SLPENDOUR OF ALL THE PROPHETS

Philip answered: 'Master, what sayest thou? It is surely written in Isaiah that God is our father: how. then hath he no sons?'

Jesus asnwered: 'There are written in the prophets many parables, wherefore thou oughtest not to attend to the letter, but to the sense. For all the prophets, that are one hundred and forty-four thousand, whom. God hath sent in to the world, have spoken darkly. But after me shall come the Splendour of all the prophets and holy ones, and shall shed light upon the darkness of all that the prophets have said, because he is the messenger of God.

نبیوں ﷺ کی تعداد اور ان کے "سرتاج"

فلپس نے جواب دیا: "استاد، یہ تو کیا کہتا ہے؟ یقیناً یسعیاہ میں لکھا ہے کہ خدا ہمارا باپ ہے۔ پھر اس کے بیٹے کیونکر نہیں ہیں؟"

یسوع نے جواب دیا: "نبیوں کے ہاں بہت سی تمثیلیں لکھی ہیں، سو تو لفظ پر نہ جا بلکہ مفہوم پر دھیان کر۔ کیونکہ تمام نبیوں نے، جو ایک لاکھ چوالیس ہزار ہوئے ہیں جنہیں خدا نے دنیا میں بھیجا، پردے میں بات کی ہے۔ مگر میرے بعد تمام نبیوں اور قدوسوں کا سرتاجؐ آئے گا اور تمام پردے کی باتوں کو، جو نبیوں نے کیں، واضح کرے گا، کیونکہ وہ خدا کا رسول (ﷺ) ہے"۔

39 ADAM KISSED UPON HIS NAIL, NAME OF MOHAMMED

Then God gave his soul to man, while all the holy angels sang: "Blessed by thy holy name, O God our Lord."

'Adam, having sprung up upon his feet, saw in the air a writing that shone like the sun, which said: "There is only one God, and Mohammed is the messenger of God." Whereupon Adam opened his mouth and said: "I thank thee, O Lord may God. that thou hast deigned to create me; but tell me. I pary thee. what meaneth the message of these words:

"Mohammed is messenger of God." Have there been other men before me?"

'Then said Gopd: Be thou welcome. O my servant Adam. I tell thee that thou art the first man whom I have

created. And he whom thou hast seen mentioned is thy son, who shall come into the world many years hence, and shall be my messenger, for whom. I have created all thengs: who shall give light to the world when he shall come; whose soul was set in a celestial splendour sixty thousand years before I made anything."

'Adam besought God, saying: "Lord, grant me this writing upon the nails of the fingers of my hands." Then God gave to the first man upon his thums that writing; upon the thumb-nail of the right hand it said: "There is only one God", and upon the thumb-nail of the left is said: "Mohammed is messenger of God.: Then whith fatherly affection of the first man kissed those words, and rubbed his eyes, and said: Blessed be that day when thou shalt come to the world."

آدم علیہ السلام نے سورج کی طرح روشن کلمہ طیبہ لکھا ہوا دیکھا

باب39: ”تب خدا نے انسان کو روح بخشی، اس وقت تمام پاک فرشتوں نے گایا۔ ”تیرا پاک نام مبارک ہو، اے ہمارے خداوند خدا“۔

”جب آدم علیہ السلام اٹھ کھڑا ہوا تو اس نے ہوا میں ایک تحریر دیکھی جو سورج کی طرح چمکتی تھی، کہ، خدا ایک ہی ہے، اور محمد خدا کا رسول ہے (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ)، اس پر آدم نے اپنا منہ کھولا اور کہا، اے خداوند میرے خدا، میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے میری تخلیق کی تقدیر فرمائی، مگر میں منت کرتا ہوں، مجھے بتا ان الفاظ کا کیا مطلب ہے۔ ”محمد خدا کا رسول ہے“ کیا مجھ سے

پہلے اور انسان بھی ہوئے ہیں؟

''تب خدا نے کہا۔ مرحبا، اے میرے بندے آدم علیہ السلام میں تجھے بتاتا ہوں کہ تو پہلا انسان ہے جسے میں نے پیدا کیا۔ اور وہ جسے تو نے (مندرج) دیکھا ہے، تیرا بیٹا ہے، جو دنیا میں اب سے بہت سال بعد آئے گا اور میرا رسول ہوگا، جس کے لئے میں نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں، جو آئے گا تو دنیا کو نور بخشے گا جس کی روح میرے ہر چیز پیدا کرنے سے ساٹھ ہزار سال پہلے ملکوتی شان میں رکھی گئی تھی''۔

''آدم نے خدا کی منت کی کہ خداوند، یہ تحریر میرے ہاتھوں میں انگلیوں کے ناخنوں پر درج فرما دے، تب خدا نے پہلے انسان کے انگوٹھوں پر یہ تحریر درج کردی، دائیں انگوٹھے کے ناخن پر لکھا تھا۔ خدا ایک ہی ہے، اور بائیں انگوٹھے کے ناخن پر لکھا تھا، محمد خدا کا رسول ہے، تب پہلے انسان نے پدرانہ شفقت سے یہ الفاظ چومے اور اپنی آنکھیں ملیں اور کہا، مبارک ہو وہ دن جب تو دنیا میں آئے''۔

(42) MESSENGER OF GOD WHOM YE CALL "MESSIAH"

Then the disciples wept after this discourse, and Jesus was weeping, when they saw many who came to find him, for the chiefs of the priests took counsel among themselves to catch him in his talk. Wherefore they sent the Levites and some of the scribes to question him, saying: 'Who are thou?'

Jesus confessed, and said the truth: 'I am not the Messiah.'

They said: 'Art thou Elijah of Jeremiah, or any of the ancient prophets?,

Jesus answered: 'No.'

Then said they: 'Who art thou? Say, in order that we may give testimony to those who sent us.'

Then said Jesus: 'I an a voice that crieth through all Judaea, and crieth: "Prepare ye the way for the messenger of the Lord," even as it is written in Esaias.'

They said: If thou be not the Messiah nor Elijah, or any prophet, wherefore dost thou preach new doctrine, and make thyself of more account than the Messiah?'

Jesus answered: 'The miracles which God worketh by my hands show that I speak that which God willeth; nor indeed do I make myself to be accounted as him of whom ye speak. For I am not worthy to unloose the ties of .... or the latchets of the shoes of the messenger of God whom ye call "Messiah," who was made before me, and shall come after me, and shall bring the words of truth, so that his faith shall have no end.'

”میں وہ مسیح نہیں“...... یسوع کا اقرار

باب42: اس تقریر کے بعد شاگرد روئے اور یسوع بھی رو رہا تھا کہ انہوں نے بہتوں کو دیکھا جو اس کی تلاش میں آئے تھے، کیونکہ سردار کاہنوں نے آپس میں صلاح کی تھی کہ اس کی باتوں میں اسے پھانسیں۔ سو انہوں نے لاویوں اور کچھ فقیہوں کو بھیجا تھا کہ اس سے سوال کریں کہ: ”تو کون ہے؟“

یسوع نے اقرار کیا اور سچ بات کہی ”میں مسیح نہیں ہوں“۔

انہوں نے کہا، ''کیا تو ایلیاہ یا یرمیاہ یا کوئی اور قدیم نبی ہے؟''۔

یسوع نے جواب دیا، ''نہیں''۔

پھر انہوں نے کہا، ''تو کون ہے؟ بتا، تا کہ جنہوں نے ہمیں بھیجا ہے ہم انہیں گواہی دے سکیں''۔

تب یسوع نے کہا، ''میں ایک آواز ہوں جو سارے یہودیہ میں پکارتی ہے کہ ''خداوند کے رسولؐ کے لئے راہ تیار کرو، جیسا یسعیاہ کی کتاب میں لکھا ہے''۔

انہوں نے کہا، ''اگر تو مسیح نہیں، نہ ایلیاہ نہ کوئی اور نبی تو، تو نئے عقیدے کیوں سکھاتا اور مسیح سے زیادہ اپنا چرچا کراتا ہے''۔

یسوع نے جواب دیا، ''جو معجزے خدا میرے ہاتھ سے کراتا ہے ان سے ظاہر ہے کہ میں وہی کہتا ہوں جو خدا کی مرضی ہے، نہ میں فی الواقع خود کو وہ کہلواتا ہوں جس کا تم ذکر کرتے ہو۔ کیونکہ میں اس لائق نہیں کہ خدا کے اس رسول کی جرابوں کے بند یا جوتیوں کے تسمے کھول سکوں جسے تم ''مسیح'' کہتے ہو، جو مجھ سے پہلے تخلیق کیا گیا اور میرے بعد آئے گا اور سچائی کا کلام لائے گا، کہ اس کے دین کی انتہا نہ ہوگی''۔

(43) SALVATION AND MERCY TO ALL NATIONS

' Verily I say unto you, that every prophet when he is come hath borne to one nation only the mark of the mercy of God. And so their words were not extended save to that people to which they were sent. But the messenger of God, when he shall come, God shall give to him as it were the seal of his hand, insomuch that he shall carry salvation and mercy to all the nations of the world that

shall receive his doctrine. He shall come with power upon the ungodly, and shall destroy idolatry, insomuch that he shall make Satan confounded: for so promesed God to Abraham, saying: "Behold, in thy seed I will bless all the tribes of the earth; and as thou hast broken in pieces the idols, O Abraham, even so shall thy seed do."

James answered: 'O master, tell us in whom this promise was made; for the Jews say "in Isaac," and the Ishmaelites say "in Ishmael.",

Jesus answered: 'David, whose son was he, and of what lineage?'

James answered: 'Of Isaac; for Isaac was father of Jacob, and Jacob was father of Judah, of whose lineage in David.'

Then said Jesus: And the messenger of God when he shall come, of what lineage will he be?.

The disciples answered: 'Of David.'

Whereupon Jesus said: 'Ye deceive yourselves, for David in spirit calleth him lord, saying thus: "God said to my lord sit thou on may right hand until I make thine enemies thy foot-stool. God shall send forth thy rod which shall have lordship in the midst of thine enemies." If the messenger of God whom ye call Messiah were son of David, how should David call him lord? Believe me, for

verily I say to you, that the promise was made in Ishmael, not in Isaac.'

ابدی وعالمگیر اخوت کا رسول

باب 43: ''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ہر نبی جب آیا ہے خدا کی رحمت کا نشان صرف ایک قوم کے لئے لایا ہے اور اسی لیے ان کا کلام نہ پھیلا، سوائے ان لوگوں تک جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے۔ لیکن خدا کا رسول، جب وہ آئے گا تو خدا اسے گویا اپنے ہاتھ کی مہر کرے گا کہ وہ دنیا کی ان تمام قوموں کے لئے جو اس کا دین قبول کریں گی نجات اور رحمت لائے گا۔ وہ بے دینوں پر قوت کے ساتھ آئے گا اور بت پرستی مٹا دے گا، یہاں تک کہ وہ شیطان کو مبہوت کر دے گا، کیونکہ خدا نے ابراہام علیہ السلام سے یہی وعدہ کیا تھا کہ دیکھ، تیری نسل، میں میں زمین کے تمام قبیلوں کو برکت دوں گا، اور جس طرح، اے ابراہام، تو نے بت پاش پاش کئے اسی طرح تیری نسل بھی کرے گی''۔

یعقوب نے جواب میں کہا۔ استاد، ہمیں بتا کہ وہ وعدہ کس میں کیا گیا تھا، کیونکہ یہودی کہتے ہیں اسحاق اور اسماعیل کہتے ہیں،

یسوع نے جواب دیا۔''داؤد کس کا بیٹا تھا اور کس نسل سے؟''

یعقوب نے جواب دیا۔''اسحاق کا'' ''کیونکہ اسحاق یعقوب کا باپ تھا اور یعقوب یہوداہ کا باپ تھا، جس کی نسل سے داؤد ہے''۔

تب یسوع نے کہا ''اور خدا کا رسول، جب وہ آئے گا تو کس کی نسل سے ہوگا''۔

شاگردوں نے جواب دیا ''داؤد کی''۔

اس پر یسوع نے کہا ''تم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہو، کیونکہ داؤد روحانی جوش میں اسے آقا کہتا ہے، جیسا کہ اس کا قول ہے ''خدا نے میرے آقا سے کہا، تو میرے دہنے ہاتھ بیٹھ، جب تک میں تیرے دشمنوں کو تیرے پاؤں کی چوکی نہ کر دوں خدا تیرا عصا بھیجے گا جو تیرے دشمنوں کے درمیان حکمرانی کرے گا، اگر خدا کا رسول، جسے تم مسیح کہتے ہو، داؤد کا بیٹا ہوتا تو داؤد اسے آقا کیونکر کہتا؟ یقین کرو، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ وعدہ اسماعیل میں تھا نہ کہ اسحاق میں''۔

(44) THE LINEAGE OF THE MESSIAH

Thereupon said the disciples: 'O master, it is thus written in the book of Moses, that in Isaac was the promise made.'

Jesus anwered, with a groan: 'It is so written, but Moses wrote it not, nor Joshua, but rather our rabbins, who fear not God, Verily I say unto you, that if ye consider the word of the angel Gabriel, ye shall discover the malice of our scribes and doctors. For the angel said: "Abraham, all the world shall know how God loveth thee: but how shall the world know the love that thou bearest to God? Assuredly it is necessary that thou do something for love of God." Abraham answered: "Behold the servant of God, ready to do all that which God shall will."

Then spake God, say ing to Abrahdm "Take thy son thy firstborn Ishmael, and come up the mountains to sacrifice him." How is Isaac firstborn, if when Isaac was born Ishmael was seven years old?

Then said the disciples: 'Clear is the deception of our doctor: therefore tell us thou the truth, because we know that thou art sent from God.'

Then asnwered Jesus: 'Verily I say unto you, that Satan ever seeketh to annul the laws of God; and

therefore he with his followers, hypocrites and evildoers, the former with false doctrine, the latter with lewd living, to-day have contaminated almost all things, so that scarcely in the truth found, Woe to the hypocrites! for the praises of this world shall turn for them into insults and torments in hell.

'I therefore say unto you that the messenger of God is a splendour that shall give gladness to nearly all that God hath made, for he is adorned with the spirit of understanding and of counsel, the spirit of wisdom and might, the spirit of fear and love, the spirit of prudence and temperance, he is adorned with the spirit of charity and mercy, the spirit of justice and piety, the spirit of gentleness and patience, which he hath given to all his creatures. O blessed time, when he shall come to the world! Believe me that I have seen him and have done him reverence, even as every prophet hath seen him: seeing that of his spirit God giveth to them prophecy. And when I saw him my soul was filled with consolation, saying: "O Mohammed, God be with thee, and may he make me worthy to untie thy shoelatchet, for obtaining this I shall be a great prophet and holy one of God."

And having saying this, Jesus rendered this thank to God.

نصرانی اور یہودی عالموں کا بغض

باب 44: اس پر شاگردوں نے کہا۔ ''اے استاد، موسیٰ کی کتاب میں یوں لکھا ہے کہ یہ وعدہ اسحاق میں کیا گیا تھا''۔ (دیکھو پیدائش 12'1)

یسوع نے کراہ کر جواب دیا۔ ''ایسا ہی لکھا ہے، مگر موسیٰ نے نہیں لکھا، نہ یشوع نے لکھا، بلکہ ہمارے ربیوں نے، جو خدا سے نہیں ڈرتے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تم فرشتے جبرئیل کے الفاظ پر غور کرو تو تم ہمارے فقیہوں اور عالموں کا بغض جان لو گے۔ کیونکہ فرشتے نے کہا۔ ابرہام، ساری دنیا جان لے گی کہ خدا سے تجھے کتنی محبت ہے؟ یقیناً یہ ضروری ہے کہ تو خدا کی محبت کے لئے کچھ کر، ابرہام نے جواب دیا۔ دیکھو، خدا کا بندہ، جو کچھ خدا کی مرضی ہو کرنے کو تیار ہے''۔

''تب خدا نے ابرہام سے فرمایا۔ ''اپنا بیٹا اپنا پہلوٹھا، اسماعیل لے اور پہاڑ پر آ کر اس کی قربانی دے، سو اسحاق پہلوٹھا کیوں کر ہوا، کہ جب اسحاق پیدا ہوا تو اسماعیل سال سال کا تھا؟''۔

تب شاگردوں نے کہا۔ ''ہمارے عالموں کا فریب ظاہر ہے، سو ہمیں سچ بتا، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تو خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے''۔

تب یسوع نے جواب دیا ''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ شیطان خدا کی شریعت باطل کرنے کی تاک میں رہتا ہے، سو اس نے اپنے پیروؤں، یعنی ریکاروں اور بدکاروں کے ساتھ...... اول الذکر نے فاسد عقیدے اور ثانی الذکر نے ذلیل زندگی کی بدولت...... آج تقریباً سب باتیں ایسی آلودہ کر دی ہیں کہ سچائی مشکل سے ملتی ہے۔ وائے ان ریاکاروں پر کہ اس دنیا کی تحریص ان کے لئے دوزخ میں ذلت اور عذاب بن جائے گی۔

''پس میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کا رسول ایک شان ہے جو تقریباً سب کو، جنہیں خدا نے بنایا ہے، مسرت بخشے گا، کیونکہ وہ آراستہ ہے فہم اور صلاح کی روح سے، عقل اور طاقت کی روح سے، خوف اور محبت کی روح سے، دانائی اور اعتدال کی روح سے، وہ آراستہ ہے سخاوت اور رحم کی روح سے، انصاف اور تقویٰ کی روح سے، شرافت اور صبر کی روح سے، جو اسے خدا نے اپنی

تمام مخلوقات میں سے تین گنی زیادہ عطا کی ہیں۔ کیا ہی مبارک ہے وہ وقت جب وہ دنیا میں آئے گا! یقین جانو، میں نے اسے دیکھا ہے۔ اور اس کی تعظیم کی ہے، جیسے ہر نبی نے اسے دیکھا ہے کہ کیونکہ اسی کی روح سے خدا نے انہیں نبوت دی اور جب میں نے اسے دیکھا تو میری روح تسکین سے بھر گئی، یہ کہہ کر کہ اے محمد، خدا تیرے ساتھ ہو اور وہ مجھے اس لائق بنائے کہ میں تیری جوتی کا تسمہ کھول سکوں، کیونکہ یہ پا کر میں ایک بڑا نبی اور خدا کا قدوس ہو جاؤں گا"۔

اور یہ کہہ کر یسوع نے خدا کا شکر ادا کیا۔

ALL PROPHETS WOULD REQUEST (54) MOHAMMED TO PROTECT AND FAVOUR THEM

When these signs be passed, there shall be darkness over the world forty years, God alone being alive, to whom be hounour and glory for ever. When the forty years be passed, God shall give life to his messenger, who whall rise again like the sun, but resplendent as a thousand suns. He shall sit, and shall not speak, for he shall be as it were beside himself. God who shall seek the messenger of God, and, having found him, shall station themselves on the four sides of the place to keep watch upon him. Next shall God give life to all the angles, who shall come like bees circling round the messenger of God. Next shall God give life to all his prophets, who, following Adam,

shall go every one to kiss the hand If the messenger of God, committing themselves to his protection. Next shall God give life to all the elect, who shall cry out: "O Mohammed, be mindful of us!" At whose cries pity shall awake in the messenger of God, and he shall consider what he ought to do, fearing of their salvation. Next shall God give life to every created thing, and they shall return to their former existence, but every one shall besides possess the power of speech. Next shall God give life to all the reprobates, at whose resurrection, by reason of their hideousness, all the creatures of God shall b afriad, and shall cry: "Let not thy mecry forsake us, O Lord our God." After this shall God cause Satan to be raised up, at whose aspect every creature shall be as dead, for fear of the horrid form of his appearance. May it please God,' Said Jesus, 'that I behold not that monster on that day. The messenger of God alone shall not be affrighted by such shapes, because he shall fear God only.

'Then the angel, at the sound of whose trumpet all shall be raised, shall sound his trumped again, saying: "Come to the judgement, O creatures, for your Creator willeth to judge you." Then shall appear in the midst of heaven over the valley of Jehoshaphat a glittering throne,

over which shall come a white cloud, Whereupon the angles shall cry out: "Blessed be thou our God, who hast created us, and saved us from the fall of Satan." Then the messenger of God shall fear, for that he shall perceive that none hath loved God as he should. For he who would get in change a piece of gold must have sixty mites; wherefore, If he have but one mite he cannot change it. But if the messenger of God shall fear, what shall the ungodly do who are full of wickedness?

(54) ''قیامت میں تمام برگزیدہ پکار اٹھیں گے اے محمد (ﷺ) ہمارا خیال رکھیو''

باب54: ''جب یہ نشانیاں ہوچکیں گی تو دنیا پر چالیس سال تاریکی چھائی رہے گی، جب تنہا خدا زندہ ہوگا، جو ابد تک محمود اور مجید ہے۔ جب یہ چالیس سال گزر جائیں گے تو خدا اپنے رسول کو اٹھائے گا، جو پھر سورج کی طرح، مگر ہزار سورجوں جیسا تابندہ، اٹھے گا۔ وہ بیٹھ جائے گا مگر بات نہ کرے گا، کیونکہ وہ گویا (خدا کی محبت میں) بے خود سا ہوگا۔ پھر خدا اپنے چاروں برگزیدہ فرشتے اٹھائے گا، جو خدا کے رسول کو تلاش کریں گے، اور اسے پا کر اس جگہ کے چار اطراف پر اس کی نگہبانی کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔ اس کے بعد خدا تمام فرشتوں کو جلا بخشے گا، جو خدا کے رسول کے گرد مہالوں (شہد کی مکھیوں) کی طرح جھومتے چکر لگاتے آئیں گے۔ اس کے بعد خدا اپنے تمام نبیوں کو اٹھائے گا، جو آدم کے پیچھے ایک ایک کر کے خدا کے رسول کا ہاتھ آ کر چومیں گے، اور خود کو اس کی پناہ میں دے دیں گے۔ پھر خدا تمام برگزیدوں کو زندہ کرے گا، جو پکار اٹھیں گے۔ ''اے محمد'' ہمارا خیال رکھیو! ان کی پکاروں پر خدا کے رسول میں رحم و کرم کا جذبہ ٹھاٹھیں مارنے لگے گا۔ اور وہ ان کی نجات پر فکر مند ہو کر سوچے گا کہ وہ کیا کرے۔ پھر خدا ہر مخلوق شے کو زندگی دے گا، اور وہ اپنے سابق وجود پر لوٹ آئے گی، لیکن، ساتھ ہی، ہر ایک کو بولنے کی طاقت بھی ہوگی۔ پھر خدا تمام مجرموں کو زندہ کرے گا، جن کے

اٹھتے ہی، ان کی بد ہیتی کے باعث خدا کے تمام مخلوق ڈر جائیں گے، اور پکار اٹھیں گے۔ ''ہمیں اپنے رحم سے محروم نہ کرنا، اے خداوند ہمارے خدا، اس کے بعد خدا شیطان کو اٹھنے کا حکم دے گا، جس کی مہیب شکل نظر آنے پر ہر مخلوق پر ڈر کے مارے مردنی چھا جائے گی۔'' خدا کرے' یسوع نے کہا، '' کہ میں اس عفریت کو اس دن نہ دیکھنے پاؤں، صرف خدا کا رسول ایسی شکلوں سے خوف نہ کھائے گا، کیونکہ وہ صرف خدا سے ڈرے گا۔

'' تب وہ فرشتہ جس کے نرسنگے کی آواز پر سب جی اٹھیں گے، اپنا نرسنگا پھر بجائے گا جس میں کہے گا۔ اے مخلوقو، حساب دینے آؤ کیونکہ تمہارا خالق تم سے حساب لینا چاہتا ہے۔ تب آسمان کے بیچوں بیچ، وادی یہوسفط کے اوپر ایک جگمگاتا تخت نمودار ہوگا جس کے اوپر ایک سفید بادل چھایا ہوگا، جس پر فرشتے پکار اٹھیں گے۔ ''مبارک ہو تو، ہمارے خدا' جس نے ہمیں پیدا کیا، ہمیں شیطان کے زوال سے بچایا، تب خدا کے رسول کو اندیشہ ہوگا وہ دیکھے گا کہ کسی نے خدا سے جیسی چاہئے تھی ویسی محبت نہیں کی۔ کیونکہ جو سونے کا ایک سکہ لینا چاہے گا اس کے پاس ساٹھ پیسے ضرور ہونے چاہئیں، سو اگر اس کے پاس ایک ہی پیسہ ہو تو وہ اس کا مبادلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر خدا کے رسول کو یہ اندیشہ ستائے گا تو بدکاروں کا کیا حال ہوگا جو شرارت سے بھرے ہوئے ہیں؟'

55 MOHAMMED AT THE JUDGEMENT

'The messenger of God shall go to collect all the prophets, to whom he shall speak, praying them to go with him to pray God for the faithful. And every one shall excuse himself for fear: nor, as God liveth, would I go there, knowing what I know. Then God, seeing this, shall remind his messenger how he created all things for love of him, and so his fear shall leave him, and he shall go nigh unto the throne with love and reverence, while the

angles sing: "Blessed be thy holy name, O God, our God."

'And when he hath drawn nigh unto the throne, God shall open his mind unto his messenger, even as a friend unto a friend when for a long while they have not met. The first to speak shall be the messenger of God, who shall say: "I adore and love thee, O my God, and with all my heart and soul I give thee thanks for that thou didst vouchsafe of create me to be thy servant, and madest all for love of me, so that I might love thee for all Things and above all thins; therefore let all thy creatures praise thee. O my God." Then all things creared by God shall say: "We give thee thanks, O Lord, and bless thy holy name. "Verily I say unto you, the demouns and reprobates with Satan shall then veep so that move water shall flow from the eyes of one of them than is in the river of Jordan. Ye shall they not see God.

'And God shall speak unto his messenger, saying: "Thou art welcome, O my faithful servant; therefeor ask what thou wilt, for thou shalt obtain all." The messenger of God shall answer. "O Lord, I remeber that when thou didst create me, thou saidst that thou hadst willed to make for love of me the world and paradise, and angels and men,

that they might glorify thee by me thy servant. Therefore, Lord God, mecriful and just, I pray thee that thou recollect thy promise made unto thy servant."

'And God shall make answer even as a friend who jesteth with a friend, and shall say: "Hast thou witnesses of this, my friend Mohammed?" and with reverance he shall say: "Yes, Lord." Then God shall answer: "Go, call them. O Gabrial." The angel Gabriel shall come to the messenger of God, and shall say: "Lord. who are thy witnesses?" The messenger of God shall answer: "They are Adam, Abraham, Ishmael, Moses, David, and Jesus son of Mary."

'Then shall the engel depart, and he shall call the aforesaid witnesses, who with fear shall go thither. And when they are present God shall say unto them: "Temember ye that which my messenger affirmeth?" They shall reply: "What thing, O Lord?" god shall say: "That I have made all things for love of him, so that all things might praise me by him. "Then every one of them shall answer: "There are with us three witnesses better than we are, O Lord." And God shall reply: "Who are thse three witnesses?" Then Moses shall say: "The book that thou

gavest to me is the first": and David shall say: "The book that thou gavest to me is the second"; and he who speaketh to you shall say: "Lord, the whole world, deceived by Satan, said that I was thy son and thy fellow, but the book that thou gavest me said truly that I am thy servant: and that book confesseth that which thy messenger affirmeth." Then shall the messenger of God speak, and shall say: "Thus saith the book that thou gavest me, O Lord." And when the messenger of God hath said this, God shall speak, saying: "All that I have now done, I have done in order that every one should know how much I love thee." And when he hath thus spoken, God shall give unto his messenger a book, in which are written all the names of the elect of God. Wherefore very creature shall do reverence to God, saying: "To three alone, O God, be glory and honour, because thou hast given us to thy messenger."

(55) محمد (ﷺ) تمام نبیوں کو اہل ایمان کے لیے شفاعت ودعا کی دعوت دیں گے

باب 55: ”خدا کا رسول تمام نبیوں کو جمع کرنے جائے گا، جن سے وہ منت کرے گا کہ اس کے ساتھ چل کر اہل ایمان کے لئے خدا سے دعا کریں اور ہر ایک خوف کے مارے عذر کرے گا، خدائے زندہ کی قسم، میں بھی وہاں نہ جاؤں گا کیونکہ مجھے معلوم ہے جو معلوم ہے۔ تب ذرا یہ دیکھ کر اپنے رسول کو یاد دلائے گا کہ اس نے اس کی محبت میں سب چیزیں پیدا کیں، سو یوں اس کا اندیشہ جاتا رہے گا اور وہ تخت کے پاس محبت اور ادب سے جائے گا، جب کہ فرشتے گاتے

ہوں گے، مبارک ہو تیرا پاک نام، اے خدا ہمارے خدا"۔

"اور جب وہ تخت کے قریب پہنچے گا تو خدا اپنے رسول سے (اپنی حکمت) کھولے گا، (گویا ہو گا) جیسے ایک دوست دوست سے، جب وہ بہت مدت سے نہ ملے ہوں۔ بولنے میں پہل خدا کا رسول کرے گا، جو کہے گا "میں تیری پرستش اور تجھ سے محبت کرتا ہوں، اے میرے خدا اپنے سارے دل اور جان سے تیرا شکرادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے پیدا فرمایا کہ تیرا خادم بنوں اور میری محبت میں سب کچھ بنایا، تاکہ میں تجھ سے سب چیزوں کی خاطر اور سب چیزوں میں اور سب چیزوں سے بڑھ کر محبت کروں، سوائے میرے خدا، اپنے تمام مخلوقوں کو اپنی حمد کرنے دے۔ تب خدا کی تمام پیدا کی ہوئی چیزیں کہیں گی...... ہم تیرا شکرادا کرتے ہیں، خداوند، اور تیرے پاک نام کی تقدیس کرتے ہیں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تب شیاطین اور مجرم مع ابلیس کے اتنا روئیں گے کہ ان میں سے ایک کی آنکھوں سے دریائے اردن سے بھی زیادہ پانی بہے گا۔ تب بھی وہ خدا کو نہ دیکھ پائیں گے"۔

"اور خدا اپنے رسول سے کلام کرے گا کہ تیرا آنا مبارک، اے میرے وفادار بندے (عبدہ) مانگ جو تو چاہے کہ تجھے سب کچھ ملے گا (سبحان اللہ)، خدا کا رسول جواب دے گا "اے خداوند مجھے یاد ہے کہ جب تو نے مجھے پیدا کیا تو فرمایا تھا کہ میری محبت میں تو دنیا اور بہشت اور فرشتے اور انسان بنانا چاہتا ہے، تاکہ وہ مجھ تیرے بندے، کے واسطے تیری تمجید کریں۔ سو خداوند خدائے رحیم و عادل، میں تیری منت کرتا ہوں کہ اپنے خادم سے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا فرما"۔

"اور خدا، جیسے ایک دوست، دوست سے ہنسی کرتا ہے فرمائے گا کیا تیرے پاس اس بات کے گواہ ہیں اے میرے دوست محمد اور وہ ادب سے کہے گا "ہاں خداوند"۔ تب خدا جواب میں کہے گا جا اور انہیں بلا، اے جبریل! فرشتہ جبریل خدا کے رسول کے پاس آئے گا اور کہے گا آقا، تیرے گواہ کون ہیں؟ خدا کا رسول جواب دے گا "وہ ہیں آدم علیہ السلام، ابرہام علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، داؤد علیہ السلام اور یسوع علیہ السلام، مریم علیہا السلام کا بیٹا"۔

"تب فرشتہ جا کر ان مذکور گواہوں کو بلائے گا، جو ڈرتے ہوئے ادھر جائیں گے اور جب وہ حاضر ہو جائیں گے تو خدا ان سے کہے گا میرا رسول جس بات کا دعویٰ کرتا ہے وہ تمہیں یاد

ہے؟ وہ جواب میں کہیں گے کیا بات، اے خداوند؟ خدا فرمائے گا یہ کہ میں نے اس کی محبت میں سب چیزیں بنائیں تاکہ سب چیزیں اس کے واسطے سے میری حمد کریں۔ تب ان میں سے ہر ایک جواب دے گا خداوند ہمارے پاس تین گواہ ہم سے بہتر ہیں۔ اور خدا جواب دے گا یہ تین گواہ کون ہیں؟ تب موسیٰ علیہ السلام کہے گا پہلا وہ کتاب ہے جو تو نے مجھے عطا کی اور داؤد علیہ السلام کہے گا دوسرا وہ کتاب ہے جو تو نے مجھے دی۔ اور جو تم سے مخاطب ہے (مسیح علیہ السلام ابن مریم علیہا السلام) کہے گا خداوند ساری دنیا نے شیطان کے بہکانے سے مجھے تیرا بیٹا اور تیرا ساجھی کہا، مگر جو کتاب تو نے مجھے دی اس نے سچ سچ کہا کہ میں تیرا بندہ ہوں اور جو تیرا رسول دعویٰ کرتا ہے یہ کتاب اس کی تصدیق کرتی ہے، تب خدا کا رسول گویا ہو کر کہے گا اے خداوند جو کتاب تو نے مجھے دی ہے وہ بھی یہی کہتی ہے اور خدا کا رسول یہ کہہ چکے گا تو خدا فرمائے گا جو کچھ میں نے اب کیا اس لئے کیا کہ ہر ایک جان لے کہ میں تجھے کتنا عزیز رکھتا ہوں اور جب وہ یہ کہہ چکے گا تو خدا اپنے رسول کو ایک کتاب عطا کرے گا جس میں خدا کے تمام برگزیدوں کے نام درج ہیں۔ تب ہر مخلوق خدا کی تقدیس کرے گی کہ تجھی کو اے خدا، جلال اور عزت ہو، کیونکہ تو نے ہمارے تئیں اپنے رسول کو دیا"۔

(56) PLACE & ROLE OF MOHAMMED ON THE DAY OF JUDGEMENT

'God shall open the book in the hand of his messenger, and his messenger reading therein shall call all the angels and prophets and all the elect, and on the forehead of each one shall be written the mark of the messenger of God. and in the books shall be written the glory of paradise.

'Then shall each pass the right hand of God; next to

whom shall sit the messenger of God, and the prophets shall sit near him, and the saints shall sit near the prophets, and the blessed near the saints, and the angel shall then sound th trumpet, and shall call Satan to judgement.

(56) تمام برگزیدوں کی پیشانیوں پر کلمہ طیبہ لکھا ہوگا

باب56: "خدا اپنے رسول کے ہاتھ میں وہ کتاب کھولے گا اور اس کا رسول اس میں سے پڑھ کر تمام فرشتوں اور نبیوں اور سب برگزیدوں کو بلائے گا، اور ہر ایک کی پیشانی پر خدا کے رسول کی نشانی لکھی ہوگی اور کتاب میں بہشت کی شان لکھی ہوگی"۔

"تب خدا کے داہنے ہاتھ ہر ایک چلا جائے گا، خدا کے پہلو میں خدا کا رسول (ﷺ) بیٹھے گا اور اس کے بعد نبی بیٹھیں گے، اور نبیوں کے بعد ولی بیٹھیں گے اور ولیوں کے بعد نیکوکار بیٹھیں گے، اور تب فرشتہ نرسنگا بجا کر ابلیس کو عدالت کے لئے طلب کرے گا"

72/A JESUS CAME TO PREPARE WAY FOR MESSENGER OF GOD (MOHAMMED)

Jesus answered: 'Let not your heart be troubled, neither be ye fearful: for I have not created you, but God our creator who hath created you will protect you. As for me, I am now come to the world to prepare the way for the messenger of God, **not deceived, for many false prophets shall come, who shall take my words and contaminate may gospel.'**

Then said Andrew: 'Master, tell us some sign, that we may know him.'

72/B HOW TO RECOGNIZE MOHAMMED?

Jesus answered: 'He will not come in your time, but will come some years after you, when my gospel shall be annulled, insomuch that there shall be scarcely thirty faithful. At that time God will have mercy on the world, and so he will send his messenger, over whose head will rest a white cloud, whereby he shall be known of one elect of God, and shall be by him manifested to the world. **He shall come with great power against the ungodly, and shall destroy idolatry upon the earth.** And it rejoiceth me because that through him our God shall be known and glorified, and I shall be known to be true; and he will execute vengeance against those who whall say that I am more than man. Verily I say to you that the moon shall minister sleep to him in his boyhood, and when he shall be grown up he shall take her in his hands. Let the world beware of casting him out because he shall slay the idolaters, for many more were slain by Moses, the servant of God, and Joshua, who spared not the cities which they burnt. and slew the children; for to an old wound one applieth fire.

'He shall come with truth more clear than that of all the prophets, and shall reprove him who useth the world

amiss. The towers of the city of our father shall greet one another for joy: and so when idolatry shall be seen to fall to the ground and confess me a man like other men, verily I say unto you the messenger of God shall be come.'

محمد (ﷺ) کیسے پہچانے جائیں گے؟

باب72: A- (جب یسوع علیہ السلام نے اپنے دنیا سے رخصت ہونے کی بات کی، حواری پریشان ہوئے) یسوع علیہ السلام نے جواب دیا۔ "تمہارا دل نہ گھبرائے، نہ تم خوف زدہ ہو کیونکہ میں نے تمہیں پیدا نہیں کیا، بلکہ خدا ہمارا خالق جس نے تمہیں پیدا کیا، تمہیں بچائے گا۔ رہا میں، تو میں اب دنیا میں خدا کے رسول کے لئے راہ تیار کرنے آیا ہوں جو دنیا کے لئے نجات لائے گا۔ لیکن خبردار دھوکا نہ کھانا کیونکہ بہت سے جھوٹے نبی آئیں گے جو میرا کلام لیں گے اور میری انجیل کو ناپاک کریں گے"۔

تب اینڈریاس نے کہا "استاذ ہمیں کوئی نشان بتا کہ ہم اسے جان لیں"۔

یسوع علیہ السلام نے جواب دیا "وہ تمہارے وقت میں نہ آئے گا، بلکہ تمہارے چند سال بعد آئے گا، جب میری انجیل کالعدم کر دی جائے گی، یہاں تک کہ بمشکل تیس ایمان دار رہ جائیں گے۔ اس وقت خدا دنیا پر رحم فرمائے گا سو وہ اپنا رسول بھیجے گا، جس کے سر کے اوپر ایک سفید بادل چھایا رہے گا، جس سے وہ خدا کا برگزیدہ جان لیا جائے گا، اور خدا اسی کے ذریعے دنیا پر ظاہر ہوگا۔ وہ بے دینوں پر بڑی طاقت کے ساتھ آئے گا اور زمین پر بت پرستی کو نیست کر دے گا اور اس سے مجھے مسرت ہے کیونکہ اسی کے ذریعے ہمارے خدا کی معرفت اور تمجید ہوگی اور میرا سچا ہونا معلوم ہوگا اور وہ ان سے انتقام لے گا جو مجھے بشر سے کچھ بڑھ کر کوئی ہستی بتائیں گے۔ (یعنی خدا بیٹا کہیں گے) میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس کے بچپن میں چاند اس کو لوریاں دے کر سلایا کرے گا اور جب وہ بڑا ہوگا تو چاند کو اپنے ہاتھوں میں پکڑے گا۔ (حضور کے شق القمر کے معجزہ کی طرف اشارہ) دنیا اس کو ٹھکرا دینے پر خبردار رہے کیونکہ وہ بت پرستوں کو قتل کرے گا، کہ موسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے نے اس سے بھی زیادہ قتل کئے اور یشوع نے جس نے شہر بھی نہ

چھوڑے جنہیں انہوں نے جلا دیا اور بچوں کو قتل کیا، کیونکہ پرانا زخم آگ سے داغتے ہیں"۔
"وہ تمام نبیوں سے زیادہ واضح سچائی کے ساتھ آئے گا اور اسے سرزنش کرے گا جو دنیا کو غلط طور پر برتتا ہے۔ ہمارے باپ کے شہر کے برج خوشی سے ایک دوسرے کو مبارک کہیں گے سو جب بت پرستی خاک میں ملتی نظر آئے اور مجھے دوسرے انسانوں کی طرح انسان مانا جائے تب میں تم سے سچ کہتا ہوں خدا کا رسول آ گیا ہوگا"۔

(83) A NIGHT (LAILATUL-QADAR) WOULD COME EACH YEAR IN THE TIME OF 'MESSIAH' MOHAMMED

After the prayer of midnight the disciples came near unto Jesus, and he said to them: 'This night shall be in the time of the Messiah, messenger of God, the jubilee every year--that now cometh every hundred years. Therefore I will not that we sleep, but let us make prayer, bowing our head a hundred times, doing reverence to our God, mighty and merciful, who is blessed for evermore, and therefore each time let us say: "I confess thee our God alone, that hast not had beginning, nor shalt ever have end; for by thy mercy gavest thou to all things their beginning, and by thy justice thou shalt give to all an end: that hast no likeness among men, because in thine infinite goodness thou art not subject to motion nor to any accident. Have mercy on us, for thou hast created us, and we are the works of thy hand."

(83) ''حضور (ﷺ) کے دور کا انعام ہر سال قدر کی رات''

باب 83: آدھی رات کی نماز کے بعد شاگرد یسوع کے قریب آئے اور اس نے ان سے کہا ''مسیح'' خدا کے رسول کے وقت میں یہ رات ہر سال جشن کی ہو گی۔ ''حضور (ﷺ) کے دور کا انعام ہر سال قدر کی رات''...... جواب ہر 100 ویں برس آتی ہے۔ سو میں نہیں چاہتا کہ ہم سوئیں، بلکہ آؤ دعا کریں اپنے سر سو بار جھکائیں اپنے خدا قادر ورحیم کی عبادت کریں جو ابد تک مبارک ہے اور پھر ہر بار کہیں ''میں اقرار کرتا ہوں کہ تو ہی ہمارا اکیلا خدا ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ کبھی انتہا ہو گی کیونکہ تو نے اپنی رحمت سے سب چیزوں کو ان کی ابتداء بخشی اور اپنے انصاف سے تو سب کو انتہا دے گا، جس کی انسانوں میں کوئی مشابہت نہیں، لیکن اپنی لا محدود نیکی میں تو نہ حرکت سے متاثر ہے نہ کسی حادثہ سے۔ ہم پر رحم فرما، کہ تو نے ہمیں پیدا کیا ہے اور ہم تیرے ہاتھ کے عمل ہیں''۔

84. JESUS HEARD VOICE OF MOHAMMED DURING BLESSED NIGHT (AL-QADAR)

Having made the prayer, Jesus said: 'Let us give thanks to God because he hath given to us this night great mercy; for that he hath made to come back the time that needs must pass in this night, in that we have made prayer in union with the messenger of God. And I have heard his voice.'

(84) یسوع علیہ السلام اور حواریوںؓ نے قدر کی رات میں حضور (ﷺ) کے ساتھ نماز پڑھی

باب 84: دعا مانگ کر یسوع نے کہا ''آؤ خدا کا شکر ادا کریں کیونکہ اس نے ہمیں اس رات بڑی رحمت عطا کی ہے، کہ اس نے وہ وقت پیچھے لوٹا دیا جو اسی رات میں گزرے گا، اس طرح کہ ہم نے خدا کے رسول (ﷺ) کے ساتھ مل کر نماز پڑھی ہے۔ اور میں نے اس کی

آواز سنی ہے"۔

(96) "THE MESSIAH SHALL COME AFTER" SAID JESUS

When the prayer was ended, the priest said with a loud voice: 'Stay, Jesus for we need to know who thou art, for the quieting of our nation.'

Jesus answered: 'I am jesus, son of Mary, of the seed of David, and Man that is mortal and feareth God, and I seek that to God be given honour and glory.'

The priest answered: 'In the book of Moses it is written that our God must send us the Messiah, who shall come to announce to us that which Good willeth, ans shall bring to the world the mercy of God. Therefore I pray thee tell us the truth, art thou the Messiah of God whom we expect?'

Jesus answered: 'It is true that God hath so promised, but indeed I am not he, for he is made before me, and shall come after me.'

The priest answered: 'By thy words and signs, at any rate we believe thee to be a prophet and an holy one of

God, wherefore I pray thee in the name of all Judaea and Israel that thou for love of God shouldst tell us in what wise the Messiah will come.'

Jesus answered: 'As God liveth, in whose pressence my soul standeth, I am not the Messiah whom all the tribes of the earth expect. even as God promised to our father Abraham, saying: "In thy seed will I bless all the tribes of the earth." But when God shall take me away from the world, Satan will raise again this accursed sedition, by making the impious believe that I am God and son of God, whence my words and my doctrine shall be contaminated, insomuch that scarcely shall there remain thirty faithful ones: whereupon God will have mercy upon the world, and will send his messenger for whom he hath made all things; who shall come from the south with power, and shall destroy the idols with the idolater; who shall take away the dominion from Satan which he hath over men. He shall believe in him, and blessed is he who shall believe his words.

(96) خاتم النبیین کی پُر شکوہ آمد

باب 96: جب دعا ختم ہوئی تو کاہن نے بلند آواز سے کہا "ٹھہر، یسوع، اپنی قوم کو خاموش کرانے کے لئے ہم جاننا چاہتے ہیں کہ تو کون ہے"۔

یسوع نے جواب دیا "میں ہوں یسوع، مریم کا بیٹا، داؤد کی نسل سے ایک بشر جو فانی ہے اور خدا سے ڈرتا ہے اور میرا مقصد ہے عزت اور جلال خدا ہی کے لیے ہو"۔

کاہن نے جواب میں کہا "موسیٰ کی کتاب میں لکھا ہے کہ ہمارا خدا ہمارے پاس مسیح بھیجے گا، جو ہمیں بتانے آئے گا کہ خدا کی مرضی کیا ہے اور دنیا کے لئے خدا کی رحمت لائے گا۔ سو میں منت کرتا ہوں ہمیں سچ بتا کیا تو ہی خدا کا وہ مسیح ہے جس کا ہمیں انتظار ہے؟"

یسوع نے جواب دیا "یہ سچ ہے کہ خدا نے ایسا وعدہ کیا ہے، لیکن یقیناً میں وہ نہیں ہوں کیونکہ وہ مجھ سے پہلے بنا ہے اور میرے بعد آئے گا"۔

کاہن نے جواب میں کہا، تیرے کلام اور نشانیوں سے ہمیں بہر طور یقین ہے کہ تو خدا کا نبی اور قدوس ہے، سو میں تجھ سے تمام یہودیہ اور اسرائیل کے نام پر منت کرتا ہوں کہ خدا سے محبت کی خاطر ہمیں بتا کہ مسیح کس طور پر آئے گا"۔

یسوع نے جواب دیا "خدائے زندہ کی قسم، جس کے حضور میری روح قائم ہے میں وہ مسیح نہیں ہوں، جس کا انتظار تمام دنیا کی تمام قوموں کو ہے، جیسا کہ خدا نے ہمارے باپ ابرہام سے وعدہ کیا تھا۔ تیری نسل میں، میں زمین کی تمام قوموں کو برکت دوں گا، لیکن جب خدا مجھے دنیا سے اٹھائے گا تو ابلیس ناپرہیزگاروں کو یہ یقین دلا کر کہ میں خدا اور خدا کا بیٹا ہوں پھر یہ ملعون فتنہ اٹھائے گا، جس سے میرے کلام اور میرے نظریات میں باطل کی آمیزش کر دی جائے گی، یہاں تک کہ بمشکل تیس ایک صاحب ایمان رہ جائیں گے، جس پر خدا دنیا پر رحم فرمائے گا، اور اپنا رسول بھیجے گا جس کے لیے اس نے سب چیزیں بنائی ہیں جو دکھن سے طاقت کے ساتھ آئے گا اور بتوں کو بت پرستوں سمیت برباد کر دے گا جو ابلیس سے وہ غلبہ چھین لے گا جو اسے انسانوں پر ہے۔ وہ اپنے ساتھ خدا کی رحمت، ان کی نجات کے لئے لائے گا جو اس پر ایمان لائیں گے، اور مبارک ہے وہ جو اس کے کلام پر ایمان لائے گا"۔

97/A NO TRUE PROPHETS SHALL COME AFTER MESSENGER OF GOD (MOHAMMED)

Unworthy though I am to untie his hosen, I have

received grace and mercy from God to see him.'

Then answered the priest, with the governor and the king, saying: "Distress not thyself, O Jesus, holy one of God because in our time shall not this sedition be any more, seeing that we will write to the sacred Roman senate in such wise that by imperial decree none shall any more call thee God or son of God.'

Then said Jesus: 'With your words I am not on consoled, because where ye hope for light, darkness shall come; but my consolation is in the coming of the messenger, who shall destroy every false opinion of me, and his faith shall spread and shall take hold of the whole world, for so hath God promised to Abraham our father. And that which giveth me consolation is that his faith shall have no end, but shall be kept inviolate by God.'

The priest answered: 'After the coming of the messenger of God shall other prophets come?'

Jesus Answered: 'There shall not come after him true prophets sent by God, but there shall come a great number of false prophets, whereat I sorrow. For Satan

shall raise them up by the just judgement of God, and they shall hide themselves under the pretext of my gospel.'

Herod answered: 'How is it a just judgement of God that such impious men should come" '

Jesus answered: 'It is just that he who will not believe in the truth to his salvation should believe in a lie to his damnation. Wherefore I say unto you, that the world hath ever despised the true prophets and loved the false, as can be seen in the time of Michaiah and Jeremiah. For every like loveth his like.'

(97/A) محمد رسول اللہ (ﷺ) کی ملکوتی شان یسوع علیہ السلام کی زبانی

باب 97: گو میں اس کے موزے کھولنے کے لائق نہیں ہوں، لیکن مجھے خدا کا فضل و رحمت ملی کہ اسے دیکھوں" تب کاہن نے خود حاکم اور بادشاہ کی طرف سے جواب میں کہا "اے یسوع، خدا کے قدوس اپنے آپ کو طول نہ کر کیونکہ ہمارے وقت میں یہ فتنہ اب نہ ہوگا، کیونکہ ہم مقدس رومی سینٹ (SENATE) کو اس طرح لکھیں گے کہ سلطانی فرمان کے ذریعے اب کوئی تجھے خدا یا خدا کا بیٹا نہ کہنے پائے گا"۔

تب یسوع نے کہا "تمہاری باتوں سے میری تسلی نہیں ہوئی کیونکہ جہاں تم کو نور کی امید ہے تاریکی آئے گی، بلکہ میری تسلی اس رسول کے آنے میں ہے جو میرے بارے میں ہر فاسد خیال مٹائے گا، اور اس کا دین پھیل کر تمام دنیا پر حاوی ہو جائے گا، کیونکہ یہی وعدہ خدا نے ہمارے باپ ابرہام سے کیا ہے اور جس بات سے مجھے تسلی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے دین کی حد نہ ہوگی بلکہ خدا کی طرف سے نا شکستہ رہے گا"۔

کاہن نے جواب میں کہا" کیا خدا کے رسول کے آنے کے بعد اور نبی آئیں گے؟"
یسوع نے جواب دیا" اس کے بعد خدا کے بھیجے ہوئے سچے نبی نہ آئیں گے، مگر جھوٹے نبیوں کی بڑی تعداد آئے گی، جس کا مجھے رنج ہے۔ کیونکہ ابلیس انہیں خدا کے سچے انصاف کے مطابق اٹھائے گا اور وہ اپنے آپ کو میری بشارت کے پردے میں چھپائیں گے"۔
ہیرودیس نے جواب میں کہا" یہ خدا کا سچا انصاف کیسے ہوا کہ ایسے ناپرہیزگار آدمی آئیں؟"
یسوع نے جواب دیا" یہی انصاف ہے کہ جو اپنی نجات کے لئے سچائی پر ایمان نہ لائے وہ اپنی ہلاکت کے لئے کسی جھوٹ پر ایمان لے آئے۔ اسی لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ دنیا نے سدا سچے نبیوں سے دشمنی اور جھوٹوں سے محبت کی ہے جیسا کہ میکایاہ اور یرمیاہ کے زمانے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ (یرمیاہ ب18/26) کیونکہ ہر کسی کو اپنے ہی جیسا پسند ہوتا ہے"۔

97/B MESSENGER OF GOD-- MOHAMMED IS HIS BLESSED NAME" -- GOD SAID.

Then said the priest: 'How shall the Messiah be called, and what sign shall reveal his coming?'

Jesus answered: 'The name if the Messiah is admirable, for God himself gave him the name when he had created his soul, and placed it in a celestial splendour. God said: "Wait Mohammed; for thy sake I will to create paradise, the world, and a great multitude of creatures, where of I make thee a present, insomuch that

whoso shall bless thee shall be blessed, and whoso shall curse thee shall be accursed, When I shall send thee into the world I shall send thee as my messenger of salvation, and thy word shall be true, in so much that heaven and earth shall fail, but thy faith shall never fail." Mohammed is his blessed name.'

Then the crowd lifted up their voices, saying: 'O God, send us thy messenger: O Mohammed, come quickly for the salvation of the world!'

(97B) خدا نے کہا: محمد (ﷺ) جو تجھے مبارک کہے گا وہ مبارک ہوگا"

باب B:97 (آخری حصہ): تب کاہن نے کہا" وہ مسیح کیا کہلایا جائے گا اور کس نشان سے اس کا آنا ظاہر ہوگا؟"

یسوع نے جواب دیا" اس مسیح کا نام قابل تعریف ہے، (محمد (ﷺ) کے لفظی معانی، تعریف کیا گیا...... کیونکہ خود خدا نے اس کا یہ نام رکھا جب اس نے اس کی روح پیدا کی اور اسے ملکوتی شان میں رکھا۔ خدا نے کہا محمد (ﷺ)! انتظار کر، کیونکہ میں تیری خاطر بہشت، دنیا اور بڑی تعداد میں مخلوق پیدا کرنا چاہتا ہوں جن کو میں تجھے تحفے میں دیتا ہوں، یہاں تک کہ جو تجھے مبارک کہے گا مبارک ہوگا، اور جو تجھے کوسے گا لعنتی ہوگا۔ جب میں تجھے دنیا میں بھیجوں گا تو اپنا رسول نجات بنا کر بھیجوں گا، اور تیرا کلام سچا ہوگا یہاں تک کہ آسمان اور زمین ٹل جائیں گے، لیکن تیرا دین نہ ٹلے گا، سو اس کا پاک نام محمد (ﷺ) ہے"۔

تب ہجوم نے اپنی آوازیں بلند کر کے کہا کہ" اے خدا، ہمیں اپنا رسول بھیج، اے محمد (ﷺ) ! دنیا کی نجات کے لئے جلد آ"۔

(98).JESUS -- NEITHER GOD -- NOR SON OF GOD

DECREE OF THE ROMAN SENATE

And having said this, the multitude departed with the priest and the governor with Herod, having great disputations concerning Jesus and concerning his doctrine. Whereupon the priest prayed the governor to write unto Rome to the senate the whole matter; which thing the governor did; wherefore the senate had compassion on Israel, and decreed that on pain of death none should call Jesus the Nazarene, prophet of the lewy, either God or son of God. Which decree was posted up in the temple, engraved upon copper.

(98) یسوع کو خدا یا خدا کا بیٹا کہنے کی ممانعت

باب98: "اور یہ کہہ کر ہجوم کاہن کے ساتھ اور حاکم، ہیرودیس کے ساتھ یسوع اور اس کے دین کے بارے میں بڑے اختلافات لیے رخصت ہوا جس پر کاہن نے حاکم سے منت کی کہ روم میں سینیٹ کو سارا معاملہ لکھ بھیجے۔ حاکم نے ایسا ہی کیا، چنانچہ سینیٹ کو اسرائیل پر ترس آیا اور اس نے فرمان جاری کیا کہ یسوع ناصری، یہودیوں کے نبی کو کوئی خدا یا خدا کا بیٹا نہ کہے، ورنہ موت کی سزا پائے گا۔ یہ فرمان تانبے پر کندہ کر کے ہیکل میں لگا دیا گیا"۔

112. GOD SHALL TAKE JESUS UP FROM EARTH

Know, O Barnabas, that for this I must have great persecution, and shall be sold by one of my disciples for

thirty pieces of money. Whereupon I am sure that he who shall sell me shall be slain in my name, for that God shall take me up from the earth, and shall change the apperance of the traitor so that every one shall believe him to be me; nevertheless, when he dieth an evil death. I shall abide in that dishonour for a long time in the world, But when Mohammed shall come, the sacred messenger of God, that infamy shall be taken away. And this shall God do because I have confessed the truth of the Messial; who shall give me this reward, that I shall be known to be alive and to be a stranger to that death of infamy.'

محمد (ﷺ) خدا کا مقدس رسول

باب112: اے برناباس جان لے کہ اس کی بدولت (فرمان شاہی، جس کا ذکر باب 97 میں اوپر کیا گیا ہے) میں بڑی اذیت میں مبتلا ہوں گا اور اپنے ایک شاگرد کے ہاتھوں تیس روپوں کے عوض بیچا جاؤں گا۔ جس پر مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے بیچے گا وہ میرے نام سے مارا جائے گا، کیونکہ خدا مجھے زمین سے اٹھا لے گا اور اس غدار کی شکل بدل دے گا کہ ہر کوئی اسے سمجھے گا کہ میں ہوں، پھر بھی جب وہ بری موت مرے گا تو میرے بارے میں دنیا میں لمبی مدت تک توہین آمیز غلط فہمی پھیلی رہے گی لیکن جب محمد (ﷺ) خدا کا مقدس رسول آئے گا تو یہ بدنامی دور ہو جائے گی اور خدا یہ کرے گا کیونکہ میں نے مسیح کی سچائی کا اقرار کیا ہے جو مجھے یہ انعام دے گا کہ مجھے زندہ اور بدنامی کی موت صلیب سے اجنبی جان لیا جائے گا"۔

(124). THE MESSENGER WOULD CLEAR TRUTH

Jesus answered: Everything that conformeth to the

book of Moses, that receive ye for tru; seeing that God is one, the truth is one; whence it followeth that the doctrine is one and the meaning of the doctrine is one; and therefore the faith is one, Verily I say unto you that if the truth had not been erased from the book of Moses, God would not have given to David our father the second. And if the book of David had not been contaminated, God would not have committed the Gospel to me; seeing that the Lord our God is unchangeable, and hath spoken but one message to all men. Wherefor, when the messenger of God shall come. he shall come to cleanse away all wherewith the ungodly haye contaminated my book.

(124) "خدا کا رسول (محمد ﷺ) سچ اور جھوٹ واضح کرے گا"

باب124: یسوع نے جواب دیا "جو بات موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے مطابق ہو اسے سچی جان کر قبول کرو، کیونکہ خدا ایک ہے تو سچائی بھی ایک ہے، اسی سے یہ نکلا کہ تعلیم ایک ہے اور تعلیم کا معنی ایک ہے لہٰذا ایمان ایک ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کی کتاب سے سچائی نہ مٹا دی گئی ہوتی تو خدا داؤد علیہ السلام ہمارے باپ کو دوسری کتاب نہ دیتا اور اگر داؤد علیہ السلام کی کتاب آلودہ نہ کر دی گئی ہوتی تو خدا مجھے انجیل نہ عطا کرتا، کیونکہ خداوند ہمارا خدا غیر متبدل ہے اور تمام انسانوں کو ایک ہی پیغام دیتا آیا ہے۔ سو جب خدا کا رسول آئے گا تو وہ سب کو پاک کرنے آئے گا جس سے بدکاروں نے میری کتاب آلودہ کر دی ہو گی"۔

136/A SATAN SHALL SMITE HIMSELF

Jesus anwered: 'Every one, be he who he may, must go into hell. It is true, however, that the holy ones and prophets of God shall go there to behold, not suffering any

punishment; and the righteous, only suffering fear. And what shall I say? I tell you that thither shall come (even) the messenger of God, to behold the justice of God, thereupon hell shall tremble at his presence. And because he hath human flesh, all those that have human flesh and shall be under punishment, so long as the messenger of God shall abide to behold hell, so long shall they abide without punishment. But he shall abide there only so long as it taketh to shut and open the eyes.

'And this shall God do in order that every creature may know that he hath received benefit from the messenger of God.

'When he shall go there all the devils shall shriek, and seek to hide themselves beneath the burning embers, saying one to another: "Fly, fly, for here cometh Mohammed our enemy!" Hearing which, Satan shall smite himself upon the face with both his hands, and screaming shall say: "Thou art more noble than I, in my despite, and this is unjustly done!"

(136) خدا کے رسول (محمد ﷺ) کی بدولت جہنم والوں کی سزا موقوف ہو جائے گی

باب 136: یسوع نے جواب دیا "ہر ایک خواہ کوئی بھی ہو، جہنم میں جا کر رہے گا۔ البتہ

یہ سچ ہے کہ خدا کے قدوس اور نبی وہاں کوئی سزا پانے نہیں، ملاحظہ کرنے جائیں گے اور وہ خوفزدہ نہیں ہوں گے اور میں کیا کہوں؟ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہاں تو خدا کا رسول بھی جائے گا خدا کا انصاف ملاحظہ کرنے۔ اس وقت اس کی موجودگی پر جہنم کانپ اٹھے گی اور چونکہ اس کا جسم بشری ہے۔ جتنے جسم والے سزا پارہے ہوں گے۔ جب تک خدا کا رسول جہنم ملاحظہ کرنے کے لئے ٹھہرے گا تب تک ان کی سزا موقوف رہے گی۔ لیکن وہ وہاں اتنی (ہی) دیر ٹھہرے گا جتنی دیر آنکھیں موندنے اور کھولنے میں لگتی ہے"

"اور خدا ایسا اس لیے کرے گا کہ ہر مخلوق جان لے کہ اس پر خدا کے رسول کا احسان ہوا ہے"۔

"جب وہ وہاں جائے گا تو تمام شیطان چلائیں گے اور ایک دوسرے سے یہ کہہ کر اپنے آپ کو دہکتے انگاروں کے نیچے چھپانا چاہیں گے اور چیخ اٹھیں گے، بھاگو، بھاگو، وہ ہمارا دشمن، محمد آتا ہے، جیسے سن کر ابلیس اپنے منہ پر دو ہتڑ مارے گا، اور چیخ مار کر کے کہے گا میری بربادی کہ "تو میرے علی الرغم کہیں زیادہ مجھ سے افضل ہے، اور یہ نا منصفانہ ہوا ہے"۔

(136/B) TWO LAST GRADES FAITHFULLS WOULD REMAIN IN HELL FOR 70,000 YEARS

'As for the faithful, who are in seventy-two grades, those of the two last grades, who shall have had the faith without good works --- the one being sad at good works, and the other delighting in evil--they shall abide in hell seventy thousand years.

'After those years shall the angel Gabriel come into hell, and shall hear them say: "O Mohammed, where are

thy promises made to us, saying that those who have thy faith shall not abide in hell for evermore?"

'Then the angel of God shall retum to paradise, and having approached with reverence the messenger of God, shall narrate to him what he hath heard.

'Then shall his messenger speak to God and say:

"Lord, my God, remeber the promise made to me thy servant, concerning them that have received may faith, that they shall not abide for evermore in hell."

'God shall answer: "Ask what thou wilt, O my friend, for I will give thee all that thou askest."

(136) بہتر (72) میں سے آخری دو درجوں والے ایماندار

(136) . 70 ہزار سال جہنم میں رہیں گے

باب136 (مزید): ''رہے ایمان دار جن کے بہتر (72) درجے ہیں تو آخری دو درجوں والے جن کا ایمان ہے لیکن نیک اعمال نہیں...... ایک، نیک اعمال پر ملول ہونے اور دوسرا بداعمال پر مسرور ہونے کے باعث...... وہ جہنم میں ستر ہزار سال رہیں گے''۔

''ان سالوں کے بعد فرشتہ جبریل جہنم میں آئے گا اور انہیں کہتے سنے گا'' اے محمد (ﷺ) کہاں ہیں؟ ہم سے کئے ہوئے آپ کے وہ وعدے کہاں ہیں کہ جن کا ایمان ہوگا وہ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ نہ رہیں گے؟''

''تب خدا کا فرشتہ بہشت میں واپس جائے گا اور خدا کے رسول کے پاس ادب سے پہنچ کر جو کچھ اس نے سنا ہوگا اسے بیان کرے گا۔

تب خدا کا رسول خدا سے عرض کرے گا اور کہے گا" خداوند، میرے خدا یاد کر وہ وعدہ جو مجھ، اپنے بندے، سے تو نے ان کی بابت کیا تھا جنہوں نے میرا دین قبول کیا ہے، کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں نہ رہیں گے"۔

"خدا جواب دے گا: جو چاہے مانگ اے میرے محبوب تو جو کچھ مانگے گا میں تجھے عطا کروں گا"۔

(137). ON PETITION OF MOHAMMED FAITHFULLS WOULD BE FREED FROM BITTER PUNISHMENT

'Then shall the messenger of God say: "O Lord, there are of the faithful who have been in hell seventy thousand years. Where, O Lord, is thy mercy? I pray thee, Lord, to free them from those bitter punishments."

'Then shall God command the four favourite angels of God that they go to hell and take out every one that hath the faith of his messenger, and lead him into paradise, And this they shall do.

'And such shall be the advantage of the faith of God's messenger, that those that shall have believed in him, even though they have not done any good works, seeing they died in this faith, shall go into paradise after the punishment of which I have spoken.'

(137) حضور (ﷺ) کی شفاعت پر گنہگار اہل ایمان کی بخشش

باب 137: تب خدا کا رسول عرض کرے گا "اے خداوند خدا! ایمانداروں میں سے وہ بھی ہیں جو ستر ہزار سال سے جہنم میں ہیں، کہاں ہے، اے خداوند میرے آقا! تیری رحمت؟ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں میرے مولا! کہ انہیں بے پناہ سزاؤں سے آزاد فرما"۔

"تب خدا اپنے چاروں مقرب فرشتوں کو حکم دے گا کہ وہ جہنم جا کر ہر ایک کو جو اس کے رسول کے دین پر ہوں، نکال لیں اور بہشت میں لے جائیں اور وہ ایسا ہی کریں گے"۔

"اور خدا کے رسول کے دین کا یہ فائدہ ہوگا کہ جو اس پر ایمان لائے ہوں گے، چاہے انہوں نے کوئی نیک کام بھی نہ کیے ہوں اس دین پر مرنے کے باعث وہ بہشت میں جائیں گے، اس سزا کے بعد جس کا میں نے ذکر کیا ہے"۔

(163). BLESSED SHALL THEY BE WHO SHALL LISTEN TO WORDS OF MOHAMMED

Jesus went into the wilderness beyond Jordan with his disciples, and when the midday prayer was done he sat down near to a plam-tree, and under the shadow on the plan-tree his discples sat down.

Then said Jesus: 'So secret is predestination, O brethren, that I say unto you, verily, only to one man shall it be clearly known. He it is whom the nations look for, to who the secrets of God are so clear that, when he cometh into the world, blessed shall they be that shall listen to his words, because God shall overshadow them with his

mercy even as this plam-tree overshadoweth us. Yea, even as this tree protecteth us from the burning heat of the sun, even so the mercy of God will protect from Satan them that believe in that man.'

The disciples answered: O Master, who shall come into the world?"

Jesus answered with joy of heart: 'He is Mohammed, messenger of God, and when he cometh into the world, even as the rain maketh the earth to bear fruit when for a long time in hath not rained, even so shall he be occasion of godd works among men, through the abundant mercy which he shall bring. For he is a white cloud full of the mercy of God, which mercy God shall sprinkle upon the faithful like rain.'

(163) حضور (ﷺ) پر ایمان لانے والے خوش نصیب ہیں: حضرت عیسیٰ علیہ السلام

باب 163: یسوع اپنے شاگردوں کے ساتھ یردن کے پار بیابان میں گیا، اور جب دوپہر کی نماز ہو چکی تو وہ ایک نخل کے قریب بیٹھ گیا اور اس نخل کے سائے تلے اس کے شاگرد بیٹھ گئے۔

تب یسوع نے کہا ''تقدیر، اے بھائیو، ایسے راز کی بات ہے کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں، یہ ایک ہی آدمی پر عیاں ہوگی۔ وہ وہی ہے قومیں جس کی راہ دیکھ رہی ہیں، جس پر خدا کے راز ایسے عیاں ہیں کہ جب وہ دنیا میں آئے گا تو مبارک ہوں گے وہ جو اس کا کلام سنیں گے،

کیونکہ خدا ان پر اپنی رحمت ایسے ہی سایہ فگن کرے گا جیسے یہ نخل ہم پر سایہ فگن ہے۔ ہاں، جیسے یہ درخت ہمیں دھوپ کی چلچلاتی گرمی سے بچاتا ہے ویسے ہی خدا کی رحمت ابلیس سے انہیں بچائے رکھے گی جو اس آدمی پر ایمان لائیں گے"۔

"شاگردوں نے جواب میں کہا "اے استاد، وہ آدمی کون ہوگا جس کا تو ذکر کرتا ہے جو دنیا میں آئے گا؟"

یسوع نے دلی مسرت سے جواب دیا "وہ ہے محمد (ﷺ)، خدا کا رسول، اور جب وہ دنیا میں آئے گا تو جیسے بارش زمین سے پھل اگاتی ہے جب بہت عرصے سے بارش نہ ہوئی ہو، ویسے ہی اس بے انتہا رحمت کی بدولت، جو وہ لائے گا وہ لوگوں میں نیک کاموں کا باعث ہوگا۔ کیونکہ وہ ایک سفید بادل ہے، خدا کی رحمت سے معمور اور رحمت ایمانداروں پر خدا کی بارش کی طرح برسائے گا"۔

(176.) GOD CREATED ALL THINGS OUT OF LOVE OF MOHAMMED

'To what doth it serve to say, "They shall feast"?' said Jesus to his disciples. 'Surely God speaketh plain. But to what purpose are the four rivers of precious liquor in paradise, with so may fruits? Assuredly, God eateth not, the angels eat not, the soul eateth not, the sense eateth not, but rather the flesh, which is our body. Wherefore the glory of paradise is for the body the meats, and for the soul and the sense God and the conversation of angels and blessed spirits, That glory shall be better revealed by the messenger of God, who (seeing God hath created all things for love of him) knoweth all things better than any

other creature.'

خدا کا رسول دوسری مخلوق سے بہتر جانتا ہے

باب176: اس کہنے کا کیا مطلب ہے کہ "وہ (اللہ کے وفادار بندے، جن پر اس کی نعمتیں تمام ہوں گی ان کو کوئی دکھ ہوگا نہ رنج، اور ایسے جنتی خوش گوار دھنوں کے پس منظر میں جنت کی راحت بخش زندگی کا لطف اٹھائیں گے) ضیافت اڑائیں گے؟" یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا "یقیناً خدا صاف صاف کہتا ہے۔ آخر کس مقصد کے لئے بہشت میں قیمتی مشروبات کے چاروں دریا ہیں اور اتنے بہت سے پھل؟ یقیناً نہ خدا کھاتا ہے نہ فرشتے کھاتے ہیں نہ روح کھاتی ہے نہ نفس کھاتا ہے بلکہ جسم جو ہمارا بدن ہے لہٰذا بہشت کی عظمت بدن کے لیے کھانے اور روح اور نفس کے لئے خدا ہے اور فرشتوں اور مبارک روحوں کی گفتگو۔ بہشت کی عظمت اور بھی اچھی طرح خدا کا رسول واضح کرے گا جو ہر دوسری مخلوق سے کہیں بہتر تمام باتیں جانتا ہے کہ اسی کی محبت میں خدا نے سب چیزیں پیدا کی ہیں"۔[1]

کیا موجودہ انجیل برناباس قابل اعتماد ہے؟

ممتاز مسیحی دانشور سٹیو۔ اے جانسن نے اس مسئلے پر ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا ہے جو عالم اسلام کے مؤقر جریدہ اسلامک ہورائزن کے فروری 1985ء کے شمارے میں چھپا تھا۔ یہ مضمون یہاں ہم من وعن شائع کر رہے ہیں۔

Is today`s Gospel of Barnabas Authentic?

What exactly is the Gospel of Baranbas? How old is it? Was it written by a Muslim Convert from Christianity who wanted to attack his former religion? Is the present Gospel of Baranabas the same work mentioned in the 6th century as the Evangelium nomine Bamabas? Does the Gospel's teaching confirm the teaching of other gospels also excluded from the present day Bible? These are

interesting, if not important, questions for anyone interested in the history of the Bible's development, and for those who in the field of da'wah are confronted with such questions, With these issues in mind, I have researched a little more into the mysterious past of the Gospel of Barnabas.

One issue must be cleared up before discussiong the Gospel of Baranabas in any detail, and that is the sistinction between the Epistle of Barnabas and the Gospel of Barnabas. The two are often confused, although they are not the same document, The Epistle of Baranbas dates between 70 and 100 C.E. and is counted among many New Testament scholars as a part of the Apostolic Fathers (important early Church writers and leaders). For example, the Epistle is mentioned very early by both Origen (185-254) and Fusebius (256-340). It is found in the Codex sinaiticus, and important Bible manuscript ascribed by biblical scholars to sometime midfourth to the early fifth century C.E. The Epistle is not found in any version of today's Bible.

The Gospel of Barnabas has a much more elusive past than the Epistle. The translation of the Gospel that

one finds floating around today usually include a preface recounting a sketchy history of the Gospel. Unfortunately, the historical claims are made without adequate scholarly documentation. Insha' ALLAH, that is what I Hope to supply at least in part here.

Ancient Documents

There are two imortant ancient documents that mention the Gospel of Barnabas. The Decretum Gelasianum de libris recipiendis et non recipiendis (the Gelasian Decree of Books to be recieved and not to be recieved) is a list of apocryphal gospels, which were supposed to have been in existence by the sixth century C.E. The Gelasion Decretal lists the Evangelium nomine Barnabae, the Gospel of Banabas. The Gospel is also mentioned at the end of the list of sixty books in the God. Barooc.206, dated in the sixth or seventh century C.E. Christian csholars such as Montague Rhodes James in his The Apocryphal New Testament (1924), attempt to dismiss the inclusion of the Gospel in these two ancient lists by saying that the existent version of the Gospel is "a forgery of the late fifteenth or century, by a renegade from Christiainity to Islam. "As early as 1908, M.R. James made the same claims offering no evidence supporting His

belief that the Gospel was from the fifteenth or sixteenth century, and using as his evidence that a Muslim convert was the author, the observation that there are some similarities in wording between the Latin Vulgate Bible and the Gospel. Such an observation is hardly a substantive argument.

Contemporary Scholarship

It is obvious that James's religious beliefs prompted him to dismiss the possibility that the present Gospel is in fact the text referred to in the Gelasian Decretal. However, Muslims must not let their religious beliefs permit them to dicmiss James's claim without sufficiently investigating the matter, James Hastings in the Distionary of the apostolic Church (1922) writes, "If there ever was a Gnostic Gospel of Barnabas it may have supplied part of the basis for the Muhammadan (Italian) Gospel of Barnabas - a curious, docetic production." It is obvious from the ancient accounts that there was such a Gospel, thus the relationship of the ancient text to the present Gospel must be determined. Some more historical background is necessary to make such a determination.

An April 1902 article by Dr. William F.A. Axon entitled, "On the Mohammadan Gospel of Barnabas, "Relates a very interesting history of the Gospel. It seems that John Toland in his book Nazarenus (London, 1718) described an Italian manuscript of the Gospel, Toland said that the Gospel was mentioned in the 206th manuscript of the Baroccian collection in the Bodleian Library. consistent with the observation by Grabe in Spcilegium Patrum, i, .302, Toland found that the 39th Baroccian manuscript contains a fragment that is an Italian equivalent to the Greek text. Thus Toland's conclusion was that the ancicnt Gospel was identical to the ancient Gospel of Barnabas. In the same year, Reland in De religione Mahommedica (1718) discovered that the Gospel also existed in Arabic and Spanish.

Another intersting bit of history known to Toland was the description of an Italian Gospel by Monsieur de la Monnoye in Menagiana, edit. Amstom 4, P. 321; which was owned by prince Eugene, Prince Eugene's copy was also mentioned by George Sale in his "preiminary discourse, "a preface to his 1734 translation of the meaning of the Qur'an. Sale himself possessed a Spanish copy of the Gospel, which was loaned to him by Rev.

Holme, the rector of Headley. Evidently, the Spanish edition was a translation of the Italian edition, carried out by Moustafa de Aranda. The preface of the Spanish translation contains a very interesting story. It says that the Christian monk, Fra Marino, read in the early Church Fathers, including Iranaeus (c. 130-202), and argument against Paul on the authority of the Gospel of Barnabas. The story continues that one day while in the Vatican library with Pope Sixtus V (1521-1590),Fra Marino dscovered the Gospel while the Pope slept. Supposedly Marino sneaked the Gospel out of the Vatican, afterwards reading it and embracing Islam.

Another Spanish version of the Gospel existed in England in the eighteenth century. The Rev. Joseph White in the Brampton lectures (Oxford, 1784, xxxiii-xxxvii, lviii) transcribed some chapters of the Gospel from Rev. Monkhouse's Spanish copy of the Gospel.

At the conclusion of Sr. Axon's article, he notes that extracts of the Gospel could be found in J.A. Fabricius's, Codex Apocryphus Novi Testamenti (Part 3, Hamburg 1743, pp. 365-394). Dr.Axon also traced the Italian manuscript to the Imperial Library of Vienna where it rested among the books of Prince Eugene.

In 1905, Lonsdale Regg noted that Clarendon Press acted upon Dr Axon's discovery. Clarendon had already been corresponding with Sr. Hastie of Glasgow on the subject and finally obtained a transcript of the document. Regg discoverd that one third of the Gospel was identical to the content of the four canonical Gospels Mathem the contect of the christian canonical canonical Gospels to overlap with accepted Islamic doctrine A final third, Ragg believed described events outside both these religious traditions. I should note that Ragg's divisions must not be taken as infallible, because he assumes that the belief that Jesus (PBUH) was not crucified, was outside Islamic belief. It is highly significant that this doctrine is Identified by Ragg as among the body of events in which experts would find traces of the last Evangelium Barnabae as mentioned in the Gelasian Decretal. In other words, Ragg identifies a Our-anic statement as the most plausible content of the early Gospel of Barnabas. I should aslo note in passing that the Gospel of Barnabas is not the only Gospel excluded from the Bible that asserts that Jesus did not die on the cross. for enaumple, the Gospal of Peter also has Jesus taken up into heaven before he could be killed.

Conclusion

Grabe's knowledge of a Greek version of the Gospel and its equivalence to the later Italian manuscript makes it highly plausible that today's Gospel of Bamabas is in fact the Evangelium Barnabae listed by the sixth century Gelasian Decretal and the sixth of seventh century Cod. Barocc, 206's list of 60 books. I say, "highly plausible" because no early Greek manuscript is known to be in existence today. However, it is equally certain that Christian claims that the Gospel of Bamabas is a forgery of some fifteenth or sixteenth century renegade Muslim, are simply vain attempts to dismiss a Gospel that strikes at the heart of contemporary Christian Christology. Paul in his letter to the Corinthians admitted the centrality of this doctrine to the entire body of Christian faith.

"Tell me, if Christ is preached as raised from the dead, how is it that some of you say there is no resurrection of the dead? if there is no resurrection of the dead, Christ himself has not been raised,And if Christ has not been raised, our preaching is void of content and your faith is empty too Indeed, we should then be erposed as false witnesses of God, for ew have bome witness befroe

him that he raised up Christ..." (I Corinathians 15" 12-13)

By Steve A. Johnson.

Islamic Horizors- Febauary 1985.

کونسٹن ورجیل جارجیو کی تحریر کے چند اقتباسات:۔

☆ حضرت محمد کا اپنے بھوکے پیٹ پر پتھر باندھنا، آزاد کردہ غلاموں بلال حبشی (رضی اللہ عنہ) اور اسامہ (رضی اللہ عنہ) کا سیدنا کہلانا اور ابوبکر (رضی اللہ عنہ) وعمر (رضی اللہ عنہ) کا مٹی گارا خود ڈھونا، اسلامی مساوات کے ثمرات ہو سکتے ہیں، اس کے مقابلے میں انقلابِ فرانس کے مساوات انسانی کے دعوے کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔

☆ انقلابِ فرانس محدود عرصہ کے لیے بھی اہل فرانس میں مساوات قائم نہ کر سکا۔ پیغمبر اسلام نے ہمیشہ کے لئے کامل مساوات قائم کر دی تمام خاندانی طبقاتی اور مادی امتیازات کو مٹا دیا۔

☆ قتل کی نیت سے آنے والا سراقہ جب اپنے ارادے کی تکمیل میں ناکام ہو گیا تو اس نے کہا، میں خطیر انعام کی لالچ میں اس کام پر آمادہ ہوا تھا، اب اندازہ ہو گیا ہے کہ ایک دن آپ نے ضرور غلبہ حاصل کرنا ہے، میں اس دن کے لئے آپ سے اپنی جان کی امان طلب کرتا ہوں۔ آپ نے اسے پیشگی پناہ دے دی۔

☆ حضرت محمد اپنی والدہ کی وفات کے 50 سال بعد ان کی قبر پر گئے اور دوزانو بیٹھ کر اتنا روئے جیسے ابھی ابھی والدہ رخصت ہوئی ہوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ بس کیجئے ورنہ میرے ضبط کے بند بھی ٹوٹ پڑیں گے۔

ایک تاریخی الزام کا تاریخی جواب

مخالفین اسلام نے حضرت محمد (ﷺ) کی بعثت، آپ کی کامیابیوں اور تاریخ اسلام پر آپ کی تحریک کے اثرات سے بوکھلا کر جو الزامات عائد کیے، ان میں ایک یہ ہے کہ اسلام پھیلنے سے دنیا میں بہت خون ریزی ہوئی۔ اگر اس الزام کا تاریخ عالم کے تناظر میں جائزہ لیا جائے تو جو نقشہ ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے:

جب بھی کوئی نظام دنیا میں آتا ہے وہ اپنے ہمراہ چند تبدیلیاں لاتا ہے۔ پہلے سے موجود نظام اور اس سے مستفید ہونے والے طبقے اس لیے مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ انہیں یقین نہیں ہوتا کہ کیا خبر نیا نظام انہیں زندہ رہنے دے یا نہ رہنے دے؟ انہیں اس وقت جو مقام اور مراعات حاصل ہیں وہ دوبارہ مل سکیں یا نہ مل سکیں؟ اس مخمصے کی بنا پر وہ حتی الامکان مزاحمت کرتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی اپنے ہمنوا بنا لیتے ہیں جنہیں مروجہ نظام نے بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچایا ہوتا۔

جب دونوں نظام ایک دوسرے کے مقابلے میں آتے ہیں تو اتنا تو ضرور ہوتا ہے کہ ایک فریق کی شکست ہوتی ہے اور دوسرے کی فتح۔ جس کی شکست ہوتی ہے تو اس کے لئے ایک ''تخریب'' بھی وجود میں آتی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نئی تعمیر وجود میں نہیں آ سکتی۔ مگر رحمۃ العالمینؐ نے فتح مکہ کے تاریخی موقعہ پر اپنے بدترین دشمنوں کے لیے بھی عام معافی کا اعلان کر کے سب کے دلوں سے یہ شبہ دور کر دیا کہ ان سے انتقام لیا جائے گا۔ آپؐ نے یہاں تک کہہ دیا کہ جو کوئی ابوسفیان (انہوں نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا اور دشمنی میں پیش پیش تھے) کے گھر میں پناہ لے لے گا اسے بھی کچھ نہیں کہا جائے گا۔

ایک روایت میں بتایا جاتا ہے کہ جس وقت لشکر اسلام مکہ میں داخل ہوا تو بے شمار لوگ

☆ جنگ سکندر دپورس میں 21 ہزار افراد صرف ایک دن میں ہلاک ہوئے۔

☆ امریکہ کی خانہ جنگی میں 6 لاکھ افراد ہلاک اور 80 لاکھ زخمی ہوئے۔

☆ جنگ عظیم اول اور دوم میں 80 لاکھ افراد ہلاک اور ایک کروڑ زخمی ہوئے۔

☆ روس میں 1917ء کے کمیونسٹ انقلاب میں دس لاکھ مسلمانوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ مجموعی طور پر ہلاکتوں کی تعداد پچاس لاکھ تھی۔

☆ چین کے ثقافتی انقلاب (1966ء) کے سلسلے میں کئی بار تطہیری عمل ہوا جس میں 25 سے 30 لاکھ تک افراد مارے گئے۔

☆ امریکہ نے 1945ء میں جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے۔ جن میں لاکھوں افراد، بے گناہ عورتوں اور بچوں سمیت ہلاک ہو گئے۔

عدل و مساوات کا پیغمبر

مہاتما گاندھی

اسلام اپنے شاندار زمانے میں غیر روادار نہیں تھا بلکہ تمام دنیا اس کی تعریف کر رہی تھی۔ اُس وقت جب کہ مغربی دنیا اندھیرے میں غرق تھی، افق مشرق کا ایک روشن ستارہ چمکا جس سے بے چین دنیا کو روشنی اور تسلی نصیب ہوئی۔ اسلام جھوٹا مذہب نہیں ہے ہندوؤں کو بھی اس کا اسی طرح مطالعہ کرنا چاہیے، جس طرح میں نے مطالعہ کیا ہے پھر وہ بھی میری ہی طرح اس سے محبت کرنے لگیں گے۔

میں پیغمبر اسلام کی زندگی کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جب میں نے کتاب کی دوسری جلد بھی ختم کر لی تو مجھے افسوس ہوا کہ اس عظیم الشان زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے اب میرے پاس کوئی اور کتاب باقی نہیں ہے۔ اب مجھے پہلے سے بھی زیادہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ تلوار کی قوت نہ تھی جس نے اسلام کے لئے دنیا کا میدان فتح کیا۔ بلکہ یہ پیغمبر اسلام کی انتہائی سادگی بے نفسی، وعدہ وفائی اور بے خوفی تھی۔ یہ آپ کا اپنے دوستوں اور پیروکاروں سے محبت کرنا۔ اور خدا پر بھروسہ رکھنا تھا۔ یہ تلوار کی قوت نہیں تھی، بلکہ یہ اوصاف اور خوبیاں تھیں جن سے تمام رکاوٹیں بہ گئیں اور آپ تمام مشکلات پر غالب آئے۔

مجھ سے کسی نے کہا تھا کہ جنوبی افریقہ میں جو یورپین آباد ہیں، وہ اسلام کی تبلیغ سے لرز رہے ہیں، اُسی اسلام سے جس نے سپین کو تہذیب عطا کی، اسی اسلام سے جس نے مراکو میں روشنی پھیلائی اور اہل دنیا کو بھائی بھائی بن جانے کی ترغیب دی، بیشک جنوبی افریقہ کے یورپین اسلام سے ڈرتے ہیں لیکن دراصل وہ اس حقیقت سے ڈرتے ہیں کہ اگر افریقہ کے دیسی باشندوں نے اسلام قبول کر لیا تو وہ سفید قوموں کی برابری کا حق طلب کرنے لگیں گے آپ ان کو

ڈرنے دیجئے۔ اگر بھائی بھائی بننا گناہ ہے، اگر وہ اس امر سے پریشان ہیں کہ ان کی نسلی بڑائی قائم نہ رہ سکے گی تو ان کا خوف بجا ہے۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ اگر ایک زولو عیسائی ہو جاتا ہے تو وہ سفید رنگ عیسائیوں کے برابر نہیں ہو سکتا، لیکن جونہی کہ وہ اسلام قبول کرتا ہے، بالکل اسی وقت وہ اسی پیالے میں پانی پیتا ہے اور اسی طشتری میں کھانا کھاتا ہے جس میں کوئی اور مسلمان پانی پیتا ہے اور کھانا کھاتا ہے۔

”اصل بات یہ ہے، جس سے یورپین کانپ رہے ہیں۔“

انسانیت کا بے غرض لیڈر

سوامی آر ایس ٹھاکر مدیر ''انصاف'' امرتسر

میں منصف مزاج غیر مسلموں سے ضرور عرض کروں گا کہ وہ تعصب کو بالائے طاق رکھ کر ایک دفعہ عرب کی اس وقت کی تاریخ کا مطالعہ کریں جب وہ دنیا بھر کی برائیوں میں مبتلا تھے، نہ ان کا دھرم تھا، نہ ایمان، نہ اخلاق تھا، نہ کیریکٹر۔ آپ ایسی حالت میں اپنے آپ کو ان کی اصلاح کے لیے تیار کریں اور پھر اندازہ کریں کہ آپ کے سامنے کس قدر مشکل کام ہے اور اس کے لیے آپ کو کتنا وقت درکار ہوگا۔ یہ سب کچھ اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد آپ حضرت محمد صاحب کے کام پر نظر ڈالیں کہ انہوں نے کس طرح اور کتنے تھوڑے عرصہ میں اس قوم کی کایا پلٹ دی۔ آپ نے کس طرح دکھ اٹھائے اور مصیبتیں جھیلیں اور سخت سے سخت تکالیف کا سامنا کیا؟ اور پھر یہ سب کچھ کس لیے؟ عزت کے لیے یا کسی دیگر ذاتی غرض کے لیے؟ آپ اس کا جواب بھی تاریخ میں تلاش کریں اور خاص طور پر اس زمانہ پر نظر ڈالیں جب کہ تمام عرب میں اسلام کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور آپ مکمل طور پر رسول اللہ تسلیم کر لیے گئے تھے۔ تاریخ کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اتنا بڑا درجہ اور اتنی بڑی کامیابی حاصل کر کے بھی دنیاوی نقطۂ نظر سے آپ نے کوئی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا، عیش وعشرت کے وسائل بسہولت مہیا ہو سکنے کے باوجود بھی آپ کا خانگی ساز وسامان ایک معمولی انسان کے ساز وسامان سے بڑھ کر نہ تھا۔

جب آنحضرتؐ فوت ہوئے ہیں، تو آپ کی بیوی حضرت عائشہؓ کی شہادت ہے کہ چند صاع (سیر) کے بدلے آنحضرتؐ کی زرہ رہن تھی۔

حضرت عائشہؓ کی شہادت ہے کہ مہینے گزر جاتے اور ہمارے گھر میں آگ نہ جلتی اور جب تک آپؐ زندہ رہے، گندم کی روٹی بہت کم نصیب ہوئی۔

جب میں ایسی باتیں پڑھتا ہوں تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں اور دل تھرتھرا اٹھتا ہے۔ خلق خدا کی بہتری کے لئے اس سے زیادہ قربانیاں اور کیا ہوسکتی ہیں؟

پیغمبر اسلام...... مختصر حالات

(تقریر صدارت جناب پالملا اسوناوہم راؤبی اے، ایل، ٹی وکیل وکھم)

حضرت محمدؐ ۵۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش سے پہلے آپ کے والد گزر چکے تھے۔ بی بی حلیمہ آپ کو دودھ پلاتی رہیں۔ آپ تین سال سے کم عمر کے تھے کہ والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ آپ کے دادا پرورش کرنے لگے۔ آپ کی عمر ۶ سال کے قریب تھی کہ آپ کے دادا نے بھی انتقال فرمایا اور آپ اپنے چچا ابو طالب کے زیر سایہ پرورش پانے لگے۔ آپ بڑے ہوئے تو تمام نبیوں کی سنت کے مطابق بکریاں چرانے لگے۔ اس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ چھوٹا سا لڑکا جو بکریاں چرا رہا ہے، ایک دن ریفارمر اور پیغمبر بنے گا۔ آپ لڑکپن ہی سے سچے تھے، امین تھے، آپ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا، اسی لیے لوگ آپ کو اُمی کہا کرتے تھے جب آپ جوان ہوئے تو مکہ کی ایک امیر عورت کے ساتھ جن کا نام خدیجہؓ تھا، بیوپار شروع کیا۔ چونکہ آپ سچے تھے، اس واسطے آپ جہاں جاتے، وہاں کے لوگ آپ ہی سے مال خریدتے، کیونکہ آپ کی نگاہ میں امیر و غریب برابر تھے۔ آپ جو قیمت امیر سے کہتے، وہی غریب سے کہتے، اس لیے آپ کا مال بہت جلد فروخت ہو جاتا اور نفع بھی پہلے سے دگنا ملتا۔ آپ نے اسی طرح 25 سال کی عمر تک بیوپار کیا۔ خدیجہؓ آپ کی ایمانداری سچائی اور خوبصورتی پر گرویدہ ہو گئیں اور نکاح کی درخواست پیش کی۔ اس وقت خدیجہؓ کی عمر 40 سال کی تھی اور آپ پچیس سال کے تھے۔ آپ نے ان کی درخواست کو منظور فرمایا اور نکاح ہو گیا۔ اس کے بعد خدیجہؓ 65 سال (انتقال تک) آپ کے گھر آباد رہیں۔ آنحضرت نے ان کے ساتھ محبت کی اور یہ آنحضرت پر فدا تھیں (ایک بیٹے کے سوا) آپ کی تمام اولاد خدیجہؓ ہی سے پیدا ہوئی۔ دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں تو گزر گئے، اور صرف ایک بیٹی فاطمہؓ کی اولاد ابھی دنیا میں باقی ہے۔ جب سے آپ نے شادی کی، یہ آپ کا معمول ہو گیا

کہ تھوڑی روٹیاں یا ستو اور پانی لے کر غار حرا میں جا بیٹھتے اور وہاں خدا کی یاد کیا کرتے اور اپنے معاشرے کی بُری حالت کو دیکھ کر بہت کڑھتے۔ اس وقت ملک عرب کشت و خون سے بھرا ہوا تھا۔ بیٹیوں کو قتل کرنا، جوا کھیلنا، شراب پینا، حرام کاری، جانوروں کا لڑانا، یہ سب چیزیں حد درجہ پر تھیں، اس لیے آپ نے اپنے ملک عرب کو گمراہی سے نکالنے کا عزم کر لیا۔ جب آپ کی عمر 40 سال کی ہوئی، تو آپ نے آسمان سے ایک نورانی تخت اپنی طرف آتے دیکھا۔ جب قریب پہنچا تو اس پر ایک نورانی صورت نظر آئی جس نے آپ کو پیغمبری کی خوشخبری دی اور دین کے احکام سکھلائے۔ اس وقت سے آپ اپنے دین کی اشاعت میں سرگرم ہو گئے۔

اسلام تلوار سے نہیں پھیلا

کئی لوگوں نے کہا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے۔ یہ بالکل ناواقفیت کی بات ہے۔ صاحبو! ایک شخص جس کا تمام عرب تو کیا عرب کی ریت تک سخت دشمن تھی۔ تلوار سے کس طرح اسلام پھیلا سکتا تھا؟ اصل واقعات یہ ہیں، کہ آپ نے چند سال کی مسلسل کوشش سے قریباً 20 آدمیوں کو مسلمان کر لیا، مگر عرب کے جاہل لوگ آپ کو اور آپ کے پیروؤں کو سخت تکلیف دینے لگے تو آپ نے اپنے تمام لوگوں کو حبش بھیج دیا اور خود وہیں رہے۔ عرب کے کئی جاہلوں نے حبش کے بادشاہ نجاشی کے ہاں ایک وفد بھیجا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ وہ نووارد مسلمانوں کو حبش سے نکال دے۔ مگر بادشاہ نے نہ مانا۔ اس پر کفار نے مکہ کے مسلمانوں پر زیادہ ظلم شروع کر دیا، جس سے تمام مسلمان تنگ آ کر 225 میل شمال کو مدینہ میں چلے گئے۔ تھوڑا عرصہ بعد خود آنحضرت بھی وہیں چلے گئے اس واقعہ کو ہجرت کہتے ہیں۔ اور سن ہجری بھی اس واقعہ سے شروع ہوا ہے، لیکن مکہ والوں نے یہاں بھی مسلمانوں کو چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ وہ سالہا سال تک ہزارہا آدمیوں کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کرتے رہے اور خون بہاتے رہے آخر سچائی کو فتح ہوئی اور مسلمانوں نے مکہ فتح کر لیا۔ جب مکہ فتح ہوا تو ہزاروں قیدی پکڑے آئے، جن میں ایسے سخت دشمن بھی تھے جنہوں نے آپ کے چچا حمزہؓ کا خون بہایا تھا۔ آپ کی پیاری بیٹی کو قتل کیا تھا۔ اگر آپ چاہتے تو ان کو قتل کر دیتے۔ خون کے بدلے میں مکہ کی زمین لال کر دیتے مگر آپ نے سب کو معاف کر دیا۔ ایسی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

صاحبو! میں دوسرے مذاہب کے متعلق زیادہ اظہار خیالات نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر سچ پوچھو تو قرآن اور محمد صاحب کے حالات جس قدر مکمل اور صحیح لکھے گئے ہیں اور کسی مذہب کے نہیں لکھے گئے۔ انجیل حضرت مسیح کے سواسو سال بعد لکھی گئی ہے۔ قرآن شریف آنحضرت کے زمانہ میں لکھا گیا اور آپ نے کئی مرتبہ اس کو سنا اور پڑھا۔ آپ کے حالات اتنے کھلم کھلا ہیں کہ آپ نے اپنے پیروؤں کو حکم دے دیا تھا کہ جو بات مجھ سے سنو اور جو کام مجھے کرتے دیکھو وہ سب لکھ لیا کرو۔ کتنی پیاری نصیحت تھی۔ صاحبو! جو کچھ میں نے کہا ہے، ایک ہندو کی حیثیت سے کہا ہے، اگر کچھ غلطیاں ہوں تو معاف فرمائیں۔

(ترجمہ از تلنگو۔ تقریر صدارت جلسہ یوم النبیؐ۔ 7 جولائی 1933ء)

زندگی کا ایک سچا نمونہ

سوامی بھوانی دیال سنیاسی کی تقریر

سوامی جی جنوبی افریقہ کے مشہور ہندوستانی لیڈر تھے اور نٹال انڈین نیشنل کانگرس کے وائس پریذیڈنٹ تھے۔

دوستو! جب مجھے معلوم ہوا کہ ڈہری میں حضرت محمد صاحب کی یادگار منائی جانے والی ہے اور اس موقعہ پر تمام دھرموں کے لوگوں کی شرکت ہوگی تو مجھے بے پناہ خوشی ہوئی اگرچہ اس وقت میں بے حد مشغول تھا، تاہم میری ساری مصروفیتیں بھی اس پاک جلسے میں شریک ہونے سے مجھے باز نہ رکھ سکیں۔ ایسے جلسے کی، جس میں اُس باعظمت شخصیت کا ذکر خیر ہو اور جہاں ہر مذہب وملت کے افراد اس جلیل و بزرگ ہستی کو خراج تعظیم وتکریم پیش کرنے کے لئے ایک پلیٹ فارم پر مجتمع ہوئے ہوں، صدارت کرنے پر مجھے فخر ہے۔

سچائی کا بول بالا

بھائیو! جس وقت ملک عرب میں بدترین جہالت پھیلی ہوئی تھی۔ قوم کی قوم کے اخلاق و عادات بگڑ چکے تھے۔ تمام لوگ چوری، ڈاکے اور لوٹ مار میں مبتلا تھے، شراب خوری اور قمار بازی، قتل و غارت گری بمنزلہ فن سمجھی جانے لگی تھی۔ لڑکیاں پیدا ہوتے ہی کمال بے رحمی اور بے دردی سے زندہ درگور کردی جاتی تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک خدا کی پرستش اور عبادت چھوڑ کر مورتی پوجا اور بت پرستی کا زور شور تھا۔ یہاں تک کہ خود کعبہ کے اندر تین سو ساٹھ بتوں کی پوجا ہو رہی تھی۔ اس وقت محمدؐ صاحب کی ہی تنہا ذات تھی جس نے بے مثال ہمت و جرأت کے ساتھ قوم عرب کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور نعرۂ توحید بلند کیا۔ آپ نے عرب کے تمام سرداروں کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے اپنے مشن کی تبلیغ کرنا شروع کر دیا اور ساری قوم کو ہر طرح کی برائیاں

اور بت پرستی چھوڑ کر خدا کے آگے سر جھکا دینے کی دعوت دی۔ لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ محمدؐ صاحب کی صداقت بھری آواز پر اُن کی قوم نے فوراً لبیک کہا اور ان کی تعلیمات کو بآسانی قبول کر لیا؟ نہیں، ایسا نہیں ہوا۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک بڑی محرومی ہوتی۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو محمد صاحب کے انتہائی صبر و استقلال بے عدیل عفو و ترحم اور آپ کی بے شمار صفات عالیہ پردۂ اخفاء میں رہ جاتیں اور دنیا ان سے واقف نہ ہو سکتی۔ محمدؐ صاحب کو بھی شروع میں انہی دقتوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا، جو ہر بڑے سے بڑے مصلح قوم کا حصہ ہیں۔ اس مصلح اعظم کو اپنے مقاصد حقہ میں کامیاب ہونے کے لیے جان گسل تکالیف و مصائب اور جگر خراش آفات و مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ آپ پر راستے میں لوگ کنکروں اور پتھروں کی بارش کرتے اور جس راستے آپ گزرتے، وہاں کانٹے بچھا دیتے۔ لڑکوں سے آپ کے پیچھے تالیاں بجوائی جاتیں، حتیٰ کہ عبادت کرتے وقت آپ پر اونٹ کا گندا اوجھ ڈال دیا جاتا۔ محمدؐ صاحب نے جب ان رکاوٹوں کا بھی نہایت صبر تحمل سے مقابلہ کیا اور ان کی سرگرمی تبلیغ اور جوش اصلاح میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا تو دشمنوں نے آپ کے قتل کی سازش کی اور آپ کو اپنا پیارا وطن مکہ چھوڑ کر دوسرے شہروں میں چلے جانا پڑا۔ تاہم محمد صاحب نے اپنے عدیم النظیر استقلال اور ہمت کو نہ چھوڑا اور برابر اسلام دھرم کی تبلیغ کرتے رہے۔ حق بات کہنے سے کبھی نہ جھجکے۔ آخر کار محمدؐ صاحب کا بول بالا ہوا اور ان کی زندگی ہی میں سارا عرب دیش تمام برائیوں سے پاک و صاف ہو گیا۔ کعبہ سے ایک ایک بت توڑ توڑ کر پھینک ڈالے گئے اور یہ قدیمی عبادت گاہ پھر ایک خدا کی پوجا کا مرکز قرار پائی۔

بے انتہا صبر اور ثابت قدمی

دشمنوں نے محمدؐ صاحب کو حد سے زیادہ ستایا اور طرح طرح سے تنگ کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن آپ نے کبھی کسی کو برا نہ کہا۔ کسی سے سخت کلامی نہ کی۔ آپ کے دل میں بدلہ لینے کی خواہش کبھی پیدا نہ ہوئی آپ با اختیار ہوئے، اس وقت بھی آپ نے عفو عام کا اعلان کر دیا اور کبھی کسی سے برا سلوک روا نہ رکھا، نہ بری طرح پیش آئے۔ ہمیشہ خوش گفتاری، خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے پیش آنا، چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب، مرد ہو یا عورت، سب سے یکساں طور پر ملنا آپ کے روزمرہ میں داخل تھا۔

سب کے لیے نمونہ

دوستو! محمدؐ صاحب کی سوانح حیات سب کے لیے نمونہ ہے اور ان کی تعلیمات سے ہر دھرم اور ہر قوم کے لوگ خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ محمدؐ صاحب نے اخوت اور مساوات کی بے بہا تعلیم دے کر دنیا پر ایک بہت زبردست احسان کیا ہے۔ اسلام میں سب سے زیادہ قابل تعریف اور خوبی کی بات یہی "برابری اور بھائی چارہ" ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنے برابر اور اپنا بھائی سمجھتا ہے، خواہ اس کی کوئی پوزیشن یا رنگ یا قومیت ہو۔ کالے گورے، امیر و غریب، ایشیائی افریقی کی اسلام میں کوئی تفریق نہیں۔ میں نے جنوبی افریقہ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایک حبشی مسلمان ایک عرب کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھانا کھا رہا ہے۔ ایسی اخوت اور ایسی مساوات کی مثال کسی اور مذہب میں ڈھونڈے سے بھی نہیں پائی جا سکتی۔ عیسائی دھرم کا دعویٰ ہے کہ وہ عالمگیر برادری کا علم بردار ہے لیکن یہ بھی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ افریقہ میں گورے عیسائیوں کے گرجے میں کالے عیسائیوں کا داخل ہونا ممنوع قرار دیا گیا ہے اور دونوں کے گرجے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ گورے عیسائی اپنی میز پر کالے عیسائیوں کو کھانا کھلانے تک کے روادار نہیں۔ یہ ہے عیسائی دھرم کی عالمگیر برادری۔

اسلام جنوبی افریقہ میں

محمدؐ صاحب نے دوسرے دھرم کے لوگوں کے ساتھ رواداری برتنے کی تعلیم بھی دی ہے۔ آپ نے خود ایک موقعہ پر ایک عیسائی وفد کو جو آپ کی خدمت میں باریاب ہوا تھا اپنی مسجد میں نہ صرف ٹھہرنے کی اجازت دی بلکہ اپنے مذہبی ارکان بجالانے کی آزادی بھی دیدی، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پادری اینڈریوز کے ساتھ مہاتما گاندھی کو صرف اس بنا پر کہ وہ ایشیائی اور غیر عیسائی ہیں، جنوبی افریقہ میں داخلے سے روک دیا گیا۔

افریقی نومسلموں کے ساتھ وہاں کے پرانے مسلمانوں کا بلاتفریق برادرانہ میل جول دیکھ کر افریقہ کے عیسائی مشنریوں کو ایک سخت خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ کیونکہ گورے عیسائی کالے عیسائیوں کے ساتھ ایسی برابری کا اصول روا نہیں رکھتے اور اس قسم کے برتاؤ سے ان مشنریوں کو یقین ہو گیا ہے کہ افریقہ میں اسلامی اخوت اور مساوات کے سامنے اب عیسائیت کی تبلیغ

کارگر نہیں ہوتی۔

اسلام کی تلوار

اپنی انہی خوبیوں کے سبب اسلام اتنی سرعت سے اشاعت پذیر ہے۔ یہ کہنا کہ ''اسلام تلوار کے زور سے پھیلا'' اسلام کی تعلیمات کے بالکل خلاف کہنا ہے۔ اسلام کی اشاعت کا اصلی سبب تو اس کی پُر اوصاف تعلیم اور اس کے بانی کی پاک وصاف اور قابل تقلید زندگی ہے۔ اسلام عام طور پر تلوار اٹھانے کے یکدم خلاف ہے۔ صرف تین ایسے مواقع ہیں، جب تلوار استعمال کرنے کی اسلام اجازت دیتا ہے۔ اول اپنی جان کی حفاظت کے لیے، دوسرے مسجدوں اور عبادت خانوں کے تحفظ کی خاطر، تیسرے اس وقت جب مسلمانوں پر ایک خدا کا نام لینے کی وجہ سے ظلم توڑا اور ان کو بے خانماں کیا جا رہا ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیم تلوار اٹھانے کو نہایت ہی اہم واقعات کے لئے محفوظ رکھتی ہے اور تلوار کے استعمال میں بہت محتاط ہے۔

بھائیو! محمدؐ صاحب کی ہمت و جرأت اور عزم و استقلال نے دنیا میں مسلمانوں جیسی بہادر اور خدا پرست قوم کو پیدا کیا ہے، جس کی سلطنت زیادہ دن نہیں گزرے ہیں کہ ہفت اقلیم پر چھائی تھی۔ سارے عالم میں اس کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا اور کوئی دوسری قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ یہی مسلمان آج اس قدر تباہ و خراب اور خستہ حال و پریشان کیوں نظر آ رہے ہیں؟ ان کی گردنوں میں غیروں کی غلامی کا جوا کیوں پڑا ہوا ہے؟ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ محمدؐ صاحب کی تعلیم سے مسلمان کوسوں دور ہٹ گئے ہیں۔ محمدؐ صاحب کے نام لیوا چاہیں تو اپنی کھوئی ہوئی عظمت و عزت کو دوبارہ واپس لا سکتے ہیں۔ اگر وہ حقیقی طور پر محمدؐ صاحب کے زبردست عزم و استقلال، جرأت و ہمت اور اخلاقی و رواداری کو پھر اپنا بنا لیں۔

دوستو! میں دوسرے مذہب کے لوگوں سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ وہ محمدؐ صاحب کو اپنا نمونہ بنائیں اور ان کی عمدہ تعلیمات پر عمل کر کے فائدہ حاصل کریں۔

روح محمدؐ سے معافی کی درخواست

تقریر صدارت: مسٹر بی، ایس کشالپہ بی اے، ڈی، ای (لنڈن)
ڈپٹی انسپکٹر مدارس (کورگ)

"بیشک محمدؐ ایک سچے پیغمبر تھے۔ سچے محمدؐ کے متعلق میرے دل میں جس قدر بدگمانیاں تھیں، میں محمدؐ سے اُن کی معافی مانگتا ہوں اور علی الاعلان کہتا ہوں کہ آج دنیا میں ایک شخص کی بھی مجال نہیں ہے کہ وہ حضرت محمدؐ کے کیریکٹر پر سیاہ داغ لگا سکے۔ میری درخواست ہے کہ جن بھائیوں نے اسلام کا لٹریچر نہیں پڑھا، وہ اسے ضرور پڑھیں کیونکہ وہ زمانہ قریب آگیا ہے جب کہ تم سب کو اسلام کا لٹریچر تلاش کرنا پڑے گا۔"

(مسٹر کشالپہ صدر جلسہ یوم النبیؐ)

میں اپنے مسلم بھائیوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھ ناچیز کو ایسے پاک اور عظیم الشان جلسہ سیرت کی صدارت کا فخر عطا فرمایا، جس میں روئے زمین کی 1/5 آبادی شامل ہوتی ہے۔ آج میں آپ کے سامنے ایک زبردست اور بے مثال ریفارمر کے متعلق ناچیز خیالات کا اظہار کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں۔ یہ ریفارمر محمدؐ ہیں۔ آپ ایک پیغمبر بھی تھے۔ یوں تو دنیا میں کئی پیغمبر اور مصلح پیدا ہوئے یعنی مسلمانوں کی مقدس کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایک لاکھ چالیس ہزار پیغمبر اس دنیا میں آئے اور انہوں نے اپنے فرائض ادا کئے۔ کسی کو خدا کا اوتار کہا گیا جیسے سری رام اور سری کرشن۔ کسی کو خدا کا بیٹا کہا گیا، جیسے حضرت عیسیٰؑ چونکہ ہندو ریفارمروں

کی کتابیں خود ان کے زمانے میں مکمل نہ ہوئیں، بلکہ انہیں مختلف زمانوں میں مختلف منصفوں نے مرتب کیا ہے اس لیے اب وہ صحیح دلائل پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض کتابوں میں بعض الزامات بھی لگائے گئے ہیں۔ مثلاً شوراتری وغیرہ میں ایسی باتیں ہیں کہ ان کا بیان کرنا بھی میرے لیے باعث ننگ و شرم ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کو ایک طرف پیغمبر کہا گیا اور دوسری طرف خدا کا بیٹا کہا گیا۔ اس طرح ان کے افعال اور اقوال میں مساوات قائم نہ رہ سکی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مقدس کتاب میں اکثر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، لیکن حضرت محمدؐ کا دعویٰ ان سب کے برعکس ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں تم جیسا ایک انسان ہوں۔ آپ کی زندگی ایک انسانی زندگی تھی۔ آپ کی لوگوں سے ملنساری اور محبت حیرت انگیز تھی۔ آپ کے افعال و اقوال یکساں تھے۔ آپ کے صبر و استقلال کی کوئی حد نہ تھی۔ آپ بادشاہ ہونے کے باوجود خود کئی کئی روز فاقہ کرتے تھے مگر دوسروں کی مہمانداری میں فرق نہ آتا تھا۔ آپ پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے۔ آپ اپنے ہاتھ سے گھر کا سارا کام کرتے اور اپنے غلام سے اپنے برابر برتاؤ کرتے۔ آپ دشمنوں پر رحم کرتے حتیٰ کہ آپ نے اپنے جانی دشمنوں اور اپنے بیگناہ عزیزوں کے قاتلوں تک کے قصور معاف کیے۔ مختصر یہ کہ آپ کی ساری زندگی حقیقتاً قرآن کے مطابق تھی۔

زیادہ شادیوں کا جواب

صاحبان! آنحضرتؐ کی کثرت ازواج کے متعلق بہتان لگایا گیا ہے۔ لیکن یہ محض غلط ہے۔ بیشک آپ نے کئی بیویاں کی تھیں مگر اس زمانے کے برے رواج کو مٹانے کے لئے اور ہر طبقے کی عورتوں کو نکاح میں لا کر اُن کا سہارا بن جانے کے لئے اور لوگوں کو ترغیب دینے کے لیے کہ وہ بھی بیوہ، باکرہ، غلام اور لاوارث عورتوں کو اپنے نکاح میں لائیں اور آپ کے نمونہ کی پیروی کریں۔ آپ نے نفسانی خواہش کے لیے نکاح نہیں کئے تھے۔ آپ میں نفسانی خواہش کی کوئی دلیل یا علامت نہیں پائی جاتی۔

اسلام اور تلوار

میں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں حضرت محمدؐ کے متعلق پڑھا تھا کہ انہوں نے ایک ہاتھ میں تلوار لے کر اپنے مذہب کی تبلیغ کی ہے۔ لیکن اب میں دیکھتا ہوں تو یہ الزام بھی بالکل

خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے لوگوں کو خوف، ظلم یا زبردستی سے قبول دین پر آمادہ نہیں کیا۔ آپ ایسا کس طرح کر سکتے تھے، جب کہ آپ کوئی زبردست حاکم نہ تھے۔ آپ کی حالت تو سراسر اِس کے خلاف تھی۔ آپ کے ہزاروں دشمن تھے، جن کے ظلم وستم سے خود آپ کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ صرف اپنے مذہب کا وعظ فرماتے تھے۔ جن کو یہ وعظ بھلا معلوم ہوتا، وہ خوشی سے دینِ محمدی میں شامل ہوتے۔ کئی دلائل موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ غیر مسلموں کے ساتھ نہایت دوستانہ برتاؤ کرتے تھے۔ آپ ان کے جان ومال کے محافظ تھے۔ خود کئی عیسائی مصنفوں نے اس کو تسلیم کیا ہے۔

پیغمبر اسلام کا اصلی معجزہ

آپ کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ کی زبان میں اثر تھا، اگرچہ آپ نہایت جہالت کے زمانے میں اور ایک وحشی ملک میں پیدا ہوئے۔ ماں باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا اور غربت کی زندگی میں پرورش پائی۔ آپ نہ دولتمند تھے اور نہ استادوں سے پڑھے تھے۔ غرضیکہ آپ کے لیے ایک بھی وجہ موجود نہ تھی کہ جس کی بناء پر آپ عرب کے وحشی باشندوں کی نظر میں ایک زبردست ہستی سمجھے جاسکتے۔ پھر ایسی حالت میں آپ کی نصیحت کا کارگر ہونا، آپ کے اثر سے دوست دشمن اور صغیر وکبیر کی فطرت کا بدل جانا، ہزار ہا لوگوں کا اپنی نفسانی خواہشوں کو خیر باد کہہ دینا اور ایک قلیل مدت میں آپ کی تعلیم کا مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک سیلاب کی طرح پھیل جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے، خاص طور پر ایسی حالت میں جب کہ نہ اخبارات تھے، نہ مطبوعات تھیں۔ اور نہ ریل اور تار برقی ہی موجود تھی۔

میں مثال کے طور پر امریکہ جیسے تہذیب یافتہ ملک کو لیتا ہوں۔ وہاں صرف ایک شراب نوشی کو بند کرنے کے لئے کیا کیا ذرائع اختیار نہیں کیے گئے؟ وہاں کی گورنمنٹ نے کئی سال تک جبری قوانین کے ذریعہ سے زبردست کوشش کی، مگر سب کچھ بے فائدہ ثابت ہوا ہے۔ ہندوستان میں گاندھی جی نے کتنی تدابیر اختیار کی ہیں اور کر رہے ہیں؟ ان کی امداد کے لیے بھی ہزاروں قابل اور دولت مند آدمی موجود ہیں۔ ان کے ساتھ بے حساب مطبوعات اور اخبارات بھی مصروف عمل ہیں مگر شراب خوری جیسی پہلے تھے، ویسی ہی ہے۔

لیکن اس کے خلاف حضرت محمدؐ صاحب کی تلقین کو دیکھئے۔ آپ کے صرف ایک زبانی حکم سے عرب میں شراب خوری تو کیا اور کتنے ہی افعال بد ایک قلیل مدت میں بالکل ہی نیست و نابود ہو گئے۔ مجھے یہ کہنے میں کچھ باک نہیں ہے کہ بیشک محمدؐ ایک سچے پیغمبر تھے۔ مجھے آج کی صدارت قبول کرنے سے پہلے آپ کے حالات پڑھنے کا موقعہ ملا ہے اور میں صرف بیس روز کے مطالعہ سے بہت کافی معلومات حاصل کر چکا ہوں۔ میں اس کے لئے اپنے مسلم بھائیوں کا مشکور ہوں۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں آئندہ پیغمبر اسلام کے متعلق وسیع لٹریچر حاصل کروں گا۔ ہاں سچے محمدؐ کے متعلق اس سے پہلے میرے دل میں جس قدر بدگمانیاں تھیں میں روح محمدؐ سے ان کی معافی چاہتا ہوں اور بلا مبالغہ اور علی الاعلان کہتا ہوں کہ آج دنیا میں ایک شخص کی بھی یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ حضرت محمدؐ کے کیریکٹر پر ایک سیاہ دھبہ لگا سکے۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ جن بھائیوں نے اسلام کا لٹریچر نہیں پڑھا۔ وہ اسے ضرور پڑھیں۔ کیونکہ اب زمانہ قریب آ گیا ہے جب کہ تم سب کو مذہب اسلام کا لٹریچر تلاش کرنا پڑے گا۔ (ترجمہ از انگریزی)

خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے لوگوں کو خوف، ظلم یا زبردستی سے قبول دین پر آمادہ نہیں کیا۔ آپ ایسا کس طرح کر سکتے تھے، جب کہ آپ کوئی زبردست حاکم نہ تھے۔ آپ کی حالت تو سراسر اس کے خلاف تھی۔ آپ کے ہزاروں دشمن تھے، جن کے ظلم وستم سے خود آپ کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ صرف اپنے مذہب کا وعظ فرماتے تھے۔ جن کو یہ وعظ بھلا معلوم ہوتا، وہ خوشی سے دینِ محمدی میں شامل ہوتے۔ کئی دلائل موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ غیر مسلموں کے ساتھ نہایت دوستانہ برتاؤ کرتے تھے۔ آپ ان کے جان و مال کے محافظ تھے۔ خود کئی عیسائی مصنفوں نے اس کو تسلیم کیا ہے۔

پیغمبر اسلام کا اصلی معجزہ

آپ کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ کی زبان میں اثر تھا، اگرچہ آپ نہایت جہالت کے زمانے میں اور ایک وحشی ملک میں پیدا ہوئے۔ ماں باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا اور غربت کی زندگی میں پرورش پائی۔ آپ نہ دولتمند تھے اور نہ استادوں سے پڑھے تھے۔ غرضیکہ آپ کے لیے ایک بھی وجہ موجود نہ تھی کہ جس کی بناء پر آپ عرب کے وحشی باشندوں کی نظر میں ایک زبردست ہستی سمجھے جا سکتے۔ پھر ایسی حالت میں آپ کی نصیحت کا کارگر ہونا، آپ کے اثر سے دوست دشمن اور صغیر و کبیر کی فطرت کا بدل جانا، ہزار ہا لوگوں کا اپنی نفسانی خواہشوں کو خیرباد کہہ دینا اور ایک قلیل مدت میں آپ کی تعلیم کا مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک سیلاب کی طرح پھیل جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے، خاص طور پر ایسی حالت میں جب کہ نہ اخبارات تھے، نہ مطبوعات تھیں۔ اور نہ ریل اور تار برقی ہی موجود تھی۔

میں مثال کے طور پر امریکہ جیسے تہذیب یافتہ ملک کو لیتا ہوں۔ وہاں صرف ایک شراب نوشی کو بند کرنے کے لئے کیا کیا ذرائع اختیار نہیں کیے گئے؟ وہاں کی گورنمنٹ نے کئی سال تک جبری قوانین کے ذریعہ سے زبردست کوشش کی، مگر سب کچھ بے فائدہ ثابت ہوا ہے۔ ہندوستان میں گاندھی جی نے کتنی تدابیر اختیار کی ہیں اور کر رہے ہیں؟ ان کی امداد کے لیے بھی ہزاروں قابل اور دولت مند آدمی موجود ہیں۔ ان کے ساتھ بے حساب مطبوعات اور اخبارات بھی مصروف عمل ہیں مگر شراب خوری جیسی پہلے تھی، ویسی ہی ہے۔

لیکن اس کے خلاف حضرت محمدؐ صاحب کی تلقین کو دیکھئے۔ آپ کے صرف ایک زبانی حکم سے عرب میں شراب خوری تو کیا اور کتنے ہی افعال بد ایک قلیل مدت میں بالکل ہی نیست و نابود ہو گئے۔ مجھے یہ کہنے میں کچھ باک نہیں ہے کہ بیشک محمدؐ ایک سچے پیغمبر تھے۔ مجھے آج کی صدارت قبول کرنے سے پہلے آپ کے حالات پڑھنے کا موقعہ ملا ہے اور میں صرف بیس روز کے مطالعہ سے بہت کافی معلومات حاصل کر چکا ہوں۔ میں اس کے لئے اپنے مسلم بھائیوں کا مشکور ہوں۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں آئندہ پیغمبر اسلام کے متعلق وسیع لٹریچر حاصل کروں گا۔ ہاں سچے محمدؐ کے متعلق اس سے پہلے میرے دل میں جس قدر بدگمانیاں تھیں میں روح محمدؐ سے ان کی معافی چاہتا ہوں اور بلا مبالغہ اور علی الاعلان کہتا ہوں کہ آج دنیا میں ایک شخص کی بھی یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ حضرت محمدؐ کے کیریکٹر پر ایک سیاہ دھبہ لگا سکے۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ جن بھائیوں نے اسلام کا لٹریچر نہیں پڑھا۔ وہ اسے ضرور پڑھیں۔ کیونکہ اب زمانہ قریب آ گیا ہے جب کہ تم سب کو مذہب اسلام کا لٹریچر تلاش کرنا پڑے گا۔ (ترجمہ از انگریزی)

اسلام اور پیغمبر اسلام

(بلدیو سہائی اے)

محترم صدر، بزرگوار بھائیو!

پیغمبر اسلام کی سیرت میں مثالی واقعات اس کثرت سے ملتے ہیں کہ اگر ان کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو ایک دفتر کی ضرورت ہوگی۔ قرآن جو مسلمانوں کی مذہبی کتاب ہے اور اللہ کی طرف سے ہے، آپ ہی کے اخلاق حسنہ کا مجموعہ ہے۔ دنیا کے تمام رسولوں اور پیغمبروں میں گوتم بدھ اور حضرت مسیح کو بہت ہی امتیازی درجہ حاصل ہے لیکن تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ ہند کے ریفارمر (بدھ) کا عمل کیا تھا؟ اور حضرت عیسیٰ جو اخلاق کا بہترین سبق دیا کرتے تھے، ان کے اپنے اعمال بھی ان کے اقوال کی تائید کرتے تھے یا نہیں؟ لیکن مکہ کا امی پکار پکار کر کہتا تھا کہ جو کچھ تم کرتے نہیں ہو، اس کو کہتے کیوں ہو؟ وہ اپنی تعلیم کا آپ نمونہ تھا۔ پیغمبر اسلامؐ جو بات مجلسوں میں کہتے اس کو گھر کی چاردیواری کے اندر بھی ادا فرماتے۔ اخلاق و عمل کی جو باریکی دوسروں کو سکھاتے اس کے عمل کا پہلے خود نمونہ بن جاتے۔ بیوی سے بڑھ کر انسان کے اخلاق کا اور کون رازداں ہوگا۔ چند اصحاب نے آپ کی بیوی حضرت عائشہؓ سے درخواست کی کہ آپ کے اخلاق بیان کیجیے" فرمایا، کیا تم قرآن نہیں پڑھتے کہ مجھ سے درخواست کرتے ہو؟ قرآن اور صرف قرآن آپ کا اخلاق تھا۔"

موجودہ آسمانی کتابیں اپنے پیغمبروں کے بہترین اخلاق اور اقوال کے مجموعے ہیں۔ قرآن بھی انہی میں ایک ہے۔ اگر قرآن کی تعلیمات واحکام پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ہر پہلو اور ہر جہت سے مکمل ہے۔ چنانچہ قرآن ہی میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اے محمدؐ! تم اخلاق کے بڑے درجے پر ہو۔"

ہمدردی خلائق

زمانہ نبوی کے بعض نکتہ چین اور کئی طرح کی بدزبانیوں کے علاوہ آپ کو سنگدل بھی کہتے تھے۔ قرآن نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ اے محمدؐ! خدا کی عنایت سے تم ان سے بڑی نرمی سے پیش آتے ہو۔ اگر تم کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے ہٹ جاتے۔ پھر فرمایا، ''اے لوگو! تمہارے پاس تم میں سے ایک پیغمبر آیا ہے اس پر تمہاری تکلیف گراں گزرتی ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا بھوکا ہے اور ایمان والوں پر نہایت مہربان اور نرم ہے۔''

پیغمبر اسلام کے علم میں قرآن کے ان دعوؤں کا ثبوت موجود ہے، چنانچہ ایک دفعہ عرب میں اور خصوصاً مکہ میں پانی برسنے کی امید نہ رہی، لوگوں کو تکلیف ہونے لگی اور سخت بے چینی پھیل گئی۔ آپ کو اس وقت پیغمبری مل چکی تھی اور آپ خدا کی تعلیم اور واحدانیت کا وعظ فرمایا کرتے تھے۔ مکہ کے مشرکوں نے جو پانی نہ ہونے سے تنگ آ چکے تھے، پیغمبر اسلام سے عرض کی کہ اگر آپ سچے پیغمبر ہیں تو خدا سے دعا کیجیے کہ پانی برسے اور آپ کی قوم موت سے بچ جائے۔ اس پر آپ بے چین ہو گئے۔ آپ نے خدا سے دعا کی اور اس کے فضل سے جل تھل ایک ہو گیا۔

یہ ایک سچا واقعہ ہے جس سے کسی کو انکار نہیں کہ آپ دنیا کے کسی فرد بشر کو تکلیف میں دیکھ کر خود بے چین ہو جاتے تھے۔

پیکر اخلاق

مسئلہ اخلاق کی نسبت لوگ ایک بہت بڑی غلطی یہ کرتے ہیں کہ صرف رحم و مہربانی اور انکساری و فروتنی ہی کو اخلاق پیغمبرانہ سمجھتے ہیں، حالانکہ اخلاق کی جامعیت، زندگی کے ہر پہلو اور واقعات کے ہر گوشہ پر محیط ہے اور دوست و دشمن، عزیز و بیگانہ بڑے چھوٹے غریب و امیر۔ صلح و جنگ، ظاہر و باطن غرض ہر جگہ اور ہر مجلس سے اسے برابر کا تعلق ہے میں چاہتا ہوں کہ مسئلہ اخلاق کی اسی جامعیت کو مدنظر رکھ کر پیغمبر اسلام کے اخلاق حسنہ پر روشنی ڈالوں۔

آپ کے مجموعۂ اخلاق کا مختصر بیان یہ ہے کہ کسی کو برا نہ کہتے۔ برائی کے بدلے میں برائی نہ کرتے بلکہ بدی کرنے والوں کو معاف فرما دیتے۔ کسی کا نام لے کر لعنت نہ کرتے۔ آپ نے

کسی لونڈی، غلام یا نوکر کو کبھی ہاتھ سے سزا نہ دی۔ کسی کی کوئی درخواست رد نہ کرتے۔ باتیں ٹھہر ٹھہر کر کرتے، تا کہ سننے والے سمجھ لیں اور یاد کر لیں۔ برا کلمہ زبان سے نہ نکالتے۔ آپ کے مزاج شناس صحابہ تیور سے آپ کا مزاج پہچان لیتے۔ مکالمہ اور محاورہ میں ضرورت سے زیادہ بات نہ کرتے۔ امن و امان کے خواہاں کو راحت و آرام پہنچاتے۔ نہایت فیاض، نہایت سچے، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش خصال تھے۔ کسی کی توہین نہ کرتے۔ ہمیشہ سچی بات کی حمایت کرتے۔ اگر کسی حالت میں آپ کو غصہ بھی آ جاتا تو برداشت فرماتے۔ ذاتی معاملات میں آپ کو نہ کبھی غصہ آیا اور نہ کسی سے بدلہ لیا۔

علم بردار صلح وسلام

چونکہ آپ کے تمام عادات وشمائل پر الگ الگ بحث کرنا ناممکن ہے، لہٰذا اس وقت صرف دو ایک باتوں پر غور کیا جائے گا۔

ہم کو موجودہ زمانے میں چند ایسے خطرات نظر آتے ہیں، جن کو اگر آنحضرت کی تعلیمات سے مٹانا چاہیں، تو فوراً نیست و نابود ہو سکتے ہیں۔ دنیا کو اس وقت امن و امان کی جس قدر ضرورت ہے، گزشتہ زمانے میں نہ تھی۔ آج اگر یورپین طاقتیں جنگِ عظیم سے تباہ نہ ہو چکی ہوتیں تو پھر سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتیں اور ہر طرف خون ہی خون کی روانیاں نظر آتیں جمعیۃ الاقوام اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ آئندہ کے لئے دنیا میں امن و امان کی حفاظت کی جائے۔ کوئی طاقتور کسی کمزور کو نہ ستائے۔ ہر ملک اپنی رعایا کی ترقی و بہبودی میں اپنی طاقت صرف کرے اور دوسری اقوام کو زندہ رہنے میں مدد دے اور جنگ کا نام مٹ جائے۔ لیکن عملی حالت یہ ہے کہ یورپ کی طاقتیں ایک دوسرے کو دیکھ کر غراتی ہیں۔ اپنی بحری و بری طاقتوں کے بڑھانے میں مصروف ہیں۔ اپنی رعایا کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رہی ہیں۔ اگر ان اقوام کو قرآن کی تعلیمات سے واقفیت ہوتی اور پیغمبر اسلام کی پاک زندگی کا نمونہ ان کے سامنے ہوتا تو وہ کبھی اس طرح دست و گریبان نہ ہو سکتیں۔ اسلام جس کے معنی ''امن'' کے ہیں اپنے پیروؤں کو حکم دیتا ہے کہ خود بھی باامن رہو اور دوسروں کو بھی چین سے رہنے دو۔'' اگر کسی مذہب نے امن و امان کو اپنا قرار دیا ہے اور اس کے قیام میں اپنی پوری قوت صرف کی ہے تو وہ مذہب صرف اسلام ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ دنیا میں ہر مذہب کے داعی نے قیام امن کی تاکید کی ہے لیکن پیغمبر اسلام کی خاص فضیلت یہ ہے کہ انہوں نے جس اہتمام کے ساتھ اس مقصد کے حصول پر زور دیا ہے اور جس تفصیل سے دنیا پر اس کے حصول کی راہیں کشادہ کی ہیں دنیا کا کوئی بھی داعی اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔ قرآن نے فتنہ وفساد کو گناہ قرار دیا ہے اور اس سے پرہیز کرنے کی سخت تاکید کی ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

''جو لوگ خدا کا عہد ایک مرتبہ باندھ کر توڑتے ہیں اور خدا نے جن رشتوں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، انہیں کاٹتے ہیں اور زمین پر فساد کرتے ہیں، وہی گھاٹے میں رہیں گے۔ زمین پر فساد نہ کرتے پھرو۔ خدا فساد کو پسند نہیں کرتا۔ خدا مفسد کو دوست نہیں رکھتا۔ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔''

یہ چند احکام نمونے کے طور پر ہیں۔ پیغمبر اسلام کے اعمال کی تفصیل آگے چل کر بیان کریں گے۔

امن افروز مساوات

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ کسی طاقتور قوم کے لیے صلح وامن کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ اپنے سے کمزوروں کو آزاد کردے اور اپنے غلاموں اور محکوموں کو برابری کا حق دے چنانچہ پیغمبر اسلام نے اپنی وفات کے وقت مسلمانوں کے ذریعہ سے دنیا کو یہی پیغام دیا تھا۔ آپ نے فرمایا ''مسلمانو! غلاموں کے معاملے میں خدا سے ڈرنا'' اسی تعلیم کا نتیجہ یہ ہے تھا کہ حضرت عمرؓ ایسے زبردست شخص کو جب خلافت ملی اور آپ نے یروشلم کا سفر کیا تو ایک منزل اپنے غلام کو اونٹ پر بٹھاتے تھے اور خود پیدل چلتے تھے اور دوسری منزل خود اونٹ پر سوار ہوتے تھے اور غلام پیدل چلتا تھا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ پیغمبر اسلام کے پیرو مساوات اور رواداری کے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی غفلت نہ کرتے تھے۔

سچے مسلمانوں کا وصف

انجیل میں حضرت مسیح فرماتے ہیں، جو کوئی اپنے آپ کو بڑا بنائے گا، وہ چھوٹا کیا جائے گا اور جو کوئی اپنے آپ کو چھوٹا بنائے گا، وہ بڑا کیا جائے گا۔ پیغمبر اسلام کی زندگی اس قول کا نمونہ تھی۔

آپ کو ایک بڑھیا مجلس کے اندر سے ہاتھ پکڑ کر لے جاتی ہے اور آپ اس کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک گلی میں بیٹھ کر بات کرتی ہے۔ آپ غور سے اس کی باتیں سنتے ہیں اور اس وقت تک بیٹھے رہتے ہیں، جب تک کہ وہ آپ کو اجازت نہیں دیتی۔ آپ بڑھیا کی اس حرکت کو برا خیال نہیں فرماتے، بلکہ نہایت ہی خندہ پیشانی اور کشادہ روئی سے دلجوئی کرتے ہیں۔

اسلام کی تعلیم ہے "زمین پر عاجزی سے چلو۔ جب جاہلوں سے ملو اور وہ جہالت کی باتیں کرنے لگیں۔ تو سلام کر کے الگ ہو جاؤ۔ لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ۔ غصے کو ضبط کرو اور لوگوں کے قصور سے درگزر کرو اور یہ بھی یاد رکھو کہ خدا احسان کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔"

اسلام نے صرف مسلمانوں سے نیک سلوک کرنے کو نہیں کہا، بلکہ دنیا کے عام انسانوں کو اس نعمت کا مستحق قرار دیا ہے، بلکہ قرآن نے تو مسلمانوں کی ایک پہچان ہی یہ بتلائی ہے کہ وہ برائی کا بدلہ نیکی سے دیتے ہیں۔ برائی کرنے والا مسلم، ہو یا غیر مسلم، مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں بلکہ نیکی سے دیتے ہیں۔

جس پیغمبر کی تعلیم یہ ہو کہ جو لوگ خدا کے سوا دوسروں کو معبود بناتے ہیں، تم ان کے معبودوں کو برا نہ کہو، ورنہ وہ بھی نادانی سے تمہارے خدا کو برا کہیں گے، وہ اپنے پیروؤں کو کس طرح یہ حکم دے سکتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے داعیوں کو برے الفاظ سے یاد کریں یا ان کو گمراہ اور بدعقیدہ کہیں۔

قرآن میں بار بار اس آیت کا اعادہ کیا گیا ہے۔ ہدایت اور ضلالت کا فیصلہ کرنے والے تم نہیں بلکہ ہم ہیں اور یہ کہ تمہارا پروردگار ہی اس بات کو خوب جانتا ہے کہ گمراہ کون ہے اور راہ حق پر کون ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ "ہر شخص اپنے طور پر عمل کرتا ہے اور اس کا علم تمہارے پروردگار ہی کو ہے کہ راہ راست پر کون ہے۔"

ان سب احکام پر غور کرنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ قرآن اور پیغمبر اسلام نے حلم و برداشت اور عفو و درگزر کے پھیلانے اور فساد اور بدامنی کے مٹانے میں کسی دوسرے مذہب کی کتابوں سے کم حصہ لیا ہے؟

مذہب کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عالمگیر برادری کا معلم ہو۔ اسلام نے گورے اور کالے، حبشی اور تاتاری، ہندی اور افغانی کی تمیز بالکل مٹا دی ہے۔ دور کیوں

جائیے، یہیں ہندوستان میں ہندوؤں کے ہر طبقہ اور ہر ذات کے لوگ اسلام لائے اور عربوں کے ہمسر ہو گئے۔ مجلسوں، مسجدوں اور مذہبی اور ملی کاموں میں ان کا حصہ برابر ہے۔

غیر مسلموں سے سلوک

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کی تعلیم نہیں دیتا اور یہ کہ وہ مسلمانوں کو مذہبی نفرت انگیزی سکھاتا ہے۔ ایسے اصحاب کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کی تعلیم اس بارہ میں حد سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ خدا فرماتا ہے:

"مسلمانو! تم خدا کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے آگے نہ بڑھو۔ خدا حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اگر تم بدلہ لو تم اس طرح جیسا تم سے لیا گیا ہے اور صبر کرو تو اچھا ہے۔ کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کو ہاتھ سے چھوڑ دو۔"

قرآن میں بعض جگہ اس قسم کے احکام بھی آئے ہیں۔ "کافروں سے لڑو اور کافر خدا کے دشمن ہیں۔" ان حکموں سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مخالف مذہب سے دشمنی رکھنا فرض مذہبی ہے، لیکن اس کا حقیقی مفہوم یہ نہیں ہے۔ یہ آیات دشمن قبائل کے متعلق ہیں۔ امن کے زمانہ اور عام حالات کے متعلق قرآن نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ فیصلہ یہ ہے:

"جو لوگ تم سے مذہبی لڑائی نہیں لڑتے نہ انہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہے، ان کی نسبت خدا تم کو اس بات سے منع نہیں کرتا کہ تم ان کے ساتھ بھلائی کرو اور انصاف کے ساتھ پیش آؤ۔ خدا تم کو ان لوگوں کی دوستی سے منع کرتا ہے، جو تم سے مذہبی لڑائی لڑتے ہوں، تمہارے نکالنے میں مددگار رہوئے ہوں جو لوگ اس آخری جماعت سے دوستی کرتے ہیں، وہ ظالم ہیں۔"

ان آیتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جب غیر قومیں مسلمانوں سے مذہبی جنگ نہ کریں ان کو اپنے ملک سے نہ نکالیں، نکالنے میں دوسروں کے مددگار بھی نہ ہوں تو ایسی صورت میں ان سے دوستی رکھنے اور بھلائی کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔

پیغمبر اسلام نے اپنی زندگی میں وہی کیا جو خدا نے قرآن کے ذریعہ سے آپ کو حکم دیا تھا۔ ذیل کے واقعات اس وقت کے ہیں، جب آپ کو ملک عرب پر پورا اقتدار حاصل ہو چکا تھا۔ اس وقت اگر آپ چاہتے یا قرآن کا حکم ہوتا تو آپ غیر مسلموں کو ضرور ستاتے یا ان کی ایذا رسانیوں

کا بدلہ لیتے، لیکن اول تو آپ طبعاً خلیق تھے اور دوم اس قسم کا فعل حکم خداوندی کے خلاف تھا، اس لیے آپ نے وہی کیا جس کی تعلیم آپ کو قرآن نے دی تھی۔

آپ کے گھر کا تمام کاروبار حضرت بلال حبشیؓ کے سپرد ہوتا تھا۔ روپیہ پیسہ جو کچھ آتا، وہی خرچ کرتے۔ اگر گھر میں کچھ نہ ہوتا تو بازار سے سودا سلف ادھار لے آتے اور وعدہ پر ادا کر دیتے۔ ایک روز بلالؓ بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک مشرک سوداگر نے کہا، اگر سودا لے جانا ہو تو مجھ سے ادھار لے جایا کرو۔ میں وعدے پر وصول کرلیا کروں گا۔ حضرت بلالؓ اس سوداگر کے یہاں سے کچھ سودا لے آئے اور وعدہ کر آئے کہ فلاں روز ادا کروں گا۔ ایک روز یہ سوداگر اپنے دوسرے عزیزوں کے ساتھ مسجد نبوی کے نزدیک آیا، اس وقت بلالؓ اذان دینے کو تھے۔ اس نے کہا۔ او حبشی! تجھے یاد ہے، وعدہ میں صرف چار دن باقی ہیں۔ اگر تم نے وعدہ پر روپے ادا نہ کیے تو یاد رکھو کہ تمہیں بکریاں چروا کے چھوڑوں گا۔ بلالؓ نے سوداگر کو کچھ جواب نہ دیا۔ البتہ نماز سے فارغ ہو کر آنحضرت کی خدمت میں آئے۔ حال بیان کیا اور کہا کہ اس وقت سوداگر کی ادائیگی کا کوئی سامان موجود نہیں ہے۔ اس واسطے میں چند دن کے لیے مدینہ سے نکل جاؤں گا۔ جب ادائیگی کا کوئی سامان ہو جائے گا، تو میں واپس آجاؤں گا۔ دوسرے دن آپ مدینہ سے نکلنے کی تیاری کر رہے تھے کہ باہر سے غلے کا ایک اونٹ آ گیا۔ حضرت بلالؓ اسی وقت بازار گئے اور قرض ادا کیا۔ پیغمبر اسلام اس وقت مدینہ کے فرمانروا تھے۔ آپ کے سامنے یہ واقعہ ہوا، مگر آپ نے سوداگر کی نسبت ایک لفظ بھی نہیں فرمایا اور نہ بلالؓ کی حمایت کی اگر غلہ بروقت نہ آ جاتا تو حضرت بلالؓ ضرور ڈر کے مارے مدینہ سے نکل جاتے۔

ایک دفعہ چند یہودی آپ کی خدمت میں آئے اور شرارت سے بجائے السلام علیکم کے السام علیکم کہا جس کے معنی ہیں تم پر موت آئے۔ حضرت عائشہ وہاں موجود تھیں ان کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے یہود کو برا بھلا کہا، لیکن آپ نے ان کو روکا اور کہا ''عائشہ نرمی کرو، اللہ نرمی کو پسند کرتا ہے''۔

عیسائیوں کا ایک وفد نجران سے آیا۔ آپ نے اپنی مسجد میں ان کو ٹھہرایا اور اجازت دی کہ وہ مسجد ہی میں اپنے مذہبی طریقہ سے عبادت کریں۔

کسی شخص نے آنحضرت سے دریافت کیا کہ یا حضرت! دشمنانِ احد کے حق میں بد دعا

کیجیے کہ انہوں نے آپ کو اس قدر تکلیف دی ہے۔ آپ نے فرمایا، کہ "میں تو صرف رحمت کے لئے آیا ہوں، نہ اس لیے کہ بددعا اور لعنت کروں۔" پھر فرمایا، "اللہ تعالیٰ نرمی پسند کرتا ہے اور جو نعمت وہ نرمی پر دیتا ہے، سختی پر نہیں دیتا۔" اللہ تعالیٰ اپنے انہی بندوں پر رحم کرتا ہے جو رحمدل ہیں۔

(ترجمہ: انگریزی۔ جلسہ یوم النبیؐ منعقدہ ڈھیری ضلع شاہ آباد)

دنیا کا سب سے زیادہ عوام پسند مذہب

یہ اہم تقریر بابو مکٹ دھاری پرشاد بی اے ایل ایل بی کی تقریر صدارت ہے، بابو صاحب گیارہ سال تک گیا کی میونسپل کمیٹی کے صدر تھے۔ دو دفعہ قومی تحریکات میں قید ہوئے۔ آپ جلسہ ڈھیری کے صدر تھے۔

بیشک! اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے لیکن اس کی تلوار لوہے کی نہ تھی بلکہ حضرت محمدؐ کے اخلاق وعفو اور پاکیزہ عادات وخصائل کی تلوار تھی۔ ان بے بہا اوصاف اور قیامت تک نہ مٹنے والی سبق آموز تعلیمات کی تلوار نے گردنیں نہیں کاٹیں بلکہ دلوں کو جوڑا اور ایک رشتے میں پرو دیا۔

آپ نے شکریہ کے بعد فرمایا، آپ حضرات کو یہ معلوم ہو یا نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسلام اور محمدؐ صاحب کے متعلق میرے خیالات پہلے اتنے اچھے نہیں تھے جیسا کہ آپ آج پاتے ہیں۔ میرا دل ان کی طرف سے تعصب سے لبریز تھا۔ اور مجھے محمدؐ صاحب اور ان کے اسلام میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی تھی، لیکن جب ترکِ موالات کی قید میں مطالعہ سیرت کیا تو میری آنکھیں کھل گئیں اور مجھے محمدؐ صاحب کی بے انتہا خوبیوں کا قائل ہو جانا پڑا اور اسی وجہ سے آج میں نے یہ معزز عہدہ قبول کرلیا ہے۔

اسلامی مساوات

ملک عرب کی تاریخوں سے ظاہر ہے کہ محمد صاحب سے قبل عرب حد درجے کی جہالت، وحشت، گمراہی، نشہ خواری اور طرح طرح کی بدکاریوں میں مبتلا تھے لیکن محمدؐ صاحب کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ صرف 23 برس کے قلیل عرصے ہی میں اس وحشی اور جاہل معاشرے کی کایا پلٹ گئی۔

آپ کی تعلیمات بے شمار ہیں۔ لیکن ان میں مجھے خصوصیت سے جو بیحد پسند ہیں اور جو ہر انسان کے لیے مفید اور قابل عمل ہیں، بیان کرتا ہوں۔

میں سب سے پہلا درجہ مساوات کو دیتا ہوں۔ اسلام نے آقا ہو یا غلام، غنی ہو یا مفلس، گورا ہو یا کالا، ہر فرد کو مسلم سوسائٹی میں مساوی درجہ عطا کیا ہے۔ محمدؐ صاحب کی تعلیم میں حسب و نسب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ عزت و بزرگی کا معیار عمل اور صرف عمل ہے۔

وراثت اور زکوٰۃ

اب وراثت اور زکوٰۃ کو لیجیے۔ میری رائے میں محمدؐ صاحب کی ان مسئلوں کے بارے میں جو تعلیمات ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ ''اسلام سرمایہ داری'' کا مخالف اور ''تقسیم دولت'' کا خواہاں ہے۔ مسئلہ وراثت کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ایک فرد کی ملکیت چند افراد میں منقسم ہو جائے اور اس خاندان کا ہر فرد افلاس سے محفوظ رہ سکے اور ساتھ ہی ایک تنہا شخص دولت مندی کے غرور میں دوسرے افراد انسانی کو اپنے سامنے ذلیل تصور نہ کرے۔

زکوٰۃ کو محمدؐ صاحب کی تعلیم میں جو نمایاں حیثیت حاصل ہے، وہ دوسرے مذاہب میں موجود نہیں۔ ملکیت کی تقسیم ایک خاندان کے افراد کی ہی مالی مشکلات کا حل ہو سکتی تھی، لیکن زکوٰۃ نے سرمایہ داری کی مخالفت کے ساتھ ایک ایک مفلوک الحال اور نادار مسلمان کو مفلسی کی پستی سے ابھارا اور دنیا میں انسانوں کی سی زندگی گزارنے کا موقعہ عطا کیا۔

عفو و درگزر

حضرات! محمدؐ صاحب کی تعلیمات کی طرح محمدؐ صاحب کے اخلاق بھی نہایت اعلیٰ پائے کے تھے۔ اس کی ایک محض ادنیٰ مثال یہ ہے کہ محمدؐ صاحب کی ایک صاحبزادی کو جب کہ وہ حاملہ تھیں ایک مشرک نے بھالے سے زخمی کر دیا۔ اس سبب سے ان کا حمل ساقط ہو گیا اور اس صدمے سے وہ جانبر نہ ہو سکیں مگر پھر جب وہی مشرک کسی موقع پر مجرم کی حیثیت میں محمد صاحب کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے اپنے حد سے بڑھے ہوئے اخلاق اور فطری عفو و تحمل سے کام لے کر ایسے مجرم کو کسی پرسش کے بغیر معاف کر دیا۔

حضرات! یہ کہا جاتا ہے کہ ''اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔'' آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ

میرا بھی یہی خیال ہے لیکن یہ کونسی تلوار تھی؟ کیا وہ آہنی تلوار تھی؟ نہیں، وہ محمدؐ صاحب کے انہی گراں بہا اخلاق وعفو، پاکیزہ عادات وخصائل، اُن کے بے بہا اوصاف اور اُن کی قیامت تک نہ مٹنے والی اور سبق آموز تعلیمات کی چمکتی دمکتی تلوار تھی، جس نے گردنیں کاٹنے کی جگہ دلوں کو ایک رشتے میں جوڑ دیا۔ اسلام کی شہرت اور قبولیت کے یہی اسباب ہیں، ورنہ کوئی شے جو زبردستی اور ظلم کی بنیاد پر قائم کی جاتی ہے، دیرپا اور بارآور نہیں ہوتی۔ محمدؐ صاحب کی بے انتہا عمدہ تعلیمات واخلاق ہی کے یہ کرشمے ہیں کہ اسلام اب تک قائم ہے اور مجھے یہ اقرار کرنے میں کچھ بھی باک نہیں ہے کہ محمدؐ صاحب کا مذہب ہی اپنی تعلیمات کی بنا پر آج دنیا میں سب سے زیادہ عام پسند مذہب ہے۔

رحمت عالم کے اخلاق

(راجہ رادھا پرشاد سنہا بی اے ایل، ایل بی آف تیلوتھو اسٹیٹ)

حضرت محمدؐ کا ہر قول اور ہر فعل استقامت اور سچائی کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ حضورؐ کی زندگی کا ہر واقعہ انسانی قوت سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ اگر حضور رحمۃ للعالمینؐ اور نمونہ خلق نہ ہوتے تو آج دنیا توحید پرستوں سے خالی نظر آتی۔ وہ کامل و اکمل کتاب جو اپنی تعریف و توصیف میں لاریب فیہ کا زبردست استدلال رکھتی ہے اس عدیم النظیر اور فقید المثال ہستی کے اخلاقی محامد و محاسن پر انک لعلیٰ خلق عظیم کی مہر تصدیق ثبت کر رہی ہے۔

الحمد للہ، اما بعد۔ محترم حضرات! جغرافیہ عالم اور تواریخ کے اوراق، دنیا کا کوئی گوشہ اور چپہ پیش نہیں کر سکے جس میں فطرت نے ہر جماعت، ہر گروہ اور قبیلہ اور ہر قوم کی سیرت و اخلاق کی درستگی و آراستگی کے لئے نبی، اوتار، رہنما، ہادی اور پیغمبر کی بعثت نہ فرمائی ہو۔ ولکل قوم ہاد۔ یہ آیت اس امر کی شاہد ہے کہ قدرت نے ہر گوشے اور ہر چپے پر خواہ وہ ارض مشرق میں ہو یا مغرب میں۔ شمال میں ہو یا جنوب میں کوئی نہ کوئی مصلح قوم، ملک و ملت کی ترقی اور ارتقائے اخلاق کے لئے ضرور مبعوث فرمایا، کہیں اگر ادریس و نوح علیہم السلام نے فیوضات واحد و صمد کی پرتو فگن کی تو کہیں الیاس و یوسف علیہم السلام نے روحانیت کے چشمے بہائے۔ اگر کہیں برہما جی نے دنیا و عالم کو فیض پہنچایا تو کہیں سری کرشن جی اور رام چندر جی نے اصلاح ملک و ملت کا بیڑا اٹھایا۔ اس کا ثبوت خود ہی اُس اسد بیشۂ نبوت اور حبیب مکین عرش نے چند مواقع پر مختلف پیرایۂ بیان میں ظاہر کر دیا۔ کسی جگہ ولکل قوم ہاد فرمایا، تو کسی موقع پر ولکل امۃ رسول کہا۔

دامانِ نگاہ کی تنگی

اگر ہم کسی ریفارمر، نبی یا اوتار کے "حالات زندگی" اور واقعات حیات کی جستجوئے کامل

بھی کریں تو ہماری نظروں کے سامنے ان کی زندگی کے تمام ماحول و واقعات نہیں آسکتے، لیکن یہ شرف و تخصیص صرف حضور انور کی ذات منبع الصفات ہی کو حاصل ہے کہ صرف سرسری مطالعۂ حیات سے تمام زندگی کا صاف نقشہ ہماری نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ اگر اس پیکر تقدس کی زندگی کے جستہ جستہ واقعات و حالات پر روشنی ڈالی جائے تو اس کے لیے بھی ایک دفتر لا متناہی درکار ہوگا۔ یہ مختصر مقالہ تو اس امر کی کسی طرح بھی کفایت نہیں کر سکتا اس نور مجسم اور پیکرِ صدق و صفا کے تمام اخلاق و عادات حسنہ جس کے متعلق لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کہا گیا ہے، پیش کر دیئے جائیں، اس وقت "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر چند مخصوص و بدیہی واقعات جن سے سامعین کرام کی روح کو تازگی پہنچنے کی قوی امید ہے، پیش کرتا ہوں۔

اخلاق نبوی کی ناپیدا کناری

وہ کامل و اکمل کتاب جو خود اپنی توصیف و تعریف میں لا ریب فیہ کا زبردست استدلال رکھتی ہے۔ اس عدیم النظیر وفقید المثال ہستی کے اخلاقی محامد و محاسن پر انک لعلیٰ خلقٍ عظیم کی مہر تصدیق ثبت کر رہی ہے۔

کفار عرب اُس یگانۂ زمانہ اور یکتائے عصر کی دشمنی اور عداوت پر کمر کسے ہوئے ہیں اور اُس مخزن جود و کرم کے فنا کرنے کی شبانہ روز کوششیں ہو رہی ہیں۔ شقاوتوں کے دریائے ناپیدا کنار، موجیں مار رہے ہیں، خوفناک اور جانگسل سازش کے زبردست جال بچھائے جا رہے ہیں، عناد اور مخالفت کی انسانیت سوز باد سموم چل رہی ہے، مگر ایسے نازک موقعہ پر بھی پیکر انسانیت و اخلاق اور بطل حق و صداقت کے پائے تحمل میں لغزش نہیں آتی ہر قول و فعل استقامت اور راستی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔ کوئی قدم بھی اخلاق کے جادۂ مستقیم سے منحرف نہیں ہوتا اور ہر وقت زبان صداقت شعار پر بھی جاری ہے۔ اللھم احسن خُلقی کما احسنت خلقی (اے اللہ میرے اخلاق کو بہترین بنا دے جس طرح تو نے میری تخلیق بہترین کی ہے) اور اللھم جنبی عن منکرات الاخلاق (اے اللہ مجھے برے خلق سے بچا)۔

مساوات اور حق کوشی

آپ اپنے اصحاب سے ہمیشہ فرمایا کرتے کہ میری توصیف و تعریف میں مبالغہ نہ کیا کرو،

جس طرح عیسیٰؑ کی امت نے حضرت عیسیٰؑ کو بڑھایا۔ میں بھی خدا کے بندوں میں ایک بندہ ہوں۔ اس لیے مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہا کرو۔" ایک روز حضورؐ انور باہر تشریف لائے، جمیع صحابہ تعظیماً استادہ ہو گئے۔ آپ فرمانے لگے کہ "عجمیوں کی طرح تم آپس میں ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوا کرو۔" ایک مرتبہ حضورؐ ایک شادی میں شریک ہوئے وہاں چند لڑکیاں مجاہدین کے کارنامے گا رہی تھیں۔ جمال انور کا مشاہدہ کرتے ہی یہ گانا شروع کر دیا کہ "ہمارے درمیان ایک ایسا نبی ہے جو آئندہ رونما ہونے والے واقعات بتا دیتا ہے۔ حضور نے فرمایا، یہ نہ کہو بلکہ جو تم پہلے گا رہی تھیں، وہی گاؤ۔"

فتح مکہ کے دن ایک شخص خدمت اقدس میں کچھ عرض کرنے کے لئے حاضر ہوتا ہے، رعب نبوی کو دیکھتے ہی لرزہ براندام ہو جاتا ہے، آپ نہایت تسلی سے فرماتے ہیں، "گھبراؤ نہیں، اطمینان سے گفتگو کرو، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں بلکہ میں بھی قریش کی ایک عورت کا بیٹا ہوں جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی۔" باوجودیکہ آپ کی خدمت تقدس آفرین میں ہر وقت خادمانِ ملت اور جانفروشانِ مذہب کا مجمع رہتا تھا اور ہر شخص سب سے پہلے جاں نثاری کو فخر خیال کرتا تھا لیکن آپ اپنے کام کے واسطے کسی کو تکلیف نہیں دیتے تھے۔ حتیٰ کہ بکریوں کا دودھ دوہنا کپڑے سینا اور جوتوں کی مرمت کرنا بہ نفس نفیس انجام دیتے تھے۔

مسجد نبوی کی تعمیر کا آغاز ہے، آپ بھی سب کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

غزوۂ خندق کے لئے خندقوں کی کھدائی کا کام زور شور سے جاری ہے۔ آپ بھی ایک ہی صف میں دوسروں کی خندق کھودتے دکھائی دے رہے ہیں۔

صبر و استقامت

اس ہادیٔ برحق اور پیکر شرم و حیا کے جس واقعہ اور جس بات پر نظر ڈالئے، وہ حکمتوں کا مجموعہ نظر آتی ہے، ہر واقعہ انسانی قوت سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی نے بھی اخلاق و مروت، تہذیب و شائستگی، متانت و سنجیدگی، شرم و حیا، تحمل و برداشت، صبر و شکیب، ایفائے وعدہ و پابندی عہد، ہمدردی و موانست کا ایسا زبردست اور موثر ثبوت بہم نہیں پہنچایا۔ مذہبی تاثرات سے قطع نظر جب ہم غور کرتے ہیں تو وہ ہستی محامد محاسن کا

مجموعہ نظر آتی ہے۔

غزوۂ احد کا زمانہ ہے۔ کافروں کی یورش بڑھی جاتی ہے۔ اس دوران میں حضور کا دندان مبارک شہید ہوتا ہے، مگر سبحان اللہ! اس تصویر قدس کی زبان سے ایک کلمہ بھی ایسا نہیں نکلا جو اخلاق کے جادۂ مستقیم سے متجاوز ہو۔

آپ حالت سجود میں ہیں۔ پشت مبارک پر اونٹ کا اوجھ رکھ دیا جاتا ہے۔ گلوے مبارک میں پگڑی ڈال کر کھینچا جاتا ہے۔ آپ کے پیچھے بازاری غنڈے لگائے جاتے ہیں۔ سنگ زنی کر کے آپ کے پائے مبارک خون آلود کیئے جاتے ہیں۔ آپ کا تمسخر اڑایا جاتا ہے، آپ کو ساحر کہا جاتا ہے۔ آپ کے ساتھ بدکلامی کی جاتی ہے، مگر آپ ان تمام مصائب کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ زوجہ ابولہب آپ کی گزرگاہ میں کانٹے بچھا دیتی ہے مگر حضور کے دست مبارک سے دامن صبر و شکیب اور اخلاق و مروت نہیں چھوٹتا۔

رحمت واخوت

آپ نے اپنی زبان صداقت لسان سے کبھی کسی کی دل شکنی گوارا نہ فرمائی۔ حضرت انسؓ جو بارگاہ حضور میں دس سال رہنے کا شرف حاصل کر چکے ہیں، فرماتے ہین کہ حضور انور نے کبھی بھی مجھ کو "تو" کہہ کر مخاطب نہیں کیا اور نہ میرے کاموں پر اعتراض کیا۔ اور کبھی بھی آپ کی زبان مبارک سے کوئی خلاف تہذیب کلمہ نہیں نکلا۔

اگر حضور رحمۃ للعالمین اور نمونہ خلق نہ ہوتے تو آج دنیا ان توحید پرستوں سے خالی نظر آتی۔ حضور اکرم کی بعثت کا مقصد اولین صرف انسان کی بگڑی ہوئی حالت کو سنوارنا اور آراستہ کرنا تھا۔ چنانچہ آپ خود فرماتے ہیں۔ بعثت لمکارم الاخلاق یعنی میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔ ان تمامی واقعات حضورؐ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تاجدار نبوت نے مساوات واخلاق کی کیسی عدیم المثال اور بے نظیر بنیاد قائم کی تھی اور اسی وجہ سے آپ کی تعلیمات میں سب سے زیادہ توحید خداوندی پر مساوات واخلاق پر زور دیا گیا ہے۔

کشور نبوت نے جہاں انما المومنون اخوۃ کا چیلنج دیا ہے، وہاں سود المومن شفاء (مومن کا جھوٹا شفا) کہہ کر اس بات پر صاف روشنی ڈالی ہے کہ مومن میں ایک دوسرے سے کسی قسم کا فرق نہیں، خواہ وہ کسی قوم یا گروہ سے متعلق ہو، میں ان تمام حضرات سے جو امیر و غریب میں تفریق پیدا

کرنا چاہتے ہیں اور اسلامی تعلیم کے خلاف دولتمندوں کو متقی (یعنی خدا سے ڈرنے والے) انسانوں سے بڑا رتبہ عطا کرنا چاہتے ہیں، پوچھتا ہوں کہ کیا سرکار دو عالم نے لفظ "مومن" کو کسی خاص گردہ یا ذات کے لیے مختص فرمایا ہے یا اس میں کچھ عمومیت بھی نمایاں ہے۔ للعاقل تکفیہ الاشارۃ۔

اخوت و مساوات کا بےمثال تاجدار

درحقیقت حضور ہی کی ایک ایسی تعلیم ہے جس نے ذات پات کی قید کو روا نہیں رکھا۔ آپ کا قانون ہے کہ کل بنی آدام گورے ہوں یا کالے۔ غریب ہوں یا امیر قوی ہوں یا ضعیف۔ شریف ذات سے تعلق رکھتے ہوں یا رذیل یا کوئی اور ہوں، سب برابر اور مساوی ہیں اور سب یکساں حقوق رکھتے ہیں۔ آپ کی تعلیم کے مطابق خدا کی نظر میں معمولی انسان اور بڑے سے بڑا شہنشاہ دونوں ایک حیثیت کے مالک ہیں، کیونکہ اس دربار میں شخصیت کی پروا نہیں ہوتی۔ یہاں تو نیک عمل درکار ہے اور اسی پر ساری شرافت اور امارت کی بنیاد قائم ہے۔

میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں اور آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے جہاں تک اپنے مذہب کی کتابیں اور دوسرے مذاہب کے بانیوں اور بڑے بڑے ریفارمروں کی جو چند تعلیمات پڑھی ہیں، ان میں مجھے کہیں بھی مساوات کا اتنا زبردست اور کھلم کھلا حکم موجود نہیں ملا، جتنے پرزور صاف اور بغیر الجھے ہوئے الفاظ میں آنحضرت نے اس کی ہدایت فرمائی ہے۔ مختلف قوموں اور نسلوں اور مذہبوں میں ایک اخوت کا رشتہ قائم کر دینا آنحضور کی ہدایت سے پیشتر دنیا میں غالباً کبھی اور کہیں نہیں دیکھا گیا۔

یہ آپ ہی کی فیض رساں تعلیم کا نتیجہ ہے کہ نسلی اور قومی تفریق مٹا کر سب کو بھائی بھائی بنا دیا۔ اور سرکار دو عالم کی یہی عام مساوات اور بھائی چارے کی وہ دلکش اور روح پرور تعلیم ہے جس نے میرے قلب پر گہرا اثر کیا ہے اور یہی وہ دلنشین اور دلپذیر ہدایت ہے، جو انسانی دلوں کو موہ لیتی ہے۔

اسلامی تہذیب اور اس کے عالمگیر اثرات

(ٹی آر سہنا صاحب ایم اے (میمیو برما) کی تقریر)

اسلام کا سب سے بڑا تحفہ ایک خدا کی پرستش ہے۔ کلمہ توحید، حج، نماز، روزہ، اسلام کی وہ چار خوبیاں ہیں جن سے اسلام تمام دنیا میں پھیل گیا پروٹسٹنٹ تحریک کا اصل بانی لیوتھر نہ تھا بلکہ حضرت محمدؐ تھے۔ لیوتھر نے حضرت محمدؐ ہی کی آواز کو دوبارہ بلند کیا تھا۔ اسلام نے وید مقدس کی پرانی تعلیم وحدت کو جس پر صدیوں کے زنگ پڑے ہوئے تھے دوبارہ زندہ کیا۔ آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند جی مہاراج گجراتی تھے لیکن ان کی تعلیم پنجاب میں زیادہ مقبول ہوئی۔ اس لیے کہ وہاں کے ہندو مسلم اکثریت کے اثرات موجود تھے۔

برادران وطن! تسلیم! میں آپ صاحبان کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ جیسے ناچیز اور ہیچمدان کو اتنی بڑی جمعیت کے سامنے ایسے اہم اور نیک شگون موقع پر تقریر کرنے کا موقع دیا ہے۔ وقت قلیل ہے اور مضمون مشکل، لہٰذا میں نے اپنے خیالات کو مندرجہ ذیل چند سطور میں قلمبند کر دیا ہے۔ امید کہ آپ معاف فرمائیں گے۔

اسلام سے پہلے عرب

پیشتر اس کے کہ میں یہ بتلاؤں کہ تہذیب اسلام کیا ہے اور یہ تہذیب دنیا میں کیسے پھیلی اور دوسری تہذیبوں پر اس نے کیا کیا اثر ڈالا؟ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند الفاظ میں یہ بتلا دیا جائے کہ اسلام سے پہلے عرب کی کیا حالت تھی؟

چاروں طرف جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ تمام ملک ایک بادشاہ کے زیر حکم نہ تھا۔

عرب میں مختلف قبیلے رہتے تھے اور ہر ایک قبیلے کا سردار اپنے آپ کو بادشاہ خیال کرتا تھا، لیکن کب تک؟ چند دنوں یا مہینوں تک کیونکہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول پر عملدرآمد تھا۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے خلاف برسر پیکار رہتا تھا۔ لوگ رہزن تھے، شرابی تھے، بدکار تھے اور انتہا درجے کے بت پرست

قبیلے قبیلے کا بت اک جدا تھا
کسی کا ہبل تھا کسی کا سفا تھا
یہ عزیٰ پہ وہ نائلہ پر فدا تھا
اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا

شیر خوار لڑکیاں زندہ درگور کر دی جاتی تھیں۔ کثرت ازدواج تھی اور کوئی حد مقرر نہ تھی۔ یہ عوام کا مذہب تھا۔ ان کے سوا چند لوگ عیسائی اور یہودی بھی تھے۔ یہودی اپنی مقدس کتابوں کو چھپائے بیٹھے تھے اور ان کو صرف اپنی قوم کے لئے مخصوص سمجھتے تھے۔ عیسائی مذہب کو زیادہ فروغ نہ تھا ان کی حالت ٹمٹماتے چراغ کی طرح تھی اور ان کے پادری توحید کی بجائے تثلیث کے مسئلے پر بحث و مباحثہ کر رہے تھے۔ اس وقت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا
ہوئے محو عالم سے آثار ظلمت
کہ طالع ہوا ماہ برج سعادت
نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدت
کہ تھا ابر میں ماہتاب رسالت
یہ چالیسویں سال لطفِ خدا سے
کیا چاند نے کھیت غارِ حرا سے

اسلام کی تعلیم

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیم میں وہ کونسی خوبیاں تھیں، جنہوں نے تمام عرب کے لوگوں کا دل قلیل عرصہ یعنی 23 سال میں گرویدہ کر لیا اور پھر یہی تعلیم کم و بیش دنیا کے ہر

گوشے میں پہنچ گئی؟ اس کا جواب مختصر الفاظ میں ہمیں جعفر طیار کی تقریر میں ملتا ہے جو آپ نے بادشاہ حبش کے سامنے بیان فرمائی۔ آپ نے بادشاہ کو بتایا تھا:

"اے بادشاہ! ہم جاہل تھے، بتوں کی پرستش کرتے تھے، مردار کھاتے تھے نہ ہم میں حیا تھی اور نہ غریبوں کے حقوق کی پاسداری کا خیال تھا۔ ہم میں انسانیت اور ایمانداری بالکل نہ تھی۔ ہم اپنے ہمسایوں کے حقوق تک نہ پہچانتے تھے اور نہ ہم میں کوئی قانون اور قاعدہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر رحم کیا اور ہمارے لیے ایک رسول بھیجا، جس کے حسب ونسب صدق و دیانت اور تقویٰ اور پرہیزگاری سے ہم خوب واقف تھے۔ اس نے ہمیں توحید کا سبق دیا اور ایک خدا کی طرف بلایا۔ اسی کی عبادت کرنے کی تلقین کی ہمیں پتھروں کی پوجا سے منع کیا۔ اس نے ہمیں سچ بولنے کا حکم دیا اور کہا کہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ امانت میں خیانت نہ کرے وعدہ پورا کرے، کمزوروں پر رحم کرے، گناہوں سے دور رہے، برائیوں سے بچے۔ اس کے علاوہ اس نے ہمیں جھوٹ بولنے، یتیموں کا مال کھانے اور عورتوں پر جھوٹے الزام لگانے سے روکا۔ نماز اور روزے کی تلقین کی۔ ہم نے ان باتوں کو تسلیم کیا اور اس کے نبی ہونے کا اقرار کرلیا۔ اس پر ہماری قوم ہم سے بگڑ گئی۔ وہ ہمیں اس لیے دکھ دے رہی ہے تاکہ ہم اپنے دین کو ترک کر کے پھر بت پرستی کی طرف لوٹ آئیں۔

اسلام کی سچائی

مذہب کیا ہے؟ نیک اور اخلاقی زندگی بسر کرنے کا طریقہ۔ اب ہم اسلام کے بڑے بڑے حکموں اور اصولوں کو لیں گے اور بتلائیں گے کہ اسلام ایک فطری اور سچا مذہب ہے اور پاک زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

اسلامی توحید

اسلام کا دنیا کو سب سے بڑا تحفہ ایک خدا کی پرستش ہے۔ اسلام کے لفظی معنے "خدا کی جناب میں سر تسلیم خم کرنے" کے ہیں۔ خدا کو اور بہت سے مذاہب بھی مانتے ہیں، لیکن اسلام اس کی ذات کو ایک اور بے شریک مانتا ہے۔ کسی مذہب کے پیرو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پیغمبر خدا کا

بیٹا ہے، کسی نے کہا کہ میں ہی خدا ہوں لیکن حضرت محمد مصطفیٰ فرماتے ہیں کہ میں تم جیسا ایک انسان ہوں، میری بڑائی صرف ایک بات پر ہے کہ خدا نے مجھ کو اپنا پیغام تمہارے پاس پہنچانے کے لئے چنا ہے قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی. (اے پیغمبر! انہیں کہہ دو کہ میں تمہارے جیسا انسان ہوں مگر ہاں میری طرف وحی کی جاتی ہے۔)

وضو اور نماز کی فلاسفی

اسلام کی دوسری خوبی طریقۂ عبادت ہے۔ پانچ وقت کی نماز پڑھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اسلام پاک وصاف کپڑوں اور پاک جسم کے ساتھ عبادت کرنے کا حکم دیتا ہے۔ بغیر وضو کے نماز جائز نہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ آنکھ اور ناک کے بہت سے امراض ان کو نجس اور ناپاک رکھنے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ جسم کے لیے ایک دفعہ غسل کافی نہیں۔ چند گھنٹوں کے بعد گرد اور وبائی بیماریوں کے جراثیم ہمارے بدن پر آ بیٹھتے ہیں۔ خاص کر جسم کے اُن حصوں پر جو کپڑوں سے باہر رہتے ہیں وضو ان اعضا کو پاک وصاف کر دیتا ہے اسلام میں چھوت چھات نہیں۔ شاہ اور گدا، آقا اور غلام ایک صف میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اتفاق اور یگانگت ہے۔

رمضان کی فلاسفی

اسلام کی تیسری خوبی ایک مہینے کے لیے رمضان کے مہینے میں روزے رکھنا ہے۔ ان سے روحانی اور جسمانی دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ رمضان میں روزہ رکھنا خدا اور اس کے حکموں کو تازہ کرتا ہے۔ بہت سے امیر موٹروں میں سیر کرنے والے اور نرم نرم گدیلوں پر سونے والے یہ نہیں جانتے کہ بھوک کیا چیز ہے اور غریبوں پر بھوک میں کیا گزرتی ہے؟ پس روزہ ان کے دل کو نرم کرتا ہے اور خیرات و زکوۃ کا دھیان لاتا ہے بہت سے ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بہت سی بیماریاں جسم کے اندر ایک قسم کے زہر کے جمع ہو جانے سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ہدایت کرتے ہیں کہ ہر بیماری تین سے لے کر سات دن تک فاقہ رکھنے سے اچھی ہو جاتی ہے۔ اس حکمت کا نام ہماری طب جدید میں نیچرل پیتھی یا قدرتی علاج ہے۔ اسلام نے اس علاج کو مذہب کا ایک جزو بنا دیا ہے۔

حج کی فلاسفی

اسلام کی چوتھی خوبی حج کا حکم ہے۔ حج ہر مسلمان پر فرض نہیں۔ مقروض نہ ہونا اور حج کو

جانے سے پہلے بال بچوں کا پورا انتظام کرنا لازمی ہے۔حج کے موقع پر تمام دنیا کے مسلمان خانہ کعبہ میں اکٹھے ہوتے ہیں اور اپنے خیالات کا تبادلہ کر کے اسلام کی بہبودی اور ترقی کے ذرائع سوچ سکتے ہیں۔

اسلام کی یہ چار خوبیاں ہیں یعنی کلمہ توحید، حج، نماز، روزہ، جنہوں نے پہلے تو عرب کے لوگوں کے دلوں کو گرویدہ کیا اور پھر اسلام کو تمام دنیا میں پھیلا دیا۔

حکم جہاد

اسلام اپنے آپ کو بچانے کے لیے لڑائی کرنے کی اجازت دیتا ہے۔اگر یہ حکم نہ دیا جاتا تو دشمن غالب آجاتے اور جاہلیت کا غلبہ برقرار رہتا۔توریت میں لکھا ہے کہ اگر کوئی تمہارا دانت توڑتا ہے تو تم بھی اس کا دانت توڑ دو اور اگر کوئی تمہاری آنکھ پھوڑتا ہے تو تم بھی اس کی آنکھ پھوڑ دو۔انجیل میں لکھا ہے کہ اگر کوئی تمہارے دائیں رخسار پر ایک تھپڑ مارتا ہے تو بائیں رخسار پر بھی ایک تھپڑ مروالو، لیکن اسلام کا حکم یہ ہے کہ اگر دشمن کو معاف کر سکتے ہو تو کرو ورنہ اگر اس نے ایک تھپڑ مارا ہے تو تم بھی ایک تھپڑ اس کو مارو۔

بدنہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سنے
ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

مذہبی رواداری

اسلام مذہبی رواداری کی تعلیم دیتا ہے۔قرآن شریف میں لکھا ہے کہ مذہب میں زبردستی نہیں اور ایک دوسری جگہ لکھا ہے، "ان لوگوں سے نفرت نہ کرو جو خدا کے علاوہ بتوں کو پوجتے ہیں۔" اسلام نے ماں باپ کو اولاد کے ساتھ الفت وشفقت کے برتاؤ کی تاکید کی ہے اور اولاد کے فرائض میں بتایا گیا ہے کہ وہ والدین کی رضا جوئی کریں اور ان کو آرام و آسائش کا سامان بہم پہنچائیں اور ان کی فرمانبرداری میں کوئی دقیقہ فروگزشت نہ کریں پڑوسیوں کے ساتھ ہمدردی کی تعلیم دی ہے۔پیغمبر اسلام نے فرمایا اس کا ایمان کامل نہیں جو اپنے پڑوسی کو شر سے محفوظ نہ رکھے۔ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ نبیؐ ہر ایک پڑوسی کے ساتھ ایسی ہمدردی سے پیش پیش آنے کی تلقین کرتے تھے کہ ہمیں یقین آگیا کہ وہ انہیں وراثت میں شریک کرنے کا حکم بھی دیں گے۔

اسلام میں عورتوں کے حقوق

اسلام پر نکتہ چینی کی جاتی ہے کہ وہ کثرت ازدواج یعنی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ اسلام میں چار عورتوں تک کے رکھنے کی اجازت ہے۔ سوائے عیسائی مذہب کے دیگر مذاہب میں بھی ایک سے زیادہ عورتیں رکھنے کی کوئی خاص مخالفت نہیں۔ کم سے کم قانونی ممانعت نہیں۔ اسلام بھی عام طور سے ایک بیوی رکھنے کا حکم دیتا ہے لیکن جنگ و جدل کی وجہ سے مردوں کی تعداد کم ہو جائے اور عورتوں کی تعداد بڑھ جائے تو وہ کہتا ہے کہ مرد ایک سے زیادہ بیویاں کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان کو ایک آنکھ سے دیکھے۔ یاد رہے کہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب جرمن میں تیس سالہ لڑائی کے بعد جو 1618ء سے 1648ء تک رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ میں ہوتی رہی اور جس میں بہت سے لوگ مارے گئے تھے، جرمن لوگوں نے دو بیویوں کا رکھنا جائز قرار دے دیا تھا۔ اسلام سے پہلے عورتوں کے ساتھ بہت بدسلوکی ہوتی تھی۔ کئی ممالک میں تو لڑکیاں پیدا ہوتے ہی دفن کر دی جاتی تھیں اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تھا تو بجائے خوشی کے ماتم کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ اگر کوئی چھوٹی بچی کو کھلانے کے لئے نکلتا تو لوگ پوچھتے تھے "جی یہ آپ کا لڑکا ہے؟" جواب ملتا تھا، جی نہیں لڑکی ہے۔ پھر کہا جاتا تھا، خیر خدا لڑکا بھی دے گا۔ اکثر ملکوں میں عورتوں کو پاؤں کی جوتی سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ انگلستان میں عورتوں کا آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں داخل ہونا ممنوع تھا۔ جائداد میں عورتوں کا حصہ نہ تھا۔ اکثر ممالک میں بیوہ چاہے کتنی ہی کمسن ہو، شادی نہ کر سکتی تھی۔

عورت اور اسلامی احکام

لیکن حضرت محمدؐ نے بتایا کہ عورت اور مرد کے حقوق برابر ہیں۔ مردوں اور عورتوں کو نیک اعمال پر یکساں انعام ملیں گے۔ جن نیکیوں کے کرنے اور جن عبادات کے بجالانے کا مردوں کو حکم دیا گیا ہے، ان کا عورتوں کو بھی حکم دیا گیا ہے۔ باپ کی وراثت میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں شریک کئے گئے اور خاوند کی وراثت میں سب بیویاں برابر حقوق کی حقدار۔ شادی سے پہلے خاوند کی مالی حیثیت کے مطابق رقم مہر کا مقرر کرنا عورتوں کے لئے آزادی کا چارٹر یا دستاویز ہے جس کو کوئی دنیوی بادشاہ منسوخ نہیں کر سکتا۔

اسلام کیوں پھیلا؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی تہذیب دنیا میں کیسے پھیلی؟ یاد رہے کہ کسی وقت آدھی دنیا اسلام کے جھنڈے کے نیچے رہ چکی ہے۔ آسٹریلیا، امریکہ اور افریقہ کا اکثر حصہ اسلامی عہد میں یورپ اور ایشیا کی قوموں کو نامعلوم تھا۔ عرب، روم، شام، عراق، ایران، ہندوستان، مصر، شمالی افریقہ، چین، اسپین اور روس کے اکثر حصے اسلامی سلطنت میں رہ چکے ہیں۔

اسلام پر اکثر حملہ کیا جاتا ہے کہ اسلام ایک فوجی مذہب ہے اور تلوار کے ذریعے سے پھیلا۔ کیا کوئی کثرت قلت کو طاقت سے ڈرا کر اپنے مذہب میں لا سکتی ہے؟ لیکن اسلام کا اعلان تو ایک ہی شخص نے کیا تھا۔ اگر وہ تلوار استعمال کرتا تو کتنے لمحے زندہ رہتا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اسلام کی کن کن خوبیوں نے لوگوں کے دل کو اپنی طرف کھینچا۔ اسلام کا خدا ایک، رسول ایک اور طریقہ عبادت اور مساوات کے احکام ایک تھے۔ تو پھر لوگ کیوں اسلام میں داخل نہ ہوتے۔

تہذیب اسلام کے اثرات

اسلام نے کاشتکاری کے لیے اصول سکھائے اور لوگوں کو تجارت کی طرف مائل کیا جہاز رانی سکھائی۔ یہ عرب کے تجار ملاح ہی تھے جنہوں نے جاوا اور سماٹرا میں اسلام پھیلایا۔ اس کے علاوہ بہت سی قومیں ایسی ہیں جو مسلمان تو نہ ہوئیں لیکن اسلامی تہذیب کا ان پر بہت اثر ہوا۔ عیسائی مذہب کی تاریخ میں لیوتھر کو پروٹسٹنٹ تحریک کا بانی سمجھا جاتا ہے، جس نے پندرھویں صدی میں رومن کیتھولک پادریوں کے خلاف جہاد شروع کیا تھا لیکن پروٹسٹنٹ تحریک کے اصلی بانی حضرت محمدؐ تھے۔ لیوتھر نے جس بت پرستی کو برا بتایا اور پوپ اور پادریوں کے جن اختیارات کی مخالفت کی، وہ وہی تھے جن کی آواز پیغمبر اسلام نے اٹھائی۔ یورپ کے لوگوں نے نجوم، جہاز رانی اور ریاضی، اسپین کے موروں (عربی قوم) سے سیکھ کر ان علوم کو اپنے ملکوں میں پھیلایا۔ اسلام سے پہلے یورپ کے ملکوں کی عمارتیں چنداں خوبصورت نہ تھیں۔ اسپین کے موروں سے انہوں نے معماری سیکھی اور اپنے ملک میں داخل کی۔

لبرٹی میں جو آج فائق ہیں سب سے
بتائیں کہ لبرل بنے ہیں وہ کب سے

فصاحت کے دفتر تھے سب گاؤ خوردہ
بلاغت کے رستے تھے سب ناسپردہ
ادھر روم کی شمع انشا تھی مردہ
اور آتش پارسی تھی فردہ
یکا یک جو برق آکے چمکی عرب کی
کھلی کی کھلی رہ گئی آنکھ سب کی

اسلام کا اثر ہندوستان پر

اسلام کا اثر ہندوستانی مذاہب پر بھی پڑا۔
وہ وید مقدس کی پرانی تعلیم وحدت جس کی شکل کو کئی صدیوں کے زنگ نے کچھ سے کچھ بنا دیا تھا۔ اسلام کی کسوٹی سے لگ کر پھر اصلی رنگ میں نمودار ہوئی۔ آریہ سماج کی شکل میں۔ آریہ سماج کے بانی گجراتی تھے۔ لیکن ان کی تعلیم پنجاب میں زیادہ مقبول ہوئی، کیوں؟ اس لیے کہ وہاں اسلام کی اکثریت ہے۔ حضرت گورو نانک کو مسلمانوں نے مسلمان سمجھا اور ہندوؤں نے ہندو اور یہ مذہب بھی زیادہ پنجاب میں مقبول ہوا۔

برادران وطن! اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے مذہبی تفرقات پر زیادہ زور نہ دیں اور باوجود مذہبی تفریق کے، خوشگوار تعلقات قائم رکھیں۔ غیر قومیں ہمارے آپس کے نفاق پر ہنستی ہیں۔ کاش کہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی اپنا اپنا یوم النبیؐ منائیں اور سب کو دعوت دے کر اپنی فراخدلی کا ثبوت دیں۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

بے نظیر اخلاق

یوم النبیؐ ۱۹۳۵ء کی تقریب پر سیرت کمیٹی اجمیر کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں ملک کے مشہور انشا پرداز اور ادیب منشی للتا پرشاد صاحب شاد میرٹھی نے ایک نہایت ہی دلچسپ اور عمدہ تقریر فرمائی۔ ہم اس تقریر کے بعض اجزا کو شائع کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں۔

آنحضرتؐ کی رحم دلی

عمرو بن امیہؓ جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے، جاہلیت کے عالم میں دوسرے عربوں کی طرح دشمن کو غفلت یا خواب میں یا دھوکا سے قتل کر دینے کے لیے بدنام تھے جو لوگ امن و سایہ میں آ جاتے تھے، انہیں بھی مار ڈالتے تھے۔ یہ کیفیت ایام جہالت میں تمام عرب کی تھی۔ چنانچہ ابوسفیان نے ایک دن قریشیوں سے کہا کہ محمد کو مدینہ کے بازاروں میں پھرتے ہوئے بحالت غفلت کوئی قتل کر سکتا ہے۔ ایک بدوی تیار ہو گیا اور خنجر چھپا کر چلا۔ آنحضرت مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ بدوی روبرو آیا آپ نے اُسے دیکھ کر فرمایا کہ یہ شخص غدار نظر آتا ہے۔ ایک صحابی نے فوراً جائزہ لیا اس کے پائجامہ سے خنجر برآمد ہوا۔ اب تو اس شقی نے گڑگڑا کر امان مانگی اور آنحضرت کا رحم ملاحظہ فرمائیے کہ آپ نے قطعی معاف فرما دیا اور سارا حال سن کر اسے چھوڑ دیا۔ صاحبان آپ کو معلوم ہے کہ اس رحم و کرم کا کیا نتیجہ نکلا؟ وہ بدوی حضرت کے اس طرز عمل سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسی وقت مسلمان ہو گیا۔

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

رحم و اخلاق کے رات دن ایسے معاملات دیکھ کر خالد ابن ولید کا دل بھی کچھ پسیجا چنانچہ

اس نے آپ کو چند گھوڑے نذر کیے۔ اس وقت تک وہ آپ کا اور اسلام سخت مخالف بلکہ جانی دشمن تھا اور مخالفوں کی طرف سے بڑی بہادری اور دلیری سے لڑا کرتا تھا۔ اس نذر پر ابوسفیان بہت برہم ہوا اور خالد سے لڑنے لگا۔ لیکن واقعات سے متاثر ہو کر دشمنوں کے کیمپ میں بھی خالد کے کئی طرف دار ہو گئے تھے۔

ایک بار قریش پر حملہ کرنے کے لیے آپ نے خاموش و خفیہ تیاریاں شروع کیں مگر ایک صحابی حاطب نامی نے تمام باتوں کی خبر مخالف کیمپ کو بھیج دی۔ حضرت عمرؓ نے قاصد کو پکڑ لیا اور خط پڑھا گیا تو سب نے حاطب کو قتل کی سزا دینی چاہی مگر آپ نے بالکل معاف کر دیا۔

ایک روز دوران خطبہ میں تمام قریشیوں کو آزاد و معاف کر دیا۔ جس کا اتنا لا جواب اثر ہوا کہ صدہا مرد و عورت حتیٰ کہ بہت سے قریش خود بھی مسلمان ہو گئے اور ابوسفیان کی بیوی اور اس کے بیٹے کی بہو بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

غربت وسادگی

آپ کی غربت و سادگی کا حال بیان کرنا مشکل ہے۔ کھانا بہت سادہ اور مقدار میں بہت کم ہوتا تھا، کپڑے ہمیشہ سادہ، معمولی اور اکثر پیوند لگے ہوئے پہنتے تھے، وفات کے بعد حضرت عائشہؓ نے آنحضرت کی زندگی بسر کرنے کا تذکرہ اس طرح کیا، کہ گھر میں سے ایک کمبل نکال کر دکھایا۔ جس میں کئی پیوند تھے اور جابجا پھٹا ہوا تھا۔ یہی کمبل آپؐ کے استعمال میں وقت وفات تھا۔

بعض اوقات تیل کی کمی کے باعث حجرہ میں روشنی تک نہ ہو سکتی تھی اور اندھیرے میں ہی رات کٹتی تھی۔ آپ کے انتقال کے وقت حضرت عائشہؓ نے ایک ہمسایہ سے تیل مانگ کر روشنی کی تھی۔

آپ کی لخت جگر سیدہ فاطمہؓ چکی پیستی اور گھر کا تمام کام دھندا کرتی تھیں حتیٰ کہ ہتھیلی پر چھالے پڑ گئے تھے۔ حضرت علیؓ خود پانی بھرتے تھے۔ ایک بار چاہا کہ رسول اللہ سے ایک خادم مانگ لیں، مگر تکلیف و پریشانی کے باوجود فرمائش کرتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی تھی۔

ایک شب کا ذکر ہے کہ آپ کو خوب نیند آئی۔ صبح اُٹھتے پر دریافت کیا کہ کیا بستر بچھایا تھا جو اس قدر آرام ملا۔ معلوم ہوا کہ روزانہ استعمال کا ٹاٹ ہی بچھایا گیا تھا مگر اتفاقاً اس روز اس کی چار تہیں کر دی گئی تھیں۔ وفات کے وقت موٹے کھدر کا تہ بند اور ایک پیوند لگا ہوا کمبل جسم پر تھا۔

آپ کی سادگی کا اثر صحابیوں پر بھی خوب پڑا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ تاجر تھے۔ بعد وفات

رسولؐ خلیفہ منتخب ہوئے۔ اور سب نے بیعت کی مگر باوجود اس شان و عزت کے اگلے روز ہی کپڑوں کی گٹھڑی کندھوں پر رکھ کر بیچنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ انسانی ذمہ داری کا اتنا احساس فی زمانہ نہایت مشکل ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کا قول تھا کہ جو کمزور ہے وہ قوی ہے، انشاء اللہ اُس کا حق دلاؤ نگا۔ اور جو قوی ہے وہ کمزور ہے اُس سے حق لے کر رہوں گا۔ آج اس مقولہ کے برعکس 'جس کی لاٹھی اُس کی بھینس' پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ پردۂ عالم پر کمزوروں پر ہی حکومت کی جاتی ہے۔ ایسا کون ہے جو اپنی طاقت وقوت کا مظاہرہ اور گھمنڈ نہ کرتا ہو۔

ایک روز حضرت علیؓ نے اپنے کسی دشمن کو جنگ میں پچھاڑ دیا جو انہیں قتل کرنا چاہتا تھا، نیچے گر کر غصہ میں اس نے حضرت علیؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ آپ فوراً چھاتی سے اتر پڑے اور یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ جا بھاگ جا بہ حالت غصہ قتل کرنا حرام ہے، اندیشہ ہے کہ کہیں تیری حرکت پر غصہ نہ آ جائے۔

بعض دیگر خوبیاں

حضرت محمدؐ صاحب کی خوش خلقی اور مہمان نوازی بے نظیر تھی۔ وہ دشمن سے بھی مسکراہٹ ملائمت اور آہستگی سے گفتگو کرتے تھے۔ غصہ تو دور رہا وہ زور سے بولتے تک نہ تھے۔ ایک بار عیسائیوں کا وفد آیا جو خاص عزت اور خاطر و تواضع کے ساتھ ٹھہرایا گیا اور جب اُن کی عبادت کا وقت ہوا تو خود مسجد نبویؐ کے صحن میں عبادت کے لئے اجازت عطا فرما دی۔

ایک بار کچھ پھل بطور تحفہ کہیں سے آئے۔ آپ نے سب سے پہلے اُس میں سے ایک حصہ اپنے ہمسایہ یہودی کو بھیجا اور پھر اہل و عیال میں تقسیم کر کے بعد میں خود استعمال فرمایا۔ ملک شاہ سلجوتی کے ایک فوجی افسر نے کسی غریب بیوہ کا جانور دھوکہ سے ذبح کر ڈالا۔ بیوہ نے اُسے پُل پر پکڑ لیا اور بیساختہ کہا کہ بتا تو میرا انصاف اس پل پر کرے گا یا قیامت کے دن پل صراط پر۔ یہ تھی اسلام کی بدولت ایک غریب بھکاری بیوہ کی ہمت، کہ بڑے فوجی افسر سے دو بہ دو کر بیٹھی اور پھر انصاف حاصل کیا۔

آپ اکثر غار حرا میں آبادی سے دور قیام فرمایا کرتے تھے اور مراقبہ کی حالت میں رہتے تھے، جہاں صرف پانی کا ایک مشکیزہ اُن کے پاس رہتا تھا۔

ہندو شعرا کا نذرانہ عقیدت

مرحبا سید مکی مدنی العربی

(مہاراجہ سرکشن پرشاد شاؔد سابق مدارالمہام ریاست نظام حیدر آباد دکن)

پرتو ذات احد جلوۂ سرِ عجمی
رو کش مہر حقیقت تو چہ عالی نسبی
چہ کنم وصفِ تو اے ہاشمی و مطلبی
مرحبا سیّد مکی مدنی العربی
دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

از وجودِ تو شدہ جامۂ احرام عدم
چشمہائے تو نمودہ اثرِ لا و نعم
از خرامِ تو بود رونقِ گلزار ارم
من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بو العجبی

دردِ عشقِ تو بدل باد مرا اے دلبر
باد سودائے از آں زلفِ معنبر در سر
باد تصویرِ تو دردیدۂ مرا شام و سحر
چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی ہاشمی و مطلبی

گرچہ گویند براقت زسرخاک گزشت
کس نداند مگر ازدانش و ادراک گزشت

واہ چہ در چشم زدن صاحب لولاک گزشت
شب معراج عروج تو ز افلاک گزشت
بمقامے کہ رسیدی نرسد ہیچ نبی

جلوۂ حق چو شدی اے شہ والا درجات
گشت پیوست بیک آئینہ ذات و صفات
جدا برزخ کبریٰ سکون و حرکات
ماہمہ تشنہ لبانیم توئی آبِ حیات
رحم فرما کہ ز حد میگزرد تشنہ لبی

ساقیٔ کوثر و تسنیم عطا کن یک جام
تا بمانم زمۓ عشق تو سرمست مدام
حسرت لذت آزار شود نیک انجام
نخل بستان مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرہ آفاق بہ شیریں رطبی

کیمیا ہست حیات تو بنی آدم را
زندگی ہست ثبات تو بنی آدم را
حق کجا داد صفات تو بنی آدم را
نسبتے نیست بذات تو بنی آدم را
برتر از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی

شد نہ اوصاف تو تحریر ازیں رو خجلم
بے گل مدح تو چوں غنچہ فسردہ است دلم
اللہ اللہ کجائی و کجا آب و گلم
نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بہ سگِ کوئے تو شد بے ادبی

چشم بد دور ز رویت شدہ عالم پر نور

ہست مشتاقِ جمالِ تو چہ انسان و چہ حور
بر فلک عیسیٰ علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام بہ تمنا سرِ طور
ذاتِ پاکِ تو دریں ملکِ عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

یا نبی مونسِ جان و دلِ عشاق توئی
خاکِ راہِ تو شوم ہست تمنائے دلی
شاد ہر وقت کند ذکرِ تو ہمچوں قدسی
سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

سلام

لالہ رام سروپ شیدا

اے رسولؐ پاک باطن منزل حق آشنا
پیشوائے دین و ملت حامی ملک خدا
تیری الفاظ و معانی سے ہے بالا تر ثنا
شان میں تیری کہا شمس الضحیٰ بدرالدجیٰ
بھیجتی خلقِ خدا ہے تجھ پر یوں صدہا سلام

جور و استبداد سے ہیں سب کے دل زخمی یہاں
چل رہی ہیں ہر طرف ظلم و ستم کی آندھیاں
خون پانی ہو کہ اب ہے اپنی رگ رگ میں رواں
وقت ہے امداد کا یہ، اے نبیؐ اِنس و جاں
عرش اعظم سے ہے تیرے واسطے اترا سلام

مضطرب خلق خدا ہے وقت ہے یہ، جلد آ
ہر طرف افلاس سے اک شورِ محشر ہے بپا
بھائی بھائی لڑ رہے ہیں ہو گئے وقفِ بلا
نالہ ہائے دل سے اپنے گونج اٹھی ہے فضا
لے لیجئے اب تو لے لیجے خدا کے واسطے میرا سلام

دیر ہے کس واسطے فرمایئے بہر خدا!
اک زمانہ معتقد ہے آپؐ کے اخلاق کا

آپؐ کی تعریف قرآں میں ہے آئی جا بجا
آپؐ کا ہی ہے لقب خیرا البشر بیضا ضیا
آپؐ ہی کے واسطے ہے خلق میں پیدا، سلام

ہیں احادیث آپؐ کی دنیا میں بہر انتظام
ہے زبانوں پر رواں وہ آپؐ کا شیریں کلام
آپؐ کے الطاف کے شیدا یہاں ہیں خاص و عام
آپؐ ہی کا نام دنیا میں ہوا خیر الانام
ہے زمانہ میں رواں یہ آپؐ کا سکہ، سلام

سلام اس پر جو آیا رحمۃ للعالمینؐ بن کر

- جگن ناتھ آزاد

سلام اسؐ ذات اقدس پر، سلام اسؐ فخرِ دوراں پر
ہزاروں جسؐ کے احسانات ہیں دنیائے امکاں پر
سلام اسؐ پر جو حامی بن کر آیا غم نصیبوں کا
رہا جو بیکسوں کا آسرا، مشفق غریبوں کا
مدد گار و معاون بے بسوں کا، زیر دستوں کا
ضعیفوں کا سہارا اور محسن حق پرستوں کا
سلام اسؐ پر جو آیا رحمۃ للعالمینؐ بن کر
پیامِ دوست لے کر صادق الوعد و امیں بن کر
سلام اسؐ پر کہ جس کے نور سے پر نور ہے دنیا
سلام اسؐ پر کہ جسؐ کے نطق سے مسحور ہے دنیا
سلام اسؐ پر جلائی شمعِ عرفاں جس نے سینوں میں
کیا حق کے لئے بے تاب سجدوں کو جبینوں میں
سلام اسؐ پر بنایا جسؐ نے دیوانوں کو فرزانہ
مئے حکمت کا چھلکایا جہاں میں جسؐ نے پیمانہ
بڑے چھوٹے میں جسؐ نے اک اخوت کی بنا ڈالی
زمانہ سے تمیز بندہ و آقا مٹا ڈالی

سلام اسؐ پر فقیری میں نہاں تھی جسؐ کی سلطانی
رہی زیرِ قدم جسؐ کے شکوہ و شانِ خاقانی

سلام اسؐ پر جو ہے آسودہ زیرِ گنبدِ خضرئ
زمانہ آج بھی ہے جسؐ کے در پر ناصیہ فرسا

سلام اسؐ پر کہ جس نے ظلم سہہ سہہ کر دعائیں دیں
وہ جسؐ نے کھائے پتھر، گالیاں، اس پر دعائیں دیں

سلام اس ذات اقدس پر حیاتِ جاودانی کا
سلام آزاد کا، آزاد کی رنگیں بیانی کا

(ماخوذ،مجلہ"علیگ"راولپنڈی)

گلشنِ بطحا

لالہ چھنومل نافذ دہلوی تلمیذ، بیخود دہلوی

اب حسیں دل میں، نہ انؐ کی یاد اب پہلو میں ہے
آج کل الجھا ہوا دل شاہ کے گیسو میں ہے

دیدۂ تر، خونِ دل شامل یہ کیوں آنسو میں ہے
جب تشفی کے لئے یادِ نبیؐ پہلو میں ہے

ہجرِ احمدؐ میں ہوا ہوں اس قدر گریہ کناں
نوح علیہ السلام کے طوفان کا عالم ہر اک آنسو میں ہے

پرسشِ روزِ جزا کی فکر پھر کیوں ہو ہمیں
بخشوانا جب ہمارا آپؐ کے قابو میں ہے

جسم و جاں جلتے ہیں فرقت میں نبیؐ کی رات دن
دل نہیں، آتش کی چنگاری مرے پہلو میں ہے

مشک و عنبر کو میسر وہ، نہ پھولوں کو نصیب
آپؐ کی زلفوں سے بہتر کوئی بھی خوشبو میں ہے

کعبہ مسلم جدا ہے کعبہ دل ہے جدا
سجدہ گاہ عاشقاں محرابِ ابرو میں ہے

اچھے اچھے اور بھی دیکھے ہیں گلشن دہر میں
گلشن بطحا مگر بے مثل رنگ و بو میں ہے

ہے سراپا درد کوئل، درد ہے آواز میں

دیکھنا کس درد سے مصروف تو ہی تو میں ہے

در پہ پیشانی گھسوں آنکھوں کو تلوؤں سے ملوں
یہ تمنا ساتھ لے کر دل، مرے پہلو میں ہے

کیا مدینے کے چمن سے ہو کے آئی ہے ابھی
کس لیے یہ دلکشی قمری، تری کُو کُو میں ہے

کس لئے ہو خوف تربت کے اندھیرے کا مجھے
روئے زیبا کا تصور جب مرے پہلو میں ہے

الفتِ حضرتؐ کا نافذ ایک ادنیٰ ہے یہ وصف
ہے کمالِ نعت گوئی اور پھر ہندو میں ہے

محبوبؐ اپنا کر لیا پروردگار نے

(چودھری دلورام کوثری ساکن نانڈری ضلع حصار)

جس دم دبایا مجھ کو گناہوں کے بار نے
میں شافعؐ گناہ کو لگا پھر پکارنے
حضرتؐ نے آ کے مجھ کو سبکدوش کر دیا
رحمت بڑی کی شافعؐ روزِ شمار نے
دیکھا بنا کے جب کہ محمدؐ کا حسن و نور
محبوبؐ اپنا کر لیا پروردگار نے
ہے نام دلو رامؔ، تخلص ہے کوثری
دیر و حرم کی سیر کی اس خاکسار نے

رسولوں میں انتخابؐ

(لالہ چندی پرشاد شیدا، دہلوی)

وہ لطف رنگ سحاب بھی ہے نسیم رحمت ماب بھی ہے
رسولوں میں انتخاب بھی ہے زمیں پہ گردوں کاب بھی ہے

رفیق بھی ہے، خلیق بھی، شفیق و رہ طریق بھی ہے
وہ ایک بحر عمیق بھی ہے بشر فرشتہ جناب بھی ہے

وہ پیکرِ نور ہے مجسم و رازِ عرفان حق کا محرم
وہ عاجزوں بیکسوں کا ہمدم وہ اک جلالت مآب بھی ہے

رحیم بھی ہے کریم بھی ہے نعیم بھی ہے حکیم بھی ہے
جہاں میں فضل عظیم بھی ہے علیمِ راہ ثواب بھی ہے

مئے رسالت کا نورِ پیکر، خمِ حقیقت کا صاف منظر
وہ بادۂ معرفت کا ساغر جہاں میں دورِ شراب بھی ہے

وہ بحر عرفاں کا ہے سفینہ کہ، حق کا سینہ ہے اک خزینہ
ہے بامِ حقانیت کا زینہ وہ گویا قدِ حساب بھی ہے

شفیع بھی ہے، رفیع بھی ہے سمیع بھی ہے خبیر بھی ہے
بصیر بھی ہے نصیر بھی ہے مگر وہ امی خطاب بھی ہے

وہ ذرہ ہو کر بھی مہر ٹھہرا، وہ قطرہ ہو کر بنا ہے دریا
بشر بھی فوق البشر ہے یکتا وہ بحر بھی ہے حباب بھی ہے

وہ سینہ اس کا فلکِ فضا ہے وہ قلب اس کا رو صفا ہے

وہاں وہ بیدار رہنما ہے خضر جہاں محو خواب بھی ہے

وہ قاب قوسین کا نظارا، حبیبؐ کہہ کر جسے پکارا
احد کا احمدؐ سے ہے اشارا سوال بھی ہے جواب بھی ہے

ہے روح فردوس کا خزانہ کہ نعت گوئی کا ہے ترانہ
کہ جس کا شیدا ہے اک زمانہ، یہ باغ رضواں کا باب بھی ہے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

لالہ لال چند فلک

نغمہ وحدت حق دہر میں گایا تو نے
کملی والے یہ عجب گیت سنایا تو نے

رب بے مثل کا، دنیا میں بٹھا کر سکہ
نقش اوہام پرستی کا مٹایا تو نے

پڑ گئے ماند سبھی شرک خودی کے اختر
مہر توحید کا جلوہ جو دکھایا تو نے

جو شراب اور نشے کے تھے ازل سے مشتاق
مئے وحدت کا انہیں جام پلایا تو نے

باہمی نفرت و کینہ تھا وطیرہ جن کا
انس و الفت کا سبق ان کو پڑھایا تو نے

خواب غفلت میں پڑے سوتے تھے مکی مدنی
لب اعجاز سے قم کہہ کے اٹھایا تو نے

ریت کے ذروں کو بارود کی طاقت بخشی
خاک ناچیز کو اکسیر بنایا تو نے

کر دیا ایک، شہنشاہ و گدا کا رتبہ
اونچ اور نیچ کا سب فرق مٹایا تو نے

دختر حارث غمگیں کو رہائی بخشی

قید پر غم سے غلاموں کو چھڑایا تو نے
کیوں نہ قربان مسلمان ترے نام پہ ہوں
حق پرستی کا جنہیں طور بتایا تو نے
گنبد و سقفِ فلک گوشِ زمیں گونج اٹھے
نعرہ توحید اللہ کا جو لگایا تو نے

ہمسر ہے کون شانِ رسالت مآب ﷺ کا

(منشی پیارے لال رونق دہلوی)

حاصل شرف ہے کس کو خدا کی جناب کا
ہمسر ہے کون شان رسالت مآبؐ کا

چمکا جو نور حسن رسالت مآبؐ کا
روشن ہوا چراغ جہان خراب کا

عاشق ہوں اس جناب رسالت مابؐ کا
کونین ایک ذرہ ہے جس کی جناب کا

پردہ حضورؐ نے جو اٹھایا حجاب کا
آنکھوں میں نور دے گیا گوشہ نقاب کا

دم میں براق پر سر عرش بریں گئے
تھا معجزہ یہ آپؐ کے پائے رکاب کا

پیتے ہی آ گیا جو انا لحق زبان پر
منصور نام ہو گیا مست شراب کا

نقش ہو گئے تھے جو کبھی جلوے خیال میں
اب تک وہی نظر میں اک عالم ہے خواب کا

بحر روان زیست میں موج فنا بھی ہے
ہستی ہے اپنی راز شکست حباب کا

لیکر سیاہی نور رخ آفتاب سے

لکھنا ہے وصف حسن رسالت مآبؐ کا

اف رے کرشمہ سازی رنگ فریب دہر
آب رواں پہ ہوتا ہے دھوکہ سراب کا

ہجر نبیؐ دیکھی ہے دل کی کہیں تڑپ
برق تپاں ہے رنگ مرے اضطراب کا

دے جائے لطف دل کو مرے کیف سرمدی
کر دیں جو مست دے کے وہ ساغر شراب کا

رونق، سخن کو میرے نہ حاصل ہو کیوں شرف
مداح ہوں جناب رسالت مآبؐ کا

فضیلت تریﷺ

تم ﷺ وہ ہو، حق نے بنایا جن کو شاہ انبیاء
تم ﷺ وہ ہو، بالا ہے سب نبیوں میں جن کا مرتبہ
تم ﷺ وہ ہو، جن کو شرف معراج کا حاصل ہوا
تم ﷺ وہ ہو عرش بریں زینہ ہے جن کے بام کا

نیر برج شرف ہوآسان معرفت
منکشف تم ﷺ سے ہوا راز نہان معرفت

تم ﷺ ہو جن کے سبب توقیر ہے اسلام کی
جلوۂ شان احد تصویر ہے اسلام کی

ہر طرف پھیلی ہوئی تنویر ہے اسلام کی
تم ﷺ سے ہی چمکی ہوئی تقدیر ہے اسلام کی

تم ﷺ نے احکام شریعت کا دکھا کر آئینہ
ہر دل تاریک میں اک نور پیدا کر دیا

ہادی دین متیں ہو تم محمدﷺ مصطفیٰ
باعث صد فخر و ملت رہنما و پیشوا

لکھ دیا حق میں تمہارے حق نے لولاک لما
تم ﷺ نہ ہوتے تو نہ بنتے یہ کبھی ارض و سما

تم ﷺ سے ہی قائم جہاں میں ہے یہ بنیاد جہاں

اس سے پہلے نام کو بھی کچھ نہ تھا نام و نشاں

تم ؐ وہ ہو چرخ رسالت کے درخشاں آفتاب
نور عالمتاب کا جس کے نہیں کوئی جواب

دیکھ کر بزم جہاں میں رنگ حسن انتخاب
شرم سے خورشید محشر ہے لئے منہ پر نقاب

تم ؐ وہ ہو ظلمت مٹا دی دم میں کفر و شرک کی
مشعل توحید کی، سب کو دکھا کر روشنی

حق تو یہ ہے حق پرستی کا بتا کر راستہ
کر دیا باطل پرستان جہاں کو حق نما

ذات اقدس ہے تمہاری مظہر صدق و صفا
بن گئے نا آشنا بھی راز وحدت آشنا

تھا وجود پاک تلقین ریاضت کے لیے
تم ؐ یہاں آئے تھے امت کی شفاعت کے لیے

ہو سکے وصف حمیدہ کا تمہارے کیا بیاں
کھل نہیں سکتی پے توصیف رونق کی زباں

خوبی ذات مقدس ہے زمانہ پر عیاں
لوٹ ہیں سب آپ کی شان رسالت پر یہاں

تم شہہ ہر دوسرا ہو۔ یا حبیبؐ کبریا
تم سا پیدا ہی نبیؐ کوئی نہ ہو گا دوسرا

مہمانداری

ماسٹر باسط بسوانی

شاہِ حبش کے بھیجے ہوئے لوگ ایک دن
حاضر ہوئے حضورؐ میں دل شاد و مطمئن
حضرت نے مہمانوں کے آرام کے لئے
اوروں کا ذکر کیا ہے، بہت کام خود کئے
کی عرض خادموں نے کہ اے شاہ ارسلاں
تکلیف آپ اٹھائیں یہ ہم سب کو ہے گراں
فرمایا سن کے سید عالی مقام نے
ہادی دین حق نے رسولؐ انام نے
مسلم گئے تھے ملک حبش جب کہ لا کلام
خاطر کا ان سبھوں نے کیا ان کی التزام
مہمان ہیں میرے کیوں نہ کروں اہتمام، میں
کیوں اپنے ہاتھ سے نہ کروں ان کے کام، میں
ممکن نہیں جواب کوئی اس جواب کا
کیا خلق تھا جنابِ رسالت مآبؐ کا

ہے پہنچ تیریؐ جہاں وہم وگماں پہنچا نہیں

پنڈت جگن ناتھ پرشاد آنند

دشتِ فاراں تک جو میرِ کارواں پہنچا نہیں
معرفت کی منزلوں تک وہ جواں پہنچا نہیں

ایک قطرہ مل سکا اس کو نہ جامِ عشق سے
تشنہ لب جو تا درِ پیرِ مغاں پہنچا نہیں

مدحِ حسنِ مصطفیؐ ہے ایک بحرِ بیکراں
اس کے ساحل تک کوئی شیریں زباں پہنچا نہیں

نیک و بد کی ہے خبر تو واقفِ کونین ہے
ہے پہنچ تیریؐ جہاں، وہم و گماں پہنچا نہیں

یہ فریبِ نفس ہے آنند الفت تو نہیں!
اب تک ان کے گوش تک شورِ فغاں پہنچا نہیں

دنیا کو تمؐ نے آ کر پُر نور کر دیا ہے

شیام سندر، سندر ایڈیٹر پارس لاہور

دنیا کو تمؐ نے آ کر پُر نور کر دیا ہے
اور ظلمتوں کو یکسر کافور کر دیا ہے
پیغام حق سنا کر مسرور کر دیا ہے
وحدت کی مئے پلا کر مخمور کر دیا ہے
اک بار تو دیارِ یثرب کو دیکھ لیتا
پابندیٔ جہاں نے مجبور کر دیا ہے
سندر سے کیا رقم ہو وہ شان ہے تمہاریٔ
جس نے گداگروں کو فغفور کر دیا ہے

شمع انوار

رانا بھگوان داس

السلام اے شمع انوار جہاں　　السلام آئینہ دارِ کن فکاں
السلام اے سیدِ کون و مکاں　　السلام اے واقفِ سر نہاں
السلام اے خواجہء پیغمبراں　　السلام اے مظہرِ رب جہاں
السلام اے ہادی گم گشتگاں　　السلام اے شافعِ بے چارگاں
السلام اے مالکِ ہر دو جہاں　　السلام اے وجہ تخلیق زماں
السلام اے تاجدارِ مرسلاں　　السلام اے راز دارِ کن فکاں
السلام اے محسنِ نوع بشر　　السلام اے نکتہ حسن جہاں
السلام اے شہریارِ دین حق　　السلام اے خسروِ نورانیاں

السلام اے جان بھگوان السلام
السلام اے سجدہ گاہ عاشقاں

اک عرب ﷺ نے آدمی کا بول بالا کر دیا

هری چند اختر

کس نے ذروں کو اٹھایا اور صحرا کر دیا
کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا
زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں اس کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا
شوکت مغرور کا کس شخص نے توڑا طلسم
منہدم کس نے الٰہی قصر کسریٰ کر دیا
کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا
کہہ دیا لا تقنطو اختر کس نے کان میں
اور دل کو سر بسر محوِ تمنا کر دیا
سات پردوں میں چھپا بیٹھا تھا حسنِ کائنات
اب کسی نے اس کو عالم آشکارا کر دیا
آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا
"اک عرب نے آدمی کا بولا بالا کر دیا"

حضرت محمد ﷺ کو مکہ کے تمام مرد، عورتیں اور بچے 'امین' کے نام سے شناخت کرتے تھے۔ امین کے معنی ہیں اعتماد کے لائق اور قابل بھروسہ۔ مجھے اس لفظ سے زیادہ معزز اور شریف لقب ایسا نظر نہیں آتا جس سے یہ لوگ آپ کو بچپن ہی سے یاد کرتے تھے۔

مسز اینی بیسنٹ

میں شکوک وشبہات کا اظہار کرنے والوں کی ہرزہ سرائی سنتا ہوں تو ششدر رہ جاتا ہوں۔ اللہ اکبر۔ اگر محمد ﷺ رسول برحق نہ تھے تو اب تک پھر کوئی رسول دنیا میں آیا ہی نہیں۔

مسٹر سکاٹ (ایڈیٹر اخبار الاندلس)

میں نے اپنی تحقیق میں کوئی ایسا ثبوت نہیں پایا جس میں حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر شبہے کا اظہار کیا جاسکے۔

جارج سیل

حضرت محمد ﷺ کی صداقت ثابت کرنے کے لئے بیشمار شواہد موجود ہیں، ان میں سب سے بڑا ثبوت میرے نزدیک یہ ہے کہ جن لوگوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا وہ سب کے سب راست باز افراد تھے جو آپ ﷺ کے محرم راز، دوست اور افراد خاندان تھے اور آپ ﷺ کی پرائیویٹ زندگی سے کامل آگاہی رکھتے تھے۔ میں بے شک یہ تسلیم کرتا ہوں کہ آپ ﷺ کے مذہب اسلام میں پرہیزگاری اور خداترسی اتنے کامل درجہ پر ہے جو دیگر مذاہب میں ہرگز نہیں پائی جاتی۔ میں اس امر کا بھی برملا اعتراف کرتا ہوں کہ اخلاق انسان کی ترقی کا باعث صرف اسلام ہی تھا۔

سر ولیم میور

''پیغمبر اسلام ﷺ غیر مسلموں کی نظر میں'' کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور آئندہ بھی لکھی جاتی رہیں گی۔ ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لئے اسوہ حسنہ کا اتباع انسانیت کے لیے ایک سعادت ہے۔ حضور ﷺ پر فرشتے تک درود بھیجتے ہیں اس لئے ان کے اخلاق وکردار کی عظمت اور ان کے پیغام کی صداقت کی غیر مسلموں سے تائید وتصویب کی ضرورت نہیں لیکن چونکہ جدید تعلیم یافتہ ذہن ہر چیز کی سند مغرب سے لاتا ہے اس لئے ان کے ذہن وفکر کی آبیاری کے لئے ہمارے دوست **محمد یحیٰی خان** کی یہ کتاب بتدریج مفید ثابت ہوگی۔ انہوں نے جن اہل فکر ونظر کی تحریروں کو اس میں شامل کیا ہے وہ اپنے معاشرہ کے بڑے لوگ تھے جنہیں ان کے علمی وادبی کارناموں کی وجہ سے امام کا درجہ حاصل ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ ائمہ فکر ونظر بھی اسوہ حسنہ کے سامنے سرافگندہ ہیں۔ میری دعا ہے کہ یہ کتاب نوجوان نسل کے لئے سرمایہ غور وفکر فراہم کرے۔ (آمین)

محبوب سبحانی (سابق ایڈیٹر، روزنامہ مشرق، لاہور)

نگارشات

24 مزنگ روڈ، لاہور، پاکستان

Ph: 0092-42-37322892 Fax: 37354205

E-mail: nigarshat@yahoo.com

www.nigarshatpublishers.com